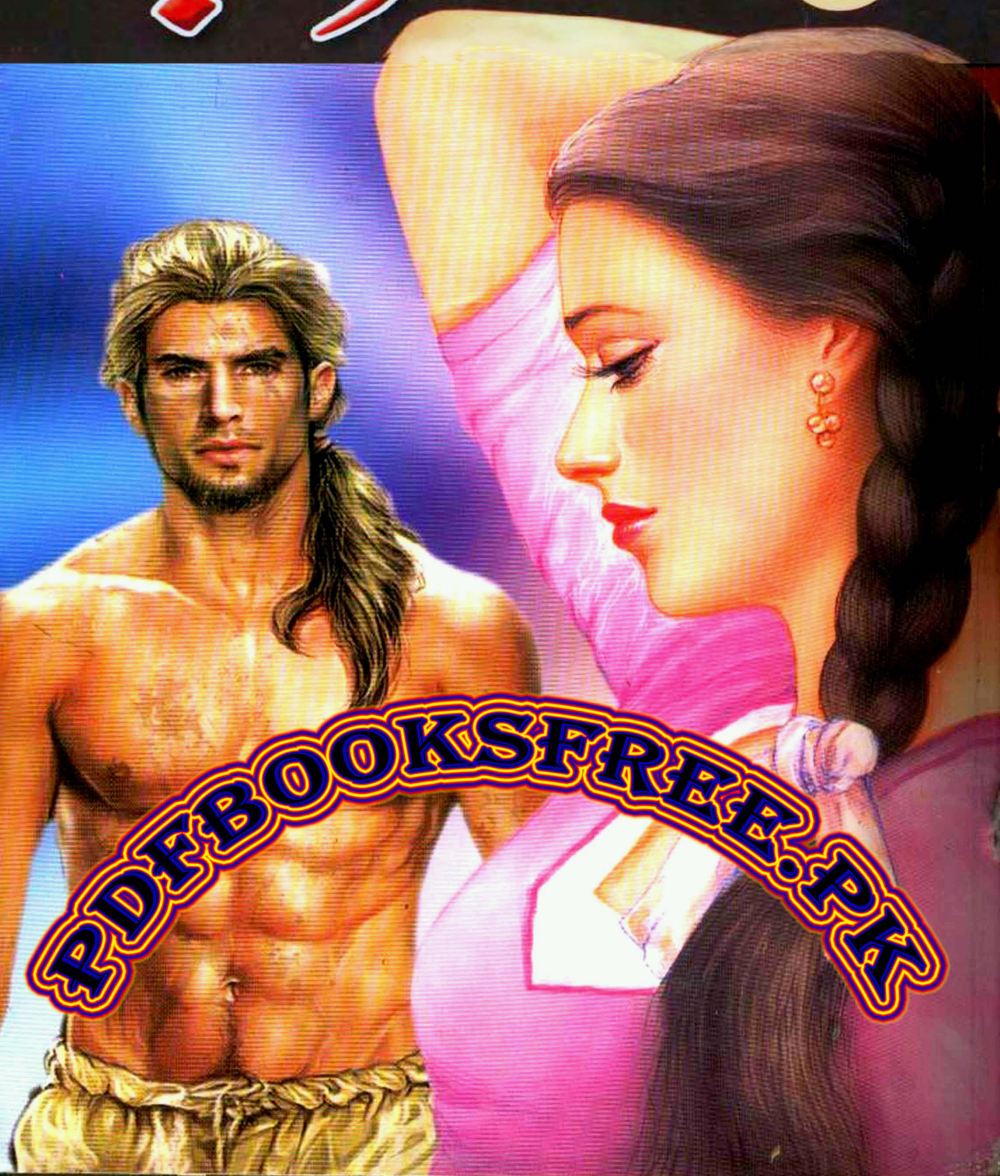


ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

16



ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تھلکہ خیز کہانی

سراب

سولہواں حصہ

کاشف زیر



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 37247414

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بارشاعت ————— اول
مطبع ————— یو این ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ————— عاطف رحمن، لاہور
قیمت ————— 250 روپے
بیرون ملک ————— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ISBN 978-969-517-320-6

Stokist: (U.K)

Azhar Enterprises

315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 0NR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علیٰ بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ رومانہ اور راشد سے فاضلی کو کیا غرض ہو سکتی تھی۔ وہ انہیں دنیا سے رخصت کر سکتا تھا مگر وہ اس کے لئے بہت معمولی سا خطرہ تھے اور ان کے لئے اس حد تک جاناکہ مجھ پر تشدد کرنا، یہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی چکر تھا۔ اسی طرح مجھے یہ خطرناک کڑا پہنانے کے پیچھے بھی کوئی چکر تھا میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ ڈیوڈ شانے ذاتی تحفظ یا مجھے فرار سے روکنے کے لئے پہنایا تھا۔ پھر اس نے چند گھنٹے کی بات کی تھی۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ جب بہت دیر سوچنے پر کوئی واضح بات ذہن میں نہیں آئی تو میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ڈیوڈ شانے مجھے جس طرح اغوا کر لیا تھا اس کے بعد ان کا محتاط ہونا لازمی تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ سفیر اب تک موبائل استعمال کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے فوری طور پر موبائل ترک کر دینا چاہئے تھا۔ ہم موبائل کی وجہ سے مارے گئے تھے۔

وسیم اور دوسرے اس صورت حال میں حفاظتی تدابیر کر رہے ہو گئے کیونکہ میرے بعد ان لوگوں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ انہوں نے یقیناً وہ تمام جگہیں چھوڑ دی ہوں گی جن کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہو کہ دشمن ان سے واقف ہیں۔ مجھے رومانہ اور راشد سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی فکر تھی۔ اگر ڈیوڈ شانے کمپنی حویلی کا پتا چلا لیتے تو وہ وہاں حملہ کر سکتے تھے۔ کھلی جنگ ہوتی تو اس میں دونوں فریقوں کو نقصان ہو سکتا تھا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچ رہا تھا میرا دل مضطرب ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ میں نے اپنے دشمنوں کی خاطر اپنے دوستوں کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ مگر یہاں میری قوت فیصلہ ڈانوا ڈول ہو رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ رومانہ میرے بدترین دشمن کی بیٹی سہی لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ اسے اُن لوگوں کے حوالے کروں جن کے نزدیک عورت صرف ایک جسم ہوتی ہے۔

میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تو اٹھ کر ٹھیلنے لگا۔ وقت دیرے دیرے گزر رہا تھا۔ بارہ بج گئے تھے اور مجھے یہاں سوچتے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر وقت ہو گیا تھا۔ اب مجھے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس لئے میں نے دروازہ بجایا اور اس وقت تک بجاتا رہا جب تک باہر سے باسو کی غراہٹ نہیں سنائی دی۔ "کیا ہے؟" مجھے واش روم جانا ہے۔"

جواب میں خاموشی چھا گئی اور جب ایک منٹ گزرنے پر بھی کچھ نہیں ہوا تو میں نے دوبارہ دروازہ بجانے کے لئے ہاتھ بلند کیا مگر اسی لمحے دروازہ کھل گیا میں پیچھے ہٹا تھا۔ سامنے باسو کھڑا ہوا تھا اس نے ہٹ کر

مجھے راستہ دیا۔ میں باہر آیا تو اس نے اشارے سے ایک طرف چلنے کو کہا۔ دوسری راہداری میں اس بار مخالف سمت میں مڑ کر ہم واش روم ایریا تک پہنچے۔ وہاں ایک ہی بڑے کمرے میں کئی ٹوائلٹس تھے جیسے کہ عوامی مقامات پر ہوتے ہیں۔ مگر یہ عوامی بیت الخلا کے مقابلے میں نہایت چمکتے دیکھتے اور صاف تھے۔ ان میں حفظانِ صحت کی جدید ترین سہولتیں مع اوزون کلیئر اور گرم ہوا کے موجود تھیں۔ میں صاف ستھرا ہی تھا مگر ٹوائلٹ سے فارغ ہو کر میں نے منہ ہاتھ دھو لیا۔ اس دوران میں باسو واش روم کے دروازے پر کسی ناقابل شکست چٹان کی طرح ایستادہ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شاا سے لایا ہی میرے لیے تھا۔ میں نے ڈرائیئر کے نیچے ہاتھ خشک کرتے ہوئے باسو سے کہا۔

”تم پیدا کئی طور پر ایسے ہو؟“

جواب میں وہ بدستور مجھے پلک جھپکائے بغیر گھورتا رہا۔ میں نے شانے اچکائے۔ ”مرضی تمہاری اگر تم جواب نہیں دینا چاہتے۔“

”بس چلو۔“

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کمرے کی طرف لے جائے گا مگر اس نے راہداری میں سیدھا چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک دروازے کے آگے رکا اور بولا۔ ”اندر جاؤ۔“

”اندر کون ہے؟“

”جاؤ۔“ وہ غریبا۔ میں نے ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہوا تو اندر سے آراستہ پیراستہ کمرے میں فاضلی خاصے عیش و عشرت کے عالم میں نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں جام تھا تو دوسرے میں ساقی۔ لڑکی نما عورت خاصے سنسنی خیز حلیے میں تھی اس نے بہت مہین پکڑے کامیکی نما چٹنوں والا لباس پہنا ہوا تھا جو جسم کے تمام قاتل خطوط کی نمائش کا فریضہ بخوبی انجام دے رہا تھا۔ میں نے غور کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس رات فراری میں فاضلی کے ساتھ تھی جب ہم اسے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ میں نے اسے بھی بے ہوشی والی ڈارٹ کا نشانہ بنایا تھا۔ میری توجہ سے فاضلی غلط سمجھا اور اس نے مسکرا کر کہا۔

”گلتا ہے تمہیں پسند آئی ہے۔“

”مجھے مونٹ چیزوں میں سب سے پسند اچل ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”دشمنوں کے لیے۔“

یہ کہہ کر میں اس کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے جلدی سے ہاتھ بلند کیا۔ ”آں..... آں۔“

میں ٹھٹک گیا اس کے ہاتھ میں وہی رنگ تھا جو ڈیوڈ شاا نے دکھایا تھا۔ میں رکا تو فاضلی مسکرانے لگا۔ ”تم

سمجھ گئے ہو گے اب تمہاری ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔“

”بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔“ میں نے سر دلچے میں کہا اور اس سے

پوچھے بغیر اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے لڑکی کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا اور اس نے اس بات کا

خاصا برا منایا تھا۔ وہ کینز تو زلفوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے استہزائیہ انداز میں لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا تم نے یہی دکھانے کے لیے بلایا ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس قسم کی عورت نما مخلوق میں

بہت دیکھ چکا ہوں۔ میرے نزدیک ان کی اہمیت کسی دیہات کی دیوار پر تھپے کو بر کے اُپلے سے بھی کم ہے۔“

لڑکی ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اس نے برہمی سے کہا۔ ”یہ شخص مسلسل میری انسلٹ کر رہا ہے اور تم سن رہے ہو۔“

میں ہنسا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے فاضلی جیسے لوگ تمہیں عزت کا مستحق سمجھ کر اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں اور بائی دی وے جو چیز تم اس سے چاہ رہی ہو وہ تو خود اس کے پاس.....“

اس سے آگے میرے حلق سے جو آواز نکلی تھی وہ قطعی بے معنی تھی کیونکہ فاضلی نے اچانک ہی اپنا رنگ والا ہاتھ آگے کیا اور مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میرے ہوش ہی گم ہو گئے۔ کمرامیری نظروں کے سامنے گھومنے لگا تھا اور ایک عجیب سی کھر جتی سی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی۔ یہ چھتی آواز جیسے میرے دماغ میں سوراخ کر رہی تھی۔ اس سے پہلے مجھے کئی بار کرنٹ کھانے کا اتفاق ہوا تھا جب دشمنوں نے بجلی کو تار چر کے لیے استعمال کیا۔ کسی کچھوے کی طرح بے ضرر ہو جانے والے اکرم چشتی نے تو اس معاملے میں حد کر دی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں کرنٹ کھانے کے معاملے میں نا تجربے کا نہیں ہوں لیکن یہ تجربہ بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ جسم میں ایسی عجیب سے سنسنی دوڑ گئی تھی جیسے بنا کسی وجہ کے خارش اٹھے اور آدی کہا بھی نہ سکے۔ دماغ سوچنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اسے ماؤف ہونے والی کیفیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ سننے اور دیکھنے کی جس کام کر رہی تھی مگر بہت ہی نرالے انداز میں۔ میرے ساتھ جو ہوا تھا اس کی وضاحت مشکل ہے۔

نہ جانے کتنی دیر یہ کیفیت رہی پھر کمرے نے گھومنا بند کر دیا اور آواز نے سب خراشی بھی بند کر دی۔ بالآخر میری نظر فوکس ہوئی تو لڑکی دوبارہ فاضلی کی بغل میں بیٹھی ہنس رہی تھی۔ یہ اسی کی ہنسی تھی جو عجیب انداز میں سب خراشی کر رہی تھی۔ غالباً وہ میری کیفیت سے مسلسل محظوظ ہوتی رہی تھی۔ میں نارمل ہوا اور میں نے غیر محسوس انداز میں گھڑی کی طرف دیکھا تو پندرہ منٹ گزرے تھے۔ گویا میں ڈبوؤ شا کے اندازے سے نصف وقت میں ٹھیک ہو گیا تھا اس نے کہا تھا اس برقی صدمے کا شکارتیں منٹ سے پہلے کسی قابل نہیں ہوتا۔ لیکن میں اسی طرح بے سدھ انداز میں بیٹھا رہا۔ فاضلی غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں قابو میں آنے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ میں اب بہتر ہو رہا ہوں۔ ”شہباز کیا محسوس کر رہے ہو؟“

”تم سے نفرت۔“ میں نے تحیف سے آواز میں کہا۔ ”پہلے سے کئی گنا زیادہ۔“

”میں تمہارے دلی تاثرات کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ اس نے کسی قدر بھنا کر کہا۔ ”میری بلا سے تم جو چاہے سوچتے رہو جسمانی طور پر کیا محسوس کر رہے ہو۔“

”کاش کہ میرے ہاتھوں میں جان ہوتی تو میں اس انگوشی کی پروا کیے بغیر تمہاری گردن مردونے کی کوشش کرتا۔“

”کوشش کر کے دیکھ لو۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ میں جواب میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد میں کوشش کر کے یوں ذرا سیدھا ہوا جیسے میرے لیے یہ کام بھی مشکل ہو۔ فاضلی نے شک سے کہا۔ ”کیا تم جیج ابھی تک شاک میں ہو۔“

”ہاں میرا جسم پوری طرح قابو میں نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ بیس منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور میری کوشش تھی کہ پورا آدھا گھنٹہ کر کے ہی ٹھیک ہوں۔ دس منٹ بھی کسی نہ کسی طرح گزار لیے۔ ”اب

میں ٹھیک ہوں اور اگر تم یہ انگٹھی اتار دو تو زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں تم اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہو گے۔“
 ایک دم فاضلی سنجیدہ ہو گیا اور اس نے سیدھا ہوئے بغیر لڑکی سے کہا۔ ”ہنی لیو اس الون۔“

ہنی جبرائیل اسکرانی، لہرا کر اٹھی اور بل کھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد فاضلی نے اپنے خالی ہونے والے گلاس کو دوبارہ بھرا اور میرے سامنے آ بیٹھا۔ ”مجھے تم سے کام ہے؟“
 ”کیا کام ہے؟“ میں نے براہ راست انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”آج رات میری زندگی کی سب سے اہم مہم درپیش ہے۔“
 میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا جب وہ خاموش رہا تو میں نے پوچھ لیا۔ ”کیا تم نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا جو ابھی تمہارے پہلو میں بیٹھی تھی؟“

فاضلی نے یوں منہ بنایا جیسے وہ خود کوئی بہت پاکباز اور شریف آدمی ہو جو کسی طوائف سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ”کیا وہ تمہارے دماغ میں گھس گئی ہے۔“
 ”نہیں یہ خیال تو ابھی آیا ہے کہ تم دونوں کا بہت پر فیکٹ میچ ہو گا۔ تم دونوں ہی حیا اور شرم کے نام سے بھی ناواقف ہو۔“

”شہباز سنجیدہ ہو جاؤ۔“ اس نے بد مزگی سے کہا۔ ”اس مہم میں تمہیں بھی اہم کردار ادا کرنا ہو گا۔“
 ”سوری میں اس کا قائل ہوں کہ آدمی اپنی سہاگ رات خود منائے۔ میری طرف سے معذرت ہے ویسے تم ڈیوڈ شا کو کیوں شامل نہیں کر لیتے۔“

اس بار میں ہوشیار تھا۔ جیسے ہی فاضلی نے ہاتھ آگے کیا میں نے اپنا کڑے والا ہاتھ پیچھے کیا اور آگے آئے فاضلی کے سینے پر لات ماری۔ میں نے جان بوجھ کر زیادہ قوت استعمال نہیں کی تھی اس کے باوجود فاضلی صوفے سمیت الٹ کر پیچھے گرا میں اسے لات مار کر واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا اور سکون سے بولا۔ ”اگر تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی تو زبان سے جواب دو۔ امید ہے تم اب سمجھداری سے کام لو گے۔“

فاضلی اٹھا تو اس کا چہرہ بگڑا جیسا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹل سے پستول نکال کر میری طرف کیا۔ میں ایک ننگے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اشتعال دیکھتے ہوئے ایک لمحے کو مجھے لگا کہ وہ گولی چلا دے گا۔ مگر پھر اس کے جوش پر ہوش غالب آ گیا۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسی وقت مجھے شوٹ کر دیتا۔ مگر ڈیوڈ شانے مجھے ایسے ہی اس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مجھے کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے گہری سانسیں لیتے ہوئے پستول واپس رکھا اور سر دسلجھ میں بولا۔ ”پھر سہی۔“
 میں نے سر ہلایا۔ ”تمہاری مجبوری سمجھ رہا ہوں۔“

اس نے صوفہ سیدھا کیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ مجھ سے جتنا الجھے گا اسے اتنی ہی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے وہ فوری مطلب کی بات پر آ گیا۔ ”آج رات ہم درگاہ مرشدیہ پر حملہ کریں گے اور یہ مرشد کی آخری رات بھی ہوگی۔“

میں پہلے ہی توقع کر رہا تھا کہ اس کی اہم مہم کا تعلق مرشد سے ہو گا لیکن یہ تازہ خبر تھی کہ آج مرشد کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔ ”ڈیوڈ شانے بتایا تھا کہ اسے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے؟“

”ہاں لیکن اعلیٰ حکام کی مداخلت پر اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔“ فاضلی نے جواب دیا۔ ”یہ ایک گھنہ پہلے کی بات ہے۔“

میں نے سوال کیا۔ ”تمہارا خیال ہے یہ مہم اتنی آسان ہوگی۔ ہو سکتا ہے مرشد کے برعکس یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہو؟“

”ہو سکتا ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ”لیکن میرا پلان مکمل ہے۔ مرشد کے بیشتر وفادار میرے ساتھ شامل ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے ان ہی پر انحصار کرتا ہے۔“

یہ اطلاع بھی نئی تھی کہ فاضلی مرشد کے بیتر وفاداروں کو خرید چکا تھا۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم تھا کہ درگاہ پر تباہ ہونے والے اسلحہ خانے کی تباہی میں فاضلی کے وفاداروں کا ہاتھ تھا اور وہ سب کے جاسوسوں نے ہی اس کا پتا چلایا تھا۔ ان کی دی ہوئی معلومات کی بنیاد پر ہم نہ صرف فاضلی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ہمیں ڈیوڈ شاو اور فاضلی کے گھوڑے کا بھی پتا چلا تھا۔ اب مجھے پتا چلا کہ ڈیوڈ شاو مرشد کے آدمیوں کے مرنے پر اتنا دلچسپی کیوں تھا کیونکہ وہ وفاداریاں بدل کر اس کے اور فاضلی کے ساتھ مل چکے تھے۔ میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے پلان میں میرا کردار کس خوشی میں ہے؟“

”کیونکہ مرشد تمہارا دشمن بھی ہے۔“

”اگر وہ میرا دشمن ہے تو اس سے منہنے کا فیصلہ میرا اپنا ہوگا میں کسی دوسرے کو بندوق چلانے کے لیے اپنا کندھا پیش نہیں کر سکتا۔“

”تم راضی خوشی کچھ نہیں کرو گے لیکن مجبوراً کرو گے۔“

”میں کس لیے مجبور ہوں گا؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس کڑے کی وجہ سے؟“

”نہیں اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔“ فاضلی کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”تمہیں یقیناً بھگوال میں موجود اپنے ساتھیوں کی زندگی کا خیال ہوگا۔“

مجھے جھٹکا لگا تھا۔ ان لوگوں نے بھگوال کی حویلی کا سراغ بھی لگا لیا تھا۔ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو بلف کر رہے ہو کیونکہ میرے موبائل کا سراغ اسی علاقے سے لگا تھا۔“

”چلو تم دل خوش کر لو مگر ان تصویروں کے بارے میں کیا کہو گے؟“ فاضلی نے اپنے ساتھ رکھا ٹیپ پی سی اٹھایا اور اس پر چند بار انگلیاں چلا کر اسے میری طرف بڑھا دیا۔ ”لو دیکھو۔“

پہلی تصویر ہی حویلی کے سامنے والے حصے کی تھی۔ پھر جھیل کی تصویر پھر زوم کر کے لی گئی کسی بلند جگہ سے حویلی کے اندر کی تصاویر تھیں اور کئی تصویروں میں وہ سب کے آدمی بھی نظر آ رہے تھے۔ اب میرے لیے فاضلی کو جھٹلانا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے ٹیپ کھینچ کر ایک دیوار پر دے مارا اور سرد لہجے میں پوچھا۔ ”تو تم میرے ساتھیوں کے نام پر مجھے بلیک میل کرو گے؟“

”اس میں حرج کیا ہے۔“ فاضلی مسکرایا۔ ”افسوس کہ تم نے آخری تصویر تک نہیں دیکھا۔ آخری تصویر میں تمہیں ایک فکس میزائل نظر آتا جو ایک قریبی پہاڑ پر نصب ہے اور صرف ایک ٹن دبانے سے یہ حویلی کے اندر گھس کر پھٹے گا اور ایک ہی میزائل پوری حویلی کو لیے کا ڈھیر بنانے کے لیے کافی ہوگا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ حویلی

میں موجود افراد پر کیا گزرے گی؟“

مجھے لگا کہ فاضلی نے مجھے چاروں طرف سے جکڑ لیا تھا۔ یہ تصور ہی اذیت ناک تھا کہ میرے ساتھی میری وجہ سے یوں بے خبری میں نشانہ بنیں کہ ان کو آنے والی موت کا پتا بھی نہ چلے اور وہ مدافعت نہ کر سکیں۔ اگرچہ میں نے میزائل کی تصویر نہیں دیکھی تھی مگر میں فاضلی کی اس بات کو بلف قرار نہیں دے سکتا تھا۔ فاضلی ایسے ہتھیاروں کا ماہر تھا اس سے پہلے اسی نے پہاڑی پر خود کار بھاری مشین گن نصب کر کے اُس ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنایا تھا جس میں سفیر، مونا، سادی اور دوسرے لوگ میانوالی جا رہے تھے۔ یہ گن ہمارے پاس موجود تھی۔ وسم نے بھی ایسی ہی ایک جدید کمپیوٹر سے کنٹرول ہونے والی گن حاصل کی تھی، جس کی مدد سے انہوں نے ہمیں بحفاظت انڈیا کی سرحد سے پاکستان آنے میں مدد دی تھی۔ فاضلی نے کچھ دیر بعد کہا۔

”شہباز کیا کہتے ہو؟“

”تم نے کہنے کو کچھ چھوڑا ہے؟“ میرا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

وہ مسکرانے لگا۔ ”اس کا مطلب ہے تم راضی ہو۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے مناسب سمجھا کہ جلد از جلد اس کا پلان سمجھ لوں، کم سے کم اپنے بارے

میں۔

”تم ایک دستے کو لیڈ کرو گے کیونکہ تم بہت اچھے لیڈر ہو۔“ فاضلی بولا۔ ”تمہارا حصہ اس مشن کی کامیابی میں بنیادی کردار ادا کرے گا۔ اس لیے تمہیں لازمی کامیاب ہونا ہے۔“

”لازمی سے کیا مراد ہے؟“

”اگر تم ناکام رہے تو اس کا خلیا زہ تمہارے ساتھیوں کو بھگتنا پڑے گا۔“

میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ جنگ میں ناکامی بھی ہو سکتی ہے۔“

”شہباز میں تمہیں جانتا ہوں۔“ فاضلی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”تم بہت شراپ ہو، بہت

کلی ہو اور بہت پُر عزم ہو۔ کامیابی کے لیے ان تینوں چیزوں کو استعمال کرو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں پوری کوشش کروں گا لیکن کامیابی یا ناکامی مقدر سے ہوتی ہے۔“

”شہباز بحث مت کرو، میں نے تمہیں بتا دیا ہے اگر ہم درگاہ کو فتح کرنے میں ناکام رہے اور مرشد

ہمارے ہاتھ نہیں آیا تو میزائل چلانے والا مین دبا دیا جائے گا۔ یوں سمجھ لو تمہارے ساتھیوں کی زندگی و موت

تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”نفوذ بالذہ۔“ میں کا پٹ اٹھا تھا۔ ”ہر انسان کی موت و زندگی سے لے کر معمولی سے معمولی بات بھی

صرف ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے۔“

”وعظ نہیں۔“ فاضلی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”یہ سب میرا نام نہاد باپ مجھے بہت کہتا تھا۔ ایک دن میں نے

اس کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔“

اب وہ اپنے اصل باپ کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنا چاہتا تھا۔ مرشد سے نیکی کے عطف کی توقع ایسے ہی تھی

جیسے شیطان سے کی جاسکے۔ اگر فاضلی اس کا تربیت یافتہ تھا تو اس میں کوئی تعجب نہیں تھا کہ وہ اس سے بڑھ کر

شیطان ثابت ہو رہا تھا۔ مرشد آج تک مجھے کسی کام پر مجبور نہیں کر سکا اور نہ ہی کبھی اپنی مرضی پر چلا سکا تھا مگر فاضلی نے یہ کام کر دکھایا۔ انکار یا مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیٹو کے بعد میں نے سوچ لیا تھا کہ اس جنگ میں میرے اور کسی ساتھی کی جان نہیں جانی چاہیے۔ کم سے کم میری پوری کوشش یہی ہوتی۔ ”اوکے میں پوری کوشش کروں گا مگر مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کے لیے مجھے کتنے افراد اور اسلحہ فراہم کیا جائے گا۔“

”گنڈیہ کی ناتم نے عقل کی بات۔“ فاضلی خوش ہو گیا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ مجھے ساتھ والے کمرے میں لایا جہاں ایک بڑی اسکرین والائی وی نصب تھا لیکن درحقیقت وہ کمپیوٹر مانیٹر تھا۔ فاضلی نے کہا۔ ”آن۔“

اسکرین آن ہو گئی اور اس پر آپریٹنگ سسٹم کی کمانڈز آنے لگیں۔ فاضلی نے بچ اسکرین پر تیزی سے ہاتھ چلائے اور چند لمحوں بعد اسکرین پر ایک نقشہ ابھرا۔ میں نے ذرا غور کیا اور شناخت کر لیا۔ ”میرا خیال ہے یہ درگاہ مرشد یہ ہے؟“

”یالکل درست پہچانتم نے۔“ فاضلی نے کہا اور نقشے کو حرکت دی۔ وہ ٹو ڈی سے تھری ڈی میں بدل گیا۔ اب درگاہ کا سامنے والا حصہ آ گیا۔ اس نے نقشے کو آگے بڑھایا اور گویا ہم مین گیٹ سے اندر چلے گئے۔ ”یہ ہم اندر آ گئے۔ اب سامنے سماع ہال ہے۔ یہ نیا سماع ہال ہے جو درگاہ کی اصل عمارت کے سامنے بنا ہے۔“ فاضلی بات کرنے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی نقشہ بدل رہا تھا۔ نئے سماع ہال کے پیچھے درگاہ کی عمارت نک آئے جس میں مرشد کے دادا اور باپ کی قبریں تھیں۔ مرکزی گنبد تلے دونوں قبریں آنے والے زائرین کے لیے صرف مخصوص دنوں میں کھولی جاتی تھیں روزانہ لوگ صرف باہری جالیوں سے زیارت کر کے چلے جاتے تھے۔ اس گنبد کے دائیں بائیں درگاہ کی عمارت تھی۔ اس میں تین فلورز پر بے شمار کمرے تھے۔ درگاہ کے اصل دھندے ان ہی کمروں میں ہوتے تھے۔ یہاں خاص مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا اور ان کی خاطر مدارت کے لیے غیر ملکی شراب سے لے کر ملکی لڑکیوں تک سب دستیاب ہوتا تھا۔ لڑکیاں اس بازار اور مرید گھرانوں سے آتی تھیں۔ ان کی آمد و رفت نہایت خفیہ انداز میں ایسے راستوں سے ہوتی تھی جن سے عام لوگ بے خبر تھے۔ یہ سب کچھ مجھے فاضلی بتا رہا تھا۔

”ایسی جگہوں پر یہی سب ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مرشد جیسے شیطانوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟“

”وہی بتا رہا ہوں۔“ فاضلی نے کہا اور ہاتھوں کی جنبش سے نقشے کو آگے بڑھا۔ ”دائیں طرف جاؤ تو مرشد کی کوٹھی اور ملازمین کی رہائش ہے اور سیدھے جاؤ تو آخری حصے میں پرانے سماع ہال کی عمارت ہے۔“

”جو دھماکوں میں تباہ ہو گئی تھی۔“

”کھسکل نہیں جڑی طور پر۔“ فاضلی نے انکشاف کیا۔ ”مرشد کے آدمیوں نے چند دنوں میں اس کی پھر سے مرمت کمرے کے قابل استعمال بنالیا۔“

”لیکن میں نے تو سنا تھا کہ وہاں سے غیر ملکی ساخت کا اسلحہ اور گولہ بارود ملا تھا۔ اتنی جلدی حکومت نے وہ

جگہ مرشد کے حوالے بھی کر دی؟“

فاضلی مسکرایا۔ ”کیا تم مرشد کے اثر و رسوخ سے ناواقف ہو۔ یہی نہیں چند دنوں میں اسے اس معاملے سے بری الذمہ قرار دے دیا جائے گا اور ملہ بان افراد پر ڈالا جائے گا جو اس دھماکے میں مارے گئے۔“

”یہ تمہارے آدمیوں کا کام تھا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں مگر وہ مکمل طور پر ٹھیک سے نہیں کر سکے تھے۔ ان کی نا تجربہ کاری آڑے آئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اب تمہارے جیسا تجربہ کار شخص میرے آدمیوں کو لیڈ کرے۔“

”تجربے میں تم بھی کم نہیں ہو۔“

”میں اس وقت کہیں اور ہوں گا ویسے تم فکرمت کرو میں تم سے زیادہ دور نہیں رہوں گا۔ مجھے سو گز والی حد معلوم ہے۔“

بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ فاضلی مجھے قربانی کے بکرے کی طرح آگے کر کے اپنا کام نکلوانا چاہتا تھا۔ میں کامیاب ہوتا یا نا کام دونوں صورتوں میں وہ خسارے میں نہیں رہتا۔ اس نے نقشہ پرانے سامع ہال کے عقب میں لا کر روک دیا۔ ”یہ چھوٹی سی عمارت دیکھ رہے ہو۔ بہ ظاہر یہ کباڑ خانہ ہے لیکن حقیقت میں پہاڑوں سے نکالی جانے والے ایک بہت بڑی سرنگ آکر اس عمارت میں نکلتی ہے۔ سرنگ اتنی بڑی ہے کہ اس میں آرام سے ایک درمیانہ ٹرک سبز کر سکتا ہے۔ دھماکوں کے بعد بہ ظاہر سرنگ بند کر دی گئی تھی مگر اب میری اطلاع کے مطابق اسے دوبارہ کھولا جا رہا ہے۔“

”کھولا جا رہا ہے؟“ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”یعنی کھولا نہیں گیا ہے۔“

”سمجھ لو یہ کام آخری مراحل میں ہے۔“ فاضلی نے کہا۔ ”ہمیں اسی سرنگ کے راستے اندر جانا ہے۔“

”فاضلی میرا ایک سوال ہے جب تم اکثر آدمیوں کو خرید چکے ہو تو تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے تم ان سے بغاوت کراؤ۔“

فاضلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ مشکوک ہو گئے ہیں اور مرشد نے انہیں پرانے سامع ہال میں قید کیا ہوا ہے میرے زرخیز کچھ ہی لوگ آزاد ہیں مگر وہ اپنے طور پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے کیونکہ ان سے اسلحہ لے لیا گیا ہے۔ مرشد نے اپنے انتہائی وفادار مریدوں کو اسلحہ دیا ہوا ہے جو تربیت یافتہ تو نہیں ہیں مگر وہ مرشد کے حکم پر اپنی جان قربان کرنا سعادت سمجھتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، آگے چلو۔“

ہم اس سرنگ کو مرشد کے آدمیوں سے صاف کرتے ہوئے پرانے سامع ہال تک رسائی حاصل کریں گے اور پھر وہاں قید لوگوں کو آزاد کرائیں گے انہیں اسلحہ دیا جائے گا اور آخری مرحلے میں ہم مرشد کی کٹھی پر دھواں بوئیں گے۔“

”میرا خیال ہے سب سے زیادہ حفاظت اسی جگہ کی کی جا رہی ہوگی۔“

”بالکل مگر میں نے بتایا کہ جن لوگوں کے پاس اسلحہ ہے وہ نا اڑی ہیں۔“

”میدان جنگ میں بعض اوقات تجربے سے زیادہ جذبہ کام آتا ہے۔“

”ایک بار میرے وفادار آزاد ہو گئے تو ان سب کو دیکھ لیں گے۔“

فاضلی سے پلان پر بات کرتے ہوئے میرا ذہن کچھ اور باتوں پر غور کر رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے ہم اندر گھس جاتے ہیں اور تمہارے ساتھیوں کو آزاد کرالیا جاتا ہے مگر اس دوران میں مرشد کو اتنی مہلت یقیناً مل جائے گی کہ وہ پولیس یا باہر موجود اپنے حلقوں کو طلب کر سکے۔“

”حملے کے آغاز میں سب سے پہلے علاقے میں موجود تین موبائل ٹاورز اڑا دیے جائیں گے۔ تمام ٹیلی فون لائنیں کاٹ دی جائیں گی اور درگاہ کے باہر ایک طاقتور جامر اس وقت تک قتل کیے جاتے ہیں کہ تمام ریڈیائی نشریات کو جامر رکھے گا جب تک ہم مرشد کو قابو نہیں کر لیتے۔“

”ٹھیک ہے تم یہ سب کر لو گے مگر ہنگامہ آرائی کی جو آوازیں باہر تک جائیں گی اور اس پاس مرشد کے وفادار ہیں کیا وہ دوڑے نہیں آئیں گے۔“

”نہیں پہلا مرحلہ بہت خاموشی سے طے کرنا ہے۔ البتہ جب مرشد کی گولی پر حملہ کریں گے تب شور ہوگا مگر اس سے پہلے کہ باہر سے کوئی مدد آئے ہم مرشد کو قابو کر لیں گے اور اسے قابو کرتے ہی درگاہ کے تمام معاملات میرے ہاتھ میں آجائیں گے۔“ فاضلی نے مٹی بند کر کے سب اپنی مٹی میں کرنے کا اشارہ کیا۔

”درگاہ میں رات کے وقت کتنے لوگ ہوتے ہیں؟“

”آج کل تو سب کا داخلہ بند ہے سالانہ مرمت کے نام پر۔ اس لیے صرف بہت خاص لوگ ہی اندر موجود ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد سو کے آس پاس سمجھو۔ ان میں سے ستر کے قریب ملازمین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں سب دیکھتی ہیں مگر یہ راز اپنے سینے سے آگے جانے نہیں دیتے۔ اس طرح جو سنتے ہیں وہ کبھی ان باتوں پر نہیں آتا۔ تیس وہ محرم راز ہیں جو مرشد کے کرتوتوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔“

”کچھ عرصے پہلے تک تم ان میں سر فہرست تھے۔“

”میں اس کا بیٹا ہوں اس کا ملازم نہیں ہوں۔“ فاضلی نے تلخی سے کہا۔ ”لیکن کچھ عرصے سے اس نے مجھے ایسا ہی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔“

”لڑنے مرنے والے ان تیس کے علاوہ ہیں؟“

”تھنڈیوں کا استعمال تو سب جانتے ہیں مگر یہ لڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔ یوں سمجھ لو یہ درگاہ کی انتظامیہ ہیں سارا کام یہی لوگ چلاتے ہیں۔ لڑنے مرنے والے ان کے علاوہ ہیں میری معلومات کے مطابق اس وقت ان کی تعداد ساٹھ سے ستر ہے۔“

”میں تشویش زدہ ہو گیا۔“ یہ تو خاصی تعداد ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ آسانی سے مارے جائیں گے۔“

فاضلی جیسے انسان دوسرے انسانوں کی جان کو بے وقعت سمجھتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک ہر انسانی جان کی اہمیت تھی۔ البتہ میں اس کا اظہار کرتا تو فاضلی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تا تجربے کا رافرا بھی اگر اتنی بڑی تعداد میں ہوں تو ان سے لڑنا آسان نہیں ہوتا۔ یقیناً تمہیں بھی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔“

”ظاہری بات ہے۔“ فاضلی نے سرسری انداز میں کہا۔ ”جنگ میں دونوں طرف کا نقصان ہوتا ہے۔“

میرے آدمی اس کے لیے تیار ہو کر جائیں گے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہوں گے اور ان میں سے مجھے کتنے ملیں گے؟“

”میرے پاس زیادہ آدمی نہیں ہیں یوں سمجھ لو کہ کل ڈیڑھ درجن ہوں گے ان میں سے چھ تم کو ملیں گے۔“

”باقی بارہ افراد؟“

”کچھ باہر کے کام نہیں گئے جیسے موبائل ٹاورز کی تباہی، کیونیکیشن لائنز کا ٹٹا اور پھر جامر لگانا۔ ان میں سے کچھ میرے ساتھ ہوں گے۔“

”اندر کتنے وفادار قید ہیں؟“

”ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے لیکن قید گارڈز کی تعداد دو درجن ہے۔ اب تک میرے وفاداران میں سے جن کو ساتھ ملا چکے ہوں گے ان کو چھوڑ کر باقیوں کو وہیں قید رکھنا ہوگا۔“

”اگر اندر سے بھی ایک درجن افراد مل جاتے ہیں تب بھی تمہارے پاس ڈھائی درجن یعنی تیس سے زیادہ افراد نہیں ہوں گے۔ جب کہ مقابلہ ڈھائی گنا نفری سے ہوگا۔ اگر مرشد کا خاص ٹولہ بھی مسلح ہو کر آ گیا تو یہ تعداد تین گنا ہو جائے۔“

”مرشد کی کوشی پر تیس افراد ہوں گے اور باقی درگاہ میں مختلف جگہ ہوں گے۔ ہمیں ان کو ایک جگہ جمع ہونے سے روکنا ہوگا۔ ان سے الگ الگ نمٹنا آسان ہوگا۔“

”وہ کیسے؟ پہلی گولی چلنے ہی سب جان جائیں گے۔“

”ہمارے ہتھیار بے آواز ہوں گے اور حتی الامکان خاموشی سے کام کرنا ہوگا۔ مجھے امید ہے ہم پہلے مرحلے میں بیس پچیس افراد کا خاتمہ کر دیں گے اور پھر باقیوں پر قابو پانا اتنا مشکل نہیں ہوگا۔“

”تمہارا منصوبہ بہت سے مفروضات پر مشتمل ہے؟“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ اب تم ڈیوڈ شا کے ساتھ ہو اس لیے تمہیں یقیناً علم ہو گیا ہوگا کہ ایسا ہی ایک پلان سرحد پار تیار کیا گیا تھا اور اس میں حصہ لینے والے بین الاقوامی قسم کے کرائے کے نہایت تربیت یافتہ فوجی تھے۔ اس میں جدید ترین ہتھیار اور آلات استعمال ہوئے تھے۔ نہایت خطرناک جنگی اسلحہ تھا۔ جن میں اینٹی ٹینک فکس میزائل تک تھے۔ میں دل و جان سے اس پلان میں شامل تھا کیونکہ مجھے کنور بیلس سے سادی کو چھڑانا تھا۔ پلان کی ہر ممکنہ نوک پلک درست کی گئی تھی۔ اس مشن کا سربراہ ایک برٹش کرنل تھا جو دو جنگیں لڑنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ ہمیں کنور بیلس کی ایک ایک چیز کا علم تھا۔ اس کے باوجود جب اس پلان پر عمل کا وقت آیا تو سب الٹ گیا۔ جو جو ہم نے سوچا اور چاہا تھا وہ نہیں ہوا۔ بلکہ کچھ اور ہی ہوا۔ وہاں جانے والا کوئی فرد زندہ نہیں بچا۔“

”سوائے تمہارے اور کرنل کے؟“ فاضلی نے سر ہلایا۔ ”مگر تم جس مقصد کے لیے گئے تھے اس میں کامیاب رہے اور بڑی اصل چیز ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کتنے لوگ مرے اور کتنے باقی بچے۔“

”میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے اس بار کہانی سرے سے الٹ جائے اور مرنے والوں میں مرشد کے بجائے تمہارا نام شامل ہو۔“

”ہوسکتا ہے۔“ فاضلی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”وعدہ کی طرح مجھے نصیحتیں بھی پسند نہیں ہیں۔ اس لیے اب کام کی بات کی جائے۔“ اس نے کہا اور ہاتھ سے نقشہ گھمایا۔ اسکرین ڈراسی دیر میں درگاہ سے باہر نکل آئی اور اب اس کا عقبی حصہ تھا۔ یہاں پہاڑ تھے جن کے اوپر سے سڑک گزر رہی تھی وہیں ایک جگہ سے سرنگ درگاہ کے اندر تک آتی تھی۔ سرنگ ایک غار سے شروع ہوتی تھی۔ مگر اس غار کا دہانہ خفیہ تھا۔ جب دھماکے کے بعد اسلحہ پکڑا گیا تو یہ سرنگ بھی دریافت ہو گئی تھی اور مرشد نے اسے بند کر دیا تھا مگر صرف لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے، جیسے ہی معاملہ ٹھنڈا پڑا اس نے سرنگ کو از سر نو بخوانا شروع کر دیا۔ ”سرنگ کا آخری حصہ باقی رہ گیا ہے اور شاید وہ بھی آج رات تک کھل جائے۔“

”اگر یہ نہ کھلی تو؟“

”تب ہم اسے ڈائنائٹ کر دیں گے۔“

”دھماکے کی آواز دوسری طرف نہیں جائے گی؟“

”جائے گی مگر مرشد کے آدمی بھی ڈائنائٹ استعمال کر رہے ہیں۔ اس لیے کوئی نہیں چونکے گا۔“

”ڈائنائٹ کا استعمال قانونی ہے؟“

میرے سوال پر فاضلی مسکرایا تو میں جھینپ گیا۔ سوال ہی احتمال تھا۔ مرشد اور فاضلی جیسے لوگ بھلا غلطی سے بھی کوئی قانونی کام کر سکتے تھے۔ یہ ان کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ فاضلی کا منصوبہ اچھا تھا مگر اس کی اصلیت عمل کے وقت سامنے آتی۔ اس میں بہت سے مفروضات تھے۔ اگر مگر تھے اور ان سے کوئی ایک بھی توقع کے مطابق نہیں ہوتا تو منصوبہ ناکام ہو سکتا تھا۔ فاضلی کا منصوبہ کامیاب ہوتا یا ناکام، میری بلا سے وہ اور اس کا باپ مرشد دونوں بھاڑ میں جاتے مگر فاضلی نے میرے ساتھیوں کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ اگرچہ اس کے پس پشت اس کی فطری خباثت بھی کارفرما تھی مگر اس طرح اس نے اپنے منصوبے کی انشورنس مجھ سے کرائی تھی اور میں ناکامی کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس صورت حال سے مجھے ایک ہی فرد نکال سکتا تھا اور وہ ڈیوڈ شا تھا۔ میں فاضلی کے سامنے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

”ہمیں کب روانہ ہونا ہے؟“

”سورج ڈوبے ہی۔“ فاضلی نے کہا۔ ”لیکن یہ کارروائی نصف رات کے بعد شروع ہوگی۔“

میرے حساب سے نصف رات کا وقت بہت نامناسب ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب کسی خاصی سکیورٹی والی جگہ حملہ کیا جائے۔ اس وقت سکیورٹی سب سے زیادہ الرٹ ہوتی ہے۔ یہی سکیورٹی سورج غروب ہونے کے فوراً بعد اور صبح کے قریب ذہنی طور پر بے سکون حالت میں ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت خطرہ نہیں ہے۔ عام طور سے ان ہی اوقات میں سکیورٹی بدلی جاتی ہے۔ جانے والے اپنی ڈیوٹی ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور آنے والے اتنے چوکس نہیں ہوتے۔ مگر یہ فاضلی کا پلان تھا اور اسے فیصلہ کرنا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ ”تم نے رومانہ اور راشد کا مطالبہ کیوں کیا؟“

فاضلی چونکا مگر پھر اس نے جلدی سے خود پر قابو پا کر کہا۔ ”مرشد سے مجھے کچھ حساب برابر کرنے ہیں۔“

”تو وہ تم مرشد سے کرو، رومانہ اور راشد سے کیا تعلق بنتا ہے؟“

”کیونکہ وہ مرشد کی بیٹی اور بھتیجا ہے۔“

”اس طرح تو تم بھی بیٹے ہو۔“ میں نے اسے یاد دلایا تو اس کا منہ بن گیا۔

”فضول باتیں مت کرو بہر حال ان کا معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ تم ساری عمر تو انہیں چھپا کر نہیں رکھ

سکتے۔“

”تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے تمہارے پلان خاصے لمبے چوڑے ہیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں

کہا۔ ”تم مکمل طور پر مرشد کی جگہ لینے کی تیاری کر رہے ہو۔“

”ہاں اس گدی کا صحیح حقدار میں ہوں۔“ اس نے غرور سے کہا۔ ”مرشد سمیت کوئی بھی شخص ذہانت اور

لڑنے مرنے میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔“

میں مسکرا دیا تھا۔ چار بج گئے تھے فاضلی نے مجھے آرام کرنے کو کہا۔ ”تمہارے پاس تین گھنٹے ہیں آرام

کر لو۔“

”میں کام کے وقت آرام کا قائل نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

فاضلی نے دروازہ کھول کر باسو کو آوازی دی۔ وہ اندر آیا اور مجھے لے کر روانہ ہوا۔ میں نے راستے میں اس

سے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنی ہے۔“

”وہ نہیں ہے۔“ باسو نے کہا۔

”تم اسے میرا پیغام دے سکتے ہو یہ بہت ضروری ہے۔ اگر اسے پیغام نہ ملا تو اسے بہت بڑا نقصان ہو

سکتا ہے۔“

جواب میں اس نے مجھے کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ بند کر دیا۔



میں ٹھنڈی سانس لے کر قالین پر دراز ہو گیا۔ میں نے اس امید پر باسو سے بات کی تھی کہ ڈیوڈ شا سن رہا

ہو گا مگر ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ یہاں نہیں ہے ورنہ مجھے ضرور طلب کر لیتا۔ شاید وہ مجھے

فاضلی کے حوالے کر کے چلا گیا تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا تو امید جاگی اور فوراً ہی مرجھا گئی کیونکہ باسو نے

ایک ٹرے اندر رکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس میں لٹچ یا شاید ڈنر تھا۔ میں نے اس سے استفادہ کیا۔ روائگی سے پہلے

یہ آخری طعام بھی ہو سکتا تھا۔ اب زیادہ وقت بھی نہیں رہا تھا۔ جیسے جیسے گھڑی کی سوئی سات کی طرف بڑھ رہی

تھی میری رگوں میں خون کی گردش بھی تیز ہو رہی تھی۔ خود کو وارم آپ کرنے کے لیے میں نے ٹھلنا شروع کر دیا

تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ جب مجھے اس حملے میں لیڈ کرنا تھی تو یقیناً مجھے میری مرضی کا اسلحہ بھی فراہم کیا جاتا

اور کیا فاضلی اتنی آسانی سے مجھے مسلح کرنے کو تیار ہو جاتا جب کہ وہ جانتا تھا کہ اب میں اس کے خون کا پیا سا ہو

گیا تھا۔

جیسے جیسے میں اس پر غور کر رہا تھا فاضلی کی میرے ساتھیوں کو ہر غمال بنانے کی حکمت عملی کا جواز سمجھ میں آ

رہا تھا۔ انہیں گمن پوائنٹ پر فاضلی نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا تھا کہ میں اسے نقصان پہنچانے کا خیال ذہن

میں نہ لاؤں۔ اس خیال سے مجھے ذرا تقویت ہوئی تھی کہ فاضلی ایسی حماقت نہیں کرے گا کہ اپنے پلان کی ناکامی

کی سزا میرے ساتھیوں کو دے۔ میں ٹھہلا اور سوچتا رہا حتیٰ کہ وقت ہو گیا اور دروازہ کھلا اور باسو کی صورت نظر آئی تو میں اس کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ فاضلی اپنے کمرے میں میرا منتظر تھا۔ میں نے جاتے ہی اس سے مطالبہ کیا۔ ”میری ڈیوڈ شا سے ملاقات کراؤ۔“

”وہ یہاں نہیں ہے۔“

”جہاں بھی ہے تم موبائل یا فون پر بات کر سکتے ہو۔“

”فی الحال یہ بھی ممکن نہیں ہے۔“ فاضلی نے چالاکی سے کہا۔ ”ہاں واپسی پر تمہاری بات ہو سکے گی۔“

”اگر واپسی ہوئی تو۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”تم پریشان مت ہو۔“ اس نے گویا مجھے تسلی دی۔ ”چلنے کی تیاری کرو سب سے پہلے کپڑے بدلنا ہوں گے۔“

فاضلی مجھے برابر والے کمرے میں لایا جہاں میز پر مکمل لباس اور ایک عدد بلٹ پروف جیکٹ رکھی تھی۔ میں نے یہ وردی نمایاں لباس پہنا جو رات کی تاریکی میں بہترین پردہ پوشی کرتا۔ اس کے اوپر بلٹ پروف پہنا۔ لباس کے ساتھ جوتے بھی تھے اور سب میرے ٹاپ کا تھا۔ فاضلی خود بھی اسی قسم کے لباس میں تھا اور اس نے بھی بلٹ پروف پہن رکھا تھا۔ ہم باسو کے ساتھ اسی عمارت کے ایک حصے میں واقع گیراج میں آئے وہاں ایک دین کھڑی تھی۔ میں اور باسو اس کے عقبی حصے میں آئے۔ یہ مکمل طور پر بند تھی۔ فاضلی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ کچھ دیر بعد دین اشارت ہوئی اور روانہ ہو گئی۔ بند دین میں جس تھا مگر جیسے ہی دین اشارت ہوئی اسے سی نے کام شروع کر دیا۔ یہاں فرش نشست تھی میں ایک طرف دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا۔

سامنے باسو بیٹھا تھا۔ اس نے گھنٹوں تک بدمودہ کے اوپر مختصر بنیان پہن رکھی تھی اور اس لباس میں اس کا جسم بہت نمایاں تھا۔ اس سے بات کرنا بیکار تھا کیونکہ وہ ٹودی پوائنٹ بات کرتا تھا اور کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں عداوت نہیں تھی۔ اس کے تاثرات عام طور سے حیوانی ہوتے تھے۔ جب کہ عام حالات میں وہ بنا تاثر کے ساٹ چہرہ رکھتا تھا۔ میری طرح وہ بھی خالی ہاتھ تھا مگر اسے ہتھیار کی ضرورت نہیں تھی اس کا جسم بذات خود مہلک ہتھیار تھا۔ اپنی جنائی قوت اور پیلہ نما ہاتھوں سے وہ منوں میں کسی مضبوط ترین شخص کو بھی توڑ مروڑ کر رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ اس مہم میں شامل تھا تو وہ اکیلا ہی چار کے برابر تھا۔ میں اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم کہاں سے روانہ ہوئے تھے اور موڈ یاد کرنے کی کوشش کی مگر فاضلی نے اتنی جلدی جلدی موڈ کاٹنے کے میں بھول گیا۔

پھر دین اندر سے ساؤنڈ پروف تھی۔ باہر کی کوئی آواز اندر نہیں آ رہی تھی جب کہ باہر ٹریفک کی موجودگی لازمی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ اسلام آباد بہت خاموش شہر تھا۔ مرکزی شاہراہوں پر بھی اکاؤنٹ گاڑیاں چلتی نظر آتی تھیں۔ مگر چند دہائیوں میں ٹریفک کا یہ عالم ہو گیا کہ اب عام سڑکوں پر بھی گاڑیوں کا اژدحام ہونے لگا تھا۔ رش کے اوقات میں ٹریفک جام بھی ہو جاتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اتنی دیر مسلسل باہر خاموشی رہتی۔ یقیناً اسے خاموش رکھنے کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ دین پون گھنٹے بعد رکی اور عقبی دروازہ کھلا تو باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ آسمان پر بادل تھے اور جس تیار ہاتھ کا بارش کا امکان ہے۔ کئی دن کی گرمی کے بعد بادل آئے تھے۔ فاضلی نے

دروازہ کھولا تھا۔ ”نیچے آ جاؤ۔“

پہلے باسو اتر اور پھر میں نیچے آیا۔ ہم ایک سڑک کے کنارے پر کچے میں موجود تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ بلکہ اسے ٹیلا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے اوپر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ کچھ دیر بعد ان جھاڑیوں سے ایک سایہ نکل کر ہمارے پاس آیا۔ یہ ایک مسلح شخص تھا اور اس نے فاضلی سے کہا۔ ”تیار کی مکمل ہے۔“

”دوسری طرف کی کیا پوزیشن ہے؟“

”ہم نے ڈرل کر کے گیس چھوڑ دی ہے۔“ آدمی نے کہا۔ ”اندر موجود ہر فرد بے ہوش ہو گیا ہوگا۔“

”گڈ۔“ فاضلی نے کہا اور اس آدمی کے ہمراہ ٹیلے کے اوپر چلا گیا۔ میں اور باسو وہیں رہے تھے۔ ٹیلا یہاں سے سو فٹ سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن فاضلی اگر ٹیلے کے دوسری طرف جاتا تو میرے اور اس کے درمیان فاصلہ سو گز سے بڑھ سکتا تھا اور یہ فاصلہ میرے لیے پیغام اجل لاتا۔ میں کسی قدر مضطرب ہو گیا اور ٹیلے کی طرف بڑھا۔ باسو نے عقب سے تنبیہ کی۔

”آگے مت جاؤ۔“

”میں اوپر نہیں جا رہا۔“ میں نے جواب دیا۔

باسو نے ایسے ہی کہا تھا کیونکہ اسے پروا نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میں بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اس نے وین کا دروازہ کھولا اور اسے ایسے ہی دھکیل کر مزید کچے میں لے آیا۔ یہ سڑک خاصی خستہ حال تھی۔ اب تک اس پر مزید کسی گاڑی کے آثار نظر نہیں آئے تھے اور نہ ہی کوئی پیدل فرد گزر رہا تھا۔ آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے اور فاضلی کو گئے ہوئے بیس منٹ ہونے کو آئے تھے۔ اس کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ تاریکی میں نمودار ہوا اور اس نے وین کا معائنہ کیا۔ مطمئن ہو کر اس نے ہم دونوں سے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم ٹیلے کے اوپری حصے تک آئے اور یہاں سے فوراً ہی تقریباً ایک کلومیٹر دور درگاہ کی روشنیاں نظر آئیں۔ درمیان میں خاصی ناہموار زمین تھی۔ بائیں طرف سڑک سے تقریباً سو فٹ دور ایک ٹیلے کے ساتھ غار نما دہانہ تھا اور اس کے آس پاس ہلکی سی روشنی تھی۔ اسی وجہ سے دہانہ نظر آ رہا تھا۔ غالباً یہی خفیہ راستے کا دروازہ تھا۔

غار کے آس پاس تقریباً ڈیڑھ درجن مسلح افراد موجود تھے اور یہ سب مقامی تھے۔ یعنی ان میں ڈیوڈ شا کا کوئی ساتھی شامل نہیں تھا سوائے باسو کے۔ اس نے فاضلی کو اپنے آدمی دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس کے باوجود وہ پوری طرح اس کی مدد اور حمایت کر رہا تھا۔ حد یہ کہ اس نے مجھے فاضلی کے حوالے کر دیا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرے خون کا بیباک تھا اور موقع ملنے پر مجھے مارنے سے گریز نہیں کرے گا۔ اس کے بعد ڈیوڈ شا فاضلی کے ساتھ کچھ بھی کر لیتا وہ مجھے زندہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی نہیں اس نے میری کلائی میں کڑا پہنا کر ایک طرح سے فاضلی کو اختیار روے دیا تھا کہ وہ ”غلطی“ سے بھی مجھے مار سکتا تھا اور بعد میں کوئی ایسی وضاحت بھی پیش کر سکتا تھا جسے جھٹلانا ڈیوڈ شا کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ ڈیوڈ شا کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ فاضلی نے چھ افراد کو اشارے سے بلایا اور وہ آئے تو اس نے میرا تعارف کرایا اور بولا۔

”اب تم لوگ شہباز کے ماتحت ہو گے۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرو گے۔“

”جو حکم جناب عالی۔“ ایک لمبے بالوں والا ملنگ نما شخص بولا۔ اس کی آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی

ستائشہ کثرت استعمال کرتا تھا۔ یہ سب عام جرائم پیشہ تھے ان کا واحد وصف مرنا مارنا تھا اور یہ کام وہ پیسے کے لیے کرتے تھے۔ میں نے ان سے سوال کیے۔ ان سب کو خود کار ہتھیار استعمال کرنے آتے تھے اور نشانہ بھی ان کے دعوے کے مطابق اچھا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ خود کار رائفل پر سائلنسر لگے ہوئے تھے۔ یہ چیک ساختہ پوزی گن تھیں۔ سب مشین گنوں میں ان کا شمار بہترین ہتھیاروں میں ہوتا ہے۔ میں نے ان کا امتحان لیا اور نشانہ لگوا کر دیکھا۔ جلد پتا چل گیا کہ سنگل شاٹ میں صرف دو ہی بہتر نشانے باز تھے۔ باقی سب صرف برست مارنے کے ماہر تھے جس میں نشانے بازی کی خاص ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ ان کے پاس پستول بھی تھے مگر یہ خاموش نہیں تھے اور ان کا استعمال اسی وقت کرتا تھا جب رائفل کا ایمونیشن ختم ہو جائے اور کھلی جنگ چھڑے۔ ان سے فارغ ہونے پر فاضلی مجھے ایک طرف لے گیا۔

”تمہیں اپنے دستے کے ساتھ آگے رہنا ہوگا۔“

”اور تم کہاں ہو گے؟“

”ٹھیک تمہارے پیچھے، میں تم سے سو گز سے زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔“

”سو گز کی حد ختم ہو سکتی ہے۔“

”تم فکرمت کرو یہ ڈیجیٹل آلہ ہے اس کا پروگرام ری سیٹ کیا جاسکتا ہے اور اب حد بڑھا کر پانچ سو گز کر دی ہے۔ یعنی تم اور میں درگاہ کی حدود میں کہیں بھی ایک دوسرے سے خطرناک فاصلے پر نہیں ہوں گے۔“

”تمہیں یقین ہے کہ یہ حد بڑھ چکی ہے۔“

”سو فیصد۔“ اس نے یقین سے کہا۔ ”اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔“

میرے پاس سوائے اس کی بات پر یقین کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بات آگے بڑھائی۔ ”ٹھیک ہے میں آگے ہوں گا۔“

”تم راستہ کلیئر کرتے ہوئے پرانے ساع ہال کی عمارت تک رسائی حاصل کرو گے اور وہاں موجود میرے وفاداروں کو آزاد کرادو گے۔“

”ٹھیک ہے یہ کام ہو گیا پھر؟“

”پھر تم درگاہ کی مرکزی عمارت کی طرف بڑھو گے۔ اس میں داخل ہونے کے دو ہی راستے ہیں ایک آگے سے ایک پیچھے سے۔ رات نو بجے کے بعد یہ دونوں دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ان دونوں تو یہ مستقل بند ہوں گے۔ تمہیں وہاں مرشد کے خاص گرگوں کا صفایا کرنا ہے۔“

”میں کسی کو بلا مقصد قتل نہیں کر سکتا۔“ میں نے انکار کیا۔

”تم مت کرنا یہ کام میرے آدمی کریں گے۔“ اس نے اصرار نہیں کیا۔

”تم کیا کرو گے؟“

”میں اپنے آدمیوں سمیت کوشی کا محاصرہ کروں گا تاکہ وہاں سے کوئی مدد کے لیے باہر نہ آ سکے۔ جب تم لوگ اپنا کام مکمل کر لو گے تو میری طرف آؤ گے اور پھر ہم کوشی پر حملہ کریں گے۔“

”یہ بھی ممکن ہے کہ حملہ ہونے کے بعد جب مرشد کسی سے رابطہ نہیں کر پائے گا تو فراری کوشش کرے۔“

”فرار کے تمام راستوں پر میرے آدمی ہوں۔“

”مرشد نے یقیناً کوئی خفیہ راستہ رکھا ہوگا۔“

”وہ خفیہ راستہ بھی میری نظر میں ہے کارروائی کے آغاز میں ہی اس کا بیرونی حصہ تباہ کر دیا جائے گا اور پھر کوئی اس راستے سے فرار نہیں ہو سکے گا۔“

فاضلی نے ہر پہلو پر نظر رکھی تھی۔ مجھے افرادی قوت کی کمی کھٹک رہی تھی۔ یہ لوگ نہ صرف تعداد میں کم تھے بلکہ ان میں ذہنی ہم آہنگی بھی کم تھی کیونکہ یہ ساتھی نہیں تھے۔ اس قسم کے حلوں میں ذہنی ہم آہنگی کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر حملہ کرنے والے منظم اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوں اور انہیں پتا ہو کہ کس صورت حال میں سیارہ عمل دینا ہے تو تھوڑے افراد سے بھی کام چل جاتا ہے۔ وہ غیر منظم انداز میں بکھر کر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے انداز میں لا پرواہی نمایاں تھی۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے یہ لوگ اس طرح سے عمل کر لیں گے جیسے ان سے کہا جائے گا۔“

”اندر گھستے ہی انہیں زندگی اور موت کی کشمکش سے واسطہ پڑے گا اور انسان سب سے بہترین تدبیر اپنی جان بچانے کے لیے کرتا ہے۔“

”مسئلہ جان بچانے کا نہیں ہوگا وہ تو فرار سے بھی بچ سکتی ہے مسئلہ کامیابی کا ہے۔ اگر انہوں نے ٹھیک سے کام نہیں کیا تو کامیابی مشکوک ہو جائے گی۔“

”شہباز اسی لیے میں نے تمہیں ان کا لیڈر بنایا ہے۔ اگر تم انہیں ہینڈل کر لو گے تو ان سے ہر کام لے سکتے ہو۔ یہ سب لڑنے مرنے والے لوگ ہیں۔ کوئی گھبرائے گا نہیں۔“

”تمہارے آدمی نے بتایا تھا کہ انہوں نے اندر گیس چھوڑ دی ہے۔ تو کیا اندر والوں کو پتا نہیں چلا ہو گا؟“

”سریگ صاف کرنے والے شفٹوں میں کام کر رہے ہیں اور اس شفٹ کو بارہ بجے جانا تھا اس سے پہلے کوئی یہاں نہیں آئے گا اور آنے کی کوشش کرے گا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا۔“

فاضلی کا مطلب تھا کہ اندر موجود اس کے آزاد و فادار نظر رکھے ہوئے تھے اور کسی قسم کی صورت حال میں وہ فوری اُسے اطلاع دیتے۔ میں نے بجلی کے بارے میں پوچھا۔ ”کیا اسے منقطع نہیں کیا جائے گا؟“

”جب تک پرانا سامع ہال اور درگاہ کلیئر نہیں ہو جاتی لائٹ آن رہے گی اس کے بعد میرے آدمی باہر سے لائٹ کاٹ دیں گے۔“

”پہلے کیوں نہیں؟“

”ایک تو ان لوگوں کو اندھیرے میں کارروائی کی عادت نہیں ہے یہ گھبرا جائیں گے۔ دوسرے جزیرہ درگاہ کے پاس ہی ہے لائٹ جاتے ہی وہ اشارت ہو جائے گا۔ جب تم درگاہ کلیئر کر لو گے تو جزیرہ اڑادو گے اور اس کے بعد باہر کی لائٹ بھی کاٹ دی جائے گی۔“

”اس صورت میں اندھیرا ہونے پر یہ نہیں گھبرائیں گے؟“

”نہیں یہ بیک آپ میں ہوں گے ہم نائٹ ویژن استعمال کر کے مرشد کے آدمیوں کو با آسانی شکار کر

لیں گے اس کے بعد باہر سے لائٹ بجال کر دی جائے گی۔“
 ساڑھے نو بج گئے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ”اندر کب داخل ہوتا ہے؟“
 ”ساڑھے گیارہ بجے۔“
 ”ابھی اس میں دو گھنٹے ہیں۔“

”آرام کرو، کھاؤ پیو۔“ اس نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کھانے کے بلکے پھلکے سامان سے استفادہ کر رہے تھے ان کے پاس منرل واٹر کی بوتلیں اور جوس کے ڈبے بھی تھے۔ آسان پر ہلکی سی بجلی چمکنے لگی تھی۔ اگر بارش ہو جاتی تو یہ زیادہ اچھا تھا ہمیں کورمٹا اور مرشد کے آدمی بارش سے بچنے کے لیے اپنی جگہوں پر محدود ہو جاتے۔ میں ایک طرف پتھر سے ٹک گیا۔ غار کا دہانہ اس قسم کا تھا کہ فاصلے سے یہ نظر نہیں آتا تھا۔ قریب آنے پر بھی یہ مٹی کے کٹاؤ جیسا لگتا تھا۔ اس قسم کے کٹاؤ سارے پونچھوہار بجن میں عام ملتے ہیں کیونکہ کثرت سے بارش مٹی بہا لے جاتی ہے۔ بالکل سامنے آنے پر پتا چلتا تھا کہ یہ غار ہے۔ میں نے ذرا دور بیٹھے فاضلی سے پوچھا۔ ”اس طرف سے غار کی حفاظت کا کیا بندوبست تھا؟“

”اندر ایک فولادی دروازہ لگا ہوا تھا اور گاڑ زہوتے تھے۔ باہر ایک ملنگ رہتا تھا جو درحقیقت یہاں کا چوکیدار تھا۔“

میں حیران تھا کہ ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں نے مرشد کو کیسے بری الذمہ قرار دے دیا اور سارا الزام ان مرحوم ملازمین پر رکھ دیا گیا جو دھماکے میں مارے گئے تھے۔ اس ملک میں اثر و رسوخ اور مفاداتی بڑی بلا بن گئے ہیں کہ آدمی عمیق ترین جرم کر کے بھی تمام شواہد اور گواہیوں کے باوجود یوں بچ نکلتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے چند موٹی بوندیں گریں اور اس کے بعد اچانک ہی تیز بوجھاڑ آئی۔ پانی سرد اور خوشگوار تھا۔ جس آلود گرمی کے بعد یہ اچھا لگ رہا تھا اس لیے میں نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ اکثر تو ہڑ بڑا کر غار میں چلے گئے تھے۔ بارش میں بھیگنا مجھے بچپن سے پسند ہے۔ جب بارش ہوتی تو میں ماں جی کی نظر بچا کر باہر نکل جاتا تھا۔ ماں جی جانے نہیں دیتی تھیں کیونکہ بارش کے وقت ہمارے علاقے میں سانپ نکلتے ہیں۔ شاید ان کے بلوں میں پانی بھر جاتا ہے اور وہ باہر آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سانپوں کے ڈسنے کے سب سے زیادہ واقعات بھی بارش کے موسم میں ہوتے ہیں۔ مجھے سانپ سے ڈر لگتا تھا مگر بارش میں بھیگنے کا لطف اس خوف کو دبا دیتا تھا۔ اس وقت بھی بدترین صورت حال کے باوجود میں بارش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ فاضلی مجھ سے کچھ دور بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔

”شہباز تم مجھے ہمیشہ حیران کرتے ہو۔“
 ”کیسے؟“

”تم بالکل بھی پریشان نہیں ہو۔“

”اس کے برعکس میں بہت پریشان ہوں۔“

”تب تمہارے ظاہر سے کیوں پتا نہیں چل رہا۔“

”جب میں کسی مسئلے کا حل نہیں نکال پاتا تو اسے اوپر والے کے سپرد کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد میری

پریشانی صرف نتیجہ کی رہ جاتی ہے۔ ویسے آج تک نتیجہ میرے حق میں ہی نکلا ہے۔“
”لیکن اس بار ایسا نہیں ہوگا۔“

”مجھے معلوم ہے ہر بار ایسا نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی شخص مکمل کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اسی طرح کوئی شخص مکمل ناکام بھی نہیں ہوتا ہے۔ سب کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔“
”لگتا ہے تم تقدیر پر بھروسہ کرتے ہو؟“

”میں تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”ہرگز رتے دن یہ ایمان پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ کاتب تقدیر نے میرے لیے جو لکھا ہے وہی سب سے بہتر ہے۔“

”میرے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”تم خود پر بھی یقین نہیں رکھتے۔“

”غلط مجھے خود پر ہی یقین ہے۔“

”یقین ہوتا ہی بے یقینی کی نشانی ہے۔ یہ میرے سامنے پانی کی بوتل رکھی ہے۔ میں یقین نہیں رکھوں گا کہ اس کا پانی میری دسترس سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ میرے سامنے ہے۔ یقین اور بے یقینی وہاں ہوتی ہے جہاں معاملات آدمی کی دسترس سے باہر ہوں۔ اسی لیے میرے نزدیک یقین ہونا اصل میں بے یقینی کی ایک صورت ہے۔“

”تم بہت عجیب باتیں کرتے ہو فلسفیوں جیسی۔“

میں ہنسا۔ ”حالانکہ مجھے سب سے زیادہ چیز اسی علم سے ہے۔ میرے نزدیک فلسفہ اپنی خواہشات اور اپنے نکتہ نظر کو دلیل دینے کا نام ہے۔“

”اس کے برعکس مجھے فلسفہ پسند ہے۔“

”مجھے قطعی تعجب نہیں ہے کیونکہ دنیا کے جتنے بڑے سفاک اور قاتل حکمران گزرے ہیں وہ سب فلسفے کے شیدائی تھے اور انہوں نے اپنے کرتوتوں کے جواز کسی فلسفی کے افکار سے ہی حاصل کیے۔“
”تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں فلسفہ پسند نہیں ہے۔“

”ہاں لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ میں نے کچھ پڑھا نہ ہو، میں نے سب پڑھا ہے۔“

بارش کے شور میں ہمیں اونچی آواز میں بات کرنی پڑ رہی تھی۔ باسو ہم سے کچھ دور ساکت کھڑا تھا یہ اس کا مخصوص پوز تھا اور میں نے تقریباً ہمیشہ اسے اسی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ دونوں بازو نیچے لٹکائے کسی دیو کی طرح ایسا تادہ رہتا تھا۔ میں نے باسو کے بارے میں پوچھا۔ ”کیا یہ قدرتی ہے؟“

”نہیں یہ اسی چینی ڈاکٹر کی بنایا ہوا ہے۔“ فاضلی نے جواب دیا تو میں چونکا۔

”کیا مطلب؟“

فاضلی نے وضاحت کی۔ ”ڈاکٹر لینگ نہ صرف جدید میڈیکل کا ماہر ہے بلکہ وہ قدیم چینی طب کا بھی ماہر ہے۔ باسو کو اسی نے بنایا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے یہ عام سا انسان تھا پھر ڈاکٹر لینگ نے اسے کسی دوا یا طریقے سے اسے گرائنڈیل بنا

دیا۔

”بالکل، ڈاکٹر لینک نے اس وقت اس کے تھائی رائیڈ گلیٹنڈز کے ساتھ کچھ کیا جب یہ صرف بارہ برس کا تھا۔ اس کے نتیجے میں باسو کے بازو لمبے اور جسم تو مند ہو گیا۔“

میں نے اس بارے میں سنا تھا کہ قدیم چینی ماہرین اتنے ماہر ہوتے تھے کہ وہ انسان کی نشوونما پر اثر انداز ہونے والے ان عدد کو چھیڑ کر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر لیتے تھے۔ وہ قدیم چینی شہنشاہوں کے لیے خاص جسم والے غلام تیار کرتے تھے۔ مگر میرا خیال تھا کہ یہ سب داستانیں ہیں۔ جیسی ہمارے ہاں الف لیلہ اور سندباد جیسی کہانیاں ہیں۔ مگر اب میرے سامنے اس قدیم روایت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ موجود تھا۔ اگر وہ بارہ سال کی عمر سے ڈاکٹر لینک کے تجربے میں تھا تو اسے خاصا عرصہ ہو گیا تھا۔ میں نے فاضلی سے اس کی عمر پوچھی۔ اس نے جواب دیا۔ ”یہ ابھی اٹھارہ سال کا ہو جائے گا۔“

میں نے باسو کو حیرت سے دیکھا۔ ”صرف اٹھارہ برس کا؟“

”ہاں اور یہ زیادہ سے زیادہ بائیس برس تک زندہ رہے گا۔“ فاضلی نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”اس وقت تک اس کا جسم اتنا بڑھ جائے گا کہ اس کا دل پورے جسم کو خون پمپ نہیں کر سکے گا۔ بائیس سال تک کبھی بھی اسے ہارٹ ایٹک ہوگا اور یہ ختم ہو جائے گا۔“

”یہ زیادتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر لینک نے اسے اپنے لیے تیار کیا ہے؟“

”نہیں وہ ڈیوڈ شا کے لیے کام کرتا ہے اور یہ تو صرف ایک نمونہ ہے۔“ فاضلی نے کہا۔ ”ڈاکٹر لینک ایسے کتنے ہی انسانوں پر تجربات کر چکا ہے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جب سے میرا واسطہ مرشد، ڈیوڈ شا اور کنور خاندان جیسے اہلس صفت لوگوں سے پڑا تھا تب سے میں ہر بار ان کی کسی نئی شیطانیت سے واقف ہوتا تھا۔ ہر بار وہ مجھے پہلے سے زیادہ شیطان صفت لگتے تھے۔ یہ انسانوں کو کس بے دردی سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے سامنے چنگیز اور ہلاکو بھی رحم دل لگتے ہیں۔ وہ صرف لاشوں اور کھوپڑیوں کے مینار بناتے تھے یہ جیتے جاگتے انسانوں کو نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیتے تھے۔

”ڈاکٹر لینک چینی ہے۔“

”تائیوان کا۔“ فاضلی نے کہا۔ ”ایک نمبر کا حرام زادہ اور سفاک شخص ہے اس کی نرم صورت پر مت جانا، یہ انسانوں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے اس کا اندازہ تمہیں باسو کو دیکھ کر ہو جانا چاہیے۔ میں نے اسی سے سنا ہے کہ باسو جیسی مخلوق بنانے میں سات بچے ضائع ہوئے تھے یہ آٹھواں تھا۔“

”کیا یہ منگول ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں باسو کا تعلق تھائی لینڈ سے ہے۔“

فاضلی ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ ”آج کی مہم میں اس کا کیا کردار ہے؟“

”تمام مشکل اور جو کھم والے کام اس کے سپرد ہوں گے۔ ویسے یہ ماہر لڑاکا ہے۔ ہر قسم کے ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہے۔ خالی ہاتھوں سے بھی لڑ سکتا۔ طاقتور اتنا ہے کہ ٹکر مار کر دیوار گرا سکتا ہے۔ ٹرک کو پکڑ لیتا

ہے تو وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔“

”یہ کتنا ہی طاقتور سی لیکن ایک گولی اسے ہمیشہ کی نیند سلا سکتی ہے۔“
 ”ایسا تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اپنا دفاع کرنا جانتا ہے۔“

باسو جواب تک ساکت کھڑا تھا اچانک حرکت میں آیا۔ وہ غار کی طرف گیا اور وہاں سے ایک بڑا بیک گھسیٹ کر غار کے دہانے تک لے آیا جہاں وہ بارش سے محفوظ تھا۔ اس نے زپ کھولی اور ایک جیکٹ نما چیز نکالی اور پہننے لگا لیکن یہ جیکٹ نہیں بلکہ بلٹ پروف تھا۔ جس نے اسے گردن سے رانوں تک کور کر لیا تھا۔ پھر اس نے دھاتی آرمر نکال کر کلائیوں اور بازوؤں پر پہنے اور ایسے ہی دھاتی خول اپنی پنڈلیوں پر باندھے۔ اس نے ایک بڑے سائز کی بھاری مشین گن نکالی جس کے ساتھ گولیوں کا بکس منسلک تھا۔ دو بڑے پستول بلٹ پروف کی سائیڈوں پر ہولٹرز میں لگائے اور ان کے اضافی میگزین مخصوص خانوں میں رکھ لیے۔ پھر مشین گن کے اضافی بکس سینے پر لگائے۔ ایک کرپان سائز کا خنجر اس نے اپنی نیام سمیت ران پر باندھا۔ وہ کسی ویڈیو گیم یا ہالی وڈ مودی کے کامک کریکٹر کی طرح دکھائی دے رہا تھا مگر یہ سب حقیقت اور بہت خوفناک تھا۔ آخر میں اس نے اپنے سر پر ایسا دھاتی اور شیشے کا بنا ہوا ہیلمٹ پہنا جس نے اس کا سر مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا۔ یہ بھی یقیناً بلٹ پروف تھا۔ فاضلی نے مجھ سے کہا۔

”یہ میرے ساتھ ہوگا۔“

بارش ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل برتی رہی تھی اور تقریباً گیارہ بجے رک گئی۔ میں اور فاضلی آدھے گھنٹے بعد اندر آگئے تھے۔ اس وقت بیگا لباس گراں گزر رہا تھا مگر گیارہ بجے تک یہ خاصا سوکھ گیا تھا۔ فاضلی کا ایک آدمی اس طرف مٹی میں ڈانٹا مائٹ لگا رہا تھا۔ اس نے وسط میں تین ڈانٹا مائٹ اسٹیکس لگائیں اور پھر ان سے منسلک تاریں لے کر باہر آیا۔ ہم سب باہر نکل آئے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے تاریں بیٹری سے منسلک کی گئیں اور مٹن دباتے ہی اندر ایک دبا ہوا دھماکہ ہوا اور گرد و غبار کا طوفان باہر آیا تھا۔ یہ پہاڑی زیادہ تر مٹی کی بنی ہوئی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ کہیں پہاڑی نہ بیٹھ جائے۔ شاید اسی خوف سے یہ لوگ محدود دھماکے کر رہے تھے۔ اس طرح آواز بھی کم ہوتی۔ مجھے یقین تھا کہ درگاہ تک دھماکے کی آواز نہیں گئی ہوگی۔ جب گرد بیٹھی تو فاضلی اپنے آدمی کے ساتھ اندر گیا اور پھر اس نے دوسروں کو طلب کیا۔ چند لمحوں بعد اندر سے کھدائی کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

شاید اب فاصلہ کم رہ گیا تھا اس لیے فاضلی نے دھماکے کے بجائے کھدائی کے اوزاروں سے راستہ صاف کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ نصف درجن افراد لگے ہوئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہ بج کر پچاس منٹ تک رستہ بن گیا تھا۔ سب سے آگے مجھے اور میرے دستے کو جانا تھا۔ راستہ بنتے ہی فاضلی باہر آیا اور اس نے مجھ سے کہا۔ ”اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر جاؤ۔ دوسری شفٹ والے آنے والے ہوں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”پہلی شفٹ والے بے ہوش ہیں۔“

”وہ مر چکے ہیں۔“ فاضلی نے لا پرواہی سے کہا۔ ”گیس کی مقدار زیادہ ہو گئی تھی۔“

میرا خون رگوں میں تیز ہوا تھا مگر یہ موقع تھا کہ فاضلی سے ان لوگوں کے چرچان کا حساب لیتا۔ ”میرا اسلحہ کہاں ہے؟“

جواب میں فاضلی نے مجھے ایک بیک بیک تھما دیا۔ ”اس میں سب ہے۔ تم اندر جاتے ہوئے چپک کرنا۔“

تمام تر احتیاطوں اور میرے ساتھیوں کو گمن پوائنٹ پر رکھنے کے باوجود فاضلی اپنے سامنے مجھے مسلح کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے مجھے بیک دیا تھا۔ میں اپنے چھ آدمیوں کے ہمراہ بنائے گئے تنگ راستے سے اندر آیا جہاں فاضلی کے آدمی پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ یہاں سرنگ میں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا مکمل انتظام تھا۔ ذرا بھی ٹھنکن نہیں تھی۔ سرنگ واقعی خاصی چوڑی اور پختہ تھی۔ فرش کنگریٹ کا اور ہموار تھا۔ ایک طرف ان چار افراد کی لاشیں تھیں جو کھدائی کا کام کر رہے تھے اور نہ جانے کس گیس کا شکار ہوئے تھے۔ گیس انہوں نے ایک ڈرل پائپ کی مدد سے اندر چھوڑی تھی۔ میں اور ملنگ کے پانچ ساتھی تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ جب ہم سرنگ کے دوسری طرف پاس پہنچے تو ملنگ کے ایک آدمی نے روشنی کے لیے جانے والی تار کاٹ دی اور سوائے آخری چند بلبوں کے تمام سرنگ تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ باقی رہ جانے والے چند بلب بے آواز فائر کر کے توڑ دیئے۔ اب صرف اس طرف سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی جس طرف سرنگ کا دہانہ کھل رہا تھا۔ ہم وہیں مورچہ لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ملنگ سے کہا۔ ”آنے والوں کو شوٹ نہیں کرتا ہے ان کو ہینڈز آپ کرنا ہے۔“

”تم باس ہو لیکن وہ مسلح ہوں گے اور اگر ایک فائر بھی ہو گیا تو گمز بڑھ جائے گی۔ آگے کا تم خود سوچ لو۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی دھمکی آگئی۔ پھر اس نے کہا۔ ”ان لوگوں کی فکر مت کرو..... یہ سب ہماری طرح چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں تب ہی تو مرشد نے انہیں اس کام پر لگایا ہے کسی عام بندے کو وہ اس کام پر نہیں لگا سکتا ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے تب اس معاملے میں تم انچارج ہو جو مناسب سمجھو کرو۔“ ملنگ نے سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا وہ اور اس کے ساتھی دیواروں کے ساتھ چپکے کھڑے تھے ان کے سیاہ لباس دیوار کا حصہ بن گئے تھے کیونکہ دیوار کھر دے سرخی سینٹ کی تھی اس پر چونا تک نہیں کیا گیا تھا۔ بارہ بیٹے میں دو منٹ پر اندر سے آوازیں آنے لگیں اور چند سائے نمودار ہوئے پھر کسی نے کہا۔ ”یہاں اندھیرا کیوں ہے؟“

”حرا خور کام بند کر کے تو نہیں چلے گئے؟“ دوسرا بولا۔

”فائر۔“ ملنگ نے دہلی آواز میں کہا اور فوراً ہی اس کی اور اس کے چار ساتھیوں کی رائفلیں بے آواز شعلے اگلنے لگی تھیں۔ آنے والے چار افراد کو آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ چھلنی ہو کر رہ گئے۔ وہ جیسے ہی گرے ملنگ کے تین آدمی تیزی سے دوڑتے ہوئے دہانے سے باہر چلے گئے اور میرے کانوں نے بھر دہلی فائرنگ کی آواز سنی۔ اس دوران میں ہم تین پوزیشن سنبھال کر بیٹھے رہے تھے۔ ایک منٹ بعد ان میں سے ایک واپس آیا اور اس نے کہا۔ ”دو اور تھے ان کو بھی اڑا دیا ہے۔“

گو یا اس مہم کا آغاز ہی دس افراد کی جانوں سے ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کنور پبلش والی مہم کا ایکشن ریلی پلے تھا۔ ہم اس چھوٹی سی عمارت میں داخل ہوئے جو بس ایک ہال پر مشتمل تھی اور اس کے ایک طرف لوہے کا اتنا

بڑا گیٹ لگا ہوا تھا جس سے ایک درمیانہ ٹرک آرام سے گزر سکتا تھا۔ سرنگ تقریباً ایک کلومیٹر لمبی تھی اور آگے بڑھتے ہوئے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں فاضلی مجھ سے پانچ سو گز دور نہ رہ جائے مگر وہ پیچھے تھا۔ اس مہم میں ہمارے پاس مواصلاتی آلات نہیں تھے جن سے آپس میں رابطہ کیا جاتا لیکن یہ میرا خیال تھا۔ جب میں گیٹ کا معائنہ کر رہا تھا تو ملنگ نے اپنے لمبے بالوں میں چھپے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”گیٹ تک کلیر ہے ہم باہر جا رہے ہیں۔“

”یہ تم کس سے بات کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”استاد سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرے پاس ریڈیو ہے۔“

بڑا گیٹ کھولنے کے بجائے اس میں لگا ہوا چھوٹا دروازہ کھولا گیا اور ملنگ نے باہر جھانکا۔ باہر بہت تیز روشنی تھی۔ اس نے اطلاع دی۔ ”سامنے ہی چار مسلح بندے نظر آ رہے ہیں۔“

اس کباڑ خانے نما عمارت سے پرانے سماع ہال کا فاصلہ کوئی پچاس گز تھا۔ اس کے دائیں طرف ایک اونچی دیوار تھی۔ جس پر خاردار کے ساتھ ساتھ تیز پول لائنس بھی لگی ہوئی تھیں۔ چاروں مسلح افراد مختلف جگہوں پر تھے۔ ملنگ نے کہا۔ ”ان کو الگ الگ اڑانا ہوگا۔“

”کیسے..... باہر جاتے ہی ہم ان کی نظروں میں آجائیں گے۔“

ملنگ نے آس پاس دیکھا اور پھر لوہے کے گیٹ کے اوپری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں سے نشانہ بنا سکتے ہیں۔“

یہ فرش سے کوئی نو فٹ اونچا تھا۔ یہاں گیٹ اور چھت کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ ملنگ اسی خلا کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایک طرف لوہے کے خالی ڈرم پڑے تھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ ڈرم اٹھا کر لائے اور گیٹ کے ساتھ رکھے۔ ان کی اونچائی ساڑھے چار فٹ تھی اور اس پر چڑھ کر کوئی بھی شخص آرام سے باہر موجود افراد کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ ملنگ اور اس کے تین ساتھی ان ڈرموں پر چڑھ گئے۔ ایک میرے ساتھ تھا۔ وہ جیسے ہی فائرنگ کرتے ہم دونوں باہر نکل جاتے اور اگر کوئی بچ جاتا تو اسے ختم کر دیتے۔ ملنگ نے آہستہ سے ایک دو تین کہا اور سب نے بیک وقت فائر کھول دیئے سب کا نشانہ الگ الگ افراد تھے۔ گیٹ کے رخنے سے مجھے دو نظر آ رہے تھے اور وہ دونوں گولیوں کا نشانہ بن کر ہاتھ لہراتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم دو باہر آئے۔ باقی دو بھی زمین پر پڑے تھے مگر وہ حرکت کر رہے تھے۔ میرے ساتھ ملنگ کا ساتھی تیزی سے ان کی طرف گیا اور باری باری انہیں شوٹ کر دیا۔

ملنگ اور اس کے ساتھی باہر آ گئے تھے اور ہم پرانے سماع ہال کی عمارت کی طرف بڑھے۔ عمارت کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ اسی لمحے ملنگ رکا اور اس نے کان پر ہاتھ لگا کر سنا پھر بولا۔ ”یہ دروازہ اس کے ساتھ ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔“

اس نے ایک چھوٹے لکڑی کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ویسے ایک بڑا جہازی سائز گیٹ اس عمارت میں بھی تھا اور ظاہر ہے وہ ٹرک اندر لے جانے کے لیے تھا۔ ہم چھوٹے دروازے تک آئے اور ملنگ نے درمیانی انگلی موڑ کر اس سے دروازے پر ایک ایک سینڈلے وقفے سے تین بار دستک دی۔ جواب میں ویسی

ہی دستک سنائی دی۔ اس بار ملنگ نے دوبارہ دستک دی جواب میں چار بار سنائی دی اور آخر میں ملنگ نے چھ بار اسی طرح دروازہ بجایا۔ اس کے ساتھ ہی دستک بازی اختتام کو پہنچی اور دروازہ کھل گیا۔ ہم خاموشی سے اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا کمرہ تھا اور یہاں ایک آدمی منتظر تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”فاضلی۔“

ملنگ نے سر ہلایا اور پوچھا۔ ”ہمارے آدمی کہاں قید ہیں؟“

”نیچے تہ خانے میں۔“ آدمی نے کہا۔ ”لیکن وہاں تین پہریدار ہیں۔“

”تم ان سے نہیں؟“ ملنگ نے بد مزگی سے کہا۔ ”تم سے کہا تھا ان کو شراب میں دوا دے دینا۔“

”موقع نہیں ملا۔۔۔۔۔ میں انہیں شراب میں دوا دیتا مگر وہ پہلے ہی بوتل لے جا چکے تھے۔“

”لعنت ہو۔“ ملنگ غرایا۔ ”اس عمارت میں اور کتنے لوگ ہیں؟“

”بس یہی تین ہیں۔“

”ٹھیک ہے ہم ان سے نمٹتے ہیں تم باہر کا خیال رکھو۔ پیچھے چار لاشیں ہیں اگر کسی نے دیکھ لیں اور کوئی ہنگامہ ہو تو تم سب سے پہلے ہمیں خبردار کر دو گے۔“

یہاں تک میں نام نہاد ہی لیڈر تھا اور سارا کام ملنگ کر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ سارا پلان اس کے علم میں تھا۔ اس نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ملنگ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا کیونکہ وہ پورے اعتماد سے تہ خانے کی طرف بڑھا۔ تہ خانہ ایک چھوٹے کمرے کے نیچے تھا۔ یعنی اس کا دروازہ یہاں تھا۔ فرش میں چوکور خلا تھا جس سے بیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ ملنگ نے نیچے دیکھا اور اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ ”نیچے کی روشنی بند کرنا ہوگی۔“

اس نے فوری طور پر اپنے اوزار نکالے اور کمرے میں موجود سوچ بورڈ کھول لیا۔ اس نے تصدیق کی۔ ”یہاں سے اضافی لائن کھیں جا رہی ہے۔“

”کاٹ کر دیکھو۔“ ملنگ نے حکم دیا اور اس نے کڑ سے تار کاٹ دی۔ فوراً ہی نیچے اندھیرا ہو گیا اور ملنگ آنکھوں پر نائٹ ویژن عینک لگا تے ہوئے بیڑھیوں سے نیچے اتر گیا تھا۔ بہ مشکل دس سیکنڈ بعد اندر سے برسٹ چلنے کی معمولی سی آواز آئی۔ یہ طویل اور بھرپور برسٹ تھا جو اس وقت خاموشی اور جب میگزین خالی ہو گیا تھا۔ پھر ملنگ کی آواز آئی۔ ”شوگی اور ناگ نیچے آئیں۔“

شوگی اور ناگ نیچے گئے میں نے پہلی بار دیکھا ان کی پشتوں پر خاصے بڑے بیک بندھے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ملنگ نے نیچے موجود مرشد کے آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اب اندر موجود قید اپنے افراد کو چھڑا تا تھا۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ ملنگ نے سر باہر نکال کر مجھ سے کہا۔ ”تم آگے جاؤ۔۔۔۔۔ جب تک میں ان لوگوں کو آزاد کرانے لاتا ہوں۔“

”اوکے باس۔“ میں نے کسی قدر استہزائیہ لہجے میں کہا لیکن وہ سنے بغیر واپس اندر جا چکا تھا۔ میں باقی تین دو افراد کے ہمراہ سماع ہال کے اگلے حصے کی طرف بڑھا۔ یہاں سے باہر راستہ مرکزی ہال سے نکلتا تھا۔ ہم نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا تو درگاہ کی عمارت کا عقبی حصہ نظر آیا۔ یہ سماع ہال سے خاصا بڑا تھا اور دونوں عمارتوں کے درمیان کوئی ستر گز کا فاصلہ تھا۔ یہاں نصف درجن سے زیادہ پہریدار تھے۔ ان لوگوں نے چار افراد کو تو

خاموشی سے ہلاک کر دیا تھا مگر سات افراد کو ٹھکانے لگانا آسان نہیں تھا اور خاموشی سے یہ کام تو بہت ہی مشکل تھا۔ اصل لوگ درگاہ کی عمارت میں تھے۔ کھڑکیوں سے ممکنہ حد تک جاسوسی کر کے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اندر رہ کر ان لوگوں کو نشانہ بنانا بہت مشکل تھا۔ یہاں زاویے نہیں تھے اور ایک بھی بچ جاتا تو گڑبڑ ہو جاتی اس لیے جب ملنگ آیا تو میں نے اس سے کہا۔

”اس طرح کام نہیں چلے گا۔“

”پھر کیا کیا جائے؟“

”ان کی تعداد کم کرنی ہوگی۔“

”کیسے؟“

”وہ شخص کہاں ہے جس نے ہمیں ریسو کیا تھا۔“

”وہ پیچھے ہے۔“

”اسے بلاؤ۔“ میں نے کہا تو ملنگ نے ایک آدمی روانہ کر دیا اور مجھ سے پوچھا۔

”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

”ان میں سے کچھ کو اندر بلا کر قابو کرنا ہے۔ کیسے کرنا ہے یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”اور جو باہر رہ جائیں گے۔“

”ان کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ اس دوران میں وہ آدمی آگیا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”منظور جی۔“

”منظور باہر سات افراد ہیں تم باہر جاؤ اور ان کو بتاؤ کہ تہ خانے میں کوئی مسئلہ ہوا ہے۔ وہاں موجود

پہریداروں کی آپس میں لڑائی ہو رہی ہے۔ چل کر معاملہ سلجھائیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتے وہ اندر والوں کو بتا دیں گے۔“

میں نے سوچا اور کہا۔ ”تم لڑائی کی وجہ دو عورتوں کو قرار دے سکتے ہو جنہیں وہ کہیں سے عیاشی کے لیے

لائے ہیں اور اب ان پر لڑائی ہو رہی ہے۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ملنگ نے مداخلت کی۔ ”میں ان حرا مزدوں کو جانتا ہوں عورتوں کا سن کر دوڑے

آئیں گے۔ باہر جا کر سب سے مت کہنا جو آگے دو تین ہیں ان کو بتانا۔“

منظور نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ ہم ہال کے بائیں طرف دو کمرے میں آئے اور وہاں دو کمرے میں مورچے

سنبھال لیے۔ منظور کامیاب ہوتا تو آنے والے بیہوش سے گزرتے۔ چند منٹ بعد آوازیں آنے لگیں۔ بولنے

والے منظور کے ساتھ تھے۔ وہ اس سے سوالات کر رہے تھے اور سوالات جھگڑے کے بجائے عورتوں کے بارے

میں تھے۔ ان کو لڑائی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کی بلا سے اندر والے آپس میں لڑ مارتے، وہ تو عورتوں کے چکر

میں جا رہے تھے۔ وہ چار تھے اور منظور سے آگے تین تھے جب کہ اس کے ساتھ ایک چل رہا تھا۔ جیسے ہی وہ آگے

نکلے ملنگ اور اس کے ساتھیوں نے اچانک راہداری میں نکل کر ان پر فائر کھول دیا۔ میں کمرے میں رہا تھا۔ منظور

کو بچانے کے چکر میں وہ کھل کر فائرنگ نہیں کر سکے تھے اس لیے نشانہ بننے والے فوراً اجل کا نشانہ نہیں بنے تھے۔ فائرنگ کی آواز معمولی سی تھی مگر ان کی چھین خاصی بلند تھی۔ پھر ملنگ اور اس کے ساتھیوں نے گرے ہوئے زخموں کو شوٹ کیا۔ منظور جواب تک ساکت کھڑا تھا اچانک گرا اور ترپنے لگا۔ ملنگ جھکا۔ ”اوئے تجھے کیا ہوا ہے۔“

تب میں نے دیکھا اس کے بائیں پہلو سے خون پھوٹ رہا تھا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کی زو میں آ گیا تھا ان لوگوں نے غلٹ میں اسے ہٹنے کا موقع نہیں دیا اور کوئی گولی اس کا دل والا پہلو چھید گئی تھی۔ وہ ایک منٹ سے بھی پہلے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ملنگ نے جھک کر اسے دیکھا اور اپنے آدمیوں سے غصے میں بولا۔ ”دیکھ کر فائر نہیں کر سکتے تھے۔“

”اب کیا ہو سکتا ہے استاد“ ایک نے لا پرواہی سے کہا۔

ان پانچ انسانوں کی موت بھی مجھے بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ مگر یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں ان کے بارے میں بات کرتا۔ بارہ بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے اور ہمیں درگاہ کی عمارت میں گھسنا تھا۔ میں نے ملنگ سے پوچھا۔ ”آزاد ہونے والے کہاں ہیں؟“

”وہ سرنگ کی طرف گئے ہیں، تیار ہو کر آرہے ہیں۔“ ملنگ نے جواب دیا۔ ”ان کے لیے بھی لباس، اسلحہ اور بلٹ پروف لائے تھے۔“

اسی لمحے راہداری میں قدموں کی آہٹیں گونجنے لگیں اور ایک درجن کے قریب افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے ہماری طرح وردیاں اور بلٹ پروف مین رکھا تھا اور اسلحہ بھی تھا۔ ان سب کے بال اور شیو بڑھی ہوئی تھی اور ان کے پاس سے نہایت وحشت ناک قسم کی بدبو آ رہی تھی یقیناً انہیں نہائے دھوئے ہفتے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے ملنگ سے کہا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”سامنے والے چار بندے۔“ ملنگ نے جواب دیا۔ ”لیکن غلطی سے منظور بھی مارا گیا ہے۔“

آنے والوں نے سرسری سے انداز میں منظور کی لاش دیکھی اور ملنگ سے بات کرنے والا بولا۔ ”انتظار کس بات کا ہے اب چلو، کھلی جنگ ہوگی۔“

”کوئی کھلی جنگ نہیں ہوگی۔“ میں نے سرد اور تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”ہمیں خاموشی سے درگاہ میں گھسنا ہوگا۔ بلاوجہ شور کی قطعی ضرورت نہیں ہے جب تک ہم جزیئر تک نہ پہنچ جائیں۔“

”یہ کون ہے۔“ ملنگ سے بات کرنے والے نے تسخرانہ انداز میں پوچھا تو میں آگے آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”تم نے مجھے پہچانا نہیں، میں شہباز ملک ہوں۔ جس سے تمہارے سابق آقا مرشد اور موجودہ آقا فاضلہ کی..... ہے۔“ خالی جگہوں میں، میں نے روانی سے ناقابل بیان الفاظ فٹ کیے۔ میرا نام سن کر اس کا تاثر بدل گیا تھا۔ اس نے ناقابل یقین نظروں سے ملنگ کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

”استاد نے ساتھ کیا ہے۔ اب یہ ہمارا لیڈر ہے۔ اس کی ہر بات مانتی ہے۔“

”میرا پہلا حکم ہے کہ میری اجازت کے بغیر کوئی گولی نہیں چلائے گا اور میں جو پلان کروں اس پر عمل ہو

گا۔ اگر کسی کو اعتراض ہے تو وہ فاضلی سے بات کر لے۔“
 مگر ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ فاضلی سے بات کرتا۔ میں پلٹ کر ہال کی طرف آیا۔
 یہاں آنے والے کے پیچھے دوسرے بھی جلد یا بدیر آتے۔ عورتوں کے لفظ نے ان پر جادو جیسا کام کیا تھا اور وہ
 نہایت آسانی سے دام اجل میں چلے آئے تھے۔ اب باہر تین تھے۔ ہم نے ہال کی کھڑکیوں سے باہر دیکھا تو وہ
 تینوں اب دسٹلی محن میں تھے اور ان کی نظریں سماع ہال کی عمارت پر مرکوز تھیں۔ وہ تینوں پاس پاس تھے اور آپس
 میں گفتگو کر رہے تھے۔ اب تک کے آثار سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ درگاہ میں کسی کو اس معاملے کے بارے میں
 علم ہوا تھا۔ میں نے ملنگ سے کہا۔ ”وقت نہیں ہے..... یا تو انہیں اندر بلانا ہو گا یا پھر ہمیں اچانک دھاوا بولنا ہو
 گا۔“

میری ایک کامیاب حکمت عملی نے ملنگ کو مرعوب کر دیا تھا اور اس نے کہا۔ ”جیسا تم کہو۔“
 میں نے سوچا اور بولا۔ ”یہاں تاریکی ہے..... اگر ہم میں سے کوئی دروازے کے اندر رہتے ہوئے انہیں
 اشارے سے یہاں بلائے تو یقیناً ان میں سے کوئی نہ کوئی آئے گا۔“
 ”تاریکی میں حلیہ نظر نہیں آئے گا۔ مگر بلٹ پروف اور ہتھیار نظر میں آسکتے ہیں۔“ ملنگ بولا۔ ”یہ کام کون
 کرے گا؟“

”میں۔“ میں نے کہا اور ہتھیار اور بلٹ پروف اتارنے لگا۔ ان کی وجہ سے میں الگ نظر آتا۔ وہ کھٹک
 سکتے تھے جب کہ پینٹ اور سیاہ ٹی شرٹ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ سب کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ
 وہ جگہ ہے جس کے بارے میں ہم لوگوں نے کتنی بار سوچا کہ یہاں کارروائی کی جائے۔ مرشد کے اس اڈے کو تباہ
 کر دیا جائے مگر ہم سوچ کر رہ گئے کبھی موقع نہیں ملا کہ یہ کام کیا جائے اور آج میں اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے ایک
 بدترین دشمن کے لیے یہ کام کر رہا تھا۔ اپنے پیاروں اور اپنے ساتھیوں کے لیے۔ میں یوں جان لڑا رہا تھا اور اپنی
 ساری کوششیں کر رہا تھا جیسے میں اپنے لیے کر رہا ہوں حالانکہ مجھے اپنا انجام معلوم نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ فاضلی
 کام نکلے ہی مجھے بھی مرشد کے ساتھ دنیا سے رخصت کر دیتا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اس کے لیے کوئی بھی
 بہانہ بنانا بہت مشکل نہیں تھا۔ وہ ڈیوڈ شا سے کہہ سکتا تھا کہ میں غلطی سے اس سے دور چلا گیا۔ اس کے باوجود میں
 فاضلی کے لیے کام کر رہا تھا۔ صرف اس لیے کہ میرے ساتھی محفوظ رہیں۔ میں سب اتار کر کھلے دروازے تک آبا
 اور روشنی سے دور رہتے ہوئے ہلکی سی سیٹی بجائی اور جب انہوں نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہاتھ سے پور
 اشارہ کیا کہ جیسے انہیں جلدی سے آنے کو کہہ رہا تھا۔ شاید میرے اشارے کی اتنی وقت نہ ہوتی لیکن اس چکر کے
 پیچھے جو مہینہ خواتین تھیں انہوں نے ان تینوں کو مجبور کر دیا اور وہ ہال کی طرف آنے لگے۔

”وہ آرہے ہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”سب پوزیشن لے لیں اور جب میں کہوں تو انہیں شوٹ کر
 دینا مگر اس بار دھیان سے ان کے ساتھ مجھے بھی مت شوٹ کر دینا۔“

ہال میں بے شمار کاٹھ کھاڑ پڑا تھا ملنگ کے چار ساتھیوں نے غلت میں اس کے پیچھے پوزیشن لے لی او
 باقی سب دیواروں سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ میں دروازے کے سامنے تھا اس لیے آنے والے بے فکری سے
 آتے تھے۔ ان کے نہ آنے پر میں مزید تاریکی کی طرف سرکا تا کہ وہ میری شناخت نہ دیکھ سکیں۔ وہ تینوں

اندر آئے میں خاصا پیچھے ہٹ گیا تھا اور شاید اس سے انہیں خطرے کا احساس ہوا۔ ایک نے کہا۔ ”اوئے کون ہے تو؟“

”میں شیدا ہوں جی۔“ میں نے ناک سے آواز نکالی۔ ”اندر جھکڑا بہت بڑھ گیا ہے جی وہ ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔“

میری بات کے دوران وہ دروازے سے کئی فٹ اندر آگئے تھے اور ان کے ہتھیار ان کے شانوں پر تھے۔ اسی لمحے ایک نے دیواروں کے ساتھ کھڑے افراد کو دیکھ لیا۔ اس نے گالی دی۔ ”..... یہ کون ہیں۔“

”فائر۔“ میں نے آہستہ سے کہا اور ملنگ کے چاروں ساتھیوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ حفظہ ماتقدم میں مزید پیچھے ہو گیا تھا۔ وہ تینوں نمایاں تھے اور بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی چند سیکنڈ میں وہ چھلنی ہو گئے اور جب گرے تو ان کی روئیں جسم سے ناط توڑ چکی تھیں۔ ”ہالٹ۔“ میں نے کہا تو فائرنگ رک گئی اور ملنگ نے سب سے پہلے ہال کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ اس کے آدمی مرنے والوں کو چیک کر رہے تھے۔ میں باہر جھانک رہا تھا اور درگاہ کی عمارت بدستور تاریکی میں تھی۔ مرشد کو پتا بھی نہیں چلا تھا اور اس کے اکیس پہریدار مر چکے تھے۔ بائیسواں منظور تھا جو فرینڈلی فائرنگ کا نشانہ بنا تھا۔ میں نے ملنگ سے پوچھا۔ ”درگاہ میں کوئی وفادار ہے؟“

”نہیں اب دو آدمی ہیں لیکن وہ کٹھی میں ہیں۔“

میں نے تہہ خانے سے آزاد کرائے جانے والوں سے پوچھا۔ ”تم میں سے کوئی درگاہ کے اندرونی حالات کے بارے میں جانتا ہے؟“

”دواگے آئے۔“ ہم جانتے ہیں۔“

”وہاں اس وقت کتنے آدمی ہوتے ہیں؟“

”تقریباً پچاس سے ساٹھ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر عورتیں آئی ہوں تو سو بھی ہو جاتے ہیں۔“

”یعنی شام کے بعد وہاں عیاشی ہوتی ہے۔“

”سوائے ہفتے کی رات۔“ ملنگ نے کہا۔ ”ہفتے کی رات یہاں اسلئے اور منشیات کی آمد و رفت ہوتی ہے

اس وقت ایک بھی غیر متعلقہ فرد یہاں نہیں ہوتا ہے۔“

میں نے سوچا۔ ”پچاس سے ساٹھ وہ افراد ہیں جو لڑنا اور ہتھیار چلانا جانتے ہیں؟“

”نہیں ان کی تعداد چالیس کے قریب ہوگی۔“ ان دونوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”باقی عام

ملازمین ہیں۔“

”درگاہ کا اندرونی نقشہ کیا ہے۔“ میں نے پوچھا تو بولنے والے نے فرش کی خاک پر عمارت کا خاکہ

کھینچا۔

”یہ درمیانی ہال ہے یہاں قبریں ہیں اور یہیں محفل ہوتی ہے۔ ذرا پیچھے مرشد کا خاص کمرہ ہے جہاں خاص لوگ اس سے ملتے ہیں۔ عام لوگوں سے وہ اس سامنے والے حصے میں ملتا ہے۔“ اس نے گنبد کے نیچے والے حصے میں آگے انگلی رکھی۔ ”یہاں فرش سے چھت تک ایک ہی کمرہ ہے۔ اوپری منزلوں کے حصے اس طرف کھلتے ہیں۔ گنبد کے دائیں بائیں راہداری ہے جس کے دونوں طرف کمرے ہیں۔“ وہ انگلی سے نقشے میں اضافہ

کر کے وضاحت کر رہا تھا۔

”سیرھیاں کس طرف ہیں؟“

”گنبد کے دونوں طرف سے سیرھیاں اوپر جا رہی ہیں۔“ اس نے سیرھیوں کی لوکیشن واضح کی۔ میں سمجھ گیا تھا۔ یہ عمارت کوئی سوگڑ لمبی اور کوئی تیس گز چوڑی تھی۔ گنبد والا حصہ آگے پیچھے دونوں طرف سے دائرے میں باہر نکلا ہوا تھا۔ پوری عمارت سفید سنگ مرمر سے ڈھکی ہوئی تھی اور آگے پیچھے کمرؤں کی اسٹائش کھڑکیاں اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں مگر یہاں رہنے والے اور آنے والے ہی جانتے تھے کہ اس خوب صورت عمارت میں کتنی بد صورتیاں چھپی ہوئی تھیں۔ تین فلورز پر ہر منزل پر بیس بیس کمرے تھے جو ایک راہداری میں پانچ پانچ کی قطار میں تھے۔ یعنی آٹھ سائے پانچ پانچ کمرے تھے۔ اس طرح ان تین فلورز پر ساٹھ کمرے بنتے تھے۔ سرورز کے لیے تہ خانہ تھا۔ وہیں کچن تھا اور ملازمین بھی وہیں رہتے تھے۔ عام طور سے تہ خانہ خفیہ سرگرمیوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے لیکن یہاں ایسا نہیں تھا۔

اب ہمارے ساتھ کل سترہ افراد تھے۔ چھ ہم اور گیارہ قید سے نکل کر آنے والے تھے۔ یہ سب لڑائی اور ہتھیاروں کے استعمال میں ماہر تھے۔ سترہ افراد کافی ہو سکتے تھے اگر ہم خاموشی سے کارروائی کرتے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ یہاں پہلی دفاعی لائن ختم کی جا چکی تھی۔ میں نے ان سب کو جمع کیا اور اپنی حکمت عملی سامنے رکھی۔ ”گنبد والے ہال کے عقبی حصے سے اندر داخل ہو کر ہم دو حصوں میں دائیں بائیں تقسیم ہو جائیں گے۔ دو افراد ہال کے سامنے والے دروازے کو کور کریں گے اور ایک پیچھے والے دروازے کو کور کرے گا۔ باقی بچے چودہ افراد، سات سات کر کے دائیں بائیں باری باری تینوں منزلیں کلیر کریں گے۔ سات میں سے دو سیرھیوں کو کور کریں گے تاکہ اوپر والے نیچے نہ آسکیں اور پانچ کمرؤں کو دیکھیں گے۔ سب سمجھ گئے۔“

انہوں نے سر ہلائے تو میں نے ملنگ سے کہا۔ ”انہیں دو گروپس بنا دو۔“

ایک گروپ ملنگ کا تھا اور دوسرا اس کے سپرد کیا جس نے میرے بارے میں پوچھا تھا۔ دو افراد کے ساتھ میں نیچے ہال میں رہتا۔ میں اگلے حصے کی نگرانی کرتا۔ میرا اسلحہ اور بلٹ پروف بدستور اتر ہوا تھا اس لیے میں نے صحن میں آ کر درگاہ کی عمارت کا رخ کیا۔ اگر کوئی دیکھ رہا ہوتا تو اسے کوئی مشکوک بات نظر نہیں آتی۔ میں نے تین قدموں سے دروازے تک پہنچا اور اسے چپک کیا تو خلاف توقع وہ اندر سے کھلا پایا گیا۔ میں نے اسے آہستہ سے اندر دھکیلا اور جھانک کر دیکھا۔ مرکزی ہال تاریک تھا اور کہیں گنبد کے اوپری حصے میں روشنی تھی جو یہاں تک بھی آ رہی تھی۔ مگر بس گزراے لائق تھی۔ میں نے پلٹ کر اشارہ کیا اور ملنگ کے آدمیوں میں سے دو افراد تیز قدمی سے عمارت کی طرف آئے۔ جیسے ہی وہ اندر گھے مزید دو افراد اسی طرح دوڑتے ہوئے آئے۔ چھ افراد کے بعد باقی سب قطار میں آئے۔ کیونکہ دودھ کر کے آنے میں دیر لگتی اور دیکھ لیے جانے کا امکان زیادہ تھا۔ مسلح فرد ایک ہوتا یا زیادہ سب ایک سے مشکوک ہوتے۔ اس بار بھی قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور کوئی اتنے مسلح افراد کو درگاہ کی عمارت میں گھسنے نہیں دیکھ سکا۔ یہاں آتے ہی سب اپنے اپنے طے کیے ہوئے حصوں کی طرف بڑھ گئے۔

میں ایک آدمی کے ساتھ سامنے والے حصے میں آیا۔ یہ بیس بائیس سال کا نوجوان تھا مگر اس نے اپنی

جوانی کا قبل از وقت بیزا غرق کر لیا تھا۔ یقیناً اس کی غیر نصابی سرگرمیاں اوائل جوانی میں شروع ہو گئی تھیں۔ چمکے گالوں اور اندر دھنسی آنکھوں کے ساتھ وہ خراب صحت کا مثالی نمونہ پیش کر رہا تھا رنگ اگر کبھی سناٹا تھا تو اب جل کر سیاہ ہو گیا تھا۔ دیگر کروت بھی دانوں اور مہاسوں کی صورت میں واضح تھے۔ ذرا سا بھاگنے سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ کسی قدر مشکل کے ساتھ اپنی رائفل کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے بھرتی کیسے کر لیا گیا تھا شاید وہ اچھا نشانے باز تھا۔ سامنے لکڑی کی جالی اور اس کے درمیان رنگین شیشوں سے بنا ہوا مرکز دروازہ اندر سے بند تھا۔

یہ تہہ در تہہ چھ پنوں میں کھلنے والا دروازہ تھا۔ پوری طرح کھلنے پر دروازے کی چوڑائی تقریباً دس فٹ ہو جاتی۔ یہ اسی صورت میں کھولا جاتا جب لوگ بڑی تعداد میں آ جا رہے ہوتے ہوں گے۔ عام حالات میں اس کے دوپٹ کھولنا بھی کافی ہوتے۔ اس کا لاک اندر یا باہر دونوں طرف سے صرف چابی سے کھولا جاسکتا تھا۔ شیشے منقش اور مرشد کے مریدوں کی طرح اندھے تھے ان سے باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اسی طرح باہر سے بھی اندر کچھ نظر نہیں آتا۔ البتہ ایک طرف ایک چھوٹی کھڑکی تھی اس کے شیشے بھی اندھے تھے مگر پٹ کھول کر باہر کا جائزہ لیا جاسکتا تھا میں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں درگاہ اور نئے سماع ہال کے درمیان بڑا خوب صورت اور ہر ابھرا باغ تھا۔ متعدد بڑے درخت تھے جن کے نیچے سینٹ کی بنچیں لگی تھیں۔ یہ آنے والے زائرین اور حاجت مندوں کے لیے تھیں۔ نئے سماع ہال کے سامنے پختہ فٹ پاتھ پر کم سے کم تین مسلح افراد موجود تھے۔ درگاہ کی عمارت کے ساتھ کتنے تھے یہ کہنا مشکل تھا۔ مگر یقیناً اس جگہ کی سیوری زیادہ ہوگی۔

اچانک عقب سے بے آواز رائفل چلنے کی گنگناہٹ سنائی دی اور کوئی بھی ایک انداز میں ذکر کیا۔ آواز میں موت کا تاثر نمایاں تھا۔ اس کے فوراً بعد رہ کر رائفلس گنگناہٹ لگیں۔ مرنے اور نشانہ بننے والے ہلکی پھلکی چیخ و پکار کر رہے تھے مگر ان کی آوازیں اتنی نہیں تھیں کہ باہر تک جاسکتیں۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ میں جہاں تھا یہاں سے دونوں طرف اوپر جانے والے سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے نیچے سیڑھیاں تہہ خانے کی طرف جا رہی تھیں اور میں نے ایک سیڑھی سے ایک شخص کو سر اٹھاتے دیکھا۔ نیم تاریکی میں وہ بہ مشکل نظر آیا تھا۔ میرے پاس سے ہلکی سی فائرنگ کی آواز آئی اور سر غائب ہو گیا۔ میں نے مدقوق نو جوان کو دیکھا۔ گولی اس نے چلائی تھی۔ میں نے سر دہلچے میں کہا۔ ”میری اجازت کے بغیر فائر کیوں کیا؟“

”وہ مسلح ہو سکتا تھا۔“ نو جوان نے جواز پیش کیا۔ ”اس کی طرف سے حملے کا انتظار نہیں کیا جاسکتا تھا۔“

بائیں طرف جانے والی ٹیم پہلے فلور سے منٹ کرواپس آ رہی تھی کہ اوپری منزل سے کسی نے فائر کیا۔ یہ شات گن کا فائر تھا۔ اگرچہ نشانہ کوئی نہیں تھا مگر اس فائر نے اعلان جنگ کر دیا اور اب تک جن لوگوں تک حملے کی اطلاع نہیں پہنچی تھی وہ بھی جان گئے کہ درگاہ میں گڑ بڑ ہے۔ فوراً ہی باہر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ میں اور مدقوق نو جوان تیزی سے پیچھے ہٹے اور مزار کی جالیوں تک آ گئے۔ یہاں زمین سے تین فٹ اوپر تک لکڑی کا نفیس جالی لگی تھی۔ میں نے رائفل کا بٹ مار کر اسے توڑا اور پھر کھینچ کر الگ کر دیا۔ میں اور نو جوان بروقت احاطے میں اترے تھے کیونکہ فوراً ہی سامنے سے کسی نے دروازے پر برست مارا اور گولیاں ہمارے اوپر سے گزری تھیں۔ نو جوان نے جوابی برست مارا تو باہر سے حملہ آور کی آخری چیخ سنائی دی۔

پھر باہر والوں نے اتنی شدت سے فائرنگ کی کہ دروازے کے پرچے اڑ گئے تھے۔ لکڑی اور شیشے بکھر گئے تھے۔ لیکن ماربل کی دیوار نے مجھے اور نوجوان کو محفوظ رکھا تھا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے عقب سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب باہر والوں کو اندر کی صورت حال کا علم نہیں تھا تو وہ اس طرح اندھا دھند فائرنگ کیوں کر رہے تھے جس میں ان کے اپنے آدمی بھی نشانہ بن سکتے تھے۔ وہ یقیناً نا تجربہ کار افراد تھے۔ ہم محفوظ تھے پیچھے کی نگرانی کرنے والے کے بارے میں کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں۔ اب عمارت کے اندر سے بھی کئی اقسام کا اسلحہ چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ظاہر ہے یہ سب مرشد کے لوگ استعمال کر رہے تھے کیونکہ ہمارا اسلحہ بے آواز تھا۔ میں نے نوجوان سے کہا۔ ”تم سامنے کا خیال رکھو۔“

میں احاطے سے کود کر باہر آیا اور دائیں طرف موجود سیڑھیوں تک آیا۔ میں نے احتیاط سے تہہ خانے کی طرف جھانکا۔ سیڑھیوں کی نگرانی کرنے والا اب دوسرے فلور پر جا چکا تھا اور وہ تیسرے فلور پر موجود افراد کو نیچے آنے سے روک رہا تھا۔ میرا جھانکنا بروقت کام آیا کیونکہ سیڑھیوں پر کم سے کم تین مسلح افراد تھے۔ انہوں نے میری موجودگی بھانپتے ہی اپنے ہتھیاروں کا رخ اوپر کر کے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ شور سے میرے کان کے پردے بج رہے تھے۔ پھر جیسے ہی ان کی طرف سے فائرنگ رکی میں نے رائفل کی ٹال اندر کر کے برسٹ مارا۔ چیخوں کے ساتھ بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دوسرے برسٹ تک سیڑھیاں صاف ہو چکی تھیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا ایک آدمی اوندھے منہ پڑا تھا اور باقی دو غائب تھے۔ وہ فوج نکلے تھے۔ اندازے کے برعکس تہہ خانے میں بھی مسلح افراد موجود تھے۔ شاید مرشد نے حالات کی وجہ سے عام ملازموں کو بھی مسلح کر دیا تھا۔ غیر قانونی اور قانونی اسلحے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ میں نے عقب کی طرف نگرانی کرنے والے کو آواز دے کر بلایا اور اسے تہہ خانے کی نگرانی پر لگا کر دوسری سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ یہاں سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں دبے قدموں ذرا نیچے کی طرف آیا تو مجھے کسی کے بولنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ کوئی عورت تھی جو روتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”مجھے جانے دو وہ سب کو مار دیں گے..... مجھے بھی مار دیں گے۔“

”چپ کر.....“ ایک پھنکارتی مردانہ آواز نے کہا۔ ”اوپر گئی تو ماری جائے گی۔ ابھی یہیں رہ..... جا اندر

جا۔“

اس گفتگو کے دوران میں سیڑھیوں سے تقریباً نیچے آچکا تھا اور اندر سے آتی روشنی میں سامنے دیوار پر ایک مرد اور ایک عورت کا سایہ واضح تھا۔ عورت کو پیچھے دھکیل کر مرد سیڑھیوں کی طرف آیا تو میں اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ جیسے ہی وہ نمودار ہوا، میں نے اس کے منہ پر رائفل کا بٹ مارا اور چیخ کے ساتھ اس کے کئی دانت بھی حلق میں اتر گئے تھے۔ دوسری ضرب پر وہ اوندھے منہ گرا اور ساکت ہو گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو عورت ایک طرف دیوار سے لگی کانپ رہی تھی۔ وہ تقریباً پچیس برس کی جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ یہاں اس کی موجودگی کی وجہ اس کے کسی قدر کمزورے کاہل اور لپ اسٹک اور بے ترتیب لباس سے واضح تھی۔ اس نے کرتے کے بن غلط لگائے ہوئے تھے جو یقیناً غلت میں لگائے گئے تھے۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر جیسی آواز میں پوچھا۔

”ذرومت میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ جھوٹ بول رہا تھا۔“

اس نے سر ہلایا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی، اس کے ردِ عمل سے مطمئن ہو کر میں نے سوال کیا۔ ”یہاں اور کتنے لوگ ہیں؟“

”بارہ ہیں جی۔“ اس نے سہمی آواز میں کہا۔ ”دوا دھر مر گئے ہیں ایک زخمی ہے اور ایک یہ ہے۔“

”باقی آٹھ کہاں ہیں؟“

”وہ توجی عورتیں ہیں۔ یہاں کام کرتی ہیں۔“

”تم بھی یہاں کام کرتی ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے میرے شہبے کی تصدیق کرتے ہوئے کہا اس کا رنگ سرخ ہو گیا تھا لیکن فی الحال اس

سے سوال جواب کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”یہیں رکو..... اور پرمت جانا..... نہ ہی اندر جانا میں واپس آ کر تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ میری

بات نہ مانی تو نتیجے کی ذمہ دار خود ہوگی۔“

”میں نہیں بلوں گی۔“ اس نے کہا اور میں آگے بڑھ گیا۔ اوپری ہال کی نسبت نیچے تہہ خانہ چھوٹے

چھوٹے حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہیں کچن تھا البتہ لنگر خانہ نئے سماع ہال کے پاس تھا۔ دوسری بیڑھیوں کی طرف

جاتے ہوئے مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور وہ کسی کو پکار رہا تھا۔

”سنئے کیوں نہیں ہو..... سب عیاشی میں لگے ہوں گے۔“

میں نے ایک دیوار کے پیچھے جھانکا تو اس چھوٹے سے لاؤنج میں ایک آدمی کی لاش تھی اور ایک زخمی

حالت میں موجود تھا۔ یہ یقیناً وہی بیڑھیوں کی طرف آنے والے تھے تینوں ہی نشانہ بنے تھے مگر دو وہاں سے نکلنے

میں کامیاب رہے تھے ایک یہاں آ کر مارا گیا تھا اور دوسرا زخمی تھا۔ وہ ایک بڑے سائز کے واکی ٹاکی پر کسی کو پکار

رہا تھا اور جواب نہ ملنے پر اسے گالیاں دے رہا تھا۔ میں دبے قدموں اس کے سر پر آیا اور پھر رائفل کی نال اس

کے سر سے لگا دی۔ وہ ساکت ہوا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے واکی ٹاکی لے لیا اور اسے فرش پر دے مارا۔

اس کے پرزے بکھر گئے تھے۔ اس نے گھگھانا شروع کر دیا۔ ”مجھے مت مارو میرے بیوی بچوں کا اور کوئی نہیں

ہے۔“

میں نے طنز کیا۔ ”بیوی بچوں کا خیال ہوتا تو یہاں نہ ہوتے کسی شریفانہ جگہ پائے جاتے اور یہ اسلحہ لے

کر تم بیوی بچوں کا خیال کرنے آرہے تھے۔“

”مجھ سے غلطی ہوئی۔“

”یہاں اور کتنے لوگ ہیں۔“

”بس ایک مجید رہے لیکن وہ پتا نہیں کہاں ہے۔ باقی عورتیں ہیں جو یہاں کام کرتی ہیں۔“

”کیا کام کرتی ہیں؟“

”کھانا بنانا صفائی ستھرائی۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہاں ایک عورت باہر کی ہے۔“

”رودشا ہوگی اسے مجید لانا ہے ساری رات دونوں عیاشی کرتے ہیں۔“

”معلومات کا شکریہ۔“ میں نے کہا اور اس کے سر پر اٹھل کا دستہ مارا وہ بے ہوش ہو کر وہیں لڑھک گیا۔ اس کے بازو پر گولی لگی تھی اور خون روکنے کے لیے اس نے کپڑا باندھ لیا تھا اس لیے اس زخم سے اس کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں واپس روشناس کی طرف آیا۔ وہ اسی جگہ کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اوپر مار دھاڑ چل رہی ہے اور وہاں کسی کا محفوظ رہنا مشکل ہے اس لیے تم یہاں موجود کام کرنے والی عورتوں کے پاس چلی جاؤ۔“

وہ ہراساں ہو گئی۔ ”اگر میں روشنی تک نہ گئی تو.....“

”تم گھر والوں سے چھپ کر یہاں آئی..... اُن کی عزت روندنے؟“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”ایسے کاموں کا انجام بالآخر یہی ہوتا ہے۔“

”گھر والوں نہیں گھر والا جی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اُسے معلوم ہے میں یہاں آتی ہوں مجید کے ساتھ۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ”تمہارے شوہر کو پتا ہوتا ہے وہ بے غیرت کچھ نہیں کہتا۔“

”اسی کی وجہ سے تو میں اس حال کو پہنچی ہوں۔ شادی کے قابل نہیں تھا مگر میری زندگی برباد کر دی۔ اب میں گناہ کرتی ہوں۔“ اس کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

”گناہ کرنے سے بہتر تھا کہ تم اس سے طلاق لے لیتیں۔“

”وہ میرا چھوٹا زاد ہے جی میں اس سے محبت کرتی ہوں طلاق لے کر اسے بدنام نہیں کر سکتی۔ شادی کے شروع دنوں میں لوگوں نے بہت باتیں بتائیں۔ مگر جب میرا بچہ ہوا تو سب کے منہ بند ہو گئے۔“

”تمہارے کتنے بچے ہیں؟“

”تین بچے ہیں۔“ اس نے کہا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ”اس وقت تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ البتہ تم ان عورتوں میں جا کر چھپ جاؤ تو بعد میں تم یہاں سے نکل سکتی ہو۔ تم بول سکتی ہو کہ زیارت کے لیے آئی تھیں اور ہنگامے کے بعد یہاں پھنس گئیں۔ اب جاؤ کیونکہ میرے علاوہ کوئی یہاں آیا تو کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا چاہے وہ ملازم ہو یا باہر سے آئی ہوئی کوئی عورت ہو۔“

وہ سم کر اندر کی طرف بڑھی تو میں بیڑمیوں سے اوپر آیا۔ درگاہ کی عمارت کی فائرنگ رک گئی تھی مگر باہر فائرنگ کا ہنگامہ جاری تھا۔ ملنگ اور اس کے ساتھی تینوں طور کلیئر کر کے میچے آپکے تھے میں نے نوٹ کیا کہ ان کی تعداد کم تھی چھ بندے غائب تھے۔ میں نے ملنگ سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

”مارے گئے..... ہم نے بھی یہاں موجود چالیس کے قریب ہندوں کو آڑا دیا ہے۔“

”چالیس؟“ میں چونکا۔ ”زیادہ لوگ تھے؟“

”عورتیں بھی تھیں کچھ کے ساتھ۔“ ملنگ نے جواب دیا۔ ”شدید فائرنگ کی وجہ سے سب ماری گئیں۔“

ان لوگوں کو کچھ کہنا بیکار تھا۔ وہ یہاں قتل و غارت گری کا پروگرام لے کر آئے تھے اور اب اس پر عمل پیرا تھے۔ ان سے کچھ کہنے کے بجائے اگلے مرحلے پر توجہ مرکوز رکھنے کی ضرورت تھی۔ ملنگ نے اپنے ساتھیوں کو تہہ

خانے میں جانے کو کہا تو میں نے منع کر دیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے وہاں چار تھے ان کو مار دیا ہے باقی ملازم عورتیں ہیں ان کو ان کے حصے میں بند کر دیا ہے۔“

”ہمیں حکم ہے یہاں موجود کسی فرد کو نہ چھوڑیں۔“ ملنگ نے کہا۔

”فی الحال تم میرا حکم مانو گے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہمیں فوری طور پر جزیئر پر قبضہ کرنا ہے اور

اسے تباہ کرنا ہے۔“

”جزیئر سانے باغ میں دائیں طرف جالی والی عمارت میں ہے۔“

سانے کئی مسلح افراد تھے اور وہ مزاحمت کرتے۔ میں نے سوچا اور ملنگ سے کہا۔ ”اپنے چھ آدمی اوپری

فلورز پر بھیج دو کھڑکیوں سے انہیں نشانہ بنائیں۔ یہاں سے ان پر حملہ کرنا مشکل ہے۔“

ملنگ کی سمجھ میں بات آگئی اور اس نے فوری اپنے چھ آدمی اوپر بھیج دیئے۔ کچھ نے یہاں مورچے لگا لیے تھے۔ ہال میں لڑائی مشکل ہو گئی تھی کیونکہ یہاں زیادہ تر شیشے تھے اور گولیوں کی آمد و رفت آزادانہ جاری تھی۔ اس لیے قبروں والے احاطے میں مورچہ لگایا گیا اور کمروں میں کھڑکیوں سے جوانی کارروائی شروع کی گئی۔ ہمارا زیادہ زور باغ والی سمت تھا کیونکہ ہمیں جزیئر تک پہنچنا تھا۔ ملنگ کے آدمیوں نے بلندی سے مرشد کے آدمیوں کو شکار کرنا شروع کیا۔ اس حکمت عملی نے باہر موجود مسلح افراد کو ساع ہال کی طرف جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ راستہ صاف ہو گیا تھا۔ اب ہمیں باہر جانا تھا میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ تین آدمی چلیں۔“

باہر موت فتنہ تھی اور ان میں سے کوئی رضا کارانہ طور پر مرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے ملنگ کے اشارے پر تین افراد بادل نا خواستہ الگ ہو کر میرے ساتھ درگاہ کے سانے والے حصے سے نکلے اور ہم تقریباً زمین سے لگے ہوئے روش کے ساتھ کرائی کی باڑ کے عقب میں آ گئے۔ دشمن نئے ساع ہال کی عمارت میں موجود تھا اور ہمیں دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ فوراً ہی ساع ہال کی طرف سے ہم پر فائرنگ کی گئی تھی مگر کرائی کی باڑ کے پیچھے آنے کے بعد ہم نظروں سے محفوظ تھے۔ اگرچہ یہ باڑ گولیوں سے نہیں بچا سکتی تھی۔ دشمن بھی یہ بات سمجھ رہا تھا اس لیے ان کی طرف سے پوری باڑ پر فائرنگ کی جانے لگی۔ ایک گولی میرے پیچھے چلنے والے کے لیے نامہ اجل لے کر آئی۔ وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ گرا اور ساکت ہو گیا۔ گولی نے اس کے سر میں سوراخ کر دیا تھا۔ کھڑے رہ کر آگے بڑھنا بہت مشکل تھا۔ میں نے نیچے گرتے ہوئے کہا۔ ”سب لیٹ جاؤ۔“

باقی دو بھی لیٹ گئے اور ہم ریک کر آگے جانے لگے۔ گولیاں رہ رہ کر برس رہی تھیں۔ درگاہ کی طرف سے برابر کا جواب دیا جا رہا تھا۔ پھر نئے ساع ہال کی جانب سے کچھ چیخوں کی آوازیں آئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد کے کچھ آدمی نشانہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد اس طرف سے فائرنگ کی شدت میں خاصی کمی آئی تھی۔ اب جزیئر والا کراہم سے چند گز کے فاصلے پر تھا مگر یہ چند گز کھلی جگہ سے گزرتے تھے۔ یہاں نشانہ بننے کا شدید خطرہ تھا۔ مگر جزیئر تک پہنچنا لازمی تھا۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔ ”مجھے کوردو میں جزیئر روم تک جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک استاد۔“ ایک نے جواب دیا۔ وہ دونوں مارٹل سے بنی ایک فٹ کی دیوار کے پیچھے مورچہ بن ہو گئے اور میں اچانک ہی اٹھ کر دوڑا۔ جب تک کسی طرف سے فائر ہوتا میں جالیوں والے کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا تھا یہ لاک تھا مگر ایک ہلکے برسٹ نے لاک والے حصے کے پر نیچے اڑا دیئے اور میں اندر گھس گیا۔

اس کے بعد عقب سے فائرنگ ہوئی تو مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوا تھا۔ جزیرہ روم کو ہوا دار رکھنے کے لیے اس کی دیواریں جالی والی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ جزیرہ خاصا بھاری بھر کم تھا اور اسے چاروں طرف سے دھاتی چادر سے تحفظ دیا گیا تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور پھر اس میں جانے والی ہیوی ڈیوٹی وائرز کو کھینچ کر توڑ دیا۔ مگر وائر بدلنا چند منٹ کا کام ہوتا ہے۔ جزیرہ کو مکمل طور پر ناکارہ بنانا تھا۔ پھر مجھے اس کے ایندھن کے ٹینک کا خیال آیا۔ یہ بیک وقت گیس اور پیٹرول سے چلنے والا جزیرہ تھا۔

اس کا ٹینک اوپری حصے میں تھا اس کا ڈھکن کھولا تو اس میں سے پیٹرول کی تیز مہک آئی۔ میں اس کا وہ پائپ تلاش کرنے لگا جو جزیرہ کو آئل سپلائی کرتا تھا۔ یہ پائپ خاصی مشکل سے ایک کونے میں ملا اور یہ دھات کا ثابت ہوا۔ میں نے پستول نکالا اور اس کی ضرب سے پائپ توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں باہر ایک بار پھر فائرنگ کا سلسلہ تیز ہو گیا جو پہلے سست پڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سننے سماع ہال میں مرشد کے تازہ دم دستے پہنچ گئے تھے۔ پستول کے دستے کی لگاتار ضربوں کے آگے دھاتی پائپ نے بالآخر شکست تسلیم کر لی اور وہ ٹوٹ گیا مگر اس سے پیٹرول نہیں نکلا تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ لائن ٹینک سے آ رہی تھی۔ میں نے اپنے پاس موجود چھوٹی ٹارچ سے لائن کے اوپری حصے میں روشنی ڈالی تو مجھے ایک چھوٹا سا والا نظر آیا۔

اسے گھماتے ہی تیل کی پتلی سی دھار تیزی سے بہنے لگی تھی۔ فی الحال یہ پیٹرول جزیرہ کے اندر کہیں گر رہا تھا مگر جلد یہ بہتے ہوئے باہر بھی آتا۔ اب مجھے یہاں سے نکلنا تھا اور دروازے سے نکلنا آسان نہیں تھا مجھے یقین تھا وہاں کئی ہتھیار صرف میرے انتظار میں مرکوز ہوں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے رسک بہت زیادہ تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا ایک طرف لوہے کی بھاری راڈ رکھی تھی۔ جو اصل میں جزیرہ کو اکٹھا کرنے والے جیک کا لیور تھی۔ اسے اٹھا کر تولا اور پھر ایک طرف جالیوں پر مارا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور جالی کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ میں نے فوری اس حصے پر طبع آزمائی شروع کر دی جہاں سے یہ کمراسماع ہال کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ سے محفوظ تھا۔ بھاری راڈ اور میری قوت کے آگے سینٹ سے بنی ہوئی جالیاں بکھرنے لگیں اور مشکل سے دو منٹ میں اتنا بڑا سوراخ کر لیا جس سے میں باہر جاسکتا تھا لیکن باہر جانے سے پہلے میں نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔

”میں باہر آ رہا ہوں مجھے کور دو۔“

”آ جاؤ استاد۔“ ان میں سے ایک بولا۔ میں باہر نکلا اور پھر پلٹ کر فرش پر پھیلتے پیٹرول پر پستول سے فائر کیا۔ گولی کی حدت نے پیٹرول کو آگ دکھادی اور میں بھاگا۔ کرائی کا باڑ کے دوسری طرف چلا گیا لگائی اور جیسے ہی زمین پر گرا جزیرہ میں دھماکہ ہوا۔ کمرے نے دھماکے کی شدت کو کم کیا تھا مگر پھر بھی اس کے اثرات طبع کے ٹکڑوں کی صورت میں باہر تک آئے تھے۔ اب کمرے میں آگ بجڑک رہی تھی۔ جزیرہ ناکارہ ہو گیا تھا۔ نئے سماع ہال کی جانب سے فائرنگ میں شدت آئی تھی مگر ایک منٹ بعد اچانک ہی درگاہ کی ساری روشنیاں غائب ہو گئیں۔ فاضلی کے باہر موجود آدمیوں نے کام شروع کر دیا تھا انہوں نے بجلی کا ڈی تھی۔ ہم تینوں اب واپس درگاہ کے مرکزی دروازے کی طرف رینگ رہے تھے۔ تاریکی میں گولیوں کے شعلے تیر رہے تھے۔ ان میں سے

بعض ہمارے سروں کے اوپر سے بھی گزرتے تھے۔ ایسا ہی ایک شعلہ مجھ سے آگے جاتے آدمی کے سر میں آکر بجھ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ درگاہ کا دروازہ ابھی کوئی بیس گز دور تھا۔ اپنے ساتھی کو مرتے دیکھ کر دوسرا خوفزدہ ہو گیا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ ایک دم اٹھ کر بھاگا تھا۔

”اے رک جاؤ۔“ میں نے کہا لیکن اس سے پہلے ہی ایک برست آکر اس کی ٹانگوں کو چھلنی کر گیا۔ وہ نیچے گر اور چیخنے، دھاڑنے لگا۔ نئے سماع ہال کی جانب سے توقع سے زیادہ مزاحمت ہو رہی تھی۔ میرے ساتھ آنے والے تینوں افراد اس طرف سے فائرنگ کا نشانہ بن چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ مشکل سے ایک فٹ اونچی یہ منڈیر مجھے کب تک بچائے گی جب کہ فائرنگ خاصی بلندی سے بھی کی جا رہی تھی۔ چند گولیاں میری طرف آئیں تو مجھے منڈیر کے ساتھ دبکنا پڑا تھا۔ میری طرف سے فائرنگ کا مطلب ہوتا کہ میں خود دشمن کو اپنی لوکیشن سے آگاہ کر دیتا۔ میں اسی طرح خاموشی سے چھپ کر آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس دوران میں آس پاس اکا دکا روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ ایمر جنسی لائٹس تھیں یا پھر کچھ جگہوں پر یو پی ایس لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ٹارچ کی روشنی بھی لہرائی تھی مگر مشکل سے چند سینکڑ کے لیے، کیونکہ کوئی ٹارچ روشن کر کے موت کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا۔



نئے سماع ہال کی جانب سے درگاہ کے دروازے پر فائرنگ کا زور تھا پھر اندر سے بھی جوابی فائرنگ جاری تھی اور ایسے میں دروازے سے گزرنے کا مطلب دنیا سے بھی گزرتا ہو سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب پیچھے کی طرف کھسکوں ورنہ آگے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ پیچھے کھسکتا تو اس چار دیواری کی طرف جاتا جس کے پار مرشد کی رہائش گاہ تھی۔ پتا نہیں فاضلی اپنے گرگوں کے ساتھ کہاں تھا۔ اگرچہ اس طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں مگر وہ بہت زیادہ نہیں تھیں۔ زیادہ زور درگاہ اور نئے سماع ہال کے درمیان فائرنگ کا تھا۔ عقیقی سمت بھی فاضلی کے ساتھ آنے والے صاف کر چکے تھے کیونکہ اس سمت سے فائرنگ کی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ اچانک شوں کی تیز آواز آئی اور نئے سماع ہال کے اوپر سے ایک شعلہ لپکا اور ماحول ایک دم روشن ہو گیا۔ میں جو منڈیر سے ذرا اوپر تھا اور یقیناً دشمن کو نظر آ سکتا تھا تیزی سے دوبارہ منڈیر تلے دبک گیا۔

”لغت ہو۔“ میرے منہ سے لکھا کسی نے یہ روشنی کا گرینیڈ فائر کیا تھا جو بہت تیز سرخ روشنی دے رہا تھا اور اس نے باغ کودن کی طرح روشن کر دیا تھا۔ فوراً سماع ہال کی طرف سے گولیوں کی بو پھاڑ آئی اور منڈیر کو ادھیڑ نے لگی جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ گولیاں تقریباً چھو کر جا رہی تھیں۔ پتا نہیں میں کیسے بچا ہوا تھا؟ پھر دوسرا گرینیڈ گولی کی طرف سے فائر ہوا اور اس طرف کا حصہ بھی روشن ہو گیا۔ مرشد اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا حالانکہ ہم اس کی سپاہ کا بڑا حصہ موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ مگر اس کے پاس شاید ہمارے اندازے سے زیادہ افراد تھے۔ فاضلی بے خبر تھا کہ اس کے پاس یہ فوجی استعمال کے روشنی والے گرینیڈ بھی تھے۔ یہ کئی منٹ تک مسلسل بہت تیز روشنی دے سکتے تھے۔ پانچ منٹ بعد اس کی روشنی ہلکی پڑنے لگی۔ تو میں تیزی سے واپس جزیرہ روم کی طرف گیا میں اس کی آڑ لے لیتا تو سماع ہال کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ سے خاصی حد تک محفوظ ہو جاتا۔

ملنگ اور اس کے ساتھی درگاہ کی عمارت میں تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ سماع ہال والوں کو وہیں تک محدود رکھیں اور انہیں کوفھی کی طرف نہ جانے دیں۔ انہیں میری قطعی پروا نہیں تھی کہ میں دونوں طرف کی فائرنگ کے بیچ میں پھنسا ہوا تھا اور کسی لمحے ایک گولی میری زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میں سرکنے میں مصروف تھا کہ اگلا گرینینڈ فضا میں بلند ہوا اور اس بار یہ درگاہ والی عمارت کے عین اوپر تھا اس لیے پوری عمارت اور آس پاس کی جگہ روشنی میں نہا گئی تھی۔ اس بار بھی میری پوزیشن دیکھ لی گئی اور سننے سے گولیوں نے میرا رخ کیا تھا۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے اگر میں ذرا بھی بے صبری کا مظاہرہ کرتا تو ملنگ کے ساتھیوں کی طرح مارا جاتا۔ میری بچت دیکر رہنے میں تھی۔ پھر کسی نے اوپر سے دستی بم اچھالا اور وہ مجھ سے کچھ دور رکھا تھا۔ میں نے بروقت اسے گرتے دیکھ لیا اور منڈیر کے ساتھ چپک کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ بم زیادہ دور نہیں تھا وہ منڈیر بھی اڑا سکتا تھا مگر میرے پاس بچنے کا موقع ہی نہیں تھا دھماکے نے جیسے مجھے منجموڑ کر رکھ دیا اور شاک و پوز مجھے دھکیل کر روش میں کھلی جگہ لے آئی تھیں۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھ لیے تھے اس لیے سرفیگ گیا تھا مگر دونوں ہاتھوں پر اڑتے سنگریزوں نے زخم ڈال دیئے تھے۔ منڈیر کا اوپری حصہ ادھڑا تھا اسی لیے میں ادھڑنے سے بچ گیا تھا۔ مگر اب موت سامنے تھی۔ میں سماع ہال میں موجود افراد کے لیے کھانا نشانہ تھا۔ اٹھ کر بھاگنے کا فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ کہیں پناہ نہیں تھی۔

دو گولیاں آکر میرے سینے پر لگیں اور میں دھچکے سے پیچھے گیا۔ ایک لمحے کو میرا سانس رک گیا تھا اور درد کی لہر نے مجھے تڑپا دیا تھا۔ مگر بلٹ پروف نے میری جان بچا لی تھی۔ میں بے تابی سے اپنی گر جانے والی رائفل تلاش کر رہا تھا۔ جب کہ اس دوران میں میرے آس پاس گولیاں برس رہی تھیں۔ رائفل نہ جانے کہاں چلی گئی تھی؟ سماع ہال کی طرف سے کم و بیش درجن بھر خود کار ہتھیار حرکت میں تھے۔ ان میں سے کم سے کم دو تین میری طرف مرکوز تھے۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر لمبے کے ٹکڑوں سے پاؤں پھسلا اور میں بے ڈھنگے پن سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ مگر اس ڈھیر ہونے نے ایک بار پھر میری جان بچا لی کیونکہ اگلا برسٹ میرے سر کے اوپر سے گزر کر دیوار پر لگا تھا اگر میں کھڑا ہوتا تو اس کا نشانہ بن گیا ہوتا۔ جب قدرت میری حفاظت کر رہی تھی تو اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہی ہوتی۔

اس بار میں نے بھاگنے کی کوشش کے بجائے خود کو رول کیا اور قلابازیاں کھاتا ہوا جزیئر کے چلتے کمرے کی طرف آیا۔ آخر کے چار پانچ گز میں نے کیسے طے کیے مجھے خود سمجھ میں نہیں آیا۔ میں دھچکے سے کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور فوراً ہی دوسرا دستی بم آکر کمرے کے دوسری طرف گرا تھا۔ دھماکے نے میرے ہوش کے ساتھ کمرے کا ایک حصہ بھی اڑا دیا تھا۔ میرے حواس ٹھکانے آئے تو میں فاضلی کو مغلظات سنارہا تھا۔ وہ خبیث آدمی مجھے اس مشکل میں پھنسا کر خود نہ جانے کہاں غائب تھا؟ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نہ جانے کب سے یہاں پھنسا ہوا تھا؟ میرے چاروں طرف آگ و خون کا یہ کھیل نہ جانے کب سے کھیلا جا رہا تھا؟ مگر جب آڑ میں آنے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو ابھی صرف ایک بج رہا تھا مجھے باہر آئے ہوئے بیس منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں گزرا تھا۔ رائفل گر جانے کے بعد اب میرے پاس صرف ایک پستول تھا میں نے اسے نکال کر چیک کیا اور پھر اپنا جائزہ لیا کہ کہاں کہاں زخم تھے؟

میرے بازو معمولی زخمی تھے ایک زخم سر کے اوپری حصے میں آیا تھا اور کچھ خون نکلا تھا باقی جسم صحیح سلامت

تھا۔ بلٹ پروف پر لگنے والی گولیاں جیسے چپک گئی تھیں اور یہ پستول کا فائر تھا اس لیے میری پسلیوں کی بچت ہو گئی اگر رائفل کی گولی ہوتی تو اس کا زور پستول کی توڑ سکتا تھا۔ اپنی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے یہاں سے نکلنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ جزیرہ روم اور درگاہ کی عمارت کے درمیان تقریباً میں گز کا فاصلہ تھا اور یہ جگہ عمارت کے کونے سے کوئی چالیس گز کے فاصلے پر تھے۔ عمارت کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں کونے کی طرف جاتا تو مجھے با آسانی سامع ہال کی طرف سے نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ اب ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں اسی جگہ دبک کر انتظار کرتا کہ دشمنی کے آدمی سامع ہال کی محاسنت کا خاتمہ کر دیں۔ مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے یا نہیں۔ پھر مجھے بڑا خطرہ اب دستی بم سے تھا۔ میں گولیوں سے آڑ میں تھا مگر یہاں میرے سامنے کوئی دستی بم آکر گرے گا تو اس سے بچنے کے لیے کوئی آڑ نہیں تھی۔

ایسا لگا کہ سامع ہال میں بیٹھا ہوا کوئی شخص میری طرح سوچ رہا تھا اور اس نے دستی بم استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری بے خبری میں ایک دستی بم آکر جزیرہ روم کی چلتی چھت پر گر کر اور دھماکے کے ساتھ چھت بھی بیٹھ گئی۔ مجھ پر بلے کی بارش ہوئی تھی لیکن میں دھماکے کے براہ راست اثرات سے محفوظ رہا تھا۔ جب بلے گرنا رکنا تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا اس کی بلندی جو پہلے بارہ فٹ تھی یک دم کم ہو کر سات آٹھ فٹ رہ گئی تھی اور یہ بھی دیواروں کی بلندی تھی کیونکہ چھت تو گر چکی تھی۔ چھت گرنے سے آگ بجھ گئی تھی اور اب اندر سے گاڑھا دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے چلا کر ملک کو آواز دی۔ ”کہاں مر گئے ہو..... تم لوگوں سے یہ چند آدمی نہیں منٹ رہے؟“

مگر ملک کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اس نے اگر سنا تو جواب دینا ضروری نہیں سمجھا وہ اس سے زیادہ ضروری کام کر رہا تھا یعنی سامع ہال میں موجود افراد کا مقابلہ اور ان کو گولی کی طرف جانے سے روکنے کا کام۔ دونوں طرف کے لوگ تقریباً محفوظ تھے بس میں درمیان میں پھنسا ہوا تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال آیا ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اس وقت میں کیسی صورت حال سے دوچار تھا۔ میرے چاروں طرف آگ و آہن کی بارش جاری تھی اور یہ سب میں ان کی خاطر برداشت کر رہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں چند لمحوں کے لیے غافل ہوا تھا اور اگلے دستی بم کو ذرا تاخیر سے دیکھا وہ جزیرہ روم کے ساتھ گرا اور لڑھکتا ہوا اس طرف آنکلا جہاں میں موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں حرکت میں آیا اور بہت تیزی سے سرک کر جزیرہ روم کے عقبی سمت گیا تھا کہ دھماکا ہوا اور میں بال بال بچا۔ فوراً ہی مجھے واپس آنا پڑا تھا کیونکہ اس طرف میں سامع ہال سے کی جانے والی فائرنگ کی زد میں تھا اور کچھ فائر زخمی ہوئے تھے مگر وہ جلّت میں بنا نشانہ لیے کیے گئے تھے۔

جہاں دستی بم گرنا تھا وہاں اب گڑھا پڑا ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے کی مختصر جنگ نے اس خوب صورت باغ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا جسے بنانے میں برسوں لگے تھے۔ جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے چند درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے اور پودے اور باڑیں تباہ ہو گئی تھیں۔ دونوں طرف کی عمارتوں کی خوب صورتی کا الگ ستیاناس ہو گیا تھا خاص طور سے درگاہ کی عمارت کا مشر ہو گیا تھا۔ میں اب ملک اور اس کے ساتھیوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا جو دستی بم ارسال کرنے والے کو کچھ نہیں کہہ رہے تھے اور وہ پوری آزادی سے مجھ پر دستی بم پھینک رہا تھا۔ ایک دوبار تو مجھ میں آتا لیکن اس کے بعد اسے تاک کر نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود ملک اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اب میں پوری طرح چونکنا تھا اگلا بم کسی طرف سے بھی آسکتا تھا۔ ایسے میں

تقدیر کے بعد صرف میری پھرتی ہی مجھے بچا سکتی تھی۔

جزیرہ روم سے سامع ہال کی عمارت تقریباً تیس گز کے فاصلے پر تھی میں نے اس کے دائیں طرف سے ایک لمبے کوچمانک کر دیکھا اور مجھے دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں رائفل بردار شخص کا ہیولہ دکھائی دیا۔ وہ درگاہ کی عمارت پر گولیاں برسا رہا تھا میں نے اچانک آڑ سے نکل کر اس پر پستول سے فائر کیا۔ میں نے تین گولیاں چلائیں اور واپس آڑ میں آگیا لیکن اس دوران میں وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گیا تھا اور اس کی رائفل خاموش ہو گئی۔ اب پتا نہیں اسے گولی لگی تھی یا وہ بچنے کے لیے پیچھے گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کی طرف سے فائرنگ نہیں ہوئی۔ اس طرف سے بس وہی فائرنگ کر رہا تھا باقی سب یا تو سارے ہال کی وسطی کھڑکیوں سے فائرنگ کر رہے تھے یا پھر وہ بائیں طرف کوئی نہ تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ میری بولی کا نشانہ بن گیا ہے اور اب یہاں کوئی نہیں ہے تو میرے پاس ایک موقع تھا میں درگاہ کی عمارت کے کونے تک جاسکتا تھا اس کے بعد میں سارے ہال کی طرف سے محفوظ ہو جاتا۔ مگر یہ ایک مفروضہ بھی ہو سکتا تھا عین ممکن تھا کہ مرشد کا مزید کوئی آدمی یہاں موجود ہوتا تو اس صورت میں وہ مجھے آرام سے شوٹ کر سکتا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس طرف کوئی تھا یا نہیں میں نے ایک سر کے سائز کا اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اسے دیوار کی اوٹ سے باہر کیا اور فوراً ایک گولی آکر اس پر گئی۔ میرا تھوچ گیا تھا مگر دھچکے سے اینٹ گر گئی۔ اس طرف کوئی تھا اور وہ بڑی چالاکی سے خود کو چھپا لے ہوئے تھا۔

دوسرا گرینیڈ بھی اب بھجنے کے قریب تھا۔ یہ پیراشوٹ سے ہوا میں معلق ہو جاتا تھا اور شعلے کی گرمانش اسے نیچے آنے سے روکتی تھی۔ جیسے گرم ہوا کے ہمارے میں بھری ہوا اسے نیچے آنے سے روکتی ہے۔ اگر یہ مجھ جاتا اور اس کے بعد مزید کوئی گرینیڈ فائر نہ کیا جاتا تو امکان تھا کہ میں بچ کر درگاہ کی عمارت کے پہلو تک پہنچ سکوں۔ مگر میری یہ آرزو دل میں ہی رہ گئی اس بار سامع ہال کی چھت سے دو گرینیڈ فائر کیے گئے اور ان کی مشترکہ روشنی نے اس جگہ کو بے نور بنا دیا تھا۔ پتا نہیں ان کے پاس کتنے گرینیڈ تھے لیکن اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ اب کوئی دہشتی ہم آتا تو میں اسے دیکھ سکتا تھا اگر روشنی نہ ہوتی تو دہشتی ہم چپکے سے میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ مسلسل فائرنگ نے جزیرہ روم کی اوپری جالی دار دیواروں کو بھی توڑ کر چھوٹا کر دیا تھا اور اب صرف تین فٹ کی موٹی کنکریٹ کی دیوار ہی مجھے تحفظ دے رہی تھی۔ چھت گر جانے سے ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کوئی دہشتی ہم اندر گرے تو وہ یہ دیوار بھی گرا دے گا۔ اگرچہ اس دیوار تلے دب کر میرا مرنے کا امکان کم تھا مگر یہ مجھے شدید زخمی یا ناکارہ کر سکتی تھی۔

زندگی میں بہت کم ایسی چوہین آئی تھیں جب میں اتنی بری طرح پھنسا تھا اور نکلنے کی کوئی راہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک طرف سے دشمن گولیاں برسا رہے تھے اور دوسری طرف وہ دہشتی ہم بھی استعمال کر رہے تھے۔ مجھے اصل خطرہ دہشتی بموں سے ہی تھا ورنہ گولیوں سے بچنا اتنا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ بات دشمن بھی سمجھ رہا تھا اس لیے اس نے اس بار چالاکی سے کام لیا اور پہلے اس نے جزیرہ روم کے بائیں طرف باغ والے حصے میں ایک دہشتی پھینکا اور وہ لڑھکتا ہوا مجھ سے کوئی دس گز دور آکر کھڑا تھا۔ میں کمرے کے دوسری طرف بھی نہیں جاسکتا تھا جہاں سامع ہال کا نشانہ باز تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے میں منطقی طور پر جان ہتھیلی پر رکھ کر روش کی طرف لپکا اور

ہملا جگہ لگا کر منڈیر کے دوسری طرف گرا اور اسی لمحے دھماکہ ہوا۔ ایک بار پھر لمبے کی برسات ہوئی مگر میں ہم کی برسات سے محفوظ رہا تھا۔ ابھی لمبے کی برسات تھی نہیں تھی کہ دوسرا دتی بم مجھ سے ذرا آگے روش کے ساتھ کیاری میں گرا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے میں اٹھنے والی تیز میس نے مجھے گرا دیا۔ گرتے ہوئے اس پر چوٹ آئی تھی۔ اس چوٹ نے مجھے معذور کر دیا تھا اور اب بم سے بچنے کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ کلر شریف پڑھا۔ پھر ایک عظیم الجثہ سایہ نمودار ہوا اور ایک دھماکہ ہوا تھا۔



دھماکے سے ذرا پہلے آنے والا عظیم الجثہ سایہ مجھ پر چھایا ہوا تھا اور اسی وجہ سے میں بچ گیا تھا۔ دھماکے کے بعد اس کی دہی ہوئی غراہٹ سنائی دی تو مجھے اندازہ ہوا وہ باسو ہے۔ وہ بروقت آیا اور میرے اور دتی بم کے درمیان میں حائل ہو گیا۔ اس نے زرہ بکتر نما لباس پہنا ہوا تھا جس نے اسے ہم کی تباہ کاری سے محفوظ رکھا لیکن وہ کچھ نہ کچھ زخمی ضرور ہوا تھا یہ بات اس کی غراہٹ سے بھی ظاہر تھی۔ غراہٹ میں اذیت کا عنصر شامل تھا۔ بم دھماکے کے بعد وہ سماع ہال کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ سے ڈھال بن گیا تھا۔ گولیاں اس پر برس رہی تھیں اور اچھی سی دتی تھیں۔ زندہ بچ جانے کے یقین کے ساتھ ہی میں حرکت میں آ گیا تھا اور اپنی رائفل تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر وہ کیاری میں مل گئی۔ مگر کیاری اب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں رہی تھی۔ دتی بموں کی برسات نے اس کا حشر کر دیا تھا۔ صرف کیاری ہی نہیں وہاں ہر چیز کا حشر ہو گیا تھا۔

جیسے ہی میں باسو کی آڑ میں کھڑا ہوا اس نے گھوم کر سماع ہال کی طرف اپنی خوفناک ساخت کی اور بچ جانے کا پناہ خط سرائیک مشین گن سے گولیاں برساتنا شروع کر دیں۔ اب تک دونوں جانب سے عام قسم کے خود کار ہتھیاروں اور مشین گنوں سے گولیوں کا تبادلہ ہو رہا تھا مگر اب اس جنگ میں باسو کی مشین گن شامل ہو گئی تھی اور اپنی خوفناک قسم تھی کہ اس کی گولیاں کنکریٹ کی موٹی دیواروں کو پار کر کے ان کے عقب میں موجود دشمنوں کو نشانہ بناتی تھیں۔ اس کا شور ایسا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر مجھے سماع ہال کی طرف سے فائرنگ میں فوری کمی سے اندازہ ہو گیا کہ دشمن اس نئے ہتھیار کی تاب نہ لا کر یا تو ہسپا ہو گئے تھے یا پھر مارے گئے تھے۔ باسو نہایت مہارت سے ان کھڑکیوں پر گولیاں برساتا تھا جہاں سے فائرنگ کی جارہی تھی۔ یہ اسی کی طاقت تھی جو اتنا بھاری اور تیز جھکے والا ہتھیار یوں استعمال کر رہا تھا ایسا صرف قلموں میں دیکھا تھا مگر قلموں میں باڈی بلڈر ہیر بھی پلاؤ سکتے تھے بنے ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ باسو اصلی مشین گن چلا رہا تھا۔ اس نے چند برست میں ہی سماع ہال واپس لوٹنے کو خاموش کر دیا تھا۔ جیسے ہی مشین گن رکی میں نے باسو سے کہا۔

”تم لوگ کہاں تھے، فاضلی کہاں ہے؟“

اس نے خاموشی سے ہاتھ اٹھا کر کوشی کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ..... پہلے ان لوگوں کا خاتمہ کرنا ہے۔“ اس کا اشارہ سماع ہال کی طرف تھا۔

”وہاں کون ہے؟“

”میں نہیں جانتا فاضلی نے ان سب کو ختم کرنے کا حکم دیا ہے۔“ باسو نے پہلی بار باقاعدہ گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ ورنہ اب تک میں اسے صرف غراتے یا چند الفاظ میں بات کرتے سنا تھا۔ ”میری آڑ میں رہنا ابھی

خطرہ ہے۔“

وہ سماع ہال کی طرف گھوما۔ بجلی بند ہونے اور جزیرہ چاہ ہونے کے باوجود وہاں کہیں کہیں برقی روشنی نظر آرہی تھی۔ یقیناً ان جگہوں پر یو پی ایس کام کر رہے تھے۔ اس جگہ روشنی کی کمی جزیرہ روم میں بھڑکتی اور جا بجا لگی آگ پوری کر رہی تھی۔ باسو مڑا تو میں نے اس کے بائیں بازو سے خون بہتے دیکھا اسے دتی بم کا کوئی ٹکڑا لگا تھا۔ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”تمہارے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔“

”چلو۔“ وہ غرایا اور سماع ہال کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے مشین گن آگے کر رکھی تھی اور میں اس کی آڑ میں تھا۔ درگاہ کی طرف سے فائرنگ تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ مگر اکا دکا فائر ہو رہے تھے۔ ملنگ اور اس کے ساتھیوں نے باسو کو دیکھ لیا تھا اس لیے انہوں نے نیچے کی جانے والی فائرنگ روک دی تھی اور اب صرف سماع ہال کی اوپری سمت گولیاں چلا رہے تھے۔ لمبے اور حشر نثر لان سے گزرتے ہوئے ہم سماع ہال کی عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک سامنے سے ایک برسٹ چلا اور گولیاں آکر باسو سے ٹکرائیں مگر اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا البتہ جب اس نے جوابی کارروائی کی تو جس کھڑکی سے برسٹ چلا تھا وہ مع چوکھٹ کے اکھڑ کر اندر جا گری۔ مرنے والوں کی چیخیں باہر تک سنائی دی تھیں۔

باسو جو پہلے دروازے کی طرف جا رہا تھا اس نے رخ بدلا اور اس کھڑکی کی طرف بڑھا۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے میں غیر محفوظ ہوتا جا رہا تھا کیونکہ دائیں بائیں کے ساتھ اوپر کی طرف سے بھی میں نشانے کی زد میں آ رہا تھا۔ اگر کوئی گولی چلاتا تو میں اب باسو کی آڑ میں زیادہ محفوظ نہیں رہا تھا۔ مگر باسو کی دہشت نے کام دکھایا تھا اور ان تمام جگہوں سے فائرنگ کرنے والے پیچھے ہٹ گئے تھے اور جواب تک نہیں بٹے تھے انہوں نے ان مرنے والوں سے سبق حاصل کیا تھا جو باسو کا نشانہ بنے تھے۔ کسی طرف سے فائر نہیں ہوا اور ہم آرام سے سماع ہال تک پہنچ گئے۔ عمارت کے نزدیک آتے ہی میں دیوار سے چپک گیا اور باسو نے اندر جھانکا اور مجھ سے کہا۔ ”اندر جاؤ۔“

بھاری مشین گن کے برسٹ نے صرف مرنے والوں کا ہی نہیں بلکہ کمرے کا بھی حشر کر دیا تھا۔ یہاں دو افراد اپنے ہی خون میں غلٹاں پڑے تھے یہاں روشنی نہیں تھی مگر باہر سے آتی روشنی کے انعکاس میں سب نظر آ رہا تھا۔ میں چوکھٹ پر چڑھ کر اندر کودا۔ کمر مختصر سا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ آرام کے لیے مخصوص تھا کیونکہ فرش پر سوائے دیپر قالین کے اس کمرے میں اور کچھ نہیں تھا۔ فاضلی نے تاخیر سے سہی لیکن باسو کو یہاں بھیج دیا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوشی کی طرف فیصلہ کن پیش قدمی سے قتل ہر طرح کی مزاحمت ختم کرنا چاہ رہا تھا۔ اسی لیے باسو کو یہاں موجود افراد کو ختم کرنے کا ٹاسک دے رہا تھا۔ میرے پیچھے باسو بھی اندر آ گیا۔ اپنی بھاری جسامت اور زخموں سے قطع نظر اسے چوکھٹ پھلانگنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ با آسانی اندر آ گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اندر یقیناً اور لوگ ہوں گے۔ مگر اس تاریکی میں ہم خود ان کا شکار بن جائیں گے۔“

جواب میں باسو نے اپنے لباس سے ایک عدد نائٹ ویژن عینک جو سوئمنگ کرنے والی عینک کی طرح تھی نکال کر مجھے تھمادی۔ اسے غالباً ضرورت نہیں تھی اس کے ہیملٹ کا شیشہ نائٹ ویژن کا کام کر رہا تھا۔ میں نے نائٹ ویژن لگائی اور یک دم ماحول روشن نظر آنے لگا۔ یہاں بھی باسو آگے تھا جیسے ہی اس نے کمرے کے

دروازے کو ہاتھ لگایا باہر سے برست چلا اور گولیاں دروازے کو چھلی کرتی ہوئی آکر باسو کو گئی تھیں وہ ایک بار پھر غرایا۔ ایک گولی اس کی دائیں ران چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی اور اب یہاں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ مگر جب باسو نے اپنے زخم کی طرف توجہ نہیں دی تو مجھے بھی فکر نہیں ہوئی۔ وہ بہت جاندار تھا اور اس قسم کے زخم آسانی سے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے خستہ ہو جانے والے دروازے کو ٹکڑی ماری اور باہر نکل کر مشین گن کا فائر کھول دیا۔ میں نے اندھا دھند اس کے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

میں دیوار سے لگ کر انتظار کرنے لگا اور جب مشین گن کا شور چھا تو میں باہر نکل آیا۔ یہ مرکزی سماع ہال تھا۔ کم سے کم بیس گز طویل اور بارہ گز چوڑا تھا۔ اس کی چھت بھی کم سے کم پچیس فٹ اونچی تھی جس پر قطاروں میں کوئی درجن بھر فانوس لگے تھے۔ وہاں چٹکے نہیں تھے بلکہ دیواروں پر بڑے سائز کے اسپلٹ لگے ہوئے تھے۔ فرش پر پچھی چاندنی اس وقت خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ وہاں چار افراد کی لاشیں موجود تھیں۔ باسو کی مشین گن کے شکار کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ باسو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اس کی ران کے زخم سے خون روانی سے بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر ساکت رہنے کے بعد اس نے اپنی زرہ کے کسی خانے سے ایک انجکشن کا سیٹ نکالا اور اس میں سے ایک انجکشن الگ کر کے اپنی ران پر اس کی سوئی رکھ کر بن دبا یا تو گیس کے پریشر سے اس میں پہلے سے موجود دوا باسو کے جسم میں داخل ہو گئی۔ اس نے خالی انجکشن پھینک کر باقی سیٹ واپس رکھ لیا۔ اس میں مزید چار انجکشن تھے۔

ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ باسو کے زخموں سے خون بہنا بند ہو گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شاید خون روکنے والے انجکشن تھے۔ میں نے ان کے بارے میں سنا تھا کہ یہ عاذ جنگ میں اگلے مورچوں پر لڑنے والے فوجیوں کو مہیا کیے جاتے تھے اور عام حالات میں ان کا استعمال ممنوع تھا کیونکہ ان کے سائیڈ ایفیکٹس بھی خاصے ہوتے ہیں۔ یہاں حالات جنگ والے تھے اس لیے باسو کا یہ انجکشن استعمال کرنا جائز تھا۔ اس دوران میں، میں سماع ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ سامنے ایک دروازہ تھا اور اس کے دائیں بائیں قطاروں میں کھڑکیاں تھیں۔ دوسری طرف اسی طرح چھوٹے چھوٹے کمروں کی قطار تھی۔ میں نے باری باری سارے کمرے چیک کیے مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر عمارت میں مزاحمت کرنے والے موجود تھے اس کا اندازہ رہ رہ کر ہونے والی فائرنگ سے ہو رہا تھا۔

میں حیران تھا کہ مرشد نے کس قدر مسلح فورس جمع کر رکھی تھی۔ اس کے کم سے کم چالیس آدمی مارے گئے تھے اور اب بھی مزاحمت کرنے والے موجود تھے۔ اس کی کوشی میں موجود گارڈز کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان دنوں وہ اپنی حفاظت کے لیے خاص طور سے فکر مند تھا اور حالات نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی فکر مندی غلط نہیں تھی۔ میں ہال کے دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ باسو نے مجھے روک دیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے دروازے کے بجائے ایک کھڑکی کو ٹکڑی مار کر توڑ دیا۔ یہ فرائیڈ اور آرائی کھڑکیاں تھیں جو فکس ہوتی ہیں۔ لکڑی کی جالیوں کے درمیان رتیلے نقش شیشے لگے ہوئے تھے۔ کسی عقیدت مند بڑھی نے بہت محنت سے یہ شاہکار کھڑکیاں بنائی تھیں۔

کھڑکی توڑ کر باسو دوسری طرف گیا اور پھر اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ چھوٹی سی گیلری تھی اور باہر

آتے ہی میں باسو کی عقل مندی کا قائل ہو گیا کیونکہ دروازے پر باہر کی جانب بولبی ٹریپ لگا ہوا تھا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے والا فوری طور پر دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ یہ جدید قسم کا بم تھا جو دروازے کے دونوں پٹوں پر چپک گیا تھا اور جب دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاتی تو اس کا میکینزم حرکت میں آ جاتا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سامع ہال میں موجود افراد نہ صرف بہت تربیت یافتہ تھے بلکہ وہ جدید قسم کے ہتھیار استعمال کرنے کے ماہر تھے۔ انہوں نے روشنی کے گرینینڈ اور ہینڈ گرینینڈ نہایت مہارت سے استعمال کیے تھے اور اب یہ بولبی ٹریپ تھا۔ گیلری دائیں بائیں عمارت کی پوری لمبائی کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر قطاروں میں ویسی ہی کھڑکیاں تھیں اور یہ حصہ درگاہ کے داخلی صحن کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے باسو سے دریافت کیا۔

”اب کس طرف جاتا ہے؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”تم بتاؤ۔“

گویا اسے ٹینک کے طور پر بھیجا گیا تھا اور اس ٹینک کی کمان اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے سوچا اور باسو کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک سمت بڑھا۔ یہ خاصی چھیدہ سی عمارت تھی اور میں اس کا نقشہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے وسط میں سامع ہال تھا اس کے دائیں بائیں دوسرے حصے تھے۔ ہال دومنزلہ اونچا تھا مگر دوسرے حصے اتنے اونچے نہیں ہوں گے۔ مجموعی طور پر سامع ہال کی عمارت تین منزلہ تھی۔ اس کا اندازہ مجھے کھڑکیوں سے ہوا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا صرف دو افراد اس عمارت کو کلیئر کر سکتے تھے؟ جہاں اب تک سب سے زیادہ محاذات سے واسطہ پڑا تھا۔ درجن سے اوپر افراد مارے گئے تھے مگر اب بھی وہاں بہت سے مسلح لوگ موجود تھے۔ سامع ہال کے آخری حصے میں گھومتے ہی ایک کشادہ کھلا لاؤنج ملا۔ یہ عمارت کے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے مل رہا تھا مگر یہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور نہ ہی کھڑکیاں تھیں۔ سامنے قطار میں تین کمرے تھے۔

جیسے ہی میں لاؤنج کے سامنے آیا ایک دروازے کی طرف سے ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا۔ اس طرف سے فائر ہوا تھا مگر میں اس سے پہلے ہی دیوار کی آڑ لے چکا تھا۔ میں نے جوابی فائر کیا اور دروازے کے عقب سے ایک گٹھی ہوئی چیچ سنائی دی اور پھر دھپ سے گرنے کی آواز آئی۔ مگر میں آگے نہیں گیا۔ مجھے لگا کہ آواز میں ہناوٹ تھی اور دھپ کی آواز ایسی تھی جیسے کسی نے دیوار پر ہاتھ مارا ہو۔ میں نے باسو کو سامنے آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے مشین گن اوپر کی تھی کہ میں نے اسے روک دیا۔ ”فائر نہیں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس شخص کو زندہ پکڑنا ہے۔“

اس نے سر ہلایا اور اطمینان سے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اداکاری کرنے والے نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا اور اس نے باسو پر فائرنگ کی مگر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ باسو کمرے میں داخل ہوا اور اس بار جو چیخ و پکار سنائی دی اس میں اداکاری کا عنصر شامل نہیں تھا۔ وہ یقیناً باسو کی گرفت میں آ گیا تھا اور برے حال سے گزر رہا تھا۔ باقی دو کمرے چپکے کر کے میں وہاں پہنچا تو باسو نے اسے اوندھے منہ زمین پر گر کر اس کی کمر پر پاؤں رکھا ہوا تھا اور اس کی جامہ تلاشی لے رہا تھا۔ اس سے پہلے اسے قابو کرنے کے لیے وہ اس کا بازو توڑ چکا تھا۔ باسو کے ہاتھی نما پاؤں تلے وہ کسمسا بھی نہیں بارہا تھا اور دبی آواز میں کراہ رہا تھا۔ اپنا کام کر کے باسو نے پاؤں ہٹا لیا اور

اسے سیدھا ہونے کا حکم دیا۔ مگر اس سے سیدھا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ غالباً باسو کے وزن سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بھی نقصان ہوا تھا۔ باسو نے اسے شوکر مار کر سیدھا کیا۔ وہ جوان آدمی تھا صورت سے بد معاش کے بجائے پڑھا لکھا اور مہذب شخص لگ رہا تھا مگر اس کی اصلیت ایک خود کار رائل کی صورت میں وہاں موجود تھی۔ میں نیچے جھکا۔

”تم میری آواز سن رہے ہو؟“

جواب میں اس نے ایک بار پھر مکاری سے کام لیا اور یوں پلکیں جھپکانے لگا جیسے اس کا دماغ کام نہیں کر رہا ہو۔ میں گہری سانس لے کر سیدھا ہوا اور باسو سے کہا۔ ”بیکار ہے اسے ختم کر دو۔“

وہ تڑپ کر بولا۔ ”میں..... سن رہا ہوں۔“

”اب آئے ہونا تم راہ راست پر۔“ میں نے جھک کر کہا اور باسو کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے تم بھگت چکے ہو اگر میں اسے اشارہ کر دوں تو یہ خالی ہاتھوں سے تمہاری ہڈیوں کا سرمہ کر دے گا اور تم سوچ سکتے ہو کہ تمہارا کیا حشر ہوگا۔“

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ وہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

”یہاں کتنے لوگ ہیں۔ میرا اشارہ اس عمارت کی طرف ہے؟“

”میں ٹھیک سے نہیں جانتا.....“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باسو نے اس کے ٹوٹے ہاتھ پر پاؤں رکھ دیا اور وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح بلبلایا۔ دباؤ چند لمحوں جاری رہا تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا اور میں نے اس کے منہ پر جوتا رکھ دیا۔ چند لمحوں بعد باسو نے پاؤں ہٹایا اور میں نے منہ سے جوتا ہٹا دیا۔ اس نے زار و قطار روتے ہوئے بتایا کہ یہاں اس کے دو درجن ساتھی تھے۔ کچھ اور مشکل مراحل سے گزر کر وہ مزید تعاون پر آمادہ ہوا اور اس نے انکشاف کیا کہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا تعلق ایک کالعدم دہشت گرد قراوردی جانے والی تنظیم سے تھا اور مرشد نے منہ مانگے داموں ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ سب تربیت یافتہ جنگجو تھے اور ان کے پاس فوجی نوعیت کا اسلحہ بھی تھا۔ یہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ یہ اسلحہ مہارت سے استعمال کر رہے تھے۔ ان دو درجن افراد کے علاوہ یہاں مرشد کے کوئی سات آٹھ ساتھی اور تھے۔ وہ سب بھی لڑنے مرنے والے تھے۔ گویا یہاں تیس سے زیادہ افراد تھے۔

مگر اب وہ تمیں نہیں تھے۔ کچھ تو پہلے ہی مارے جا چکے تھے یا زخمی تھے اور باسو کے ہاتھوں بھی کم سے کم چھ افراد مارے گئے تھے۔ فرض کر لیا جائے کہ دشمن کی نصف نفری صاف ہو گئی تھی تب بھی آدھے دشمن باقی تھے اور ہمیں ان سے مقابلہ کرنا تھا۔ اب پتا چلا کہ اس جگہ سے اتنی شدید مزاحمت کیوں ہو رہی تھی۔ اس نے خاصا ہولناک انکشاف کیا تھا۔ اب دہشت گرد کرائے کے گوریلوں کا کردار بھی ادا کرنے لگے تھے اور کوئی بھی منہ مانگے معاوضے پر ان کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ اس میں اپنے پرانے اور دوست دشمن کی تمیز نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر دہشت گرد کارروائیوں میں بھارتی ساختہ اسلحہ اور امریکی ساختہ آلات استعمال ہوتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ پیسے کے عوض خود کش حملہ آور بھی مل جاتے ہیں۔ اس کی حالت بہتر ہوئی تھی اور وہ کھڑا ہو سکتا تھا اس لیے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

”ار تم آگے رہو گے اور ہماری رہنمائی کرو گے۔“

”میرے ساتھی مجھے مار دیں گے۔“ اس نے مزاحمت کی۔

”دوسری صورت میں ہم مار دیں گے۔“ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ”تمہارے پاس

فیصلہ کرنے کے لیے صرف تین سیکنڈ ہیں، ایک..... دو.....“

تین کہنے سے پہلے ہی وہ مان گیا تھا۔ میں نے باہر جانے سے قبل اس سے مزید معلومات حاصل کیں۔ پتا چلا کہ سامع ہال کے دوسری طرف سروس ایریا تھا اور وہیں واش روم بھی تھے۔ دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے اور تیسری منزل بھی کمروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے اکثر رہائش کے لیے مخصوص تھے۔ سب سے زیادہ مزاحمت اسی منزل سے ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ حملہ ہونے کے بعد اس کے اکثر ساتھی اوپر چلے گئے تھے۔ اوپر جانے کا راستہ سروس ایریا سے تھا گویا ہمیں سامع ہال کے دوسری طرف جانا تھا۔ میں اور باسو اسے لے کر روانہ ہوئے۔ باسو گیلری سے گزرتے ہوئے ہمارے آگے ڈھال ہٹا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم سروس ایریا کے لاؤنج میں داخل ہوئے سیڑھیوں کی طرف سے فائر ہوئے اور گولیاں باسو کے زہرہ بکتر پر بے اثر لگیں۔ جواب میں اس کی بھیاں تک مشین گن نے حملہ آوروں پر قیامت ڈھادی۔ ان کو فوج کر فرار ہونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ سیڑھیوں پر ہی مارے گئے۔ ان کی لاشیں دیکھ کر ہمارے قیدی کی حالت خراب ہو گئی۔ اس نے گھگیا کر کہا۔

”خدا کے لیے مجھے مت مارنا۔“

”خدا کے واسطے مت دو۔“ میں نے اسے آگے دھکیلا۔ ”کبھی تم نے بھی کسی کے منہ سے یہ واسطے سنے ہوں گے۔“

وہ بادل نا خواستہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ صرف اس کی خاطر اس کے ساتھی سیز فائر نہیں کریں گے اور وہ بھی مارا جائے گا۔ اس لیے اس کے ذہن میں فرار کا خیال آیا اور اس پر اس نے بڑے بے دھتکے پن سے عمل کیا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کرے گا۔ وہ آگے تھا اور جب سیڑھیاں چڑھ کر وہ محوم کر اوپر جانے والی جگہ پہنچا جہاں ایک شیشے اور کٹری کی آرائشی کھڑکی تھی اس نے اچانک چٹلاک لگائی اور فلمی انداز میں کھڑکی توڑ کر باہر نکل گیا۔ عموماً فلموں میں ہیرو کو اسی طرح دشمنوں سے بچتے دکھایا جاتا ہے مگر یہ نہ تو ظلم تھی اور نہ وہ ہیرو تھا جب میں نے ہما تک کر دیکھا تو وہ ایک منزل نیچے اس طرح گرا تھا کہ کھڑکی کا ایک ٹوٹنے والا شیشہ اس کی گردن میں پیوست ہو گیا اور وہ خرخراتی آوازوں کے درمیان اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی شیشہ اس کی گردن سے نکلا خون کا فوارہ پھوٹا تھا۔ بہ ظاہر اس کے بچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

”اوپر چلو۔“ باسو نے آگے جاتے ہوئے کہا۔ اس نے قیدی کے فرار اور اس کی عبرت ناک موت پر کوئی

رجوعِ خاطر نہیں کیا تھا۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ تمام مزاحمت کرنے والے اسی منزل تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ جنگی حکمت عملی کے لحاظ سے انہوں نے نہایت احمقانہ حرکت کی تھی۔ اب وہ اس جگہ پھنس گئے تھے اور فرار کے واحد راستے پر ہم موجود تھے۔ باسو آگے تھا اور میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم اوپر اسی طرح کے سروس ایریا میں نکلے وہاں واش روم تھے اور ایک لاؤنج کے ساتھ کچن تھا۔ لاؤنج میں چاندنی چیمنی تھی۔ سامنے کی طرف سے ایک

گیلری دوسری سمت میں جا رہی تھی اور بیڑھیاں یہاں سے تیسرے اور آخری فلور کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ میں نے باسو سے کہا۔

”تم گیلری کے دوسری طرف موجود حصہ کیلئے کر کے آؤ جب تک میں یہاں گھات لگائے ہوئے ہوں۔“ وہ سر ہلاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا۔ میں نے بیڑھیوں کا جائزہ لیا۔ تاریکی میں وہاں کسی قسم کی سرگرمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کچن کی طرف باہر سے کچھ روشنیاں جھلک رہی تھیں۔ اسی جگہ سے درگاہ والی عمارت پر فائرنگ کی جاتی رہی تھی کیونکہ یہاں جوابی فائرنگ کے آثار نمایاں تھے۔ ایک اوپری کیبنٹ ٹوٹ گئی تھی اور سنک میں گولیوں کے سوراخ تھے۔ سنک کے اوپر لگاتل دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مجھے شدت کی پیاس لگی ہوئی تھی۔ میں نے جھک کر تیل سے پانی پیا اور کچھ اپنے چہرے پر ڈالا تھا۔ اس جگہ کی بجلی بند ہونے سے یہاں شدید جس اور ٹھٹھن ہو گئی تھی۔ منہ پر ٹھنڈا پانی پڑا تو سکون ملا تھا۔ اسی لمحے گیلری کے دوسری طرف سے باسو کی مشین گن گرجی تھی۔ یقیناً اسے وہاں اپنے شکار مل گئے تھے۔

اوپر والوں نے بھی یہ آواز سن لی تھی کیونکہ ان کی طرف سے رد عمل ہوا تھا اور کوئی چیز اوپر سے گری اور لاؤنج میں آکر بجلی سی آواز سے پھٹ گئی اس سے دھواں اور گیس خارج ہو رہی تھی۔ میں سانس روک کر اس کی طرف لپکا اور اسے اٹھا کر کچن کی ٹوٹی کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ مجھے گیس بم اٹھا کر باہر پھینکنے میں بہ مشکل بیس سیکنڈ لگے ہوں گے۔ لیکن اس کے باوجود لاؤنج میں کچھ گیس جمع ہو گئی تھی۔ یہ آنسو گیس تھی، یہ سانس کے ساتھ آنکھوں پر بھی اثر کرتی تھی۔ میں نے اپنی شرٹ کا دامن پھاڑ کر اسے پانی سے تر کیا اور اسے منہ پر رکھ کر پھر سانس لی تھی۔ گیس کے اخراج کے لیے میں نے لاتوں سے مار کر مٹی دو کھڑکیاں توڑ دی تھیں۔ دشمن کا یہ حربہ بھی ناکام رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اب اوپر زیادہ لوگ نہیں رہے تھے اور اسی وجہ سے وہ دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ مرشد نے انہیں اپنی حفاظت کے لیے بلایا تھا مگر اس وقت ان کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے مرشد کا خیال کہاں سے آتا۔ مجھے خیال آیا کہ انہیں یہیں چھوڑ کر روانہ ہو جانا چاہیے، شاید وہ ہمارے پیچھے آنے اور اس معرکے میں مزید حصہ لینے سے گریز کرتے۔ مگر مجھے معلوم تھا باسو ہر صورت فاضلی کے حکم کی تعمیل کرے گا اور یہاں موجود آخری فرد کے خاتمے تک واپسی کا نام بھی نہیں لے گا۔ اوپر والے اتنی آسانی سے فوت ہونے پر آمادہ نہ ہوتے اور اپنی جان بچانے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرتے۔ ایک منٹ بعد باسو گیلری کی طرف سے نمودار ہوا اور ماحول کو کسی قدر وحشت لادیکھ کر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”اوپر والوں نے گیس کا بم مارا وہ میں نے باہر پھینک دیا۔“

وہ آرام سے سانس لے رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کا ہیلت گیس ماسک بھی تھا۔ یہ خاصی حیرت انگیز چیز تھی شاید مستقبل کی جنگوں کے لیے تھی جسے اس طرح ٹیسٹ کیا جا رہا تھا۔ باسو بیڑھیوں کی طرف بڑھا مگر جھلکے سے پیچھے آیا کیونکہ اس بار اوپر سے ہینڈ گرنیڈ آکر گر رہا تھا۔ میں تو خیر فوراً کچن کی آڑ میں ہو گیا تھا مگر باسو نے بھی حیرت انگیز تیزی سے ایک ستون کی آڑ لی تھی۔ اگرچہ ستون اس کے دیوہیکل جسم کو پوری طرح چھپانے سے قاصر تھا مگر پھر بھی خاصی بچت ہو گئی۔ دھماکے نے بیڑھیوں کے آس پاس کی جگہ تباہ کر دی تھی اور وہاں موجود

فرنیچر اور فرش پر بھی چاندنی نے آگ پکڑ لی تھی۔ یہ آگ سرعت سے پھیل رہی تھی۔ جب میں نے کچن سے جھانک کر دیکھا تو باسو بیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا اور وہ ہاتھ اوپر کر کے بیڑھیوں کے اوپری حصے میں کچھ رکھ رہا تھا۔ یہ کام کرتے ہی وہ تیزی سے واپس ستون کی آڑ میں آیا اور اس کا انداز دیکھ کر میں بھی واپس کچن میں روپوش ہو گیا۔

اس بار دھماکے نے بیڑھیاں تباہ کر دی تھیں۔ اب اوپر والے نیچے نہیں آ سکتے تھے اور نیچے والے اوپر نہیں جاسکتے تھے۔ مگر میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ باسو کیا کر رہا تھا۔ دھماکہ ہوتے ہی وہ تیزی سے کچن میں آیا اور اس نے اپنی جتنی قوت سے گیس کے فولادی پائپ توڑ دیئے اور ان سے تیزی کے ساتھ گیس خارج ہونے لگی۔ اب میں سمجھ گیا تھا اور باسو سے پہلے نیچے کی طرف لپکا۔ باسو بھی پیچھے آیا تھا جب ہم غلی منزل تک پہنچے تو اوپر دھماکہ سنائی دیا تھا گیس نے آگ پکڑ لی تھی اور شعلوں کی لپٹ نیچے تک آئی تھی۔ یہاں بھی باسو نے نچلے کچن میں گیس آؤ کرنے کی کارروائی کی۔ اوپر سے آگ بھڑکنے کی آوازیں کے ساتھ کچھ لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ باسو نے گیس بھرنے کا انتظار کیا اور پھر ایک گریڈینٹ پن نکال کر کچن میں رکھا اور ہم ایک کھڑکی توڑ کر اگلے صحن میں باہر نکل آئے تھے اور دیوار کے ساتھ دبک گئے اور گریڈینٹ کے دھماکے کو گیس کی موجودگی نے کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

اس طرف سے دیوار کا ایک حصہ گر گیا تھا اور اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ دھماکہ ہوتے ہی باسو دیوار سے ہٹ گیا اور اس کا منہ اوپر کی طرف تھا۔ اس نے مشین گن چھوڑ کر پستول نکال لیا تھا۔ پھر اس نے اچانک یکے بعد دیگرے کئی فائر کئے اور دو افراد اوپر سے پکے آم کی طرح نیچے گرے تھے انہیں گولیاں لگی تھیں اور رہی سہی کسر کرنے سے پوری ہو گئی۔ بیڑھیاں تباہ ہونے سے اب اوپر چھننے والے براہ راست اترنے کی کوشش کر رہے تھے اور باسو اسی لیے اس طرف نکلا تھا۔ وہ پوری طرح پُر عزم تھا کہ ایک آدمی بھی بچ کر نہ جانے پائے۔ اسے معلوم تھا کہ بیڑھیاں تباہ ہونے اور آگ پھیلنے کے بعد اوپر والے کھلی چھت سے نیچے اترنے کی کوشش کریں گے اور وہ ان کے استقبال کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ دو افراد کے مارے جانے کے بعد اوپر سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی تھی مگر میں جھجے تلے اور باسو اپنی زرہ بکتر میں محفوظ تھا۔ اس نے پھر پستول سے جوابی کارروائی کی اور بولا۔

”وہ عمارت کی چھت پر ہیں ان کو نشانہ بناؤ۔“

پہلے میں سمجھا کہ شاید وہ مجھ سے مخاطب ہے لیکن جلد مجھے احساس ہوا کہ وہ ریڈیو پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ شاید اس نے درگاہ میں موجود افراد سے کہا تھا کیونکہ فوراً ہی درگاہ کی چھت سے جوابی کارروائی شروع ہوئی اور دونوں طرف سے جواب دیا جانے لگا تھا۔ سماع ہال کی عمارت کسی قدر نیچی تھی مگر اس کے اوپر باؤنڈری وال تھی اس لیے مزاحمت کرنے والے بالکل ہی کھلی جگہ نہیں تھے۔ وہ دیوار کی آڑ میں بچ سکتے تھے مگر اب وہ نیچے اترنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔ سامنے درگاہ کی عمارت پر ملنگ اینڈ کمپنی موجود تھی اور یہاں باسو موت کے فرشتے کے نمائندے کی حیثیت سے اُن کے استقبال کو بالکل تیار تھا۔ سماع ہال کی عمارت میں لکڑی کا کام بہت زیادہ تھا اور اس لیے وہاں آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ابتدائی ہدایت کے بعد باسو بھر فرمایا۔

”کوئی کسی طرف سے بچ کر نہ جانے پائے۔“

عقب میں ہم موجود تھے۔ عمارت کے دائیں بائیں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ صرف آگے اور پیچھے سے نکلا جاسکتا تھا۔ سامنے درگاہ کی عمارت تھی اور بہ ظاہر اوپر موجود افراد کے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں میری اتنی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں دیوار سے لگے لگے مرشد کی رہائشی کونٹھی والے حصے کی طرف بڑھا۔ فی الحال اوپر سے خطرہ نہیں تھا مگر میں نے نکلی جگہ آنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت میں مشن سے زیادہ ذاتی حفاظت کو ترجیح دے رہا تھا۔ میں نے عمارت کے کونے سے جھانکا تو اس طرف تاریکی میں کئی افراد دکھائی دیئے وہ مورچہ بند تھے اور کونٹھی کے احاطے سے کی جانے والی فائرنگ کا جواب دے رہے تھے۔ مورچہ بند افراد فاضلی کے تھے اور یقیناً ان میں فاضلی بھی موجود تھا۔ اتفاق سے وہ سب میرے نشانے پر تھے اور مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ ان میں سے فاضلی کون ہے تو میں اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا مگر نائٹ ویزن صرف دکھائی دیتی تھی چیزوں اور انسانوں کو، بہت واضح نہیں کر رہی تھی۔

فاضلی کا دعویٰ تھا کہ اس نے مرشد کے فرار کا یا باہر سے اس کے لیے مدد آنے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا مگر میں سوچ رہا تھا یہاں جس قسم کا تباہ کن اور شور شرابے والا اسلحہ استعمال ہوا تھا کیا یہ ممکن تھا کہ پولیس اور انتظامیہ کان بند کر کے پڑی رہتی۔ اس وقت ایک بچ رہا تھا اور کارروائی شروع ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ یہ وقت اسلام آباد سے پولیس کی آمد کے لیے کافی تھا۔ مگر فی الحال ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے کہ یہاں پولیس آنے والی تھی۔ سماع ہال کی عمارت میں آگ اتنی سرعت سے پھیل رہی تھی کہ اب اس کے شعلے اور تپش کھڑکیوں سے باہر آنے لگی تھی۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر اوپری منزل کا جائزہ لیا تو وہاں صورت حال زیادہ ابتر دکھائی دی۔ شعلے تقریباً تمام کھڑکیوں سے لپٹے ہوئے تھے کیونکہ یہ سب لکڑی کے کام والی کھڑکیاں تھیں۔ میں فکر مند ہو گیا کیونکہ معاملات اس طرف جارہے تھے کہ حکومتی اداروں کی طرف سے مداخلت لازمی تھی۔ شعلوں کے ساتھ دھواں بھی اٹھ رہا تھا اور یہ خاصی دور سے نظر آتا۔

کونٹھی کے گارڈز اور فاضلی کے آدمیوں کے درمیان فی الحال ہلکی پھلکی چل رہی تھی۔ باسو نے فائزر کیے تو میں چونکا۔ اس نے نیچے آنے کی کوشش کرنے والے ایک اور آدمی کو مار گرایا تھا۔ پھر عمارت کے دوسری طرف سے ایک چیخ سنائی اور کوئی دھپ کی خوفناک آواز سے نیچے گرا تھا اس نے غالباً آگ سے گھبرا کر چھلانگ لگا دی تھی اوپری چھت سے زمین تک کا فاصلہ کم سے کم پینتالیس فٹ تھا اور اگر گرنے والا بچ بھی گیا تھا تو یقیناً اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ باسو ملنگ اینڈ پارٹی سے رابطے میں بھی تھا۔ اس نے سر ہلایا اور میری طرف آیا۔ ”اوپر کوئی باقی نہیں رہا ہے۔“

”ممکن ہے کوئی ہو اور چھپ گیا ہو؟“

”تب وہ جل کر مرے گا۔“ باسو نے کہا اور مرشد کی کونٹھی کے احاطے کی طرف بڑھا۔ اس طرف بڑا سا خالی میدان تھا اس میں شاید رش کے دنوں میں گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں۔ مشن کا آخری مرحلہ شروع ہونے والا تھا یعنی مرشد کی کونٹھی تک رسائی حاصل کرنا اور بالآخر اسے قابو یا دنیا سے رخصت کرنا۔ میں اس مرحلے میں شامل ہونا چاہتا تھا مگر جب میں نے باسو کے ساتھ جانا چاہا تو اس نے مجھے روک دیا۔ ”تم پیچھے سے درگاہ کی طرف جاؤ۔“

”کیوں؟“

”فاضلی کا حکم ہے۔“ وہ فرمایا۔ ”تم وہاں رک کر اگلے حکم کا انتظار کرو گے۔“

باسو کا انداز بتا رہا تھا کہ مجھے اس کے کہنے پر عمل کرنا ہی تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ میں زیرِ لب فاضلی کو بے نقطہ سناتا ہوا دوسری طرف مڑ گیا۔ غالباً فاضلی نہیں چاہتا تھا کہ میں مسلح حالت میں اس کے پاس آؤں۔



میں سماع ہال کی عمارت کے دوسری طرف پہنچا جہاں اوپر سے چھلانگ لگانے والا جانکی کی کیفیت میں دم توڑ رہا تھا۔ اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور منہ ناک سے خون جاری تھا۔ اس کی گن اس کے برابر میں پڑی تھی مجھے دیکھ کر اس نے سکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے منہ سے سوائے خون کے بلبلوں کے اور کچھ نہیں نکلا تھا۔ اس کے باوجود وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی حالت بہت عبرتناک تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ جب وہ بول نہیں پاتا تو اس نے اشارے سے مجھے پاس آنے کو کہا۔ میں اس کی طرف جھکا تو مجھے اندازہ ہوا وہ کہہ رہا ہے۔ ”مجھے مار دو۔“

وہ بہت اذیت میں تھا اور اس سے چھٹکارا چاہتا تھا میں نے کہا۔ ”معاف کرنا میں صرف اسے مارتا ہوں جو مجھے مارنے کی کوشش کرتا ہے ہاں تمہارے لیے یہ کر سکتا ہوں۔“

میں نے کہتے ہوئے اس کے سر پر رائل گولڈ کا دستہ مارا اور وہ ساکت ہو گیا۔ اللہ جانے بے ہوش ہوا تھا یا دنیا سے گزر گیا تھا۔ مگر اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا اب وہ اذیت میں نہیں تھا۔ وہ بچتا نہیں لگ رہا تھا اور اچھا تھا کہ بے ہوشی میں دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ مزید اذیت سے بچ جاتا۔ میں نے عمارت کے اوپری حصے کی طرف دیکھا۔ اب شعلے اس طرف بھی پہنچ گئے تھے۔ اوپر موجود کسی فرد کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ درگاہ کے اس طرف گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ بہ ظاہر یہ جگہ ایسے ہی چھوڑ دی گئی تھی۔ اس پر برگد، ہینپل اور نیم کے بڑے درخت اُگ آئے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ درخت درگاہ بننے سے پہلے سے یہاں موجود ہوں اور کیونکہ اس جگہ کی ضرورت نہیں تھی اس لیے ان درختوں کو چھینا نہیں گیا تھا۔ درختوں کے پاس درگاہ کی بلند چار دیواری تھی۔ یہ چار دیواری تقریباً بارہ فٹ اونچی تھی اور اس پر اندر باہر اس طرح سے خاردار باز لگائی تھی کہ اسے عبور کرنا آسان کام نہیں تھا۔

میں سماع ہال کے کونے تک پہنچا اور جھانک کر درگاہ کی عمارت کی طرف دیکھا تو مجھے ملنگ کے دوسا تھی سامنے نظر آئے تھے وہ بھی آس پاس کا جائزہ لے رہے تھے اور جس طرح بے فکری سے کھلی جگہ پر گھڑے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ سماع ہال کی طرف سے حراحت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ وہ سگریٹ پی رہے تھے اور آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھنے سے پہلے انہیں آواز دے کر اپنے بارے میں بتایا ورنہ کوئی بھروسہ نہیں تھا وہ بھڑک کر مجھ پر غائر کھول دیتے۔ خبردار کر کے میں ان کے پاس پہنچا اور ملنگ کے بارے میں پوچھا۔ ان میں سے ایک نے سر ہلایا۔ ”اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“

میرا ماتھا ٹھکا۔ ”کیا ہوا وہ زخمی ہے؟“

دوسرے نے بھی گھڑے جیسا سر ہلایا۔ ”پیٹ میں دو گولیاں لگی ہیں۔“

”پیٹ میں کیسے لگ گئیں اس نے بلٹ پروف پہنا ہوا تھا؟“

اس پر پہلے نے ذرا کھل کر بتایا کہ گولیاں کہاں لگی تھیں اور اگر ملنگ بیچ گیا تو کن امور کے قابل نہیں رہے گا۔ میں نے لا حول پڑھی۔ ”تم لوگوں کو اس وقت بھی یہی سوچ رہی ہے۔ اس کی جان بچانے کے لیے کچھ کیا ہے؟“

”ادھر ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“ اس نے مایوسی سے کہا تو میں اس سے سرکھپانے کے بجائے اندر آیا جہاں ملنگ تقریباً بے ہوشی کی حالت میں مرشد کے باپ اور دادا کے حرار شریف کے پاس پڑا ہوا تھا۔ گولیاں واقعی نازک جگہ لگی تھیں اور انہوں نے اعضا کے حیتمزے اڑا دیئے تھے۔ خون روانی سے بہہ رہا تھا اور اس کے بے حس ساتھیوں نے خون روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا تھا جب کہ ان کے پاس بیک بیک میں مرہم پٹی کا سامان بھی تھا۔ خود ملنگ کی پشت پر بندھے بیک میں بھی موجود تھا۔ اس مہم سے پہلے انہیں اس بارے میں بتایا تھا۔ میں نے اس کا بیک اتارا اور اس میں سے خون جذب کرنے والے پیڈ زنگال کر ملنگ کے زخم پر رکھے اور ایک آدی سے کہا۔

”اسے پکڑ کر رکھو۔“

اس نے بادل نا خواستہ پیڈ دیا تو میں نے اوپر سے ٹیپ لپیٹ دیا۔ زخم کو چھونے پر ملنگ بلبلہ کر ہوش میں آ گیا تھا میں نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس خون روکنے والا انجکشن ہے جیسا کہ باسو کے پاس ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے خمیف لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس ایسا کوئی انجکشن نہیں ہے۔“

”تم فاضلی سے رابطہ کر کے اس سے کہو کہ تمہیں وہ انجکشن بھیج دے۔ خون اسی طرح بہتا رہا تو تم مر جاؤ گے۔“

ملنگ کے چہرے پر دہشت نظر آنے لگی۔ اس نے کانپتے ہاتھ سے اپنے بالوں میں چھپے مائیک پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”میں زخمی ہو گیا ہوں گولیاں..... لگی ہیں جی خون بہت بہہ رہا ہے۔“

”ایک منٹ مجھے بات کرنے دو۔“ میں نے کہا تو ملنگ نے ریڈیو کا ہیڈ سیٹ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ اصل ریڈیو اس کے لباس میں چھپا ہوا تھا میں نے فاضلی سے کہا۔ ”اس کے لیے خون روکنے والا انجکشن بھیج دو باسو کے پاس ہے۔“

”وہ صرف باسو کے لیے ہے۔“ فاضلی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”کسی کو نہیں مل سکتا۔“

”یہ تمہارا آدی ہے اور اگر اس کا زیادہ خون بہہ گیا تو.....“

”تو یہ مر جائے گا۔“ فاضلی نے میری بات کاٹ کر استہزاء سے انداز میں کہا۔ ”آدی میرا ہے اور فکر تمہیں ہو رہی ہے۔“

”ابھی تمہارا مشن پورا نہیں ہوا ہے اور تمہیں آدمیوں کی ضرورت ہے۔“

”اگر یہ بیچ بھی گیا تب بھی بیکار ہے حریف کچھ نہیں کر سکے گا اس لیے اسے چھوڑ دو۔“

”جہنم میں جاؤ۔“ میں نے مائیک نیچے بیچ دیا۔ ملنگ نے میری یکطرفہ گفتگو سے سمجھ لیا تھا کہ فاضلی نے کیا جواب دیا ہے۔ اس نے پچھلی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کوئی بات نہیں اسی بات کا تو معاوضہ دیا ہے اس نے۔“

”تمہارے گھروالوں کو چند لاکھ مل جائیں گے اور تم یہاں خون بہنے سے مر جاؤ گے۔“

ملنگ کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ میں گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں ان معاملات میں غیر ضروری طور پر گھس رہا تھا جب کہ مجھے اپنی گلو خلاصی پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے تھی میں نے وہاں موجود افراد سے پوچھا۔ ”اب انچارج کون ہے۔“

اس پر وہ ہنسا جس نے قید خانے سے نکلنے کے بعد میرا پوچھا تھا۔ ”انچارج پوچھتا ہے کہ انچارج کون ہے؟“

”بکومت۔“ میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”میں نام نہاد انچارج ہوں پہلے یہ ملنگ تھا اب کون ہے؟“

میرے لہجے پر اس کی آنکھوں میں چمک آئی تھی اور اس نے کاٹ دار انداز میں کہا۔ ”مجھے سمجھ لو۔“

”اچھا تو انچارج صاحب اب ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”باس کے حکم کا انتظار۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہاں کتنے آدمی بیچے ہیں؟“

یہاں آنے والے سترہ افراد میں سے چھ مارے جا چکے تھے اور ملنگ سمیت تین شدید زخمی تھے یعنی وہ کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ لڑنے کے قابل مجھ سمیت نو افراد بیچے تھے۔ مگر دوسری طرف مخالف پارٹی میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔ پرانا سامع ہال، درگاہ کی عمارت اور نیا سامع ہال تینوں کلیئر ہو چکے تھے۔ اب صرف مرشد کی کوٹھی رہ گئی تھی۔ فاضلی کے ساتھ اب بھی ایک درجن مسلح افراد تھے اور وہ سب محفوظ تھے کیونکہ انہوں نے ماردھاڑ کی کارروائی میں بہت احتیاط سے حصہ لیا تھا۔ سب سے آگے میرا گروپ تھا اس لیے نقصان بھی زیادہ اسی کا ہوا تھا۔ شاید اسی لیے اسے آگے رکھا گیا تھا۔

پھر فاضلی کے پاس باسو جیسا خطرناک آدمی تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کا اصل دستہ وہی تھا اور یہ کرائے کے گوریلے تھے۔ ان کے جینے مرنے سے اُسے خاص فرق نہیں پڑتا ہاں ان کی طرف سے ذمے داری پوری کرنا لازمی تھا۔ مجھے ان کے ساتھ لگانے کا مقصد یہی تھا کہ میں اپنا تجربہ کام میں لاؤں اور ان کی مدد کروں۔ اس کے باوجود فاضلی نے مجھے نام نہاد انچارج بنایا تھا۔ میرے معاملے میں وہ ذرا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مجھے ایسی کوئی رعایت نہیں دے رہا تھا جو بعد میں خود اس کے گلے پڑ جائے۔ نئے انچارج کا نام گل جی تھا۔ مجھے اس گل جی کو دیکھ کر افسوس ہوا جو مصور گل جی کے بالکل برعکس تھا۔ قدرت نے اسے معصوم پیدا کیا ہوگا مگر اس نے اپنے کروت سے اپنے نقش و نگار خود بنا لیے تھے۔ اس نے بتایا کہ ان تینوں مقامات پر دشمن کے کم سے ساٹھ آدمی مارے گئے تھے۔

گویا دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں ستر کے قریب افراد اپنی جان ہار چکے تھے۔ مگر فاضلی اور مرشد جیسے لوگوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ساری دنیا کے انسانوں کے مرنے سے بھی مطمئن ہو سکتے تھے بشرطیکہ ان کی جان کو خطرہ نہ ہو۔ لیکن اس جنگ میں جو اس وقت یہاں جاری تھی۔ مرشد اور فاضلی میں سے کسی ایک ہی کو زندہ رہنا تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا اور حالات بتا رہے تھے کہ موت کا گھبراہٹ مرشد کے گرد جنگ ہو رہا تھا۔ اب تک

ہونے والا جانی نقصان تقریباً تمام ہی مرشد کے آدمیوں کا ہوا تھا۔ درگاہ کی تین اہم ترین عمارتوں پر فاضلی کا قبضہ ہو گیا تھا یا پھر وہ مرشد کے قبضے میں نہیں رہی تھیں۔ اچانک مجھے ان عورتوں کا خیال آیا جو درگاہ والی عمارت کے تہہ خانے میں تھیں۔ میں نے گل جی سے پوچھا۔ ”ان کا کیا ہوا؟“

”وہی جو دوسرے لوگوں کا ہوا۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

میرا خون کھینچ کر سر میں آ گیا تھا اور میں نے غرا کر پوچھا۔ ”کیوں؟ وہ عام عورتیں تھیں اور اس جگہ قید تھیں، پھر انہیں کیوں مارا؟“

”اودہ سرجی، میں نے کب کہا کہ انہیں مار دیا ہے۔“ اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے کوئی تہہ خانے کی طرف گیا ہو اور انہیں مار دیا ہو۔“

”اگر انہیں مار دیا گیا ہوا تو یہ مارنے والے کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا اور تہہ خانے کی طرف بڑھا وہاں مرشد کے ان تین آدمیوں کی لاشیں موجود تھیں۔ جسے میں نے بے ہوش کیا تھا اس کے سر میں بھی کسی نے سوراخ کر دیا تھا۔ مگر مجھے لگتا کہ ان عورتوں کی تھی۔ تہہ خانے میں یو پی ایس کام کر رہا تھا اور یہاں روشنی تھی۔ تلاش کرتا ہوا میں ایک راہداری کے آخری حصے میں پہنچا جہاں ایک چھوٹی سی کوٹھری کا دروازہ تھا اور وہاں نو عورتیں ایک دوسرے سے چٹ کر بیٹھی تھیں۔ خوف اور گرمی سے وہ پسینے میں نہاتی ہوئی لیکن زندہ تھیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا مگر مجھے دیکھ کر ان کی ہلکی پھلکی چیخیں نکل گئی تھیں۔ میرا حلیہ ہی ایسا ہو رہا تھا سر سے پاؤں تک زخموں اور لہو میں ڈوبا ہوا تھا جگہ جگہ جلنے اور کٹنے کے نشانات تھے۔ چہرہ بھی ان سے خالی نہیں تھا اس لیے میں عورتوں کو بھیا تک لگا تھا مگر روشنائی نے مجھے شناخت کر لیا اس نے دبی آواز میں رونے والی عورتوں کو خاموش کر لیا۔ ”چپ..... چپ یہ اچھا آدمی ہے اسی نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔“

”تم لوگ یہیں رہو اور کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کر لو۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی اوپر مار دھاڑ چل رہی ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا ہو۔ اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں خودکوش کرنا ہوگی۔“

”ہم ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتے۔“ ایک ادھیڑ عمر عورت بولی۔ ویسے وہ سب ہی معمولی صورت کی اور عمر رسیدہ عورتیں تھیں سبھی ان کو یہاں یہ کام سونپے گئے تھے ورنہ شاید وہ بھی مرشد اور اس کے گرگوں کی دل بستگی کا سامان بنی ہوتیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جوانی میں وہ اس مرحلے سے گزر چکی ہوں اور اب بیکار ہو گئی تھیں۔ اس لیے کہاؤ کی طرح یہاں تہہ خانے میں ڈال دی گئی تھیں۔ جب وہ یہاں آئی یا لائی گئی ہوں گی تو ان کے خاندان گھر بار ہوں گے مگر اب ان کا کوئی تھا بھی تو اس نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ وہ زندگی کے آخری سانس تک یہاں رہنے پر مجبور تھیں۔ ان میں صرف روشنا جوان اور خوب صورت تھی اور اس کا تعلق یہاں سے نہیں تھا۔ باقی عورتوں کی نسبت حوصلہ مند بھی تھی۔ حوصلے والی نہ ہوتی تو اتنا خطرہ مول لے کر یہاں تک کیسے آتی؟ اس نے مجھے بتایا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے یہاں دو آدمی آئے تھے تو میں چھپ گئی تھی۔ وہ ان عورتوں کو دیکھ کر چلے گئے۔“

”ہاں، ہمیں کچھ اقرار دیا تھا۔“ اسی ادھیڑ عمر عورت نے نجی سے کہا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ روشنا بولی۔ ”وہ پھر آئیں اور مجھے یہاں دیکھ لیا تو.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ

دیا مگر مکمل خدشہ اس کے لہجے میں موجود تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”اب کوئی نہیں آئے گا وہ سب اوپر معروف ہیں۔“

روشنا آگے آئی۔ ”تم اچھے آدمی ہو مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ جب تک میں یہاں سے نکل نہ جاؤں۔“

”تم میرا حلیہ دیکھ رہی ہو۔ موت کتنی ہی بار میرے پاس سے گزری ہے اور آگے بھی گزرتی رہے گی۔ میرے ساتھ رہنے والے اکثر لوگ مارے جاتے ہیں۔ تم یہیں رہو اور تمہیں ڈرکس بات کا ہے؟“ آخری جملہ میں نے بے ساختہ کہا تھا حالانکہ میرا وہ مقصد نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

”ہاں مجھے کس بات کو ڈر ہے، میرے پاس کھونے کو ہے ہی کیا؟“

”معاف کرنا میرا یہ مقصد نہیں تھا اور نہ ہی یہ وقت جذباتی ہونے کا ہے، صرف اپنی جان بچانے کا سوچو۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”دروازہ اندر سے بند کر لو۔“

میں کوٹھری سے نکلا اور کچن کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے وہاں بڑے سائز کے کئی فرنیج دکھائی دیئے میں نے ایک چھوٹے فرنیج کا دروازہ کھولا تو اس میں منرل واٹر اور سوپ ڈرکس سے زیادہ ہاٹ ڈرکس بھری ہوئی تھیں۔ میں نے لاحول پڑھی اور تلاش کے بعد ایک سوپ ڈرکس ٹن مل گیا اور میں نے اسے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اتنی قتل و غارت گری کرنے اور دیکھنے کے بعد دماغ گرم ہونا لازمی تھا اور مجھے کسی بخ بستہ مشروب کی ضرورت تھی۔ اس ٹن نے مجھے کسی قدر شہنشاہی کر دیا تھا۔ سیڑھیوں کی طرف سے آہٹ ہوئی اور گل جی دو آدھیموں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”کیا بات ہے سرجی تم تو یہیں کے ہو کر رہ گئے۔“

”اوپر کیا پوزیشن ہے؟“ میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ اس نے شانے اچکائے۔

”کوئی پوزیشن نہیں ہے سرجی۔“

وہ عام قسم کے مجرم تھے جو معمولی ذہنی سطح کے حامل تھے اور جانوروں کی طرح ری ایکٹ کرتے تھے۔ وہ کسی چیویشن میں اپنی ذہانت استعمال کرنے کے قابل نہیں تھے۔ میں نے دیکھا کہ مار دھاڑ بند ہونے کے بعد وہ لاپرواہی سے بکھرے ہوئے تھے اور ان کی چوکی ختم ہو گئی تھی ایسے میں اگر اچانک کسی طرف سے مرشد کے آدمی آجاتے تو انہیں اپنا دفاع کرنے میں بھی کچھ وقت لگتا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”تم نیچے کیوں آئے ہو، ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی ہے۔“

”ہمارے لیے تو ختم ہو گئی ہے۔“ گل جی نے کہا۔ ”نیچے اس لیے آئے ہیں کہ ذرا موج مستی کر لیں۔“

”موج مستی بعد میں کر لینا اگر فحش گئے تو۔“ میں نے طنز کیا۔ ”تمہارے گردن تمہیں مرنے کے لیے

کرائے پر لیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے اوپر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تاہم ذرا موج مستی کرنے آئے ہیں آپ جاؤ ہم آتے ہیں۔“ گل جی نے ٹھہرے لہجے میں کہا تو میرا ماتھا ٹٹکا۔ وہ یقیناً عورتوں کے چکر میں نیچے آئے تھے۔ وہ اسی درگاہ میں رہتے تھے اور انہیں یہاں موجود عورتوں کے بارے میں علم تھا۔ گل جی میری طرف متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے خیال ہو کہ میں اسے منع کروں گا اور پھر اس سے الجھوں گا مگر میں نے سر ہلایا اور خاموشی سے اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے فی الحال نہ الجھنے والی حکمت عملی اپنائی تھی۔ اب دشمن توقع کر رہا ہو تو اس سے محاذ آرائی سے گریز کرنا چاہیے۔ وار اس وقت کرو جب وہ اس کی توقع نہ کر رہا ہو۔ میں پہلے اوپر والوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو گل جی کے تقریباً سارے آدمی درگاہ والے ہال میں آچکے تھے۔ ان کی تعداد چار تھی۔ میں نے انہیں گھورا۔

”تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”تو کیا کریں؟ کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔“ ایک کسمسا کر بولا۔

”ابھی یہاں مرشد کے آدمی موجود ہیں۔ تم میں سے ایک سامنے رہے اور دو پیچھے جائیں ایک اسی جگہ رہے گا۔“ میں نے ان کو بے ظاہر کام باٹا لیکن درحقیقت انہیں بانٹ دیا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ موج مستی میں اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ جب ان کی باری آئے گی تو انہیں اجازت ملے گی اور تب تک کے لیے وہ باہر ہیں۔ بادل نا خواستہ وہ حرکت میں آئے اور باہر نکل گئے۔ میں نے ملک کا معائنہ کیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا مگر فی الحال اس کی زندگی کو خطرہ نہیں تھا خون بھی رک گیا تھا۔ اگر وہ بچ جاتا تو اسے آنے والی زندگی میں خاصی محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب ہال میں میرے ساتھ صرف ایک آدمی رہ گیا تھا۔ بے ظاہر وہ ٹہل رہا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ شاید گل جی نے اسے کوئی ہدایت کی تھی۔ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھتا تھا کہ اس نے عقب سے کہا۔

”آپ کہاں جا رہے ہو؟“

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”انچارج میں ہوں یا تم، جو مجھ سے سوال کر

رہے ہو؟“

”وہ میں یہاں اکیلا رہ جاؤں گا۔“

”تو تمہیں کوئی کھا نہیں جائے گا تمہارے تین ساتھی یہیں موجود ہیں۔“ میں نے کہا اور سیڑھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے رائفل تھام لی اگرچہ اس کی نال نیچے کی طرف تھی مگر اس کے ہاتھوں کا تناؤ بتا رہا تھا کہ وہ اسے استعمال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور میں نے سیڑھی پر پہلا قدم رکھا تھا کہ اس نے کہا۔

”آپ نیچے نہیں جاسکتے جی۔“

میں نے مصنوعی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب؟ کیوں نہیں جاسکتا؟“

”گل جی نے کہا ہے کہ آپ یہاں ہمارے ساتھ رہیں گے۔“

”اوہ اچھا یہ گل جی کا حکم ہے۔“ میں نے نارمل انداز میں کہا اور پلٹ کر واپس آ گیا۔ اس نے سکون کا

سانس لیا اور رائفل پر اس کے ہاتھوں کی گرفت نرم پڑ گئی تھی۔ میرے رویے سے وہ دھوکھا کھا گیا۔ میں نے پاس

جاتے ہی اچانک اس کی گردن پر سامنے سے ہاتھ مارا۔ اس کی سانس رک گئی تھی اور ضرب نے اسے مفلوج کر دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کسی قابل ہوتا میں نے رائفل کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا اور اس کے گرتے ہی اسے کھینچ کر مزار کے احاطے میں ڈال دیا جہاں وہ اپنے ساتھیوں کی نظروں سے اوجھل تھا جب تک کہ وہ خاص طور سے آکر یہاں نہ دیکھتے اور پھر میں پھرتی سے نیچے کی طرف بڑھا دے قدموں سبز ہریاں اتر کر تہ خانے میں آیا تو دور سے عورتوں کے چلانے کی آواز آئی۔ میرا خون کھولنے لگا تھا۔ لیکن جب میں کچن کے پاس پہنچا تو میں نے راہداری میں گل جی کے ایک ساتھی کو چوکس پایا اس نے مجھے دیکھتے ہی رائفل کا رخ میری طرف کر دیا اور غرا کر بولا۔

”یہاں کیوں آئے ہو واپس جاؤ۔“

”یہ عورتیں کیوں چلا رہی ہیں۔“

”عورتوں کا کام ہی چلانا ہے۔ تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟“

”اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کروں تو تم کیا کرو گے؟“

”میں تمہیں گولی مار دوں گا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے میں واپس جا رہا ہوں۔“

میں پلٹا اور کچن کے پاس سے گزرتے ہوئے جیسے ہی دیوار کی آڑ میں آیا ہیٹل سے ہستول نکال کر اس پر لگا تار فائر کیے۔ اس نے شاید سوچا بھی نہیں تھا کہ میں ایسی حرکت کر جاؤں گا اس لیے دوسری گولی نے اس کے سر میں سوراخ کیا تو گرنے سے پہلے وہ مر چکا تھا۔ بلٹ پروف کی وجہ سے میں نے جان کر اس کے سر کا نشانہ لیا تھا۔ فائرنگ کا شور گونجا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ مجھے بے آواز رائفل استعمال کرنی چاہیے تھی مگر جلد بازی میں ہستول استعمال کر بیٹھا اور اب اوپر نیچے سب کو پتا چل گیا تھا فوراً ہی عورتوں کے چلانے کی آواز تھم گئی اور گل جی نے چلا کر قادر سے پوچھا۔ ”قادرے کیا ہوا ہے؟“

مگر قادرے اوپر جا چکا تھا۔ کچھ دیر جاتی تھی کہ جب اوپر والے آجاتے اور گل جی اپنے دوسرے ساتھی سمیت مجھے اس جگہ گھیر لیتا۔ ابتدائی غلطی کے بعد میں اس کے مداوے کا سوچ رہا تھا۔ پھر میں حرکت میں آیا اور برتن مانہنے والی موٹی تار سے ایک ٹکڑا نکال کر زرد کی ساکٹ میں داخل کیا۔ سوچ آن کرتے ہی شعلہ لپکا اور اس جگہ کی بجلی غائب ہو گئی۔ اپنی کارکردگی پر سر ہلاتے ہوئے میں نے ٹائٹ ویژن آنکھوں پر کی اور آنے والوں کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ اب گل جی کے ساتھی اوپر والے بھی چلا چلا کر پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے؟ اپنی جانور فطرت کے ساتھ انہوں نے خطرہ بھانپ لیا تھا۔ قادرے کی طرف سے کوئی جواب نہ ملنے کا مطلب واضح تھا کہ قادرے جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے ایک مناسب جگہ پوزیشن سنبھال لی جہاں سے میں بیک وقت اوپر اور نیچے والوں کو آتے دیکھ سکتا تھا۔ مگر کئی منٹ گزرنے کے باوجود کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ روشنی بند کر کے میں نے ان کے لیے ٹریپ تیار کر لیا تھا۔ وہ اس ٹریپ میں آنے کو تیار نہیں تھے۔

مجھے ان کے ساتھ ساتھ عورتوں کی فکر بھی تھی۔ ان کی آوازیں بند ہو گئی تھیں لیکن وہ گل جی اور اس کے ساتھی کے قبضے میں تھیں۔ میرے کان آہٹوں پر مرکوز تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میڑھیوں سے کوئی اتر کر نیچے تک آیا

تھا مگر وہ سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھیر رہے تھے۔ درگاہ مرشدیہ میں میرے لیے ایک اور صبر آزما جنگ شروع ہو گئی تھی۔ میرا مقابلہ پانچ چھپے ہوئے بد معاشوں سے تھا اور میں اپنے اعصاب پر قابو رکھ کر ہی اس جنگ میں کامیابی حاصل کر سکتا تھا۔ اچانک کسی عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ اس کے انداز میں اذیت نمایاں تھی۔ پھر گل جی بولا۔ ”شہباز تم میری آواز سن رہے ہو میں نے اس عورت کی گردن پر چاقو رکھا ہوا ہے اگر تم سامنے نہیں آئے تو میں اس کا گلا کاٹ دوں گا۔“

میرے کان گل جی کی طرف مگر اب آنکھیں میڑھیوں سے آنے والے راستے پر لگی تھیں مجھے لگا جیسے گل جی نے کوئی پلان بنایا ہے اور اب اس پر عمل کیا جا رہا تھا اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ میں کسی عورت کی خاطر اس کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ جب کہ پہلے ہی ان عورتوں کی زندگی کا بھروسہ نہیں تھا۔ گل جی اور اس کے ساتھی ان کی آبروریزی کے بعد انہیں قتل بھی کر سکتے تھے اور شاید وہ اپنا گھناؤنا جرم چھپانے کے لیے ایسا ہی کرتے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب اوپر والوں میں سے ایک نمودار ہوا اس نے راتقل سامنے کی ہوئی تھی اور بہت چوکس تھا مگر اس کی چوکی اس گولی سے نہ بچا سکی جو میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر چلائی تھی وہ اس کے حلق میں اتر گئی۔ میں بروقت پیچھے ہوا تھا کیونکہ راتقل کی نال پر اس کی انگلی بے ساختہ دب گئی اور دبی آواز میں فارنگ ہونے لگی۔ میں جس ستون کے پیچھے تھا کئی گولیاں آکر اس پر لگیں۔ گولیوں کے ساتھ ساتھ اس کے خزانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں اور پھر دونوں آوازیں ایک ساتھ ٹھم گئیں۔

میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ چپڑا ہوا تھا اور اس کے گردن کے سوراخ سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ اگر وہ مرنا نہیں تھا تب بھی خون سے محرومی نے اس کے دماغ کو ناکارہ کر دیا تھا۔ میرا ایک دشمن کم ہو گیا تھا مگر ابھی چار باقی تھے۔ مجھے پہلے بھی اس قسم کی خوش فہمی نہیں تھی کہ یہ لوگ نائٹ وین سے محروم تھے۔ ان کے پاس نائٹ وین کی موجودگی عین ممکن تھی اور یہ اس مشن کا تقاضہ بھی تھا۔ مرنے والے نے نقدیق کردی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں پر نائٹ وین عینک موجود تھی اور اگر میں بے احتیاطی سے کسی کھلی جگہ ہوتا تو وہ آتے ہی مجھے دیکھ لیتا۔ آڑ میں ہونا مجھے بچا گیا تھا۔ ستون خاصا بڑا تھا کیونکہ ان ہی ستونوں پر درگاہ کی وزنی عمارت کا بوجھ تھا اس لیے ان کا سائز بڑا رکھا گیا تھا۔ اگر یہ چھوٹا ہوتا تو اس کے عقب سے میرے جسم کی حرارت جھلک سکتی تھی اور میں آنے والے کو آڑ میں ہونے کے باوجود دکھائی دیتا۔

میں فکر مند ہو گیا مجھے نائٹ وین کا تو ذکر تھا۔ کچن میں دیواروں پر ایمرجنسی لائٹس لگی تھیں میں نے ان کا معائنہ کیا۔ یہ مینول تھیں اور تار کی مدد سے بجلی کے نظام سے منسلک تھیں۔ آٹومیک حالت میں یہ لائٹ جاتے ہی آن ہو جاتی تھیں مگر اس وقت ان کا سسٹم آف تھا۔ یہ طاقتور ایل ای ڈی لائٹس تھیں اور ایک لائٹ میں کوئی تیس پینتیس ایل ای ڈیز لگی تھیں۔ یہ نہایت جدید قسم کی ایمرجنسی لائٹس تھیں جو ریوٹ سے بھی آن آف کی جاسکتی تھیں۔ خوش قسمتی سے ان کے ریوٹ ان کے ساتھ ہی موجود تھے۔ میں نے کچن کی دونوں لائٹس اتار لیں اور آڑ میں لا کر باری باری انہیں اپنے جسم سے لگا کر آن کر کے دیکھا۔ یہ پوری طرح چارج تھیں اور ان کی روشنی خاصی تیز تھی۔ جسم سے لگا کر اس لیے چپک کیا کہ نائٹ وین سے ہلکی سی روشنی بھی ان لوگوں کو فوراً نظر آ جاتی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں علم ہو کہ میرے پاس روشنی کا ذریعہ آگیا تھا۔ میں نے انہیں پاس رکھا اور دوبارہ سکون

سے بیٹھ کر مزید کسی وقوے کا انتظار کرنے لگا۔

گل جی نے اپنی دھمکی کا رد عمل اپنے ساتھی کی خرخراہٹوں کی صورت میں سن لیا تھا اس لیے اس نے دوبارہ دھمکی دینے کی حماقت نہیں کی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی پلاننگ سے ظاہر تھا کہ ان لوگوں کے پاس ریڈیو تھے اور ان کا آپس میں رابطہ تھا بھی گل جی نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ اسے اپنی جان عزیز تھی اس لیے اس نے اپنے ساتھیوں کو استعمال کیا تھا۔ فاضلی نے مکاری سے کام لیتے ہوئے مجھے ٹائٹ ویژن سے محروم رکھا تھا مگر خدا بھلا کرے باسو کا جس نے مجھے ٹائٹ ویژن دے دی تھی۔ اب میں اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر فاضلی نہیں چاہتا تھا کہ مجھے ٹائٹ ویژن ملے تو باسو نے مجھے کیسے دی تھی۔ کیا اسے ڈیوڈ شا کی طرف سے کوئی ہدایت تھی کہ وہ یہ وقت ضرورت میری مدد کرے۔ تبھی وہ مجھے بچانے کے لیے جن کی طرح نمودار ہوا تھا اور اس نے مجھے ٹائٹ ویژن بھی دی تھی۔

اوپر والوں کو اپنے ایک ساتھی کی موت سے عبرت حاصل ہوئی تھی اور اب ان میں سے کوئی آگے آنے کو تیار نہیں تھا جہاں سے براہ راست میرے نشانے پر آ جاتا۔ اس لیے اب میرے پاس موقع تھا میں دبے قدموں اپنی جگہ سے نکلا اور ذرا آگے تک آیا۔ سیڑھیوں کے پاس مجھے حرارت کی جھلک دکھائی دی وہ سیڑھی پر موجود تھے۔ وہاں سے میں کوٹھری کی طرف جانے والی راہداری تک آیا۔ گل جی اور اس کا ساتھی کوٹھری میں تھے اس کا دروازہ ذرا سا کھلا تھا اور اندر سے حرارت کی لہریں باہر آرہی تھیں۔ دونوں جگہ زندہ انسان موجود تھے۔ مجھے ان سے نمٹنا تھا۔ رات کے تین بج چکے تھے اور معرکہ شروع ہوئے تین گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ پولیس اور سرکاری حکام بدستور عنقا تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ فاضلی نے اب تک کوٹھی پر قبضہ کر لیا ہو گا یا مرشد کے آدمی بدستور مزاحمت کر رہے ہوں گے؟ دونوں صورتوں میں میرا جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا مناسب تھا۔ کلائی پر موجود کڑے کے ہوتے ہوئے ایک ہی طریقہ تھا کہ میں کسی طرح فاضلی پر قابو پاؤں یا اس سے انگوٹھی چھین کر اس سے نجات حاصل کر لوں۔

لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میں حرکت میں آؤں یوں بیٹھے رہنے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ یہاں سے جانے کے لیے مجھے دو افراد سے نمٹنا تھا اور یہ اتنا مشکل نہیں تھا۔ مشکل یہ تھی کہ پیچھے وہ نو عدد عورتیں پھر گل جی اور اس کے ساتھی کے رحم و کرم پر رہ جائیں اور وہ رحم نام کی چیز سے نا آشنا تھے۔ وہ انہیں بے آبرو کرتے اور پھر مار دیتے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے فی الحال انہیں اپنے ذہن سے جھٹکنے کا فیصلہ کیا۔ میں آڑ سے نکل کر بلند آہنگ چاپ کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ وہاں موجود دونوں افراد نے یقیناً میری آمد کی اطلاع سن لی تھی۔ وہ الارٹ ہو گئے مگر انہوں نے سوچا نہیں تھا جو میں کرنے جا رہا تھا کچن کی دیوار کی آڑ سے نکلنے سے پہلے میں نے ریسیوٹ کا بٹن دبایا اور سیڑھیوں کے رخ پر رکھی ہوئی ایمرجنسی لائٹ آن ہو گئی۔ میں نے ٹائٹ ویژن اتاری اور رائفل سیدھی کیے آگے بڑھا۔ ان کی بوکھلائی آوازیں مجھ تک آرہی تھیں۔

تیز روشنی نے ٹائٹ ویژن کے ہوتے ہوئے ان کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا تھا اور فی الحال انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا جب تک وہ اپنی ٹائٹ ویژن اتارتے میں ان کے سروں پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے ہاتھوں اور پیروں کے ساتھ ہاتھوں سے انہیں مارا اور وہ سیڑھیوں پر گر کر چیخنے دھاڑنے لگے تھے۔ انہوں نے ٹائٹ ویژن اتار

دی تھی اس لیے میں نے ریموٹ سے ایمر جنسی لائٹ آف کر کے ٹائٹ ویژن پہن لی اور پھر ان کے ہتھیران سے دور کر دیئے۔ ایک کے دونوں پاؤں چھلنی ہو گئے تھے اور دوسرے کا ایک پاؤں اور ایک ہاتھ شدید زخمی تھا۔ وہ شدید تکلیف میں تھے اور میں نے دونوں کے سروں میں ایک ایک گولی مار کر ان کو اس تکلیف سے ہمیشہ کے لیے نجات دلادی۔ ان کی چیخ و پکار کی تو عقب سے عورتوں کے چلانے کی آواز آئی۔ ان کی چیخوں میں خوف اور ہسٹریا کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ تکلیف میں نہیں تھیں۔ شاید گل جی اور اس کا ساتھی انہیں ڈرا، ہکا رہے تھے۔ اچانک رائفل کے برسٹ کی گنگناہٹ سنائی دی اور اس بار چیخنے والی عورتوں کی آوازوں میں کرب شامل تھا۔ گل جی یا اس کے ساتھی نے ان بستی عورتوں پر فائر کھولا تھا۔

میرے اندر تشہی بڑھنے لگی تھی۔ یہ گھنیا لوگ ان بے بس عورتوں پر ظلم کر رہے تھے جو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتی تھیں اور ان کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں جھکے سے مڑا۔ ایمر جنسی لائٹ اٹھائی اور راہداری کی طرف بڑھا جس کے آخر میں کوٹھری تھی۔ میں نے دیوار سے جھانک کر دیکھا تو کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔ میں دے قدموں آگے بڑھا۔ یہ ٹھوس لکڑی کا بنا ہوا دروازہ تھا جس کے اندر باہر کنڈیاں تھیں اور کوئی ایسا رخسہ نہیں تھا جس سے باہر جھانکا جاسکتا۔ جیسے جیسے میں کوٹھری کے یاس جا رہا تھا عورتوں کے رونے اور سسکنے کی آوازیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ جو زخمی تھیں وہ سسک رہی تھیں اور جو جگمگاتی تھیں وہ خوف سے رو رہی تھیں۔ گل جی انہیں دینی زبان میں ڈانٹ پھنکار رہا تھا۔ ناقابل اشاعت الفاظ کے ساتھ وہ انہیں دھمکا بھی رہا تھا پھر اس نے اپنے ساتھی کو نواہ جو باہر نظر رکھنے کے بجائے ان حالات میں بھی عورتوں پر نظر رکھے رہے تھا۔ وہ دروازے کی طرف آیا تھا کہ میں تیار ہو گیا۔

جیسے ہی اس نے دروازہ ذرا سا کھولا میں نے اس کے عین منہ پر ایمر جنسی لائٹ آن کی۔ روشنی براہ راست اس کی آنکھوں میں گئی اور اس نے دھاڑ ماری تھی مگر یہ دھاڑ پستول کی گرج میں دب کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کے کپٹے منہ میں گولی ماری تھی۔ وہ جھکے سے پیچھے گیا اور میں بروقت پیچھے ہوا تھا کیونکہ گل جی نے اندر سے برسٹ مارا اور گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی گزر گئی تھیں لیکن میں جوابی برسٹ نہیں مار سکتا تھا۔ اندر عورتیں بھری ہوئی تھیں اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں ان کو بچا کر صرف گل جی کو شوٹ کر سکتا۔ عورتوں نے پھر ہسٹریائی انداز میں چلانا شروع کر دیا تھا اور ان کے شور میں گل جی کی آواز دب گئی تھی وہ کچھ کہہ رہا تھا شاید مجھے دھمکی دے رہا تھا مگر اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ گل جی کے آدمی کو مارتے ہی میں نے ایمر جنسی لائٹ آف کر دی تھی اس وقت میں اسے بنن سے آن آف کر رہا تھا۔ ٹائٹ ویژن آنکھوں پر سیٹ کر لی۔

دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ اندر کر کے اوپر کی طرف پستول کر کے فائر کیے۔ اس محدود جگہ گولی کی آواز بہت زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ عورتیں جو کسی قدر چپ ہو گئی تھیں فائرنگ ہوتے ہی انہوں نے ایک بار پھر چیخ و پکار کر کے کمرے کی چھت سر پر اٹھالی تھی۔ میں گل جی کا صبر آزما رہا تھا اور اس کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے جواب میں دروازے کی طرف پورا برسٹ چلایا۔ گولیاں دروازے سے گزر رہی تھیں لیکن میں دیوار کی آڑ میں محفوظ تھا۔ پھر اس کی رائفل خالی ہو گئی اور گنگناہٹ کی جگہ خالی کلک کی آواز آنے لگی۔ میں اسی موقع کا منتظر تھا۔ میں نے ٹائٹ ویژن اتاری اور دروازے کو لات مارے ہوئے ایمر جنسی لائٹ آن کر لی۔ میں نے

خطرہ مول لیا تھا کیونکہ عین ممکن تھا کہ گل جی نے بھی نائٹ ویرن اتاری ہوئی ہو اور ایرجنسی لائٹ اس کے لیے لائٹ ٹاور کا کام کرتی اور میں اس کے لیے آسان ہدف ثابت ہوتا مگر ایرجنسی لائٹ بند ہونے کے بعد اس نے نائٹ ویرن لگا لی تھی۔ اس لیے روشنی اس کے حق میں مضرت ثابت ہوئی اس سے بچنے کے لیے اس نے آنکھوں ہاتھ رکھا اور اس کا دوسرا ہاتھ پستول نکال رہا تھا۔

لیکن اس سے پہلے وہ پستول استعمال کرتا میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچا اور اسے پوری قوت سے ایک طرف دیوار پر دے مارا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے بے اختیار گیا اور دیوار سے ٹکراتے ہوئے اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ عورتیں ایک کونے میں دبکی ہوئی تھیں اور ان میں سے دو فرش پر بے سندھ پڑی تھیں ان کے جسموں سے خون نکل کر فرش پر پھیل رہا تھا ایک کے سینے میں کئی گولیاں لگی تھیں اور دوسری کی کپٹی میں سوراخ تھا۔ دونوں مر چکی تھیں۔ اشتعال کے عالم میں، میں نے اٹھنے کی کوشش کرنے والے گل جی کو اٹھایا اور اس بار اسے دروازے سے باہر پھینک دیا۔ اس کا پستول اور رائفل وہیں گر گئی تھی۔ میں باہر آیا تو گل جی اوندھے منہ ساکت پڑا تھا لیکن میں اس کی مکاری میں آنے والا نہیں تھا۔ وہ اتنا غیرت مند کہاں سے ہو گیا کہ دو چوٹیں کھا کر بے ہوش ہو جاتا۔ میں نے اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری تو اس نے تڑپ کر ہاتھ چلایا اور میں پیچھے ہو گیا اس کے ہاتھ میں دبا خنجر میری پنڈلی کو تقریباً چھو تا ہوا گزرا تھا۔ اس کا ہاتھ آگے نکلا تو میرا پیچھے ہونے والا پاؤں اسپرنگ کی طرف واپس آیا اور اس نے عقب سے کہنی پر بھر پور ٹھوکر ماری۔ کہنی جھج گئی۔ گل جی نے بلبلایا کر دوسرے ہاتھ سے کہنی تھامی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں نے خنجر اٹھا کر اس کی ران میں گھونپ دیا۔ اس نے دلخراش چیخ ماری۔

ایرجنسی لائٹ کی روشنی باہر تک آرہی تھی۔ نائٹ ویرن کی ضرورت نہیں تھی میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور وہ واویلا مچاتا رہا۔ یہ سورا کچھ دیر پہلے کسی عورت پر اپنی مردانگی آزمایا رہا تھا۔ میں نے کھینچ کر خنجر نکالا اور اس کی دوسری ران میں گھونپ دیا۔ اس وقت میرے دل میں اس کے لیے اتنا ہی رحم تھا جتنا کسی قسائی کے دل میں بکری کے لیے ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں نے غلط کہا قسائی پر فیشنل ہوتا ہے۔ میں مجسم انتقام بنا ہوا تھا۔ راہداری میں اس کا خون پھیل رہا تھا۔ خنجر نے اس کی شریان کاٹ دی تھی اور خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جب اس کا واویلا کم ہوا بلکہ اس میں چلانے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تو میں نے پوچھا۔ ”کس کے کہنے پر تم نے یہ سب کیا؟“

”فاضلی کے حکم پر۔“ اس نے سسک کر جواب دیا۔

”میرے بارے میں اس نے کیا کہا تھا؟“

”بی بی..... اگر تم..... مزاحمت کر دو تو..... تمہیں مار دیا جائے۔“ اس نے کہا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میں اسے بخش دوں۔ مجھے یہی توقع تھی یہ حکم کے غلام تھے اپنے طور پر ایسا قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔ فاضلی کی نیت پر مجھے شک ہی شک تھا اور اب یہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ وہ مجھے اس جگہ سے زندہ جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا قطع نظر اس کے کہ وہ ڈیوڈ شا سے کچھ وعدے وعید کر کے آیا ہوگا۔ وہ مرشد کی اولاد تھا اور اس نے وہی کیا تھا جو مرشد نے کیا تھا یعنی ڈیوڈ شا کو جو تے کی نوک پر رکھا تھا۔ میں نے گل جی کی تلاشی لی اس کے پاس مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا ازار سے مطمئن ہو کر میں اندر آیا۔ عورتیں اب مرنے والیوں کا بین کر رہی تھیں۔ میں نے

روشنا کو تلاش کیا تو وہ عورتوں کے پیچھے دبی ہوئی نظر آئی۔ یہاں سے صرف اس کے بال دکھائی دے رہے تھے جو بری طرح نکھرے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہو۔“

اس پر وہ یوں سامنے آئی کہ میں اپنے سوال پر شرمندہ ہو گیا۔ اس کا اوپری لباس مکمل طور پر غائب تھا اور اس نے ہاتھوں سے ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ میں نے نظریں جھکاتے ہوئے ایک مرنے والی عورت کی چادر اس کے پردہ کی۔ ”معاف کرنا مجھے آنے میں دیر ہوئی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے غم لہجے میں کہا۔ ”آپ نے ٹھیک کہا تھا میرے پاس گنوا نے کو کچھ نہیں تھا۔“ اس نے چادر لپیٹ لی تھی اور میں نے موضوع بدل دیا۔ ”میں نے کہا تھا کہ دروازہ اندر سے بند رکھنا۔“

”اس نے کھول دیا تھا۔“ روشنا نے ایک مرنے والی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ گل جی کو جانتی تھی اور سمجھی کہ

”مرد کے لیے آیا ہے۔“

”تم نے دیکھ لیا کہ اس نے کیسی مدد کی۔“

عورتوں میں دو زخمی تھیں مگر ان کے زخم جان لیوا نہیں تھے انہوں نے خود پٹی کر لی تھی۔ صورت حال بدل گئی تھی اب مجھے اپنی جان بچانی تھی اور اپنے ساتھ ان عورتوں کی جان بھی بچانی تھی۔ روشنا کے ساتھ جو دوسری عورت گل جی کے ساتھی کی دست درازی کا شکار ہوئی تھی اس کا لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ میں نے عورتوں سے پوچھا۔ ”تم لوگ یہاں رہتی ہو تمہارے پاس کپڑے ہوں گے۔“

”بالکل ہیں جی۔“ ایک عورت بولی۔

میں نے روشنا سے کہا۔ ”ان کے ساتھ جاؤ اور کپڑے پہن کر آؤ اسے بھی لے جاؤ۔“

دوسری عورت پر سکتہ طاری تھا۔ دو عورتیں اسے سہارا دے کر لے گئیں۔ لاشیں اسی کوٹھری میں چھوڑ کر ہم اہر آئے۔ جب تک روشنا اور دوسری عورت ڈھنگ کا لباس پہن کر آئیں میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ واقعی دیر سے بھوک پیاسی قید تھیں اس لیے باہر آتے ہی پانی پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ میں نے روشنا سے کہا۔ ”ان کو تم نکل کر دے گی اور جب میں تمہیں باہر نکال دوں تو انہیں ساتھ لے جانا۔“

”میں انہیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔“ اس نے ذرا انک کر کہا۔ میں اس کی بات سمجھ گیا۔

”اپنا ذکر مت کرنا اور ان عورتوں کو بھی سمجھا دینا۔ ان سے کہنا کہ پولیس کے پاس نہ جائیں اپنے گھروں کو جائیں۔ تم اپنے گھر سے نکلی ہی نہیں۔ باقی تمہارا شوہر سب جانتا ہے۔“

اس کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہوا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”میں ایسا ہی کروں گی جی۔“

”میرے ساتھ آؤ لیکن بالکل خاموشی سے۔“

ہم تہہ خانے سے نکل کر اوپر آئے سیڑھیوں پر موجود لاشوں نے عورتوں کو خوفزدہ کر دیا۔ اوپر تباہی کے ناظر اس سے کہیں زیادہ بھیسا تک تھے۔ عمارت کے اندر باہر جا بجا لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔



میں سات عورتوں کے قافلے کے ہمراہ درگاہ کے سامنے والے حصے سے باہر آیا جہاں نئے سماع ہال کی اورت پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ پتا نہیں فاضلی اینڈ کمپنی کو میری بغاوت اور یہاں ہونے والی

قتل و غارتگری کا علم تھا یا نہیں مگر ان کی طرف سے مداخلت کے آثار نہیں تھے اگر فاضلی جان بھی گیا تھا تو یہ لوگ اتنے 'ہم نہیں تھے کہ وہ ان کے لیے کمک روانہ کرتا۔ ویسے بھی اس کے پاس محدود افرادی قوت تھی۔ کٹھنی کی طرف، جاے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم بائیں طرف مڑ گئے۔

نئے سامع ہال اور درگاہ کی عمارت کے درمیان کوئی نہیں تھا اور نہ ہی دائیں طرف کوئی نظر آ رہا تھا۔ ہم عمارت کے ساتھ خالی میدان تک پہنچے۔ میں نے احتیاطاً ہر طرف نظر دوڑائی۔ خوش قسمتی سے یہاں بھی کوئی نہیں تھا اور اس کی وجہ تھی۔ میرے ساتھ آنے والے فاضلی کے تمام گرجے جہنم رسید ہو چکے تھے اور اب یہاں صرف فاضلی کے ساتھ آنے والے بچے تھے اور وہ فاضلی کے ساتھ مرشد کی کٹھنی کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں اب تک عمارت کی آڑ میں کھڑی تھیں۔ مطمئن ہو کر میں نے مڑ کر اشارہ کیا اور ہم قطار میں چلتے ہوئے درختوں کے جھنڈ تک پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جھنڈ کے پار دیوار میں شاید ایسا کوئی مقام ہو جہاں سے دیوار عبور کی جاسکے۔ درگاہ کے سامنے والے حصے سے لکنا آسان نہیں تھا اور شاید ممکن بھی نہیں تھا۔ مگر جب میں اندر جانے لگا تو ایک عورت نے مجھے روک دیا۔ ”ادھر نہ جاؤ صاحب۔“

”کیوں ادھر کیا ہے؟“

”ادھر زہریلے سانپ ہوتے ہیں۔“ اس نے انکشاف کیا۔

میں رک گیا۔ ”زہریلے سانپ وہ کیسے؟“

”مرشد عالی نے ادھر زہریلے سانپ چھوڑے ہوئے ہیں۔“ عورت نے انکشاف کیا۔ ”ان کی وجہ سے اس طرف کوئی نہیں جاتا ہے اور اگر کوئی غلطی سے بھی چلا جائے تو اسے یہ سانپ ڈس لیتے ہیں وہ منٹوں میں م جاتا ہے۔“

میں نے اس طویل جھنڈ کو دیکھا جو درگاہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیوار کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ اس کی چوڑائی تیس گز سے زیادہ نہیں تھی اور لمبائی کوئی پانچ سو گز تھی۔ فی الحال یہ تفتیش کا موقع نہیں تھا کہ مرشد کی اس حرکت کا جواز تلاش کرتا کہ اس نے زہریلے سانپ کیوں چھوڑے تھے۔ شاید اس لیے وہ خود بھی زم سے بھرا ہوا تھا اور زہریلے جانوروں کی ہم نشینی پسند کرتا تھا۔ اب اس طرف سے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں وہیں درگاہ کے سامنے والے حصے کی طرف مڑ گیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی اور صرف مجھے نظر آ رہا تھا۔ میرے پاس ایمر جنسی لائٹس تھیں مگر روشنی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے عورتوں سے کہا۔ ”سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں اور ایک پیچھے سے میری قمیص پکڑ لے۔ خاموشی سے میرے پیچھے آنا ہے۔“

روشنانے میری قمیص پکڑ لی اور باتوں نے درجہ بہ درجہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا اور ہم قطار میں سا کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ نائٹ ویژن سے سانپ بھی نظر آئے گا۔ مگر ایسا نہیں تھا مجھے خیال نہیں آیا کہ سانپ ٹھنڈے خون والے جانور ہوتے ہیں اور ان کے جسم کا درجہ حرارت وہی ہوتا ہے جو ماحول کا ہوتا ہے۔ لپے وہ نائٹ ویژن میں الگ سے نظر نہیں آتے ہیں۔ مگر اللہ نے اس کو برا کو تو فٹ دی کہ اس نے ہمیں پاس پا ڈسنے کے بجائے پھنکار ماری۔ جواب میں عورتوں نے کورس میں سریلی چیخ ماری اور میں نے بوکھلا کر ایمر جنس لائٹ روشن کر دی۔ مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر ایک بڑا کوبرا سانپ تیزی سے درختوں کی طرف رینگ

تھا۔ غالباً وہ ہوا خوری کے لیے کھلی جگہ نکل آیا تھا اور ہم اس کے سر پر پہنچ گئے۔ عورتیں واپس بھاگنے پر آمادہ تھیں میں نے بڑی مشکل سے انہیں باز رکھا کہ پیچھے زیادہ زہریلے ناگ تھے۔ جوان کی عزت آبرو کو ڈسنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ہمیں آگے جانا ہے۔“

”ادھر سانپ ہیں۔“ ایک عورت بولی۔

میں نے سوچا اور حکم دیا۔ ”سب زمین پر زور زور سے پاؤں مار کر چلو۔“

”نہیں اس طرح تو سانپ ہماری طرف آجائیں گے۔“ روشنانے ڈر کر کہا۔

”سانپ اور دوسرے کیڑے مکوڑے انسان سے ڈرتے ہیں۔ تم نے دیکھا یہ کوبرا بھی بھاگ رہا تھا۔

جب تم زور سے پاؤں مار کر چلو گی تو یہ ڈر کر بھاگیں گے۔“

خواتین بڑی مشکل سے اس پر تیار ہوئی تھیں کہ وہ زور زور سے پاؤں مار کر چلیں۔ میں نے لائٹ بند کر دی اور اب درختوں سے ذرا فاصلے پر ہو گیا۔ میں خود زمین پر زور سے جوتا رکھ کر چل رہا تھا اور خواتین بھی پاؤں مار کر چل رہی تھیں اس لیے کسی قدر پریذیمسی آواز آرہی تھی۔ لائٹ چلانے اور خواتین کی چیخوں کا آس پاس کوئی رد عمل نہیں ہوا تھا اس لیے میں مطمئن تھا کہ پاؤں مار کر چلنے سے بھی کوئی متوجہ نہیں ہوگا۔ درگاہ کے اگلے حصے میں کچا ہوا رمیدان تھا۔ بہ ظاہر یہ عام زائرین کے لیے مخصوص تھا۔ نذر نذرانے دے کر ذلت کے ساتھ یہیں سے عرس میں شرکت کر کے واپس چلے جاتے ہوں گے جب کہ خاص زائرین بارگاہ خاص میں شریک ہوتے تھے۔ یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ اندرون خانہ یہاں کیا ہوتا تھا اور مجھے اسی کی توقع تھی۔ کیونکہ یہ جمونا حرار اور خانقاہ بنا کر اسلام کو بدنام کرنے کی سازش زور شور سے ہو رہی تھی۔ مرشد جیسے جہنمی ہی ایسا کر سکتے تھے۔

درختوں کے آخری سرے تک آ کر اب دائیں جانب مین گیٹ تک صرف دیوار تھی۔ تاریکی میں گیٹ کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا اور ٹائٹ ویڈن سے بہ ظاہر کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے عورتوں کو وپس رکھنے کا اشارہ کیا اور رائل تھام کر محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ دیوار کے ساتھ میں اس بڑے سے فولادی گیٹ تک آیا تو اسے مقفل پایا۔ اس کے دونوں پٹوں میں چھوٹے دروازے بھی تھے اور وہ بھی اندر سے تالے ڈال کر بند کیے ہوئے تھے۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ یہ عورتیں گیٹ یا دیوار کسی صورت نہیں پھلانگ سکتی تھیں۔ گیٹ کے اوپری حصے میں ایسی ڈیزائن والی کانٹے دار گرل تھی جسے عبور کرنا بہت مشکل تھا۔ فولادی کانٹے انسان کی کھال پھاڑ دیتے۔ تالے بہت بھاری اور مضبوط قسم کے تھے انہیں توڑنا ممکن نہیں تھا اور کسی کانٹے والی چیز سے بھی بہت مشکل اور دیر سے کانٹے جاتے۔ مکرال تو یہاں ایسی کوئی چیز دستیاب نہیں تھی اور دوسرے اگر فولاد کانٹے والی آری ملی جاتی تب بھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں واپس آیا اور خواتین کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ فکر مند ہو گئیں اور کئی ایک تو رونے لگی تھیں۔ میں نے کہا۔

”رونے سے کام نہیں چلے گا یہ بتاؤ یہاں سے باہر جانے کا اور کوئی راستہ ہے؟“

”ادھر دیوار کے ساتھ ایک دروازہ ہے۔“ روشنانے درختوں کے جھنڈ کے وسطی حصے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں ایک بار اس طرف سے آئی تھی۔“

میں چونکا۔ ”وہ کیسے، یہاں سانپ ہوتے ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم جی۔“ اس نے سادگی سے کہا۔ ”مجید لے کر آیا تھا۔ مجھے تو ابھی معلوم ہوا ہے کہ یہاں سانپ بھی ہوتے ہیں۔ اگر اس وقت معلوم ہوتا تو میں مرکز بھی نہ آتی جی مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

حالانکہ اسے انسانوں سے ڈرنا چاہیے تھا اس سے زیادہ بڑا موزی کوئی نہیں ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ان عورتوں کا یہاں سے لکنا لازمی تھا۔ وہ میرے گلے پڑ گئی تھیں۔ میں جہاں جاتا وہ جلوس کی صورت میں ساتھ ہوتیں اور ان کی وجہ سے میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہتا۔ انہیں واپس درگاہ کی عمارت میں پہنچانا بھی ممکن نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اب فاضلی کے آدمی وہاں آگئے ہوں اور اپنے آدمیوں کے بدلے ان بے گناہ عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ فاضلی سے بچ جاتیں مگر بعد میں پولیس انہیں لے جاتی اور ان کا کوئی والی وارث بھی نہیں تھا جو انہیں چھڑاتا۔ کچھ غور و فکر کے بعد میں نے مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ ”اب تم لوگ بتاؤ، یہاں سے نکلنے کا واحد راستہ سانپوں کے درمیان سے گزرتا ہے کیا تم جاسکو گی؟“

”میں تیار ہوں۔“ روشنا بولی۔ ”مجھے سانپ سے ڈر لگتا ہے لیکن یہاں بھی موت ہی ہے۔“

”میں نہیں جاسکتی۔“ ایک عورت نے صاف انکار کیا۔ وہ سب دو حصوں میں بٹ گئی تھیں تین جانے سے انکار کر رہی تھیں اور پانچ جانے کے لیے تیار تھیں۔ میں نے تین سے کہا۔

”ٹھیک ہے اس صورت میں تم یہیں رہو گی میں ان لوگوں کو چھوڑنے جا رہا ہوں۔“

اکیلے رکنے کی بات پر کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ باقی تین بھی تیار ہو گئیں، میں بھی یہی چاہتا تھا اس لیے میں نے یہ بات زاد حمکی امیر انداز میں کہی تھی اور اس کا فوری اثر بھی ہوا۔ ہمارا قافلہ واپس جھنڈ کے وسطی حصے کی طرف چل پڑا۔ ایک درخت کے پاس پہنچ کر روشنا نے کہا۔ ”ہم یہاں سے نکلے تھے۔“

”پکا یاد ہے نا؟“

”ہاں۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔ ”ہم درگاہ والی عمارت سے تھوڑا پہلے نکلے تھے۔ مجھے یاد ہے وہ پتیل کا درخت تھا اور یہاں پتیل کا بس یہی ایک درخت ہے۔“

میں نے دونوں امیر جنسی لائٹ آن کیں اور ان سے کہا۔ ”سب ایک قطار میں چلیں گی اور سانپ دیکھ کر کوئی چیخ نہیں مارے گی۔ چلنے کا وہی طریقہ ہوگا یعنی پاؤں مار کر چلنا، سانپ خود ڈر کر بھاگ جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟“

سب نے سر ہلایا۔ جان بچانے کے لیے وہ اس جگہ سے گزرنے کو تیار ہو گئی تھیں مگر سب کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں سب سے آگے تھا اور ایک امیر جنسی لائٹ میں نے رکھی تھی دوسری روشنا کو دے دی۔ وہ درمیان میں تھی۔ ہم درختوں میں داخل ہوئے تو سب بہت محتاط تھے۔ خواتین سامنے سے زیادہ آس پاس دیکھ رہی تھیں۔ مگر یہ خیال کسی کو نہیں آیا کہ سانپ درختوں پر ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک اچانک گرا اور ایک عورت کی گردن پر گرا۔ اس نے دل خراش چیخ ماری تھی اور بے ساختہ سانپ کو دور جھٹک دیا۔ پہلی چیخ کے بعد اس نے بس نہیں کیا تھا بلکہ مسلسل چلا رہی تھی میں پلٹ کر اس کی طرف آیا اور اسے خاموش کرانے کی کوشش مگر جب اس نے ہسٹریائی انداز میں چلانا جاری رکھا تو مجبوراً مجھے تھمڑے کام لینا پڑا۔ دو تھمڑے کھا کر اس کی چیخیں بند ہو گئیں اور اس نے ٹھکائیے انداز میں کہا۔

”سانپ نے مجھے ڈس لیا ہے۔“

”وہ صرف گرا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”کہاں ڈسا ہے۔“

اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ سانپ نے اسے ڈسا نہیں تھا اس لیے وہ ڈرے ڈرے انداز میں ہنس دی۔ ”نہیں ڈسا جی۔“

”اب جلدی چلو یہاں سے۔“ میں نے کہا اور وہ سب تقریباً دوڑنے کے انداز میں چل پڑیں۔ میں نے روکا نہیں کیونکہ اس وقت ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہی مناسب تھا۔ اس بار کسی سانپ نے راستہ نہیں کاٹا اور ایک منٹ سے بھی پہلے ہم دیوار کے پاس نکلے۔ روشنا کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا مجید اسے گھما پھرا کر لایا تھا شاید اسے علم تھا کہ سانپ کہاں کہاں ہوتے ہیں؟ اور کون سا راستہ محفوظ ہے۔ دروازے تک کچھ فاصلہ اور طے کرنا پڑا۔ یہ بھی فولادی دروازہ تھا مگر اس پر لگا ہوا تالا عام قسم کا تھا۔ میں نے اس میں راکفل کی نال چھسائی اور جھٹکا تو وہ ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا تھا۔ پٹ کھلتے ہی خواتین نے جلّت میں نکلنے کی کوشش کی اور کسی قدر جھنسن کر اور رگڑ کھا کر وہ نکل بھی گئیں۔ انہیں چوٹیں آئی تھیں لیکن اس کی پروا نہیں تھی۔ اندر صرف روشنارہ گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”آپ بھی چلیں۔“

تب مجھے یاد آیا کہ میری کھائی پر ایک کڑا تھا اور اگر میں یہاں سے باہر نکلا اور فاضلی سے پانچ سو گز سے زیادہ دور گیا تو اس کڑے کا میکروم حرکت میں آجائے گا اور اس میں بھرا ہوا مہلک زہر مجھے چشم زہن میں موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”میں نہیں جاسکتا، تم جاؤ اور ان عورتوں کی مدد کرنا ان کا باہر شاید کوئی نہیں ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”مجھے یاد رکھو یا نہ رکھو لیکن یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ تاریک راہوں پر چلنے والے اچانک ہی انجام کا شکار ہوتے ہیں اور ان کو واپسی کا موقع نہیں ملتا ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ تم کو ایک موقع مل رہا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر اپنی فطرت پر صبر نہیں کر سکتیں تو بہتر ہے شوہر سے طلاق لے لو مگر تاریکی میں گناہ کے ساتھی مت تلاش کرو۔ اس کا انجام میں نے اس دنیا میں برائی دیکھا اور دوسری دنیا کا حساب تو تمہیں پتا ہوگا؟“

اس کا رنگ سرخ ہوا تھا مگر اس نے سر ہلایا اور باہر نکل گئی۔ اس کے پاس لائٹ تھی اور وہ اندھیرے میں اس کی مدد سے راستہ تلاش کر سکتی تھی۔ میں واپس چل پڑا لیکن میں جھنڈے سے فوری نکلنے کے بجائے دیوار کے ماتھ ساتھ درگاہ کے عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ یہاں درخت اتنے اتنے گھنے اور ان کے تنے پاس پاس تھے کہ درگاہ کے کسی حصے سے روشنی نظر آنا مشکل تھا اس لیے میں بے فکری سے ٹائٹ ویژن کے بجائے لائٹ کی روشنی پر بھروسہ کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے اس سفر میں میں نے کئی سانپ دیکھے اور یہ سب نہایت زہرے لیے قسم کے سانپ تھے۔ یک شاید ناگن تھی سفید رنگ پر ہلکی سرمئی رنگ کی دھاریاں تھیں اور وہ بلاشبہ نہایت حسین تھی۔ مگر اس کی ہلاکت بڑی میں شبہ نہیں تھا۔ جب میں اپنے اندازے کے مطابق سابق سماع ہال کے سامنے پہنچ گیا تو میں نے رخ ال دیا اور اب میں جھنڈے سے باہر آ رہا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے آخری بار راستے کا معائنہ کر کے ایمر جنسی ٹٹ بند کر دی اور آگے بڑھا۔

ایک محاورہ ہے کہ جہاں پر سٹے جال وہیں نفس ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جب میں اپنے طور پر بیچ کر نکل رہا تھا تب میرے بائیں پاؤں میں درد کی شدید لہر اٹھی اور میں نے جلدی سے لائٹ آن کی تو ایک درمیانے سائز کا سانپ لہراتا ہوا تیزی سے جا رہا تھا۔ ایک لمحے پہلے تک وہ میرے سامنے نہیں تھا اور ایک لمحے بعد وہ مجھے ڈس کر جا چکا تھا۔ خوف کی ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے بتایا کہ مجھے سانپ سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے بیٹھ کر پنڈلی سے پتلون اوپر کی تو دو سوراخوں سے سیاہ خون کی بوندیں فٹک رہی تھیں۔ دونوں سوراخوں کے درمیان فاصلہ دیکھ کر میری تشویش بڑھ گئی کیونکہ اس سے پتا چل رہا تھا کہ سانپ بڑے سائز کا تھا اور سانپ جتنا بڑا ہوتا ہے اس میں اتنا ہی زیادہ زہر ہوتا ہے۔ میرے پاس چاقو نہیں تھا ورنہ میں اس کی مدد سے کٹ لگا کر خون بہا دیتا اور زہر کا اثر کم ہو جاتا۔ میں نے رائفل کی اسٹریپ اتاری اسے کس کر زخم سے ذرا اوپر باندھ لیا اور پھر زہر... گیا۔ ایک لمحے کو مجھے چکر آیا تھا۔ مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ میں نے ابتدائی خوف پر قابو پالیا تھا۔

”شہباز میاں قسمت میں کیا کھوا کر آئے ہو۔“ میں نے خود سے کہا۔ ”ابھی ایک مصیبت سے نکلنے نہیں ہو کہ دوسری آفت آلتی ہے۔“

میری زندگی میں یہ دوسرا واقعہ تھا جب مجھے کسی زہریلے سانپ نے ڈسا تھا۔ پہلی بار کو برانس کے سانپ نے ڈسا تھا اور اوشا کے باپ سدھو نے علاج کے نام پر مجھے بھڑکسا تھا۔ بیچ میں ویسے ہی گیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ سب حکیم قاذوں کی ہی ہوئی معجزاتی دواؤں کا اثر تھا جو زہریلے ترین سانپ کا زہر بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکا تھا۔ مگر ان دواؤں کے استعمال کو بہت دن گزر چکے تھے اور ضروری نہیں تھا کہ ان کا اثر اب تک باقی ہو اس لیے مجھے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور اس سے پہلے مجھے اپنے زخم پر کٹ لگانا تھا۔ میں جھنڈے سے ہاتھ لگا کر درگاہ کی عمارت دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس کے آس پاس بیٹھائوٹے ٹشٹے بکھرے تھے اور میں ان سے کام لے سکتا تھا۔ میں نکلڑا ہوا عمارت کی طرف بڑھا۔ تیز حرکت سے گریز کر رہا تھا جس سے دوران خون میں تیزی آئی اور زہر زیادہ تیزی سے پھیلتا۔ اس کے باوجود جب میں درگاہ کی عمارت کے پاس پہنچا تو میرے ذہن پر غودلی سی چھانے لگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس سانپ کا زہر سلانے والا تھا۔ یہ زہر دماغ کے ان حصوں کو ناکارہ کر دیتا ہے جو دل کی دھڑکن اور سانس لینے کے عمل کو قابو کرتے ہیں۔ نتیجے میں دل اور سانس رک جاتے ہیں اور آدمی مر جاتا ہے۔ یہ زہر اذیت دینے کے بجائے ذہن پر سکون سا طاری کرتا ہے۔

عمارت کے سامنے ٹشٹے ہی ٹشٹے بکھرے تھے مجھے لائٹ آن کر کے ایک موزوں ٹکڑا تلاش کرنا پڑا اور میں نے اس کی نوک سے سانپ کے کانے کی جگہ کو چیرنا شروع کر دیا۔ درد کی ایک تیز لہر کے ساتھ ہی سیاہ خون کا فوارہ سا اچھلا تھا۔ درد نے ذہن پر چھاتی غنودگی کو بھی عارضی طور پر ختم کر دیا تھا۔ ذرا دیر بعد خون بہنے کی رفتار سست ہو گئی اور اس کا رنگ بھی بدلنے لگا تھا۔ یہ کسی قدر سرخ ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ زہر کم ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کٹ لگایا اور خون دوبارہ روانی سے بہنا شروع ہو گیا۔ زہر جتنا نکل جاتا میرے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ اس بار بھی خون ایک منٹ بعد رک گیا۔ دونوں بار کٹ لگانے پر کوئی پاؤ بھر خون نکلا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سارا زہر نکل گیا تھا یقیناً زہر کا ایک حصہ میرے خون میں اب تک موجود تھا۔ میں کھڑا ہوا تو

ہلکا سا پکڑ آیا تھا مگر اس کے بعد میں سنبھل گیا اور اب خود کو بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اگر مجھے کہیں سے سیاہ تلخ کافی یا چائے مل جاتی تو یہ غنودگی بھگانے میں اکسیر ہوتی مگر یہاں دونوں چیزوں کی دستیابی کا امکان نہیں تھا۔

میں واپس درختوں کی طرف آیا مگر ان سے دور رہ کر پرانے سماع ہال کی طرف بڑھا یہاں کوئی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر مرشد کی کونجی کی طرف خاموشی اور ابھی تاریکی تھی۔ بجلی بحال نہیں ہوئی تھی کیونکہ تمام روشنیاں بند تھیں۔ میں نے بڑے گیٹ کے رخسوں سے سماع ہال کے اندر جھانکا۔ ٹائٹ ویڑن سے جہاں تک دکھائی دے رہا تھا وہاں کوئی نہیں تھا البتہ چند چوہے کونے کھدروں میں موجود تھے اور اپنی جسمانی حرارت کی وجہ سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اندر داخل ہوا۔ عقبی حصے میں خاموشی تھی۔ میں نے اس کے دروازے سے جھانکا تو وہ عمارت بھی خاموش دکھائی دی جس میں سرگنگ نکل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا فاضلی نے اس طرف کسی کو چھوڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے اسے عقب میں کسی سے خطرہ نہیں تھا جو خطرہ تھا وہ اندر موجود لوگوں سے تھا اور ان میں سے اکثر فنا کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فاضلی نے کوئی ایسا بندوبست بھی کیا تھا کہ اب تک پولیس یہاں نہیں آئی تھی۔ ورنہ اتنی فائرنگ، دھماکوں، روشنی کے گرینیڈ چلنے اور مہرے سماع ہال کی عمارت کو کٹنے والی آگ کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی رپورٹ نہ کرتا۔



دیکھا جائے تو میرے فرار کے لیے اس سے زیادہ سازگار حالات دشمن کی قید میں کبھی میسر نہیں آئے تھے مگر دشمن نے ایک کڑا پہنا کر مجھے اپنا اسیر بنا لیا تھا اور میں چاہتا بھی تو یہاں سے نہیں جاسکتا تھا۔ بلکہ میں تو سرگنگ تک بھی نہیں جاسکتا تھا کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ اس صورت میں پانچ سو گز کی حد ختم نہ ہو جائے اور میں کڑے میں موجود پوٹاشیم سائائیڈ کا شکار ہو جاؤں۔ کونجی یہاں سے کوئی ڈھائی سو گز کے فاصلے پر تھی لیکن خود فاضلی کہاں تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ ممکن تھا کہ وہ جان بوجھ کر کسی جگہ چلا جاتا کہ پانچ سو گز کی حد آ جاتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچانک ہال کے اندر کچھ روشنیاں جل اٹھیں۔ ان کی روشنی اس وسیع اور تاریک ہال کو روشن کرنے سے قاصر تھی مگر اس سے مجھے پتا چل گیا کہ درگاہ کی بجلی، بحال ہو گئی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ فاضلی نے مرشد یا کم سے کم اس کی کونجی پر غلبہ پالیا تھا اور مرشد اگر اس کے ہاتھ نہیں آیا تھا تب بھی وہ دفاعی پوزیشن میں چلا گیا تھا ورنہ حالات فاضلی کے کنٹرول میں تھے۔ نہ جانے کیوں یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔

فاضلی اور مرشد دونوں میرے بدترین دشمن تھے۔ یہ میری اور بہت سے مظلوموں کی خوش قسمتی کہ وہ دونوں آپس میں لڑے تھے۔ یہ اڑدھے اور مگر کچھ کی لڑائی تھی جو ہارتا خلق خدا ایک موذی سے محفوظ ہو جاتی۔ مگر اس وقت مجھے فاضلی کا حالات پر حاوی ہو جانا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ کیونکہ میں اس کا قیدی تھا اور وہ جتنا مضبوط ہوتا میری رہائی اور زندگی کے امکانات اتنے ہی کم ہوتے جاتے۔ گل جی نے تصدیق کی تھی کہ فاضلی میرے لیے قاتلانہ عزائم رکھتا تھا اور مجھے اس طرح دنیا سے رخصت کرنا چاہتا تھا کہ براہ راست اس پر الزام نہ آئے۔ جیسے میں اس کی کامیابی میرے لیے مزید مشکلات کا پیغام لاسکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں، نہیں کیا کر سکتا تھا۔ میں آزاد تھا اور میرے پاس اسلحہ بھی تھا۔ میں فاضلی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا جب تک میں اس تک نہ پہنچ جاتا اور اس کے آدمی یقیناً میری راہ میں حائل ہوتے۔

فاضلی کے آدمیوں سے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں ان میں کمی کی کوشش کروں۔ فاضلی اور مرشد جیسے لوگ کرائے کے قاتلوں پر اکڑتے تھے ان میں کمی ہوتی تو یقیناً ان کی اکڑ میں بھی کمی آتی۔ ایک راہ سمجھ میں آتے ہی میں حرکت میں آ گیا۔ میں جتنی دیر ساکت رہا تھا ذہن پر غنودگی کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور اب مجھے حرکت میں آ جانا مانتا کہ میں غنودگی سے لڑ سکوں۔ چلنے سے پاؤں کے زخم میں ٹیسیں اٹھتی تھیں اور یہ جگانے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔ میں پرانے سارے ہال سے نکلا اور صحن سے ہوتا ہوا مرشد کی کونھی کی طرف بڑھا لیکن میں دیوار کے ساتھ ساتھ تھا اور تاریک حصوں سے گزر رہا تھا۔ اب اس طرف فاضلی کے مورچہ بند آدمی نظر نہیں آ رہے تھے۔ نائٹ ویژن کی ضرورت نہیں تھی مگر روشنی مجھے گراں گزر رہی تھی خاص طور سے مرشد کی کونھی کی چار دیواری پر بہت طاقت والی سرچ لائٹس روشن تھیں۔ اس کے پاس جانے والا کوئی شخص نگرانی کرنے والوں سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ فاضلی کے آدمی وہاں موجود ہوں گے۔ کم سے کم کونھی کا احاطہ ان سے خالی نہیں ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں فاضلی تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔

اس طرف سے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ کونھی میں داخلے کا راستہ سامنے سے تھا مگر اس طرف فاضلی کے آدمی ہوتے۔ کچھ دیر غور کے بعد میں نے درگاہ کے عقبی حصے کا رخ کیا۔ یہاں زمین پر سبزیاں اور پھلدار درخت تھے اور یہ سب یقیناً مرشد اور اس کے اہل خانہ کے لیے تھا۔ سنگتروں کے باغ سے گزرتا ہوا میں مرشد کی کونھی کے عقبی حصے میں آیا۔ یہاں بھی اس کی چار دیواری بلند اور خاردار باڑ سے ڈھکی تھی۔ اسے عبور کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں پلٹ کر باغ میں آیا۔ ذرا سی جستجو کے بعد مجھے مالی کی کونھری مل گئی اور وہاں سے ایک سیزم مل گئی۔ بانس کی بنی یہ سیزم ہلکی پھلکی تھی میں اسے با آسانی کونھی کی دیوار تک لے آیا۔ کونھری میں ہی مجھے شاخص کاٹنے والا ایک پاور کٹر مل گیا تھا جس سے فولادی تاریکی کاٹی جاسکتی تھی۔ سیزم کی دیوار کے ساتھ ٹکا کریں اور پر پہنچا اور پہلے ایک فولادی اوزار تاروں پر مارا مگر کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ شاید ان تاروں میں بجلی تھی تو اسے فاضلی کے آدمیوں نے منقطع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ہچکچاتے ہوئے پاور کٹر سے دائرہ چھپڑی اور جب مجھے بجلی کا جھٹکا نہیں لگا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

یہ کٹر معمولی طاقت سے کہیں زیادہ مضبوط اور موٹی اشیا کو کاٹنے کے لیے بنایا گیا تھا اس لیے اس نے با آسانی دائرہ کاٹ دی۔ پانچ منٹ میں، میں نے اتنی جگہ بنائی کہ دیوار کے دوسری طرف جاسکتا تھا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ اس بارہ فٹ اونچی دیوار کے دوسری طرف کیسے اترتا۔ اس طرف لان تھا اور دیوار کے ساتھ پھولدار پودوں کے تختے تھے۔ مجھے ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا۔ میں نے کٹر دوسری طرف پھینک دیا۔ گھاس میں گرنے سے بہت ہلکی سی آواز آئی تھی اور میں رائفل سنبھال کر کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ کہیں ایک دو کتے پہریداری پر مامور تھے تو وہ آجائیں تو پہلے میں ان سے نمٹ لوں مگر کسی طرف سے کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ میں نے رائفل بھی نیچے پھینکی اور دوسری طرف لٹک گیا۔ جب زمین میرے پیروں سے پانچ فٹ نیچے رہ گئی تو میں نے دیوار کا کنارہ چھوڑ دیا۔ میں پودوں پر گرا اور کوئی چوٹ نہیں آئی مگر ٹانگ کے زخم میں شدید ٹیس اٹھی تھی۔ میں کچھ دیر کے لیے بیٹھا رہ گیا اور پھر بہت کر کے اٹھا۔

مرشد کی کونھی زیادہ بڑی نہیں تھی یہ شاید ایک کنال کے رقبے پر بنی تھی اور دو منزلہ تھی لیکن جس احاطے میں

یہ کوٹھی تھی وہ کم سے کم دس ہزار گز یا ایک ہیکٹر رقبہ پر محیط تھا۔ اس رقبہ کا بیشتر حصہ سرسبز لان اور درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ عقبی لان بھی خاصا بڑا تھا اور اس کے دائیں کونے میں ایک نینگلو ٹائل والا سوئمٹنگ پول نظر آ رہا تھا۔ پول کے اندر لائنس آن تھیں اور یہ باہر تک آ کر ماحول کو عجیب سی جھلملاتی روشنی سے منور کر رہی تھیں۔ احاطے کے اندر بھی روشنی کا بھرپور بندوبست تھا اور اگر کوئی اس طرف آ نکلتا یا کوٹھی کی کسی کمرے کی جھانک لیتا تو میں اسے صاف نظر آتا۔ کوٹھی کے عقب کی طرف کھلنے والی بیشتر کمرے یا تارکے تھیں یا ان کو تاریک دکھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر احاطے کے اندر بھی خاموشی اور سکون تھا۔ مجھے تعجب ہوا کیا فاضلی حالات پر قابو پا کر مع ساقیوں کے سو گیا تھا یا سب نے اجتماعی خودکشی کر لی تھی اور اب یہاں کوئی زندہ فرد نہیں تھا۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا فاضلی خودکشی کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

کوٹھی کے عقبی حصے سے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور اوپری منزل کا لیئرس اس قسم کا تھا کہ اس تک رسائی بھی ناممکن تھی جب تک رتی یا سیزمی کا سہارا نہ لیا جاتا۔ میں نے آگے بڑھنے کے لیے دائیں طرف کا انتخاب کیا اور سوئمٹنگ پول کی طرف آیا۔ یہ کوٹھی کے عقبی اور دائیں حصے میں واقع تھا۔ پول خاصا بڑا تھا ہم اسے اولمپک سائز تو نہیں کہہ سکتے مگر یہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں پائے جانے والے مروجہ پولز سے خاصا بڑا تھا۔ مرشد نے نہ جانے صرف کوٹھی کی زینت بڑھانے کے لیے بنوایا تھا یا پھر اسے یا اس کے اہل خانہ کو تیراکی کا شوق تھا۔ میں پول کے پاس آیا تو اس کے اندر موجود لائنس یوں مدہم ہوئیں جیسے ان کے سامنے کوئی چیز آگئی ہو۔ پول میں کوئی تھا۔ میں چونکا ہوا گیا اور احتیاط سے آگے بڑھا اور پول میں جھانکا۔ ایک لمبے کو مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا لیکن پول میں تقریباً نصف درجن افراد زیر آب تیراکی کر رہے تھے۔ یہ صرف ایک لمبے کے لیے لگا تھا اور میں رائفل سیدھی کرنے جا رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ وہ زندہ نہیں تھے بلکہ یہ چھ افراد کی لاشیں تھیں جنہیں قتل کر کے سوئمٹنگ پول میں ڈال دیا تھا۔ ان کی لاشیں تیر رہی تھیں۔

غور کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ وہ سب عام افراد تھے۔ شاید مرشد کے مرید تھے جنہیں اس نے اسلحہ تھا کر یہاں حفاظت کے لیے رکھا تھا اور وہ سب فاضلی کا نشانہ بن گئے تھے۔ ان کے خون سے پول کا پانی کسی قدر سرخ ہوا تھا مگر یہ سرخی اتنی نہیں تھی ایسا لگ رہا تھا لاشیں مرنے کے کچھ دیر بعد یہاں ڈالی گئی تھیں۔ پول کے آس پاس جگہ جگہ چھوٹے قد کے آرائشی درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو کوٹھی کے اگلے حصے تک چلا گیا تھا۔ درخت چھوٹے تھے لیکن یہ ایک بندے کو چھپانے کے لیے کافی تھے میں ان کی آڑ میں آگے بڑھنے لگا۔ دیوار سے اترتے ہوئے پاؤں میں ٹیس آئی تو غصہ کی کا حملہ پسا ہوا تھا مگر اب میں پھر غصہ کی محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں لیئوں اور سو جاؤں۔ مگر میں جانتا تھا کہ یہ نیند ہمیشہ کی بھی ہو سکتی تھی۔

وسطی اور جنوبی پنجاب میں مختلف اقسام کے زہریلے سانپ بہت زیادہ ملتے ہیں لیکن پنڈی اور اس کے نواح میں سانپ بہت زیادہ نہیں پائے جاتے اور ان کی بیشتر اقسام زہریلی نہیں ہوتی ہیں۔ مرشد نے یہ زہریلے سانپ خاص طور سے حاصل کر کے یہاں چھوڑے تھے۔ ممکنہ طور پر ان کی خوراک کا خیال رکھا جاتا ہو گا تاکہ یہ تندرست اور توانا رہیں اور مرشد کے لیے چوکیداری کا فرض انجام دیتے رہیں۔ ایک سانپ نے اپنا کارہ منصبی بخوبی انجام دیا تھا۔ اس کا زہر اب مجھے سلانے پر آمادہ تھا اور میں جاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک درخت کی آڑ

سے جب میں کوٹھی کا معائنہ کر رہا تھا تو مجھے ایسا چکر آیا کہ میں تقریباً گر گیا۔ غنودگی سے لڑتے ہوئے جب میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے خود کو ایک گھٹنے اور ہاتھ کے بل زمین پر نکلے پایا۔ نہ جانے میں گرنے پہ کیسے بچا تھا؟ شاید گر جاتا تو سو جاتا۔ سر جھٹک کر میں دوبارہ کھڑا ہو گیا اور کوٹھی کے اگلے حصے کی طرف بڑھا۔ یہ حصہ پورچ اور کرائٹا باڑ سے ڈھکے لان پر مشتمل تھا۔ پورچ تک آنے کے لیے بل کھاتا ہوا ڈرائیو سے تھا جس کے دونوں طرف کرائٹا باڑ لگا کر لان کی پردہ پوشی کی گئی تھی۔ آنے اور جانے کے لیے الگ الگ راستے تھے اور دونوں آکر اس نیم دائرے نما وسیع کار پورچ میں مل رہے تھے جس میں کم سے کم نصف درجن گاڑیاں پارک کی جاسکتی تھیں۔ اس وقت بھی وہاں دواغلی درجے کی نہایت قیمتی کاریں موجود تھیں۔ پورچ کے نزدیک آنے پر مجھے وہاں موجود افراد کا احساس ہوا تھا۔ کم سے کم دو افراد آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ زبان پنجابی اور لہجہ دیہاتی اور نچلے درجے کے افراد کا سا تھا۔ میں نے کان لگا کر سنا ایک کہہ رہا تھا۔ ”رو بے بھاگ چل در نہ ہم بھی مارے جائیں گے۔“

”بھاگ کر کدھر جائیں؟“ رو بے نے سوال کیا۔ ”یہ لوگ سیدھے ہمارے گھر آئیں گے اور جب ہم نہیں ملیں گے تو ہمارے گھر والوں کا کیا ہوگا؟“

”پر یار مجھے ڈر لگ رہا ہے انہوں نے تو کسی کو نہیں چھوڑا۔ جس نے ہتھیار نہیں ڈالے اسے بھی مار دیا اور جس نے ہتھیار ڈالے اسے بھی مار دیا۔“

ان لوگوں کا تعلق غالباً مرشد سے تھا اور وہ فاضلی اینڈ پارٹی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ فاضلی اور اس کے آدمیوں نے یہاں موجود ہر فرد کا خاتمہ کر دیا تھا۔ چھ افراد کی لاشیں میں پول میں دیکھ چکا تھا اور باقی لاشیں پتا نہیں کہاں تھیں؟ اس سے ایک سوال اور میرے ذہن میں آیا کہ فاضلی یوں اندھا دھند قتل و غارت گری کیوں کر رہا تھا۔ اس کی دشمنی مرشد سے اور اس کے خاص آدمیوں سے تھی ان عام لوگوں کا قتل عام بلا جواز تھا۔ یہ لوگ درگاہ میں کام کرتے تھے اور فاضلی ان سے کام لے سکتا تھا یا اگر اسے کوئی خدشہ تھا تو وہ انہیں نکال کر دوسرے آدمی لے آتا۔ انہیں مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سوال کا جواب بھی رو بے نے دیا۔ اس نے کہا۔ ”وہ پاگل ہو رہا ہے، کوٹھی سے ہونے والی فائرنگ میں اس کے تین آدمی مارے گئے اور اسی لیے ہر آدمی کو مار رہا ہے۔“

”ہاں پتا نہیں ہم کیسے بچ گئے، پر مجھے لگ رہا ہے ابھی اس کے آدمی آئیں گے اور ہمیں بھی مار دیں گے۔“ دوسرا رد ہانے لہجے میں بولا۔ ”میں تو ایک معمولی سامالی ہوں۔“

”میں کھانا بنا تا ہوں۔“ رو بے نے کہا۔ ”ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔“

”اس کے ساتھ جو وہ خوفناک آدمی ہے۔ اسی نے سب سے زیادہ لوگوں کو مارا ہے۔“

ان کی باتیں سننے کے لیے میں ذرا گھوم کر ایک کرائٹا باڑ کے پیچھے آ گیا جو پورچ کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور وہ دونوں وہیں موجود تھے۔ کوٹھی پر حملے میں فاضلی کے تین آدمی مارے گئے تھے اور اس نے طیش میں آ کر کوٹھی میں موجود ہر فرد کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے آدمیوں نے جن جن کو سب کو مارا تھا۔ جو کہیں چھپ گئے تھے ان کو تلاش کر کے گولی ماری۔ یہ دونوں فاضلی کے قدموں میں گر گئے تھے اور رو دھو کر فی الحال اپنی جان بچا لی تھی

مگر انہیں خدشہ تھا کہ فاضلی انہیں بھی بخشے گا اور مجھے یقین تھا کہ وہ انہیں مار دے گا۔ وہ دونوں اس قتل عام کے عینی گواہ تھے جو فاضلی کے حکم پر وہاں ہوا تھا۔ اس قتل و غارت گری میں سائلنسر والی رائفلیں استعمال ہوئی تھیں اس لیے کوٹھی سے باہر پتا نہیں چلا کہ اندر کیا ہوا تھا۔ میں جس باڑ کے پاس کھڑا تھا اس طرف سات افراد کی لاشیں پڑی تھیں اور ان میں ایک عورت بھی تھی۔ یہ بھی عام یا خاص ملازم تھے۔

ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے خیال آیا کہ فاضلی سب کو اس لیے مروا رہا تھا کہ کوئی عینی گواہ باقی نہ رہے جو بعد میں اس کارروائی کے بارے میں کہیں، بتا سکے۔ مرشد خاندان کا کچھ پتا نہیں تھا اور خود مرشد کا بھی پتا نہیں تھا۔ اگر وہ فاضلی کے ہتھے چڑھا ہوگا تو زیورہ مکان یہی تھا کہ وہ بھی مارا گیا تھا۔ فاضلی اسے مارنے ہی تو آیا تھا اور اس چکر میں سوے اوپر افراد اپنی جانوں سے گئے تھے۔ ذہن پر جھاتی غنودگی سے بچنے کے لیے میں نے ایک بار پھر اپنا زخم کھریدا تھا۔ اب خون سرخ ہی آ رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ باقی ماندہ زہر دماغ تک رسائی حاصل کر کے اپنا کام کر رہا تھا۔ اگر یہ ایک حد سے زیادہ ہوتا تو مجھے ہمیشہ کی نیند سلا دیتا اور اگر کم ہوتا تو امکان تھا کہ میں بچ جاؤں۔ میں شاہ کوبرا کے زہر سے بھی بچ گیا تھا مگر اس میں کچھ دھل سدھو کی کوششوں کا بھی تھا۔ اس نے مجھے بعض جزی بوٹیاں استعمال کرائی تھیں اور پھر اس وقت میں نے حکیم قادس کی دوائیاں بھی تازہ تازہ نوش فرمائی ہوئی تھیں۔ اس بات کو خاصا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ اب ان دواؤں کا اثر باقی تھا یا نہیں اور وہ زہر کو ناکارہ بنا سکتی تھیں؟

اچانک درگاہ کے سامنے والے حصے سے کسی گاڑی کے انجن کی تیز آواز آئی تھی۔ میں نے ذرا چک کر دیکھا یہ ایک ہندوین تھی جو تیزی سے ڈرائیوے کی طرف آ رہی تھی۔ مجھے سمیت تمام افراد سرگ کے راستے اور پیدل آئے تھے۔ پھر یہ کون ہو سکتے تھے۔ اگر فاضلی کے آدمی گاڑی میں آتے تو وہ سرگ والے راستے سے آ سکتے تھے مگر مجھے خیال آیا کہ سرگ کا آخری حصہ اتنا نہیں کھلا تھا کہ اس سے کوئی گاڑی اندر آ سکتی۔ یہ گاڑی یقیناً سامنے والے حصے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ مین گیٹ لاک تھا مگر کسی نے لاک کھول دیا ہوگا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ وین میرے پاس سے گزر کر پورچ میں رکی۔ اگلے حصے سے دو آدمی اترے اور پھر انہوں نے اس کا عقبی دروازہ کھولا فوراً کسی لڑکی کی چیخوں اور آدمی کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ وین کے عقبی حصے سے بھی پانچ آدمی نکلے تھے ایک نے ایک لڑکی کو دبوچ رکھا تھا اور اس کا انداز بہت گھٹیا تھا۔ وہ اسے قابو کرنے سے زیادہ اس سے جسمانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ باقی دو نے ایک لڑکے کو قابو کیا ہوا تھا جو خود کو چھڑانے کی از حد کوشش کر رہا تھا۔

لڑکی رومانہ تھی اور لڑکا راشد تھا۔ میرا دل ایک لمحے کو رکا تھا۔ اگر وہ یہاں آ گئے تھے تو میرے ساتھی کہاں تھے؟ اگر انہوں نے کسی ڈیل کے تحت انہیں نہیں چھوڑا تھا تو پھر حویلی میں کیا ہوا تھا؟ فاضلی کے آدمیوں نے انہیں کیسے حاصل کیا تھا؟ یہ سوالات لمحے میں میرے ذہن میں گونجنے اور ایک اشتعال اور دہشت کی لہر نے میرے وجود پر قبضہ کر لیا اس کے بعد میں نے جو کیا وہ جیسے خود بخود ہوا تھا۔ میں نے رائفل بلند کی اور اسے سنگل موڈ پر کر کے پہلے اسے شوٹ کیا جس نے راشد کو پکڑ رکھا تھا وہ سامنے اور کھلا نشانہ تھا۔ گولی اس کے سینے میں اتری اور وہ ڈکرایا۔ اس سے پہلے دوسرے صورت حال کو سمجھتے میں نے دوسرے کو بھی نشانہ بنایا۔ وین سے آگے

سے اترنے والے دونوں افراد نے صورت حال کو سمجھ لیا تھا ایک چلایا۔ ”وہ ادھر باڑ کے پیچھے ہے۔“

انہوں نے بیک وقت اپنے ہتھول نکالے اور میری طرف اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے مگر میں ان کی فائرنگ سے بے نیاز اس شخص کو نشانہ بنا رہا تھا جس نے رومانہ کو بہت مستی میں پکڑ رکھا تھا اور اپنے ساتھیوں کو مرتے دیکھ کر اس کی ساری مستی ہوا گئی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور وہ وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور اسی عالم میں گولی نے اس کے سر میں سوراخ کر دیا۔ اس کا لہو اچھل کر رومانہ پر گرنا اور اس نے چیخ ماری۔ وہ دیوانہ وار اپنے چہرے پر آنے والا خون صاف کر رہی تھی اور پھر اچانک وہ کوٹھی کی طرف بھاگی۔ راشد جو حیران پریشان کھڑا تھا رومانہ کو بھاگتے دیکھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ نے چلا کر انہیں رکنے کے لیے کہا مگر فائرنگ کے شور میں میری آواز ان تک نہیں پہنچی تھی یا پہنچی بھی تو انہوں نے اسے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔

گولیاں میرے آس پاس سے گزر رہی تھیں مگر ابھی تک کوئی مجھے چھو نے کا میاب نہ ہو سکی تھی۔ البتہ ان دونوں کو مزید موقع ملتا تو وہ مجھے نشانہ بناتی لیتے اب تک تو وہ بدحواسی میں فائرنگ کر رہے تھے اور انہوں نے ڈھنگ سے نشانہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے رائفل کو آٹو میٹک موڈ پر کرتے ہوئے ان دونوں پر ایک طویل برسٹ مارا اور وہ چھلنی ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے گرتے ہی وہاں سناٹا چھا گیا۔ میں نے باڑ چھلانگی اور راشد کو آواز دی۔ درمیان میں وین اور دوسری گاڑیاں تھیں۔ وہ دونوں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ وین سے اترنے والے پانچ میں سے تین مارے جا چکے تھے اور دو زندہ تھے۔ ان میں سے ایک نے خودکشی کر لی اس نے اپنا ہتھول نکالا جو اسے نہیں نکالنا چاہیے تھا اور میں نے میگزین میں بیج جانے والی گولیاں اس پر چلا دیں۔ آخری آدمی بے ہوش تھا اور جاگتی میں تھا کیونکہ اس کا سینہ سانس لینے کی کوشش میں اچھل رہا تھا۔ میں آگے بڑھا تو رو بے اور اس کا ساتھی پوربج کے کونے میں دیکھے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر رو بے مگھلایا۔

”خدا کے لیے ہمیں نہ مارنا۔“

”وہ لڑکا اور لڑکی کہاں گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا میرا نہیں مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر میں نے رائفل کو دھمکانے والے انداز میں سامنے ہی رکھا تھا۔ ان دونوں نے اپنے ہاتھ اوپر کر رکھے تھے۔ دوسرا بولا۔

”وہ جی اندر چلے گئے ہیں۔ رومانہ بی بی اور راشد صاحب۔“

گویا وہ انہیں جانتے تھے اور کیسے نہیں جانتے، ایک مرشد کی دختر تھی اور دوسرا اس کا بھتیجا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ”یہاں سے چلے جاؤ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔“

”ہم کہاں جائیں گی؟“ رو بے نے پوچھا۔

”اپنے گھر جاؤ اگر فاضلی بعد میں پوچھے تو کہہ دینا کہ ایک آدمی نے حملہ کیا تھا اور تم ڈر کر بھاگ گئے تھے۔“

انہوں نے سر ہلایا اور بیج دوڑ لگا دی۔ ان کا رخ سامنے والے حصے کی طرف تھا۔ میں نے پلٹ کر وین کی طرف دیکھا۔ اس کے پاس پانچ افراد پڑے تھے یعنی یہاں مزید پانچ لاشوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اندر کی طرف بڑھا اور جب برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو مجھے لگا جیسے میرے قدم منوں وزنی ہو رہے ہوں۔ میری رگ و پے میں جیسے سستی اور تھکاوٹ سرایت کر رہی تھی۔ جیسے تیسے میں اس شاندار برآمدے میں آیا جہاں ایک

طرف ماربل کی میز کے گرد دھات اور قابہر کی کرسیاں رکھی تھیں۔ یہاں تین دروازے تھے ایک بڑا دروازہ جو دو پٹ کا تھا اور اس کے دائیں بائیں ذرا فاصلے پر دو چھوٹے دروازے تھے اور یہ سب کیل کی مضبوط ترین لکڑی کے بنے تھے اور ان پر دو دھیا رنگ کی پالش تھی۔ اس کوئی کی ایک ایک چیز سے امارت فک رہی تھی۔ درمیان والا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر میں اس سے اندر نہیں گیا۔ روانہ اور راشد کو اندر گئے ہوئے مشکل سے ایک منٹ ہوا تھا مگر اب ان کی آواز نہیں آرہی تھی۔

کیا وہ فاضلی کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے یا صورت حال بھانپتے ہوئے کہیں خاموش ہو کر دبے ہوئے تھے؟ یہ ناممکن تھا کہ اندر موجود افراد کو باہر ہونے والے ہنگامے کا علم نہ ہوا ہو۔ میری رائفل بے آواز تھی مگر دین والوں کے پستول بے آواز نہیں تھے۔ فائرنگ کی آواز اندر تک پہنچی ہوگی۔ ایسے میں منہ اٹھائے سامنے والے دروازے سے اندر جانا مسئلہ مندی نہیں تھی۔ غنودگی کا اثر میری سوچنے کی صلاحیت پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا اور مجھے فیصلہ کرنے میں ذرا دیر لگی کہ مجھے دائیں طرف سے جانا چاہیے یا بائیں طرف سے۔ بالآخر میں بائیں طرف بڑھا۔ یہاں بھی مارا ماری کے آثار نمایاں تھے دیواروں پر گولیوں کے نشانات تھے اور کئی جگہوں پر اچھا خاصا خون پھیلا ہوا تھا ایک جگہ خون کے ساتھ مغز کا کچھ حصہ بھی پڑا تھا۔ گولی نے کسی کا دماغ نکال دیا تھا۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مجھے ہلکی کا احساس ہوا اور پھر میں نے بے ساختہ جھکتے ہوئے الٹی کر دی تھی۔

پیٹ سے پانی نکلا تھا کیونکہ کچھ کھائے ہوئے مجھے خاصی دیر ہو گئی تھی اور میں نے یہاں صرف پانی اور کوئلہ ڈرنک پٹی تھی۔ الٹی کر کے مجھے سکون سا محسوس ہوا تھا اور ذہن پر جمائی غنودگی بھی کم ہونے لگی تھی۔ شاید زہر کا کچھ حصہ الٹی کے ساتھ نکل گیا تھا۔ چند گہری سانس لے کر میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس مضبوط دروازے کو ہلانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اب اندر جانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے رائفل کی نال لاک پر رکھ کر فائر کرنا چاہا مگر رائفل کلک کر رہ گئی۔ اس کا میگزین خالی ہو گیا تھا۔ میں نے دوسرا میگزین نکالنا چاہا تو ہتھ چلا کہ میرے پاس کوئی میگزین نہیں رہا تھا وہ اس ہنگامہ آرائی میں کہیں گر گیا تھا کیونکہ میں نے دو ہی استعمال کیے تھے اور ایک باقی تھا۔ مجھے کسی اور کے میگزین لینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اب میرے پاس صرف ایک پستول اور اس کا ایک فاضل میگزین تھا۔ میں نے رائفل نیچے ڈال دی اور پستول کی نال تالے پر رکھ کر فائر کیا۔ دھماکے کے ساتھ تالے کے انجر بنجر ڈھیلے ہو گئے اور اس بار لٹو کھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

میں اندر داخل ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال وے تھا۔ یعنی ہال نما راہداری، جس میں کچھ فرنیچر بھی تھا دیواروں پر آرٹ اور فن کے اعلیٰ نمونے آویزاں تھے۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور ہال وے کے ایک طرف قطار سے کمرے تھے۔ ان کی تعداد چار تھی۔ یہاں فانوس روشن تھے اور ایک ایک چیز واضح نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر سن گن لیتا رہا مگر وہاں خاموشی تھی۔ پھر میں دبے قدموں ایک کمرے تک آیا اس کا دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ لاک نکلا۔ دوسرا اور پھر تیسرا کمرہ بھی لاک تھا۔ ہال وے آگے جا کر گھوم رہا تھا۔ میں نے چوتھا دروازہ چیک نہیں کیا اور اس کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور کسی نے مجھے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ میں بالکل تیار نہیں تھا اس لیے بے اختیار کھینچا چلا گیا اور کسی نے آگے ٹانگ اڑائی تو منہ کے بل زمین پر گیا۔ اگر فرش پر دبیز قالین نہ ہوتا تو مجھے تارے نظر آتے مگر اب بھی پکڑ ضرور آیا تھا اور اس سے فائدہ اٹھا کر وہاں موجود افراد نے مجھے قابو کرنے

کی کوشش کی تھی۔ البتہ ان کا انداز اناڑیانہ تھا۔ ایک نے میرا بازو پکڑ کر پیچھے کھینچا اور دوسرے نے دوسرا بازو پکڑا اور انہوں نے خود مجھے اٹھا دیا۔ حالانکہ ان کو چاہیے تھا مجھے گرا کر قابو کرتے۔ کھڑے ہوتے ہی میں نے ایک کے منہ پر کہنی ماری اور اس نے چلا کر اپنی والدہ کو یاد کیا۔

”ہائے ماں جی۔“

”ماں کے.....“ دوسرے نے چپ کر غلط انداز میں اس کی والدہ کو یاد کیا۔ ”ٹھیک سے پکڑ..... ہائے۔“ اس دوران میں، میں دوسرے کے گھٹنے پر اپنے بائیں پاؤں کی ایڑی مار چکا تھا اور جملے کے آخر میں ہائے اسی کی وجہ سے نکلی تھی۔ کہنی کا وار زیادہ شدید تھا اور پہلے والے کے سامنے کے دانت جواب دے گئے تھے۔ اس نے مشتعل ہو کر میری شان میں مدح سرائی کی تو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا اس لیے مجھے آسانی ہوئی اور میں نے دونوں کے ہاتھ پکڑ کر انہیں یوں چکر دینے کہ میں خود درمیان میں تھا اور وہ میرے گرد گھوم رہے تھے۔ وہ حرکت کرنے پر مجبور تھے ورنہ ان کی کہنیاں اپنے جوزوں سے نکل جاتیں پھر میں نے انہیں بیک وقت چھوڑا۔ ان میں سے ایک تقریباً ڈکڑ رینگ ٹیبل کے شیشے سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ چمٹنا پڑا ہو گیا۔ کم سے کم اس کی چیخ و پکار سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ دوسرے کو جو اصل میں پہلا تھا اور اپنے کچھ دانتوں سے محروم ہو چکا تھا۔ میں نے مزید ایک چکر دے کر کونے میں رکھے لمپ کی طرف پھینکا اور وہ اس کے ساتھ نیچے گرا۔

اس دوران میں پہلا والا کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے بدستور چیخیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کے پیٹ پر لات ماری تو وہ پھر ڈرینگ ٹیبل کے لمپے پر جا گرا۔ لمپ کے ساتھ گرنے والا کچھ دیر تو لمپ کی طرح بجا پڑا ہا پھر حرکت میں آیا مگر اس کی حرکت سلوموشن میں تھی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا جس سے اس کی حرکت میں خاطر خواہ تیزی آئی۔ اسے چکر دیا تو تصادم سے پہلے ہی اس نے ہو ہو کی آواز نکالی اس بار میں نے اسے اس کے ساتھی پر پھینکا اور اس سے ٹکرا کر وہ لمبا ہوا تو ایک ہی صف میں دونوں پڑے تھے۔ جب میں نے پہلی بار ڈرینگ ٹیبل سے ٹکرانے والے کا منہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر خون ہی خون تھا اور آنکھوں میں شیشے کھپ گئے تھے۔ میرے روٹنے کھڑے ہو گئے نہ جانے وہ کیسے ٹکرایا تھا کہ شیشے ٹوٹ کر اس کی آنکھوں میں کھس گئے تھے اور وہ اسی لیے چیخ و پکار کر رہا تھا۔

مگر مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ وہ یہاں میری دعوت کے لیے نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے جس طر ح حملہ کیا اس سے لگ رہا تھا وہ میرے خاتمے کے مشن پر تھے۔ میں نے دانتوں سے محروم شخص کو کھینچ کر کھڑا کیا اور اس کی تلاشی لی۔ وہ جھول رہا تھا اور درحقیقت، دونوں ہی بہت کم حوصلہ غایت ہوئے تھے۔ اتنی مار پیٹ معمولی بات تھی اور وہ اسی میں بے حال ہو گئے تھے۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور دوسرا بھی خالی تھا۔ میں نے اسے تھپڑ مارا۔ ”کون ہو تم؟“

جواب میں اس کے منہ سے جو نکلا وہ کچھ یوں تھا۔ ”میں..... زنی..... زامی..... زوں۔“

میں نے جواب واضح کرنے کو کہا مگر ہر بار اس نے وہی زے کی بولی بولی اور میں پچھتا گیا کہ اسے دانتوں سے کیوں محروم کیا۔ مجبوراً مجھے اندھے ہو جانے والے سے رجوع کرنا پڑا اس سے پہلے میں نے بے دانت کے

منہ پر ایک گھونسہ رسید کر کے اسے لٹا دیا یقیناً اس کے مزید کچھ دانت اسے داغ مغارت دے گئے تھے۔ زنجی اب کراہ رہا تھا۔ میں نے اسے کھڑا کیا اور اس کی بھی تلاشی لی۔ اس کے پاس سے ایک عدد کھلے والا چاقو نکل آیا جو بٹن دبانے سے کھلتا تھا۔ انہیں نہتا پا کر مجھے پہلی بار شبہ ہوا کہ وہ فاضلی کے آدمی نہیں تھے بلکہ مرشد کے ملازم تھے اور قتل و غارت گری کے بعد یہاں چھپ گئے تھے۔ جلد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ بے دانت کا اصل میں مرشد کا حقہ بردار تھا اور آنکھوں سے محروم ہو جانے والا مالشیہ تھا۔ مرشد جب رات بھر شراب اور شباب سے شغل کر کے بے حال اور کمزور ہوا ہو جاتا تو یہ مالشیہ ہی تھا جو اس کی زبردست مالش کر کے اسے دوبارہ کسی قابل بناتا تھا۔

حقہ بردار کا کام نازک مگر آسان تھا۔ وہ مرشد کے لیے خاص تمباکو لینڈ کر کے حقے میں جماتا تھا۔ مالشیہ نے بتایا کہ جب کوٹھی پر حملہ ہوا تو وہ اس کمرے میں چھپ گئے تھے۔ بہت دیر بعد فائر کی آواز آئی اور میں اندر داخل ہوا تو انہوں نے مجھ پر قابو پا کر یہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا مگر بد قسمتی سے وہ خود میرے قابو میں آ گئے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے غلط لوگوں پر ہاتھ اٹھایا مگر یہ وقت افسوس کا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے مزید معلومات حاصل کرنا جاری رکھی۔ وہ عام سا ملازم تھا ورنہ اتنی آسانی سے مجھے یہ سب نہ بتاتا دیے اسے اپنی آنکھوں کی بہت فکر تھی۔ وہ ہر سوال کا جواب دے کر آخر میں یہ ضرور پوچھتا تھا کہ اس کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی اور میں ہر بار اسے تسلی دیتا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے حاصل شدہ معلومات سے یہ بات سامنے آئی کہ مرشد نے اپنے تمام اہل خانہ کو شہر میں مرشد ہاؤس بھیج دیا تھا۔

یہاں مرشد خود صرف چند ملازمین اور بے شمار مسلح افراد کے ساتھ تھا۔ درگاہ اور کوٹھی میں کام کرنے والے سو کے قریب ملازمین کو چھٹی دے کر گھر بھیج دیا گیا تھا اور یہاں مشکل سے دو درجن ملازم تھے۔ ان کے علاوہ منڈ کے تیس سے پینتیس خاص محافظ اور ان سے زیادہ باہر سے منگوائے ہوئے مسلح افراد تھے۔ روز کے جانے والے ملازم محرم راز تھے اور وہ بھی مسلح تھے۔ میں نے سنی کر کسی قدر اطمینان محسوس کیا تھا۔ یعنی یہاں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو عام ہو۔ میرے دل پر وہ جو بھکم ہونے لگا جو اتنی اموات دیکھ کر فطری طور پر آ گیا تھا۔ کچھ بے گناہ بھی مارے گئے تھے مگر زیادہ تر اسی انجام کے مستحق تھے۔ وہ اب تک شرافت سے جواب دے رہا تھا پھر اس نے اپنی آنکھوں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی اور اس میں جیسے شبہ ہاتھ پر لگے تو وہ چیخ اٹھا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”یہ شیشے ہیں جو تمہاری آنکھوں میں اتر گئے ہیں۔“ میں نے اسے آگاہ کیا مگر میری توجہ اس کی طرف نہیں بلکہ باہر سے آنے والی آہٹوں پر تھی۔ میں اس سے بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا کیونکہ میرے ذہن میں تھا کہ اس پاس فاضلی کے گرگے موجود ہوں گے۔ اسے بھی آہستہ آواز نکالنے کو کہا تھا اسی لیے میں باہر سے آنے والی آوازیں سننے میں کامیاب رہا۔ وہ چپ ہوا تو باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی اور میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے ٹپ کر ہاتھ ہٹانا چاہا مگر میں نے اسے جکڑ لیا۔ اس بار میں نے واضح کسی کو بولنے سنا تھا۔ میں نے اس کے کان میں کہا۔ ”شش..... باہر کوئی ہے اب آواز مت نکالنا..... ورنہ دونوں ماریں جائیں گے۔“ مگر وہ جس طرح پھل رہا تھا اگر میں اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیتا تو اس نے لازمی داویلا کرنا تھا۔ زنجی ہونے سے زیادہ آنکھوں سے محرومی کے صدمے نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ میری بات کا اس پر کوئی اثر

نہیں ہوا تو خطرہ محسوس کر کے میں نے اسے خاموش کرنے کے لیے اس کے سر پر ایک ہاتھ مارا۔ وہ ڈھیلا ہوا تھا مگر اس کی مزاحمت ختم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ دوسرے ہاتھ پر وہ بے سدھ ہو گیا۔ اسے زمین پر ڈال کر میں دروازے کے پاس آیا اور کان لگا کر سنا تو باہر دو افراد سرگوشیوں میں مچھو گفتگو تھے۔ البتہ ان کی سرگوشیاں بھی اتنا بلند تھیں کہ مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ”آواز اسی کرنے سے آئی ہے۔“

”اب کیوں نہیں آرہی ہے؟“ دوسرے نے سوال کیا۔

”شاید اندر موجود لوگوں نے ہماری آواز سن لی ہے۔“

”تو اتنی زور سے بولنے کی کیا ضرورت تھی؟“ دوسرے نے اپنا طارق عزیز شو جاری رکھا یعنی سوالات

کرتا رہا۔

”اپنی بکواس بند کر۔“ پہلے نے کہا۔ ”دروازہ کھول۔“

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اب مجھے ذرا شبہ نہیں تھا کہ باہر موجود دونوں افراد فاضلی کے آدمی تھے۔ میں نے پستول سیدھا کیا اور یکے بعد دیگرے کئی گولیاں اندازے سے چلائیں۔ جواب میں ایک چیخ سنائی دی تھی۔ چوتھی گولی چلاتے ہی میں دیوار کی آڑ میں ہو گیا اور فوراً ہی باہر سے برسٹ دروازے کو چھلنی کرتا اندر آیا اور بے سدھ پڑے بے دانت کے حقہ بردار کو چھلنی کر گیا۔ وہ بے ہوشی میں ہلکا سا ٹپ کر ساکت ہو گیا۔ بالمشے کو میں نے ذرا ہٹا کر لٹایا تھا اس لیے وہ بچ گیا۔ فائرنگ کرنے والے نے اس زاویے سے گولیاں چلائی تھیں کہ گولیاں میری مخالف سمت میں گئی تھیں اور مجھے لگا وہ اب دوسری طرف سے فائرنگ کرے گا تاکہ کمرے کا زیادہ سے زیادہ حصہ کور کر سکے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے فرش پر قلابازی کھائی اور دوسری طرف چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے پھر برسٹ چلا اور اس بار گولیاں اس طرف آئیں جہاں میں دیوار سے دبا ہوا تھا۔ بچنے والا نہایت شاطر تھا اور اس نے درست قدم اٹھایا تھا۔

مجھے ہی اس نے فائرنگ روکی میں نے ہاتھ آگے کر کے اندازے سے اس طرف دو فائر کیے۔ اس بار بھی چیخ سن کر میرا دل باغ باغ نہیں ہوا کیونکہ وہ اپنی عیاری ثابت کر چکا تھا اس لیے میں دروازے کے سامنے آنے کے بجائے پیچھے ہٹا اور پھر نیچے گرنے والا گولی کا خول اٹھا کر دروازے پر مارا ہلکا سا کھٹکا ہوا اور باہر سے اس نے پھر پور برسٹ چلایا۔ وہ صرف سامنے ہی نہیں بلکہ دائیں بائیں بھی فائر کر رہا تھا۔ اس کا شکار اندھا ہو جانے والا بالمشے ہوا تھا وہ اٹھ رہا تھا کہ فائرنگ کی زد میں آ گیا اور دل خراش چیخ کے ساتھ دوبارہ لیٹ گیا۔ فائرنگ کرنے والے نے ایک گالی دی اور دروازے پر لالت مار کر اندر آیا۔ اس نے آتے ہی اندر پڑے دو افراد پر پھر برسٹ مارا حالانکہ وہ پہلے ہی دنیا سے گزر چکے تھے۔ میری موجودگی کا اسے ذرا تاخیر سے احساس ہوا اور پھر وہ غمزدہ ہو گیا۔ میں نے پستول تان رکھا تھا اور بالکل ساکت تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”رائفل نیچے رکھ کر دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا، آگے تمہاری مرضی ہے۔“

میں نے کہا تا وہ عیار تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ مجھ سے نہیں جیت سکے گا جب تک وہ رائفل کا رخ میری طرف کرے گا میں، اسے شوٹ کر چکا ہوں گا۔ بادل ناخوابہ اس نے سر ہلایا اور آہستہ سے جبک کر رائفل نیچے رکھ دی اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ میں نے اگلا حکم دیا۔ ”دونوں ہاتھ دروازے سے کھلو اور پاؤں پھیلا

لو۔

اس نے اس بار بھی حکم کی تعمیل کی۔ دروازہ بند ہو گیا تھا اور وہ اس پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور اس کی قمیص سے ایک عدد پستول اور نکل آیا۔ اس کے پاس بھی وہی سائلنسر والی رائفل تھی اس لیے اس کا شور نہ ہونے کے برابر تھا البتہ میرے پستول کا شور خاصا تھا اور اس کی آواز یقیناً کونٹھی کے دوسرے حصوں تک گئی ہوگی۔ اس کی تلاشی لینے ہی میں نے اس کی گدی پر پستول کا دستہ مارا۔ ضرب ہلکی رکھی تھی اس لیے وہ کراہ کر گر کر گر بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک تو وہ میری سفاکی کا اندازہ لگا لے دوسرے مزاحمت کے قابل نہ رہے۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور دو زوردار تھپڑ رسید کیے۔ اس کے حواس ٹھکانے آ گئے اور اس نے احتجاج کیا۔ ”مجھے کیوں مار رہے ہو؟“

”صرف یہ بتانے کے لیے کہ میں کتنا رحم دل ہوں فاضلی کا آدمی ہونے کے باوجود تم کو قتل نہیں کیا۔“ میں نے کہا اور پستول کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔ ”لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں قتل کر نہیں سکتا۔“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ان میں دہشت نمایاں نظر آنے لگی۔ ”کک..... کیا چاہتے ہو؟“

”فاضلی کہاں ہے اور مرشد کس حال میں ہے۔“

”وہ دونوں اوپری منزل پر ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم دونوں کے علاوہ فاضلی کے اور کتنے آدمی ہیں۔“

”سات آدمی ہیں۔“ اس بار بھی وہ جلدی سے بولا۔ ”آٹھواں وہی ہے دیو۔“

اس کا اشارہ باسو کی طرف تھا۔ مجھے جان کر تعجب ہوا کہ مرشد زندہ تھا۔ ”فاضلی نے مرشد کو کیوں زندہ رکھا ہوا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم میری اور صورت کی ڈیوٹی یہاں نیچے تھی۔“

صورت اس کا ساتھی تھا اور وہ باہر چرت پڑا ہوا تھا۔ گولی اتفاق سے اس کے دل سے ذرا نیچے لگی تھی اور وہ ایک چیخ کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ ”نیچے اور کتنے لوگ ہیں؟“

”دو اور ہیں وہ پیچھے کی طرف ہوتے ہیں۔“

گویا اوپر فاضلی کے ساتھ پانچ آدمی تھے اور چھٹا باسو تھا جو اکیلا درجن کے برابر تھا۔ ”تم جانتے ہو یہاں مرشد کی بیٹی اور اس کا بھتیجا آئے ہیں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہم نے انہیں قابو کر کے اوپر پہنچا دیا تھا۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گویا رومانہ اور راشد فاضلی کے ہاتھ چڑھ گئے تھے۔ فاضلی مرشد کے ساتھ اس کے سارے خاندان کا خاتمہ بھی چاہتا تھا سوائے اپنے کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا ایک ان لکھا حصہ تھا۔ جب ڈیوڈ شانے بلا واسطہ فاضلی کی یہ خواہش مجھ تک پہنچائی تب میں اسے محض ایک انتقامی جنون سمجھا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ فاضلی کسی مقصد کے تحت رومانہ اور راشد کو اپنے قبضے میں چاہ رہا تھا اور وہ کامیاب رہا تھا۔ میں نے جلد بازی میں انہیں لانے والوں کو دنیا سے رخصت کر دیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی بچ جاتا تو وہ بتا سکتا تھا کہ انہوں نے رومانہ اور راشد کو کیسے حاصل کیا تھا؟ پھر رومانہ ہسٹریا کا شکار ہو کر کونٹھی کی طرف بھاگی تھی

اس کا رعبہ فطری تھا ہر انسان مشکل وقت میں اپنی جائے پناہ یعنی اپنے گھر کی طرف جاتا ہے۔ اسے علم نہیں تھا کہ اس کا گھر اس کے لیے جائے پناہ کے بجائے عقوبت خانہ بننے والا تھا۔

مجھے ایک بار پھر شدت سے اپنے ساتھیوں کی سلامتی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ تر نوالہ نہیں تھے مگر فاضلی نے جو خوفناک میزائل مجھے دکھایا تھا وہ کسی ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوتا تو وہ لوگ بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا اور اچانک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں لہرا کر گر رہا ہوں اور میں نے اپنی ساری فوجی ارادی اس پر مرکوز کر دی کہ مجھے گرتا نہیں ہے ساکت رہنا ہے۔ مگر شاید یہ ممکن نہیں تھا۔ اس بارز ہر کا حملہ خطرناک اور طاقتور تھا۔ میں نے شاید سانس روک لی تھی اور پھر جس طرح اچانک اندھیرا چھایا تھا اسی طرح اچانک ختم بھی ہو گیا اور میں نے خود کو اسی حالت میں پا کر خدا کا شکر ادا کیا ورنہ یہ عیار دشمن اب تک میرا کام تمام کر چکا ہوتا۔ میں اس پر جھکا ہوا تھا اور پستول اس کے ماتھے پر رکھا ہوا تھا۔ البتہ وہ الجھ گیا تھا شاید اس نے میری کیفیت میں تغیر بھانپ لیا تھا مگر یہ نہیں جاسکا کہ میں بالکل اندھا ہو گیا تھا۔ میں نے پستول کی نال اس کے ماتھے سے ہٹائی اور اچانک گھبرا کر اسے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ اس کا سر گھوما اور وہ بے ہوش گیا۔ اس سے پہلے میں بے ہوش یا ناکارہ ہو جاتا اسے بے ضرر کرنا لازمی تھا۔ میں اٹھا اور بڑی مشکل سے اٹھا مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی ہو۔

میں نے اس کی رائفل قالین سے اٹھائی۔ اس کا ایک اضافی میگزین اس کے لباس میں تھا وہ بھی نکال لیا اور پھر دروازے کے پاس آکر یاہر کی سن گن لی۔ بہ ظاہر وہاں سناٹا تھا مگر یہ سناٹا غیر فطری تھا کیونکہ فائرز کی آواز نیچے موجود مزید دو افراد نے لازمی سن لی تھی اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے ساتھی کہاں گئے تھے؟ اس لیے وہ اب اسی طرف آئے ہوں گے اور باہر گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ دشمن کو بے خبر کرنے کے لیے میں نے آزمودہ طریقہ آزمایا اور نوٹ جانے والے نیبل لیپ کا تار کھینچ کر چاقو سے اس کا ایک کلڑا کاٹ کر اس کے دونوں سرے چھیلے اور پھر کرے کے سوچ بورڈ کے ساکٹ میں ڈال کر بن دبا یا تو شعلہ لپکا اور کر اتار ایک ہو گیا۔ میں نے نائٹ ویژن آنکھوں پر کی اور ذرا سا دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ وہاں بھی تاریکی تھی یعنی اس جگہ کا فیوز ایک ہی تھا۔ البتہ عمارت کے دوسرے حصوں میں الگ فیوز ہی ہوتے۔ شاید اس جگہ کی وائرنگ پرانی تھی ورنہ اب تو ایسا فیوز سسٹم آگیا ہے کہ ہر کمرے کا الگ فیوز ہوتا ہے اور کسی خرابی یا شارٹ ہونے کی صورت صرف اسی کا فیوز اڑتا ہے۔

میں باہر آیا ہال دے کے آخری حصے میں روشنی جھلک رہی تھی اور یہ عام روشنی نہیں بلکہ نائٹ ویژن سے نظر آنے والی انفراریڈ شعاعیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا اس طرف کوئی زندہ فرد موجود تھا جس کا جسم حرارت خارج کر رہا تھا۔ میں دے قدموں اس طرف بڑھا تو کوئی دبی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”ادھر روشنی بند ہو گئی ہے جی..... نہیں جی پوری جگہ کی بند ہوئی ہے۔“

دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بولنے والا شاید ریڈیو پر کسی کو اطلاع دے رہا تھا۔ میں نے کونے سے جھانک کر دیکھا تو ایک شخص دیوار سے ٹکا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی مگر اس کی توجہ نہیں تھی اور تاریکی میں ہمیں اسے نظر بھی کہاں آتا۔ میں نے رائفل سیدھی کی اور اس کے سامنے آیا تھا۔ شاید اس کی چھٹی جس نے

اسے چونکایا اور اس نے جلدی سے رائفل سیدھی کرنا چاہی لیکن اس سے پہلے میں گولی چلا چکا تھا۔ میں نے اس کے دائیں بازو کا نشانہ لیا تھا مگر گولی بازو چھیدتی ہوئی جسم میں اتر گئی۔ اس نے ایک جھٹک لیا اور دیوار کے ساتھ پھسلتا ہوا نیچے گر گیا۔ میں نے لات مار کر اس کی رائفل دور پھینک دی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور یہ ظاہر وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے کان پر لگا ہوا ریڈیو اتار دیا یہ جدید قسم کا چھوٹا سا ریڈیو تھا جو کان میں فٹ ہو جاتا تھا اس کی ریخ زیادہ نہیں تھی۔ میں نے کان سے لگایا مگر دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ریڈیو پھینک کر میں سیدھا ہوا تو پھر چکر آیا تھا اور مجھے دیوار کا سہارا لینا پڑا تھا اور نہ اس بار شاید میں گر جاتا۔

دیوار کے سہارے آگے بڑھا۔ ابھی مجھے دینچے ایک فرد سے اور نمٹنا تھا تب ہی میں اوپر جا سکتا تھا۔ صورت حال خاصی مشکل تھی میں پہلے ہی فاضلی کا قیدی تھا اور اب مجھے سانپ نے بھی ڈس لیا تھا اس کا زہر مجھے ناکارہ کر رہا تھا اور مجھے سات مسلح افراد سے نمٹ کر فاضلی کو قابو کرنا تھا تاکہ یہاں سے نکل سکوں۔ بد ظاہر یہ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے برابر لگ رہا تھا۔ مگر اپنی جدوجہد کے دوران میں نے ایک سبق اچھی طرح سیکھ لیا تھا کہ مجھے حالات اور امکانات سے قطع نظر عمل کرنا چاہیے۔ آگے راہیں نکالنے والا اوپر بیٹھا تھا۔ یعنی کسی بھی حال میں مایوس ہو کر جدوجہد ترک نہیں کرنی ہے۔ ویسے بھی میں پختہ دل سے مایوسی کو کفر سمجھتا ہوں۔ اس لیے اس حال میں بھی فاضلی تک پہنچنے اور اسے قابو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ہال وے اس طرف گھومنے کے بعد پتلی سی راہداری کی صورت اختیار کر گیا تھا اس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ آخری حصے میں ایک لاؤنج جیسا نظر آ رہا تھا اور وہاں ہلکی روشنی تھی۔ فیوز صرف اسی حصے کا اڑا تھا۔ میں راہداری کے وسط میں تھا کہ دوسرا فرد اچانک ہی لاؤنج کی طرف سے نمودار ہوا اور میں نے غلت میں اس پر فائر کیا۔ اسی وجہ سے وہ بچ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا۔ مگھانے اسے چونکایا اور وہ تیزی سے واپس آڑ میں گیا تھا۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی میں غلت میں پسپا ہوا کیونکہ یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ بچنے کے بعد وہ چند سیکنڈ بعد واپس آیا اور اس نے راہداری میں رائفل کر کے برست چلایا۔ میں اس سے پہلے ہی گر گیا تھا اور گولیاں میرے اوپر سے گزریں اور کچھ میرے آس پاس فرش پر لگی تھیں اس نے اندھی فائرنگ کی تھی کیونکہ وہ خود آڑ میں تھا۔ اس نے صرف ہاتھ نکال کر اندازے سے برست مارا تھا۔

میں لینے لینے پیچھے کی طرف سرکا۔ پیچھے جانے کے دوران پہلے آدمی سے لکرایا جو دیوار سے ٹکا بیٹھا تھا میں اس کے دوسری طرف چلا گیا اور اس کی آڑ میں دوسرے برست سے بچ گیا۔ چند گولیاں اسے لگی تھیں اور اس نے جھٹک لیا مگر ہلانہیں۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ اتنی گولیاں لگنے کے بعد اس کا بچنا مشکل ہی تھا۔ یہاں ہر فرد کے بعد دیگرے موت کا شکار ہو رہا تھا اور چند ایک خوش نصیب تھے جو زندہ بچے تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ میں اس کی آڑ میں ہی پیچھے سرکا اور پھر ہال وے میں آ گیا۔ ایک بار پھر میں بچا کیونکہ میری طرف سے جواب نہ پا کر اس نے سامنے آ کر اس بار سیدھی فائرنگ کی۔ جیسے ہی وہ رکا میں نے اسی کے انداز میں رائفل آڑ سے نکال کر اندھا برست مارا۔ میری طرح وہ بھی بچ گیا اور تیزی سے آڑ میں ہو گیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہو۔ رگوں میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں سن کی سی کیفیت میں تھے۔ میری حالت اس شرابی کی سی تھی جس نے

اوقات سے زیادہ پی لی ہو۔ سرگھوم رہا تھا اور حواس قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ یہ شاید زہر کا مزید کوئی اثر تھا کیونکہ اب تک اس نے سوائے نیند طاری کرنے کے مجھے اور کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ یہ بھی تکلیف نہیں تھی بلکہ بے چینی تھی جو گرمائش اور سنسنائٹ کے ساتھ جسم میں پھیل رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے ہال دے کی دیواریں اور وہاں رکھا ہوا سامان متحرک ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسی طرح بیٹھا رہا تو سو جاؤں گا یا حواس گم کر بیٹھوں گا۔

اس لیے میں کھڑا ہو گیا اور ہال دے کے دوسری طرف بڑھا اس کا ایک دروازہ یقیناً کوشی کے مرکزی دروازے کی طرف کھل رہا تھا اور اس طرف نہ جانے کیا تھا۔ فاضلی کے آدی ریڈیو سے آپس میں منسلک تھے اس کا مطلب تھا کہ اوپر والوں کو نیچے جاری جنگ کا علم ہو گیا تھا اور ان کی طرف سے مزید ملک روانہ کر دی گئی ہوگی۔ یہ امکان بھی تھا کہ اس دروازے کے باہر فاضلی کے گر گئے گھات لگائے بیٹھے ہوں کہ میں نمودار ہوں اور وہ میرے جسم میں چند عدد سوراخوں کا اضافہ کر دیں۔ اب فاضلی واضح طور پر میرے خاتمے پر قتل گیا تھا۔ اس لیے میں اسی دروازے سے باہر آیا جس سے اندر داخل ہوا تھا۔ کھلی فضا میں آنے کے بعد بے چینی کا احساس کم ہوا تھا۔ گہری بڑھ رہی تھی اور سنسنائٹ کچھ زیادہ ہی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ایسی سنسنائٹ تھی کہ میں ہاتھ کو

سرسے اٹھ سے چھو تا تو ہلکا سا کرنت لگتا تھا۔ نہ جانے یہ زہر کا اثر تھا یا نہ کیا تھا؟

برآمدے میں ماربل ٹیبل پر ایک منرل واٹر کی بوتل رکھی تھی پہلے میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا مگر اب اندر کی آگ سے گھبرا کر میں نے اسے اٹھایا اور منہ سے لگا کر اس وقت تک پیتا رہا جب تک آخری قطرہ بھی حلق سے نہیں اتر گیا تھا۔ تقریباً پون لیٹر پانی پی کر مجھے سکون ملا تھا اور اندر ابھرتی آگ میں کمی محسوس ہوئی تھی۔ ہاتھ پیروں کی سنسنائٹ بھی کم ہوئی تھی۔ میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ چند گہرے سانس لے کر میں مرکزی دروازے سے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ بھی لاک تھا اور اسے بھی کھولنے کے لیے گولی کا سہارا لینا پڑا۔ البتہ اب میرے پاس خاموش رائفل تھی اس لیے یہ کام خاموشی سے ہو گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو یہ ایک بڑی نشست گاہ ثابت ہوئی تھی۔ شاندار قسم کے صوفوں اور فرنیچر سے مزین یہ جگہ خالی تھی۔ یہاں ہلکی روشنی کے قہقے روشن تھے اور کچھ خواب ناک سا ماحول تھا یا پھر میری جو کیفیت تھی تو مجھے خواب ناک لگ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا وہیں کسی دبیز صوفے پر گر جاؤں اور سو جاؤں۔

اس دلی خواہش کو رد کرنے کے لیے میں خود کو خبردار کر رہا تھا کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے اور مجھے اپنی زندگی کھونے سے گریز کرنا چاہیے۔ مجھے خود سے لڑنا پڑ رہا تھا اور جب میں نے خود سے لڑائی کی تو مجھے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ نفس سے لڑنے کو جہاد اکبر کیوں کہا جاتا ہے۔ میں آگے بڑھا تو میرے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ پاؤں جیسے بے جان ہوئے جا رہے تھے۔ ایک صوفے کے پاس سے گزرتے ہوئے میں کچھ زیادہ ہی لڑکھڑایا اور پھر صوفے پر گرا۔ وہاں سے میں لڑکھ کر قالین پر آ گیا۔ رائفل کی ٹالی گلاس ٹاپ ٹیبل سے ٹکرائی اور خاصی بلند آواز آئی تھی۔ اس آواز نے دشمن کی رہنمائی کی اور وہ نشست گاہ کی طرف آیا تھا۔ مجھ میں کھڑے ہونے کی تاب نہیں تھی رائفل اٹھا تا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ دشمن اندر آیا تو کسی چیز سے ٹکرایا اور اس نے بھی اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ دشمن سر پر آ گیا تھا اور میں ہاتھ پاؤں پھیلائے بے بس پڑا تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا صوفے کے دوسری طرف سے نمودار ہوا اور اس نے مجھے دیکھتے ہی رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا

کہ وہ ابھی فائر کھول دے گا۔ مگر اس نے اس کے بجائے ریڈیو پر کہا۔

”وہ مل گیا ہے ادھریوں پر اے جیسے بے ہوش ہو۔“ اس نے دوسری طرف سے جواب سنا اور سر ہلایا۔

پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”چل بھئی تیرا وقت پورا ہو گیا ہے، تیار ہو جا مرنے کے.....“

اس کا جملہ منہ میں تھا کہ صوفے کے ساتھ لگے میرے ہاتھ میں دبے پستول سے فائر ہوا اور گولی صوفے کو چرتی ہوئی اس کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ اسے میری رائفل دکھائی دی تھی اس لیے وہ فطری طور پر مطمئن ہو گیا تھا اور اس نے سوچا نہیں کہ میرے چھپے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہو سکتا ہے۔ اسے اسی کا خیال نہ بھٹکتا پڑا تھا۔ گولی کے جھٹکے سے وہ پیچھے گیا۔ اس نے بے ساختہ رائفل کا ٹریگر دبایا اور برسٹ چلا مگر رائفل کا رخ اوپر کی طرف ہو گیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے اس پر پورا میگزین خالی کر دیا۔ ہر فائر کے ساتھ وہ جھٹکے سے پیچھے جاتا تھا اور ہر بار اس کی رائفل برسٹ مارتی تھی اور اس کا نشہ نشست گاہ کی چھت اور فانوس بن رہے تھے میرے آس پاس لوٹے شیشوں کی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے چہرہ چھپا لیا تھا۔

آخری گولی کے ساتھ ہی اس کی رائفل خالی ہو گئی اور وہ دھپ سے نیچے گرا تو اس کا جسم روح سے خالی ہو چکا تھا۔ وہ صوفے کے دوسری طرف تھا اور میں اسے دیکھنے سے قاصر تھا مگر وہ جس طرح گرا تھا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ میں کچھ دیر لیٹا رہا پھر ہمت کر کے اٹھنے لگا تھا کہ نشست گاہ کے دروازے پر ایک دیو قامت سایا نمودار ہوا اور میں کراہ کر رہ گیا۔ بالآخر فاضلی نے اپنی فوج کا سب سے خطرناک ہتھیار بھیج دیا تھا میری سرکوبی کے لیے۔ میرا پستول خالی ہو گیا تھا اور مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ میں اس کا میگزین بدل سکتا اسی طرح رائفل اٹھانے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اس کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ باسو پر گولی اسی طرح بے اثر تھی جیسے مرد ناداں پر کلام نرم و نازک۔ باسو نے اندر آ کر میرا جائزہ لیا اور پاس آیا۔ میں پھر لیٹ گیا تھا کیونکہ میرا سر شدت سے چکرانے لگا تھا مجھے لگا جیسے باسو گھومتا ہوا میری طرف آیا ہے۔ اس نے جھک کر مجھے دیکھا اور منہ سے سیکڑ کر کچھ سونگھا اور زربولہ بولا۔

”اسٹیک پوائزن..... تمہیں سانپ نے کاٹا ہے؟“



اس نے سوال نہیں کیا تھا بلکہ تجزیہ کیا تھا کہ مجھے سانپ نے کاٹا ہے اس کے باوجود میں نے جواب دینے کی کوشش کی تھی کہ یک لخت تاریکی مکمل ہو گئی اور مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ بالآخر زہر نے مجھ پر غلبہ پالیا تھا۔ مگر یہ غلبہ عارضی تھا چند منٹ بعد میں ہوش میں آنے لگا۔ میں اسی جگہ پڑا ہوا تھا اور باسو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے جسم کی حدت کم ہو رہی ہو اور ذہن پر چھائی غنودگی تیزی سے چھٹ رہی تھی۔ زہر کا اثر زائل ہو رہا تھا مگر کیسے؟ دو منٹ بعد میں اٹھ بیٹھا اور خود کو خاصا بہتر محسوس کرنے لگا تھا میں نے باسو کی طرف دیکھا اور بولے والا تھا کہ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنی زرہ بکتر سے ایک گیس سرنگ نکال کر دکھائی۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ اس نے مجھے یہ انجکشن لگایا تھا یقیناً اس میں اپنی ڈوٹ تھا یعنی سانپ کے زہر کا تریاق اور اسی وجہ سے میں اتنی تیزی سے ٹھیک ہوا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر اٹھایا اور مخصوص لہجے میں غرا کر بولا۔ ”چلو۔“

ذہنی طور پر چاق و چوبند ہونے کے باوجود جسمانی کمزوری باقی تھی باسو کے سہارے کے باوجود میں لڑکھڑا گیا تھا اور اگر اس نے پکڑ نہ رکھا ہوتا تو میں گر جاتا۔ میری حالت دیکھتے ہوئے اس نے مجھے اٹھا کر اپنے شانے پر لا دلیا اور چل پڑا۔ اس کا رخ کونٹوں کے اوپری حصے کی طرف تھا۔ دنیا کو الٹے ہو کر دیکھنا ایک منفرد اور کسی قدر احمقانہ تجربہ ہوتا ہے میں اس وقت اسی تجربے سے گزر رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر آیا جہاں وسیع و عریض لاونچ میں ساری پارٹی موجود تھی۔ فاضلی اپنے مسلح گروں کے ساتھ تھا اور ان کی تعداد اب پانچ رہ گئی تھی۔ ایک طرف کرسیوں پر سرشد، رومانہ اور راشد بندھے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے فاضلی کسی فلمی ولن کی شان سے صوفے پر براجمان تھا اور شغل مے نوشی کر رہا تھا۔ جب باسو نے مجھے نیچے ڈالا تو اس نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ”یہ زندہ ہے؟“

”مرنے والا ہے اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔“ باسو نے لاپرواہی سے کہا تو میں فوری طور پر بے سدھ نظر آنے لگا۔ فاضلی اٹھ کر میری طرف آیا اور اس نے بھی میرے جسم سے آتی بو محسوس کر لی تھی۔ اس نے اسے قریب آنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مجھے کرنٹ لگ جاتا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ورنہ وہ کرنٹ بھی بڑا درد فرساتھا۔ فاضلی نے سر ہلایا۔

”اسے سانپ نے کاٹا ہے۔ یہ یقیناً درختوں کی طرف گیا ہوگا۔ مگر یہ بچا ہوا کیسے ہے وہاں پایا جانے والا

ہر سانپ اتنا زہریلا ہے کہ آدمی منٹوں میں مر جاتا ہے۔ کیوں میں نے ٹھیک کہا نا؟“ فاضلی نے مرشد کی طرف دیکھا۔

”یہ غلط ہے۔“ مرشد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں نے جو سانپ پالے ان میں تم سے زیادہ زہریلا کوئی نہیں ہے۔“

”ہاں کیونکہ میری رگوں میں تمہارا خون ہے۔“ فاضلی بولا۔

مرشد کی زرتار قبائغاب تھی اور وہ اس وقت سادہ شلوار کرتے میں لمبوس تھا۔ اس کے بال جو سلیقے سے بنے ہوتے تھے اس وقت بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر چوٹوں کے نشانات تھے۔ اس کے دائیں شانے سے کرتہ خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد نے بہ نفس نفیس لڑائی میں حصہ لیا تھا اور بہادری سے لڑ کر گرفتار ہوا تھا۔ مرشد خوفزدہ نہیں تھا یا تھا تو ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اس کے برعکس روانہ اور راشد کا خوف سے برا حال تھا۔ خاص طور سے روانہ کا حسین چہرہ بگڑ گیا تھا اور مسلسل رونے سے اس کی آنکھوں کے گرد ورم آ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فاضلی کو انہیں قابو کیے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ مرشد نے کہا۔

”تم چاہتے کیا ہو؟“

”میں تمہیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔“ فاضلی نے بلا جھجک کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں کوئی لاوارث آدمی ہوں جو تم مجھے قتل کر دو گے اور کوئی نہیں پوچھے گا۔“

”کیوں نہیں پوچھے گا لیکن ان نامعلوم قاتلوں سے جو کبھی نہیں ملیں گے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو سب مجھ سے تعزیت کریں گے اور میں بھی تمہاری یاد میں مگر مجھ کی طرح آنسو بہاؤں گا۔ بہر حال مجھ سے کوئی نہیں پوچھے گا۔“ فاضلی نے یقین سے کہا۔ ”میں تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا لیکن اس سے پہلے میں تم سے کچھ کاغذات پر سائن لینا چاہتا ہوں۔“

”اور تمہارا خیال ہے میں سائن کر دوں گا؟“ مرشد نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا میں اتنا ہی احمق ہوں۔“

”تم کرو گے۔“ فاضلی اطمینان سے بولا۔ ”ویسے کیا تم جاننا نہیں چاہو گے کہ میں تم سے کن کاغذات پر سائن کراؤں گا؟“

فاضلی کے دو آدمی سترھیوں کے پاس تھے اور باقی تین ہمارے آس پاس موجود تھے۔ میں ان تینوں سے ذرا فاصلے پر قالین پر پڑا تھا اور باسو میرے سر پر موجود تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے میری جان کیوں بچائی تھی۔ جب کہ اس کا عاضی آقا میری جان لینے کے درپے تھا اور اس وقت بھی مجھے زندہ پا کر اس نے مایوسی کا اظہار کیا تھا اور اگر باسو سانپ کے زہر سے میری متوقع فوٹکی کا اعلان نہ کرتا تو شاید وہ مجھے اپنے ہاتھ سے شوٹ کر دیتا۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ باسو اپنے اصل آقا کی ہدایت کاری کے مطابق میرا تحفظ کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ جب میں فوت نہیں ہوں گا تو فاضلی کا کیا رد عمل ہوگا؟ اور اگر وہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے گا تو باسو کا کیا رد عمل ہوگا؟ اس کا جواب آنے والا وقت ہی دے سکتا تھا۔ یعنی میرے لیے انتظار کرو اور دیکھو کہ پالیسی کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ مرشد نے پہلے کی طرح سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تم مجھ سے میری جائیداد اور دولت کی ملکیت کے کاغذات سائن کراؤ گے۔“

”بالکل اور ساتھ میں ایک وصیت نامہ بھی ہوگا جس کی رو سے میں گدی کا جانشین ہوں گا۔“

مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی گدی پر تمہارا حق تسلیم نہیں کرے گا۔“

”بالکل مانیں گے۔“ فاضلی نے عیاری سے کہا۔ ”اس کے لیے ایک پوری کہانی تیار کی گئی ہے۔ کہانی

کچھ یوں ہے کہ جب میں اعلیٰ حضرت مرشد علی کے گھر پیدا ہوا تو بعض الہامی اشاروں پر مجھے اس غریب مزید جوڑے کے حوالے کر دیا گیا تا کہ میری پرورش غریبوں میں ہو اور میں بچپن سے غریب پرور بنوں۔ الہامی اشارے پر یہ بات سب سے چھپائی گئی اور اب وقت آ گیا ہے کہ اسے ظاہر کیا جائے۔ کیا خیال ہے تمہارے جاہل عقیدت مند یہ سن کر لوٹ پوٹ نہیں ہو جائیں گے۔ تم بھی تو انہیں ایسی ہی کہانیوں سے بے وقوف بناتے آئے ہو۔“

مرشد خاموش رہا تھا لیکن میں فاضلی سے متفق ہو گیا تھا۔ اس ملک میں جعلی پیروں فقیروں کا بزنس اسی وجہ سے چل رہا ہے کہ عوام عقل کے بجائے اندھی عقیدت اور جذبات سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا دین تو سراسر عقل کا ہے۔ اس میں اندھی عقیدت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فاضلی کا دعویٰ بالکل تسلیم کیا جاتا، جب کہ درگاہ کا ہر فرد اسے مرشد کے معتد خاص کی حیثیت سے جانتا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ گدی پر قابض ہوتا تو طاقت بھی اس کے ہاتھ میں ہوتی اور پھر کون اس کے سامنے کھڑا ہو سکتا تھا۔ مرشد کی طرح خود کو تگزیر سمجھنے والے ہر انسان کے لیے اس میں عبرت تھی کہ انسان اپنی زندگی میں چاہے زمین آسمان ایک کر دے مرتے ہی اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ مرشد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم کہانی بنا لو گے لیکن خود کو میری اولاد کیسے تسلیم کراؤ گے؟“

”بہت آسانی سے، ڈی این اے ٹیسٹ اسی لیے تو ہوتا ہے کہ آدمی کے ماں باپ کا پتا چل جائے۔“

گویا فاضلی نے ساری تیاری کر لی تھی۔ مرشد کا چہرہ ست گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس گفتگو میں مداخلت کروں مگر میں تو مارگزیدہ بنا ہوا تھا اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔ مرشد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”یہاں جو قتل و غارت گری ہوئی ہے اس کا کیا جواب دو گے؟“

”مجھے جواب دینے کی کیا ضرورت ہے، کہانی یہ ہوگی کہ دہشت گردوں نے درگاہ پر حملہ کیا اور تم سمیت سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ یہاں وہ ٹولہ موجود ہے جسے تم نے اپنی حفاظت کے لیے بلوایا تھا اور اس کا تعلق ایک کالعدم دہشت گرد تنظیم سے ہے۔ وہ حملہ آور شمار ہوں گے۔ میں زخمی ہونے کے باوجود بچ جاؤں گا کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا۔ جب میں تمہارا جانشین بنوں گا تو جو آج تمہارے وفادار ہیں وہ فوراً پٹری بدل کر میرے وفادار بن جائیں گے۔ پولیس اگواڑی کی رپورٹ میری مرضی کے مطابق بنے گی اور تم شاید جان گئے ہو کہ میری پشت پر کون ہے۔“

”ڈیوڈ شا۔“ مرشد نے حقارت سے کہا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو وہ ہمیشہ یہاں تمہاری پشت پناہی کے لیے موجود رہے گا۔“

”نہیں لیکن جب تک میں مضبوط ہو جاؤں گا۔“ فاضلی نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ڈیوڈ شا کی حیثیت کی نفی سے گریز کیا کیونکہ یہاں باسو موجود تھا۔

”پھر بھی میرے بچے موجود ہیں تم ان کے ہوتے ہوئے جائیداد اور گلدی پر قبضہ نہیں کر سکتے ہو۔“
 ”کیوں بچوں کی سی بات کر رہے ہو جب میں نے تمہارے سارے چچا زادوں کو مع خاندان کے ختم کر دیا ہے تو یہ چند بچے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان کو آرام سے ایک ایک کر کے ختم کر دوں گا۔“
 ”بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ فاضلی صورت حال پر حادی ہو گیا تھا مگر مرشد نے ابھی حوصلہ نہیں ہارا تھا۔“ اگر میں سائن کرنے سے انکار دوں تو؟“

اس پر فاضلی نے معنی خیز نظروں سے رومانہ اور راشد کی طرف دیکھا۔ ”میں نے انہیں کس لیے حاصل کیا ہے اور بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے۔ شہباز کے ساتھیوں کو بہت چکر دیئے تب کہیں جا کر انہوں نے اس جوڑے کو میرے حوالے کیا۔“

فاضلی کی بات نے میرے اندر موجود بے چینی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ راشد اور رومانہ فاضلی کے ہاتھ میرے ساتھیوں سے کسی ذلیل کی صورت میں لگے تھے۔ اسٹی ڈوٹ دینے سے میری حالت ہر گزرتے لمحے بہتر ہو رہی تھی۔ جسم کی گرمی اور سنسنائٹ ختم ہو گئی تھی۔ ذہن پر طاری ہونے والی غنودگی سرے سے غائب تھی اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں بھی میرے قابو میں آتے جا رہے ہیں۔ شاید پندرہ بیس منٹ میں اس قابل ہو جاتا کہ کسی ہنگامہ آرائی میں حصہ لے سکتا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ مرشد اپنی بیٹی اور دامادی کی طرف سے لاپرواہ نظر آ رہا تھا اس نے ایک بار بھی ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ فاضلی کی بات پر اس نے سر دلچھے میں کہا۔ ”میرا ان دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تعلق تو ہے۔“ فاضلی نے کہا اور رومانہ کی طرف بڑھا اس نے رومانہ کا چہرہ ماپنے ہاتھ میں جکڑ کر مرشد کی طرف مٹھمایا۔ ”یہ تمہاری جوان اور حسین بیٹی ہے۔ اگر تمہارے سامنے اس کے ساتھ کوئی برا سلوک ہو تو تمہارے دل کو تکلیف تو ہوگی۔“

رومانہ بچل رہی تھی مگر اس سے اپنا منہ نہیں چھڑا سکتی تھی۔ فاضلی نے خود اسے چھوڑا اور پھر وہ راشد کی طرف بڑھا اور اچانک اس کے منہ پر گھونٹ مارا۔ اس کا منہ گھوم گیا اور ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ رومانہ نے چیخ ماری تھی۔ فاضلی ہنسا۔ ”یہ تمہارا عزیز بھتیجا ہے۔ تمہارے دل میں اس کے لیے بھی کچھ نہ کچھ جگہ تو ہوگی۔“

”یہ دونوں میرے مجرم ہیں اور میرے آدمی انہیں تلاش کر رہے تھے۔ اگر یہ مل جاتے تو اب تک کسی نامعلوم قبر میں دفن ہو چکے ہوتے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہیں شہباز نے پناہ دی ہوئی ہے۔“

”واقعی؟“ فاضلی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”تم واقعی ان کے ساتھ یہ سلوک کرتے؟“

”میں نے کہا تا میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے تم ان کے ساتھ جو چاہے کرو۔“ مرشد کا لہجہ مزید سخت ہو گیا مگر مجھے لگا اس سختی کے اندر کہیں کچھ اور بھی تھا۔ دوسرے فاضلی نے رومانہ کے لیے جس طرح کے الفاظ استعمال کیے تھے میرے اندر ایک خیال سرسرا نے لگا۔ مگر میری عقل اسے مسترد کر رہی تھی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی کتنا ہی شیطان کیوں نہ ہو جائے اپنی بہن کو بری نظر سے کیسے دیکھ سکتا ہے۔ رومانہ اس کی سوتیلی بہن تھی بے شک یہ رشتہ خونی نہیں تھا۔ فاضلی نے پھر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”کچھ بھی کروں اور بے شک تمہارے سامنے کروں۔“

”ذلیل.....“ راشد نے تڑپ کر کہا۔ ”اپنا گندہ منہ بند رکھ۔“

فاضلی نے اس کا جواب یوں دیا کہ پے در پے راشد کے منہ پر کئی کے رسید کیے اور صحیح معنوں میں اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ وہ ذرا نازک نوجوان تھا اور اس کے لیے یہ چند کچے بھی بہت تھے۔ مگر وہ حوصلے سے برداشت کرتا رہا اور رومانہ چلا رہی تھی۔ مرشد البتہ خاموش تھا اور اس کا چہرہ مزید ست گیا تھا۔ فاضلی نے اپنا ہاتھ روکا اور پھر راشد کی شرٹ سے ہاتھ پر لگنے والا اس کا خون صاف کیا۔ اس نے اطمینان سے مرشد کی طرف دیکھا اور بولا۔

”اب کیا کہتے ہو ویسے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں کس حد تک جاسکتا ہوں۔“

”ہاں مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔“ مرشد نے کہا۔ ”لیکن میں تمہاری بات نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا تا تم ان کے ساتھ جو چاہے کرو۔“

فاضلی سفاک انداز میں مسکرایا۔ ”میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم اتنی آسانی سے نہ مانو۔“

”کیا کرو گے تم ان دونوں کو مار دو گے؟“ مرشد تحارت سے بولا۔ ”پھر مجھے مار دو گے؟“

”ارادہ تو یہی ہے لیکن اتنی آسانی سے نہیں۔“ فاضلی بولا۔ ”پہلے میں تمہارے سامنے تمہاری بیٹی کو بے آبرو کروں گا۔“

”کتے کے بچے۔“ راشد چلایا اور رومانہ دہشت زدہ انداز میں رونے لگی۔ میں نے کمزوری آواز میں کہا۔

”فاضلی مجھے اندازہ نہیں تھا تم اس قدر ذلیل اور شیطان صفت شخص نکلو گے۔“

”عجب ہے۔“ اس نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔ ”میری ولدیت کے بارے میں جان کر بھی تم

میرے بارے میں ایسا خیال رکھتے تھے؟“

”ہاں اس کے باوجود خیال نہیں آیا۔ کاش کہ میں تمہیں قتل کر سکتا۔“

”تم نہیں میں تمہیں قتل کروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے طریقہ بھی سوچ لیا ہے۔“

”انسان سوچتا بہت کچھ ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو اوپر والا چاہتا ہے۔“ میری بات پر اس نے بھنویں سکیز کر مجھے دیکھا اور کسی قدر مشکوک لہجے میں بولا۔

”کیا بات ہے تم میں بڑا دم غم نظر آ رہا ہے۔ بہ ظاہر تو تم قریب المرگ تھے۔“ وہ کہتے ہوئے میرے

قریب آیا اور اس نے جائزہ لیا۔ ”تمہیں اب پسینہ بھی نہیں آ رہا ہے۔“

میں نے جواب دینے سے گریز کیا۔ فاضلی نے باسو سے پوچھا۔ ”تم کہہ رہے تھے اسے سانپ نے کاٹا

ہے اور یہ مرجائے گا اسے یہاں آئے ہوئے دس منٹ سے اوپر ہو گئے ہیں اور اب تک اس کے مرنے کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے یہ میرے اور تمہارے اندازے سے زیادہ سخت جان ہو۔“ باسو نے سپاٹ لہجے میں جواب

دیا۔ ”شاید سانپ ٹھیک سے ڈس نہ سکا ہو۔“

فاضلی کی آنکھوں میں شک نمایاں تھا پھر اس نے مکارانہ انداز میں کہا۔ ”اچھی بات ہے یہ اتنی جلدی نہ

مرے اور بہت کچھ دیکھ کر میرے ہاتھوں مارا جائے۔ مجھے دنیا میں کسی شخص کو قتل کرنے کی اتنی خواہش نہیں ہے

جتنی اس شخص کو قتل کرنے کی ہے۔“

”غالباً مرشد کے بارے میں تم ایسے ہی خیالات رکھتے ہو۔“ میں نے کہا۔ اس نے مرشد کی طرف دیکھا

اور بولا۔

”کچھ بھی سہی لیکن ہے تو میرا باپ، اس وقت بھی مجھے اس پر رحم آ رہا ہے لیکن شہباز ملک تمہارے لیے میرے اندر صرف ایک ہی جذبہ ہے۔“

راشد جو کچھ دیر پہلے تک فاضلی کو گالیاں دے رہا تھا اب گھبرایا ہوا لگ رہا تھا اس نے فاضلی سے کہا۔
 ”سنو، مرشد ٹھیک کہہ رہا ہے اگر اس کا بس چلے تو ہمیں اپنے ہاتھ سے مار کر اپنے کتوں کو کھلا دے۔“
 ”تب میں بھی یہی کروں گا۔“ فاضلی ہنسا۔ ”اپنے باپ کی آخری خواہش سمجھ کر۔“

وہ رومانہ کی طرف بڑھا تو وہ چلانے لگی تھی۔ جب اس کے منہ پر خون گرا تھا تب وہ جیسے حواس کھو بیٹھی تھی اور اس وقت بھی وہ اسی طرح جنونی ہو رہی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا وہ اپنے باپ کے کیے کی سزا بھگتتے جا رہی تھی۔ فاضلی اسے کھولنے لگا۔ جیسے ہی وہ آزاد ہوئی اس نے فاضلی کا منہ نوچنے کی کوشش کی مگر ایک تھپڑ کھا کر واپس کرسی پر گر گئی تھی۔ فاضلی نے ذرا لحاظ نہیں کیا کہ وہ بہت نازک سی لڑکی تھی۔ راشد پھر چلانے اور گالیاں دینے لگا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو باسو نے اپنا بھاری ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا اس کی آنکھوں میں اشارہ تھا کہ میں خاموش رہوں لیکن میرے شانے ایک عورت کی بے رحمی ہو اور بے شک وہ میرے بدترین دشمن کی بیٹی کیوں نہ ہو، مجھ سے یہ قطعی برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے مرشد سے کہا۔ ”تمہارا مقدر مسموم ہے اور تمہارا یہ ناجائز بیٹا کسی کو نہیں چھوڑے گا۔ پھر کیوں ذلت کے ساتھ مر رہے ہو۔ اگر تمہارے نزدیک اپنی کوئی عزت نہیں ہے تو اپنی بیٹی کو تو عزت سے مرنے دو۔“

”تم اسے نہیں جانتے۔“ مرشد نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”اگر میں نے سائن بھی کر دیئے تب بھی یہ یہی سب کرے گا۔“

”لعنت ہو تم پر ایک امکان پر تم یہ سب برداشت کرنے کو تیار ہو گئے ہو جسے کوئی باپ برداشت نہیں کر سکتا۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

فاضلی نے رومانہ کو بے رحمی سے نیچے گرایا اور اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لاؤنچ کے وسط میں موجود کاؤچ کی طرف لے جانے لگا۔ اس نے رومانہ کو کاؤچ پر دھکا دیا اور مرشد سے بولا۔ ”شاید تم تیار ہو، لیکن یہ شو بہت طویل ہو گا اس میں میرے بعد یہ سب بھی حصہ لیں گے۔“ اس نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”شو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تم مان نہیں جاتے یا پھر یہ مرنے نہیں جاتی۔“

فاضلی کسی شیطان کی طرح تنکا ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ انسان اپنے وجود کے نہاں خانوں میں کس قدر گندہ اور بے غیرت ہو سکتا ہے آج میں اس کی انتہا دیکھ رہا تھا۔ میں انتہائی شدت سے خواہش کر رہا تھا کہ اللہ مجھے ایک موقع دے اور میں آپن واحد میں اس شخص کو جہنم رسید کر دوں۔ مگر میں مجبور تھا۔ جب میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو فاضلی کے دو آدمیوں کی گتوں کا رخ میری طرف ہو گیا تھا اور اس وقت وہ میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ پھر باسو کا ہاتھ میرے شانے پر کسی چٹان کی طرح جما ہوا تھا۔ مرشد کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات تھے وہ شدید اندرونی تکلیف کا شکار تھا۔ اچانک رومانہ چلائی۔ ”پاپا.....“

فاضلی ہنسا۔ ”تمہاری لاڈلی بیٹی نے تمہیں پکارا ہے جو تمہارے منہ پر کاک مل کر بھاگ گئی تھی۔“
 ”فاضلی میں تیار ہوں۔“ مرشد نے کہا۔ ”لیکن میری ایک شرط ہے رومانہ کو جانے دو۔“
 فاضلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہرگز نہیں، اسی کی موجودگی میں تم سائن کرو گے۔ ورنہ تم بعد میں مکر سکتے ہو۔“

”میں نے سائن کر دیئے اور تم نے پھر بھی یہی سب کیا تو.....؟“
 ”تو مجبور تم ہو میں نہیں۔“ فاضلی بولا۔ ”اور یہ سائن بھی میرے لیے بیکار ہیں میں خود کر سکتا ہوں اور کوئی اسے چیلنج نہیں کرے گا۔“

”تب تم میرے سائن کیوں چاہتے ہو؟“
 ”اپنی تسکین کے لیے۔“ فاضلی نے بلا جھجک کہا۔ ”میں تمہیں اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔“
 ”اب اس سے زیادہ اور کیا جھکوں۔“ مرشد تلخی سے بولا۔ ”میرے ہاتھ کھول میں سائن کے لیے تیار ہوں۔“

فاضلی کے اشارے پر اس کے ایک گرگے نے مرشد کے ہاتھ کھول دیئے۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی میز لا کر رکھی اور فاضلی نے وصیت نامے اور ملکیت کے کاغذات کی فائل مع پین اس کے سامنے رکھ دی۔ مرشد نے فائل کھولی۔ ”مجھے بتاؤ کہاں سائن کرنے ہیں۔“

”ایک یہاں؟“ فاضلی نے انگلی رکھی۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ مرشد کی رضا مندی سے خوش نہیں تھا غالباً وہ چاہتا تھا کہ مرشد مزاحمت کرے اور وہ مرشد کو ذلیل کرنے کے لیے رومانہ کو بے آبرو کرے۔ مرشد نے خاموشی سے سائن کر دیئے۔ فاضلی نے صفحے پلٹے اور پھر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”اب یہاں سائن کرو۔“

اس وقت مرشد نے جو کیا وہ میں نے کیا بہت چوکس فاضلی نے بھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے اچانک پین فاضلی کی آنکھ میں گھسانے کی کوشش کی۔ یہ دھات کا بنا ہوا اعلیٰ درجے کا بال پوائنٹ تھا۔ اگر مرشد کا نشانہ ٹھیک بیٹھتا تو فاضلی شدید زخمی ہو جاتا اور وہ مر بھی سکتا تھا کیونکہ آنکھ کے صرف دو انچ پیچھے دماغ ہوتا ہے مگر اس کی بد قسمتی کہ اس کا نشانہ درست نہیں بیٹھا اور بال پین کی نوک فاضلی کی آنکھ کے پاس رخسار کو چیرتی چلی گئی۔ وہ بچنے کی کوشش میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا تھا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی اور اس نے بے ساختہ ہاتھ زخم پر رکھا جس سے خون پھوٹ رہا تھا۔ مرشد اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ صرف اس کے ہاتھ آزاد تھے اور جسم کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ فاضلی کے ایک آدمی نے عقب سے اس کے سر پر ہلکی ضرب لگائی اور پھر اس سے بال پین چھین لیا جسے مرشد نے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ فاضلی کا ایک آدمی اسے اٹھانے کے لیے آیا تو فاضلی نے خود اٹھتے ہوئے اسے تھپڑ مارا۔ یہ کہار کا غصہ گدھے پر نکالنے والی بات تھی۔ پھر وہ آگے آیا اور جھولتے مرشد کے چہرے پر پوری قوت سے تھپڑ مارنے لگا۔ ہر تھپڑ پر مرشد کا چہرہ گھوم جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر زخم نمایاں ہو گئے۔

بہ ظاہر میں بے بس تھا کیونکہ باسو کے قبضے میں تھا میرے بائیں شانے پر اس کی گرفت سخت تھی۔ میں بہت زور لگاتا تو شاید اس کی گرفت سے نکل جاتا مگر اس دوران میں دوسروں اور خود باسو کو میرے خلاف کارروائی

کا موقع مل جاتا۔ اس کا رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا ایک طرف وہ فاضلی کے حکم کی قیبل کر رہا تھا اور مجھے اس کے معاملات میں مداخلت سے باز رکھے ہوئے تھا تو دوسری طرف وہ میرا غیور بھی کر رہا تھا۔ مرشد کے حملے اور پھر فاضلی کی جوابی کارروائی میں تقریباً سب کی توجہ ان کی طرف ہو گئی تھی۔ باسو تک بہت دلچسپی سے مرشد کی مرمت کا منظر دیکھ رہے تھے۔ صرف رومانہ اس معاملے میں ناخوش تھی۔ فاضلی کے جو آدمی مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے اب ان کی نظر بھی مجھ پر نہیں تھی۔ اس لیے جب میں نے باسو کی ران سے بندھے ہوئے لشر سے اس کا پستول نکالا تو فوری طور پر کسی کو پتا نہیں چلا۔

یہ خاصا دزدی اور خوفناک پستول تھا جو شاید خاص طور سے باسو جیسے دیوبقامت کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ بہر حال میں اسے استعمال کر سکتا تھا۔ فاضلی کے ساتھ ہی اس کا گرگا کھڑا تھا اور وہی میرے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا اس لیے میں نے پہلے اسے ہی نشانہ بنایا۔ خوفناک دھماکے کے ساتھ اس کا سر تقریباً غائب ہو گیا اور اس کا خون اور مغز اچھل کر فاضلی اور مرشد پر گر ا تھا۔ وہ گرا تو میں نے اس کے پیچھے کھڑے دوسرے شخص کو نشانہ بنایا گولی نے اس کا بایاں شانہ اڑا دیا تھا۔ پستول بچ بھی خوفناک تھا اس کی گولی ہلاکت خیزی میں شاٹ گن جیسی تھی۔ باسو چونکا اور اس نے میرا شانہ چھوڑ کر مجھ سے پستول چھیننے کی کوشش کی مگر میں اس کی ٹانگوں کے درمیان گر گیا۔ اس اثنا میں فاضلی کے باقی آدمیوں نے مجھ پر فائر کھول دیا۔ یہ اور بات تھی کہ گولیاں باسو کے جسم پر لگیں اور زرہ بکتر سے اچٹ گئیں۔ وہ اب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا اور مجھے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ فائرنگ کے خلاف میری ڈھال بھی بنا ہوا تھا۔

فاضلی کے ایک آدمی نے گھوم کر مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اسے شوٹ کر دیا۔ گولی نے اس کے پیٹ اور سینے کے سنگم پر کوئی چھانچ کا سوراخ کر دیا تھا اور وہ تیرا کر گر ا تھا۔ باسو مجھے قابو کرنے کی کوشش کے ساتھ اپنا بچاؤ بھی کر رہا تھا کیونکہ اس نے ہیلٹ کا شیشہ ہٹایا ہوا تھا اور اس کا چہرہ غیر محفوظ تھا۔ ساتھ ہی وہ دھاڑ کر فائرنگ بند کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں اس کی ٹانگوں میں اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ وہ مجھے قابو نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی دوران میں مجھے موقع ملا اور میں نے ایک طرف جاتے فاضلی پر فائر کیا مگر وہ عین موقع پر جھک گیا اور قضا اس کے ایک آدمی کی آئی تھی۔ وہ اس کے عین پیچھے تھا۔ فاضلی غائب تھا میں نے اندازے سے اس طرف باقی ماندہ گولیاں چلا دیں جہاں فاضلی گر ا تھا۔ البتہ یہ خیال رکھا کہ رومانہ زد میں نہ آئے۔ اپنے چار ساتھیوں کی موت پر پانچواں آدمی دیوانہ ہو گیا تھا اور اندھا دھند برسٹ مار رہا تھا اگر باسو میری ڈھال نہ ہوتا تو اب تک میں چھلنی ہو چکا ہوتا۔

پھر باسو نے اچانک میرے سر پر ہاتھ مارا اور اس ضرب نے مجھے ناک آؤٹ کر دیا۔ ضرب شدید نہیں تھی اگر باسو پوری قوت استعمال کرتا تو میرا سر ٹوٹ جاتا مگر اس نے ناپ تول کر ضرب لگائی تھی۔ میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا مجھے ہوش آیا تو باسو میرے سر پر موجود تھا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پشت پر پلاسٹک کی کس جانے والی ڈوری سے باندھ دیے تھے۔ فاضلی پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا اور اس کی گالیوں کا ہدف میں تھا۔ میں سر جھٹک کر اٹھا تو فاضلی میز کے ساتھ کھڑا بوتل سے براہ راست شراب اپنے حرام وجود میں اتار رہا تھا۔ ہر گھونٹ کے ساتھ وہ مجھے گالیاں دیتا تھا۔ اس کے زخم سے بہنے والا خون اس کی شرٹ تک آ رہا تھا مگر اسے پروا

نہیں تھی۔ اس کا پانچواں ساتھی جو اپنے حواس کھو بیٹھا تھا ایک طرف بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ شاید اسے باسو نے بے ہوش کیا تھا۔ رومانہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ مرشد اور راشد پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر فاضلی میری طرف آیا اور جھک کر زہریلے لہجے میں بولا۔

”بس یہی کر سکتے تھے تم؟“

”نہیں تمہیں بھی کتے کی موت مار دیا ہوتا اگر مجھے ایک لمحہ اور ملتا اور تم اس وقت جہنم میں ہوتے۔“

”لیکن تم مجھے مار نہیں سکے۔“ اس کا لہجہ فاتحانہ ہو گیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تمہیں میں ماروں گا اور میں نے طریقہ بھی سوچ لیا ہے۔ میں نے اس کی حد پچاس گز کر دی ہے۔“ اس نے کڑے کی طرف اشارہ کیا۔

”جیسے ہی تم مجھ سے پچاس گز دور جاؤ اس میں بھرا زہر تمہارے جسم میں اتر جائے گا اور اس بار تم بچو گے نہیں۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”میری موت اسی طرح کھلی ہو۔“

”اور جب تم مرو گے اس وقت میں اسے پامال کر رہا ہوں گا۔“ اس نے رومانہ کی طرف دیکھا۔

”تم شیطان سے پست انسان ہو یہ تمہاری بہن ہے۔“

”تم نے کہہ دیا کہ میں شیطان سے بھی گیا گزرا ہوں تو تم مجھ سے کیا توقع کرتے ہو۔“ فاضلی نے کہا اور پلٹ کر مرشد کی طرف گیا۔ ”بس چند منٹ اور پھر میں تمہیں اس دنیا کی ہر تکلیف سے آزاد کر دوں گا۔“

”باسو مجھے کھول دو۔“ میں نے اپنی طبیعت پر جبر کر کے التجا کی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ فاضلی شیطانی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”یہ میرے حکم کا غلام ہے میں اسے جو کہوں گا یہ وہی کرے گا کیوں باسو؟“

باسو نے پھر سر ہلایا۔ جیسے فاضلی کی بات کی تصدیق کر رہا ہو۔ میں نے جھنجھٹا کر کہا۔ ”تب وہ تمہارا نام نہاد آقا مجھ سے کیا چاہتا ہے کیا وہ میری لاش کو لے کر جائے گا۔“

فاضلی ہنسا۔ ”تم نے ٹھیک کہا وہ تمہاری لاش لے جائے گا اسی لیے اس نے مجھے اجازت دی ہے کہ تم کو قتل کر دوں۔“

میں دنگ رہ گیا۔ ڈیوڈ شانے یہ راستہ نکالا تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے اس کی شان میں ناگفتنی نکل گئی تھیں۔ فاضلی پھر ہنسا اور باسو بولا۔ ”اے کوٹھی سے باہر لے جاؤ، کم سے کم پچاس گز دور۔“

باسو نے مجھے شانے سے پکڑ کر اٹھایا اور سیرھیوں کی طرف دھکیلا میں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کی جتنی قوت کے سامنے میری ایک نہ چلی اور وہ مجھے سیرھیوں تک لے آیا۔ تب فاضلی رومانہ کی طرف بڑھا۔ راشد چلانے لگا تھا۔ سیرھیوں سے نیچے آتے ہوئے میں نے مرشد کی آواز سنی وہ فاضلی سے التجا کر رہا تھا کہ وہ مار دے لیکن اس کی بیٹی کو چھوڑ دے۔ میں اب باسو کو گالیاں دے رہا تھا جو مجھے موت کی طرف دھکیل رہا تھا۔ مگر گولیوں کی طرح اس پر میری گالیاں بھی اثر نہیں کر رہی تھیں۔ وہ مجھے نیچے لایا اور پھر کوٹھی سے باہر لے جانے لگا۔ جب اس نے مجھے برآمدے سے نیچے دھکیلا تو میں ذہنی طور پر مرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا اور میں نے باسو سے کہا۔ ”ٹھیک ہے مجھے موت قبول ہے لیکن تم اس لڑکی کو بچا سکتے ہو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے فاضلی کے معاملے میں مداخلت سے منع کیا گیا ہے۔“

میں نے گہری سانس لی اور آگے بڑھا اب باسو کو مجھے دھکیلتا نہیں پڑ رہا تھا۔ ہم پورچ میں آئے یہاں سے کوٹھی کے اوپری لاؤنچ کا فاصلہ شاید پچاس گز تھا۔ میں جیسے ہی پورچ کے وسط تک پہنچا میری کلائی میں بندھے کڑے میں کچھ حرکت ہوئی اور ایک تیز چھین سی محسوس ہوئی تھی۔ فوراً میرا سر چکرایا اور میں نیچے گر گیا۔ تب میں نے ڈرائیو سے ایک گاڑی کو آتے دیکھا۔ وہ رکی اور اس سے وسیم اور عبداللہ اترے تھے۔ میرے ساتھی آگے تھے لیکن انہوں نے آنے میں ذرا تاخیر کر دی تھی۔ ان سے پہلے فرشتہ اجل مجھے لینے آگیا تھا میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں اور جسم سے جیسے جان نکل رہی تھی میں نے دل میں کہا۔ ”الوداع میرے دوستو اب میدانِ حشر میں ملاقات ہوگی۔“

ذہن تاریک ہوا اور موت کا سانسانا چھا گیا تھا۔



اس سے پہلے مجھے کبھی اپنی وفات کا اتنا یقین نہیں ہوا تھا جتنا کہ مرشد کی کوٹھی کے احاطے میں زمین پر پڑے ہوئے آیا تھا۔ میرے ساتھی آگے تھے اور میں انہیں دیکھتے ہوئے اپنے طور پر دنیا سے گزر گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے چاروں طرف دھند ہے یا روئی کی دھنکے ہوئے بادل ہیں اور میں ان کے درمیان تیر رہا ہوں۔ میرا جسم اتنا ہلکا ہلکا پھلکا ہو رہا تھا جیسے بس روح رہ گئی ہو۔ شاید مرنے کے بعد انسان ایسی ہی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ جسم دنیا میں رہ جاتا ہے اور وہ لطیف روح کے ساتھ دوسری دنیا میں پہنچتا ہے۔ میں اس جگہ اکیلا تھا۔ مگر نہیں میرے آس پاس کوئی تھا۔ مجھے کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ پھر ایک چہرہ میرے سامنے نمودار ہوا۔ وہ عین میرے اوپر تھا۔ وہ واضح نہیں تھا مگر مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”ہم کو نہیں پہچانتا۔“ اس نے کہا۔

”فتح خان۔“ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم بھی مر گئے ہو؟“

”ہم نہیں مرا جب تک ہم وہ ہیرے حاصل نہیں کر لے گا ہم نہیں مرے گا۔“ اس نے جواب دیا اس کا چہرہ واضح ہو گیا تھا۔ ”شہباز خان تم جانتا ہے وہ ہیرا کدھر ہے۔“

”فتح خان تمہاری ڈھٹائی پر حیرت ہے تم جانتے ہو میں تمہارے خون کا پیاسا ہوں اگر تم میرے سامنے آئے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“

”ابھی تم ہم کو قتل نہیں کر سکتا، تم انگلی بھی نہیں ہلا سکتا، ابھی میں تم کو قتل کر دے تو تم کچھ نہیں کر سکتے گا۔ پر شہباز خان ہم تم کو قتل نہیں کرے گا۔ بس یاد رکھنا ہم کو وہ ہیرے چاہئیں کسی بھی قیمت پر.....“ بولتے ہوئے فتح خان کا چہرہ دھندلانے لگا اور پھر وہ اور اس کی آواز دونوں دھند میں غائب ہو گئے اور کچھ دیر بعد یہ دھند بھی غائب ہو گئی۔

مجھے اچانک ہوش آیا تو میں نے خود کو اسی دنیا میں اور اسی جانی پہچانی جگہ پایا جہاں مجھے ایک بار پہلے بھی اسی طرح ہوش آچکا تھا۔ میں اسی صوفے پر ڈیوڈشا کے عین سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کا سفید فام گرگا اس کے عقب میں پوزیشن سنبھال رہا تھا شاید اسی نے مجھے وہ عجیب سی خوشبو والی دوا سونگھائی تھی جو بے ہوشی سے ہوش میں لے آتی ہے۔ میں نہایت صاف ستھری حالت میں اور صاف سفید لباس میں تھا۔ جسم ہلکا پھلکا اور درد کا نام و

نشان نہیں تھا حالانکہ مجھے درگاہ مرشدیہ میں بے شمار زخم آئے تھے اور سانپ نے الگ کاٹا تھا۔ سب سے بڑھ کر میری کلائی پر بندھے کڑے سے سائنائیز میرے جسم میں اچکھٹ ہوا تھا۔ کڑا اب بھی میری کلائی میں تھا۔ مجھے خیال یہ آیا کہ شاید میں پھر خواب دیکھ رہا ہوں۔ مگر اب سب واضح تھا۔ وہ سب دھندلا اور غیر واضح تھا۔ اس لیے وہ خواب تھا اور بھلا فتح خان یہاں کہاں سے آگیا۔ میں اس وقت ہلکا ہچکچاتا تھا اور اپنے وجود کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ خواب نہیں تھا۔

لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ دنیا کا مہلک ترین زہر ایک خاص میکنزم کے تحت میرے جسم میں اچکھٹ ہو گیا تھا اور مجھے سو فیصد فوت ہو جانا چاہیے تھا تب میں زندہ کیسے تھا؟ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ جس طرح میرے جسم نے سانپ کے زہر کو ناکارہ بنا دیا تھا اسی طرح وہ پونا شیم سائنائیز کو بھی ناکارہ بنا دے گا۔ سانپ کا زہر خطرناک ہوتا ہے مگر اس کے مالی کیولز آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں جس کے بعد یہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ باسو نے مجھے اپنی ڈوٹ بھی دیا تھا جس سے میری حالت بہت تیزی سے سدھ گئی تھی مگر کیمائی زہر کے مالی کیولز بہت سخت ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ زہر آسانی سے ناکارہ نہیں ہوتا ہے۔ پھر پونا شیم سائنائیز کا تو کوئی توڑ ہی نہیں ہے ایک باریہ ہلاکت خیز مقدار میں جسم میں داخل ہو جائے تو صرف قدرت ہی انسان کو مرنے سے بچا سکتی ہے۔ تو کیا مجھ پر قدرت نے مہربانی کی تھی یا؟

میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ”ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آسانی ہو گئیں۔“

”میں نے غالب کو پڑھا ہے۔“ اس نے اردو میں کہا۔ ”میں اسے دنیا کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتا ہوں۔“

”شکر ہے کہ تم نے مجھنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ غالب کو تو یہاں کے لوگ نہیں سمجھتے۔ اگر تم مشکلوں کی جگہ حیرت کر لو تو میری کیفیت با آسانی سمجھ سکو گے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تمہاری حیرت بجا ہے اور میرے پاس اس کی وضاحت ہے۔“

”کیسی وضاحت؟“

”ایک وضاحت تو یہ ہے کہ کڑے میں سائنائیز نہیں بلکہ بے ہوشی کی دوا تھی اس لیے تم مرے نہیں صرف بے ہوش ہوئے۔“

”اور دوسری وضاحت؟“

”سائنائیز کڑے میں نہیں بلکہ فاضلی کی انگلی میں موجود انگوٹھی میں تھا۔ چار سولی گرام خالص سائنائیز۔“ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں وقت جتنی پیچیدگی کے ساتھ گزرا۔ مجھے ہر لمحہ کسی نئی چیز سے دوچار ہونا پڑا۔ دشمنوں نے مجھے اور میں نے دشمنوں کو لاتعداد چکر دیئے۔ دھوکا در دھوکا تھا۔ مگر ڈیوڈ شا کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ ایسا چکر اور ایسے دھوکے میرے گمان میں بھی نہیں آئے تھے۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”فاضلی کی انگوٹھی میں سائنائیز..... تو اس کا کیا ہوا؟“

”جیسے ہی پچاس گز کی حد پوری ہوئی اس کی انگوٹھی میں موجود میکنزم حرکت میں آ گیا اور زہر اس کی انگلی

میں انجکٹ ہو گیا۔“

”وہ مر گیا؟“ میں نے انہماکیوں کی طرح پوچھا۔ غالباً میرا منہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ڈیوڈ شانے سر ہلایا۔

”مشکل سے دس سیکنڈ میں۔“

میں نے گہری سانس لی اور اپنے منتشر ہو جانے والے اعصاب کو پرسکون کرنے لگا۔ اب کچھ کچھ معاملہ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ ڈیوڈ شانے میرے حوالے سے غلط بیانی کی تھی اور بہ ظاہر مجھے غلام بنا کر فاضلی کے حوالے کر دیا تھا تاکہ میں مرشد کے خلاف جنگ میں شامل ہوں۔ دوسری طرف اس نے باسو کو میرا مگران اور محافظ مقرر کر دیا۔ باسو کا کام مجھے تجاوز ہونے سے روکنا اور فاضلی کی جانب سے میرا تحفظ کرنا تھا۔ اس نے اپنا یہ فرض بخوبی انجام دیا۔ حیرت کے دورے پر قابو پا کر میں نے چند منٹ بعد کہا: ”ڈیوڈ شااب میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد نے اس خطے میں کن سیاستوں سے کام لیا اور پوری ایک صدی تک یہاں کیسے حکومت کی۔“

وہ مسکرایا تو اس کے انداز میں تقاضا تھا۔ ”میں ان باہت لوگوں کی برابری نہیں کر سکتا کہ انہوں نے بہت ناموافق حالات میں کام کیا تھا۔“

”حالات موافق نہیں ہوتے کیے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ فاضلی کے مرنے کا سن کر مجھے ناقابل بیان غمی ہو رہی تھی اور اس سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ رومانہ کے حوالے سے اپنے مکروہ منصوبے میں ناکام رہا ہوگا۔ اسے مہلت ہی کہاں ملی ہوگی کیونکہ باسو مجھے مشکل سے ایک منٹ میں باہر لے آیا تھا اور آخر وقت میں، میں نے مزاحمت ترک کر کے اس کا کام اور آسان کر دیا تھا۔ ”مرشد زندہ ہے؟“

”ظاہر ہے۔“ ڈیوڈ شانے جواب دیا۔

”رومانہ اور اس کا شوہر راشد.....“

”سب ٹھیک ہیں۔“ اس بار اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”گزشتہ چوبیس گھنٹے کے حالات تمہیں
خبردارت سے پتا چل جائیں گے۔ ابھی اعلیٰ بات کرو۔“

میں اپنی بات کرنے کی بجائے سوچ رہا تھا کہ میں یہاں تک کیسے آیا۔ وسیم اور عبد اللہ وہاں آگئے تھے اور ان کے ہوتے ہوئے باسو مجھے کیسے واپس لے آیا۔ میں نے کسی قدر سرد لہجے میں پوچھا۔ ”میرے ساتھیوں کے دوتے ہوئے باسو مجھے یہاں کیسے لایا؟“

”بہت آسانی سے۔“ ڈیوڈ شامسکرایا۔ ”اس نے تمہارے ساتھیوں کے سامنے دو آپشن رکھے، ایک

اش لے جائیں اور دوسرا تمہیں زندہ سلامت باسو کے ساتھ جانے دیں۔“

میں ٹھنڈی بانس لے کر رہ گیا۔ ”ظاہر ہے میرے ساتھیوں نے دوسرا آپشن چنا۔ ڈیوڈ شامیں ابھی تک میں سمجھ سکا کہ تم نے فاضلی کی مدد کیوں کی اور پھر مجھے اس کے حوالے کیوں کیا اور پھر میرے بجائے اسے زہر دے دیا؟“

ڈیوڈ شانے میرے سوالات سنے اور انہیں نظر انداز کر کے بولا۔ ”مرشد بیچ گیا ہے مگر اس وقت سرکاری جیل میں ہے اور اس سے درگاہ میں ہونے والی قتل و غارت گری کے بارے میں تفتیش ہو رہی ہے۔“

”کیا فائدہ؟“ میں نے تپنی سے کہا۔ ”وہ اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر بچ جائے گا۔“

”اب مشکل ہے۔“ ڈیوڈ شانے نفی میں سر ہلایا۔ ”درگاہ میں مارے جانے والے دو درجن سے زیادہ افراد ایسی تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے جن پر بین الاقوامی پابندیاں ہیں۔ ان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص ان پابندیوں کا نشانہ بن سکتا ہے۔ مرشد کی جان بخشی اتنی آسانی سے نہیں ہوگی۔“

”تم نے اسے سزا دی ہے۔“

”ایسا ہی سمجھ لو، وہ ایسا سانپ بن گیا ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی نوٹ گئی ہو۔“

میں نے کسی قدر بے چینی کے ساتھ کہا۔ ”لیکن وہ زندہ ہے اور جب تک وہ زندہ ہے میرا چچا نہیں چھوڑے گا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ جھکا اس کے لیے کافی ہے۔“

”ڈیوڈ! مجھے تمہارے خیال کی نہیں ٹھوس یقین دہانی کی ضرورت ہے کہ مرشد میرے اور میرے

ساتھیوں کے لیے بے ضرر بن گیا ہے۔“

میں بہ ظاہر ڈیوڈ شانے سوالات کر رہا تھا مگر اس کا کھیل میرے ذہن میں واضح ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے مرشد کو سزا دینے کے لیے فاضلی کو استعمال کیا مگر ساتھ ہی اس سے چھکارے کا بندوبست بھی کر لیا۔ مرشد کی اصل طاقت درگاہ تھی۔ ڈیوڈ شانے اس جگہ کو تباہ کر دیا۔ یہ مرشد کے لیے بہت بڑا نقصان تھا۔ اسے ڈیوڈ شانے ضمانت ٹھکرانے کی سزا ملی۔ مگر ڈیوڈ شانے اسے مارا نہیں ورنہ باسو کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ ڈیوڈ شانے اسے اپنی طاقت دکھائی کہ وہ اپنی ایک بھی گولی ضائع کیے بغیر اس کے خلاف کیا کر سکتا ہے اور وہ راہِ راست پر نہ آیا تو وہ ایک گولی ضائع بھی کر سکتا ہے جو مرشد کے دل یا داغ میں اتر جائے گی۔ دوسری طرف اس نے مجھے رام کرنے کے لیے میرے ایک دشمن کو ٹھکانے لگا دیا اور دوسرے کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ فی الحال وہ مجھ سے دشمنی کر سکے۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ اب میں آزاد تھا۔ میں نے اس سے جو سوالات کیے تھے، اس نے ان کا جواب نہیں دیا اور اب ان کے جواب خود واضح ہو رہے تھے۔

میں مطمئن نہیں تھا۔ میں مرشد کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنی سرشت نہیں چھوڑ سکتا تھا اور جیسے ہی وہ دوبارہ طاقتور ہوتا پھر سے میرے خلاف میدان میں اتر آتا۔ مقامی سطح پر اس کے خلاف کوئی انکوائری بیکار تھی اور نہ ہی اس سلسلے میں بین الاقوامی دباؤ کام کر سکتا تھا۔ کتنی ہی تنظیمیں بین الاقوامی پابندیوں کا شکار ہیں مگر وہ آزادی سے کام کر رہی ہیں۔ ایک مرشد کو کیا فرق پڑتا۔ ڈیوڈ شا اس تماشے کے بعد مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور جب اس کا کام نکل جاتا تو اس کی بلا سے مرشد میرے ساتھ کیا کرتا ہے۔ وہ پلٹ کر بھی نہ پوچھتا اور جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا تو ڈیوڈ شا مجھ سے بھی کم خراب نہیں رکھتا تھا صرف وادی تک جانے کی مجبوری اور وہ بھی اس کے خیال میں تھی جس کی وجہ سے وہ میرے آگے مجبور ہو رہا تھا۔

جب میں سوچتا کہ جدید ترین دنیا کا باسی جو اس دنیا کے حکمرانوں میں بھی شامل ہے وہ ایک بوڑھے کی بات کو اتنی سنجیدگی سے لے رہا ہے تو میرا اوپر والے کی ذات پر ایمان اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ یہ ساری کا کناٹہ اور اس کا ایک ایک ذرہ اس کا کھلوتا ہے وہ اس سے جیسے چاہے کھیلتا ہے۔ اکر نے اور تکبر کرنے والا انسان بھی

نہیں جانتا کہ وہ جو کر رہا ہے اس میں اس کی کوئی مرضی شامل نہیں ہے وہ اس خالق حقیقی کے آگے اس سے زیادہ بے بس ہے جتنا سیلاب کے پانی کے آگے ایک حقیر تنکا ہوتا ہے۔ مگر ڈیوڈ شا اور مرشد جیسے لوگ یہ بات سمجھ نہیں سکتے۔ اگر سمجھ سکتے تو تکبر کیوں کرتے۔ اللہ جسے تباہ کرنا چاہتا ہے اسے اس لاعلاج بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ غرور کرنے والے کا آخری ٹھکانا جہنم ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور ڈیوڈ شا بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔ ”اگر تم مرشد کی موت چاہتے ہو تو یہ بھی ممکن ہے۔“

”میں مرشد یا کسی کی بھی موت نہیں چاہتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے تم سے کبھی نہیں کہا کہ میرا کوئی مسئلہ حل کر دو، یہ تو تم ہو جو میرے پیچھے پڑے ہو۔ اس لیے جو فیصلہ کرنا ہے تمہیں خود کرنا ہے۔ تم چالاکی سے میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش مت کرو۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں محسوس ضمانت چاہتا ہوں اور اب یہ تم پر ہے کہ تم مجھے کس طرح مطمئن کرتے ہو۔“

ایک لمحے کے لیے ڈیوڈ شا کے چہرے پر جھنجھلاہٹ نظر آئی تھی۔ پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تو تم کبھی رضا مند نہیں ہو گے۔“

”دوسرا طریقہ بھی ہے میں تمہارے قبضے میں ہوں مجھے اسی طرح وادی کی طرف لے جاؤ اور اس بوڑھے کے سامنے پیش کر دو جس نے میری جان عذاب میں کرنے والی شرط لگائی ہے۔ شاید تمہیں وادی میں اترنے کی اجازت مل جائے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”یہ آپشن تو میرے پاس ہمیشہ سے ہے لیکن میں تمہیں اس طرح نہیں لے جانا چاہتا۔“

”دوسرا طریقہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ مجھے مطمئن کرو اور میرے دوست بھی ساتھ جائیں گے۔ میں صرف وادی تک جاؤں گا اور پھر واپس آ جاؤں گا مجھے نیچے اترنے کا قطعی شوق نہیں ہے اور نہ ہی میں اتروں گا۔“

”اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن پہلے مرشد۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو ڈیوڈ شا سوچ میں پڑ گیا۔ میرے جسم پر آرام دہ پاجامہ اور کھلی سی ٹی شرٹ تھی۔ جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں میڈی کلنڈ پٹیاں چپکی ہوئی تھیں۔ میں خود کو جسمانی طور پر بہترین محسوس کر رہا تھا۔ اگرچہ درد کش دواؤں کا اثر بھی ہو سکتا تھا مگر میں اپنے اندر ایسی توانائی محسوس کر رہا تھا جیسے میں بہت اچھا وقت گزارتا ہوا آیا ہوں۔ ڈیوڈ شا کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ مجھے یہاں آئے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ وہاں کہیں کوئی گھڑی نہیں تھی جس میں، میں وقت دیکھ سکتا اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ابھی کیا وقت ہو رہا ہے۔ میری بات پر ڈیوڈ شانے گہری سانس لی۔

”شہباز میں کبھی کسی شخص کے سامنے اتنا بے بس نہیں ہوا۔“

”کیونکہ مجھے تم سے غرض نہیں ہے تمہیں مجھ سے غرض ہے۔“ میں نے وجہ بیان کی۔ ہمارے درمیان گفتگو اردو میں ہو رہی تھی شاید اسی لیے ڈیوڈ شانے اپنے گرجے کے آگے بھی کھل کر اعتراف کر لیا۔ اسے یقیناً اردو نہیں آتی تھی۔ ڈیوڈ شانے سر ہلایا اور بولا۔

”ٹھیک ہے میں سوچوں گا کہ تمہیں کیسے مطمئن کروں۔ تب تک تم آرام کرو۔“

”میں آرام کروں گا لیکن میرے ساتھی سکون سے نہیں ہوں گے اور وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ تم یہ

ملت سمجھنا کہ وہ تمہارے ٹھکانے تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے کوئی ہنگامہ ہو اس سے پہلے میرے بارے میں فیصلہ کر لو۔“ میں نے اسے خبردار کیا اور کھڑا ہو گیا۔ میں نے ڈیوڈ شا کو حرکت کرتے نہیں دیکھا تھا مگر اس نے کوئی خفیہ اشارہ ارسال کیا اور فوراً ہی باسو وہاں آ گیا۔ اس نے حسب معمول بڑی سی نیکر اور بنیان پہنی ہوئی تھی اور اس کے جسم پر جہاں جہاں زخم آئے تھے وہاں پٹیاں چسکی ہوئی تھیں۔ ڈیوڈ شا کو کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں باسو کے ساتھ ہولیا۔ میں نے راستے میں اس سے پوچھا۔

”تم ٹھیک ہونا؟“

اس نے صرف سر ہلایا اور میرے لیے مخصوص کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں نے اندر جانے سے پہلے اس سے کہا۔ ”باسو اگرچہ تم میرے دشمن کے ساتھ ہو لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے کئی مواقعوں پر میری مدد کی اور میری جان بچائی۔“

وہ مجھے گھورتا رہا اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس قسم کے الفاظ اور جذبات اس کے لیے اجنبی تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے عقب سے دروازہ بند کر دیا۔ کمر بہت سادہ سا تھا۔ چھت، فرش اور دیواریں بہت سفید تھیں اور ایک طرف سفید ہی رنگ کا پتلے گدے والا سہجلی بیڈ تھا۔ اس پر سفید نکیہ تھا۔ ایک طرف براؤن رنگ کی پلاسٹک کی میز اور پلاسٹک کی ہی کرسی تھی اور میز پر کھانے پینے کا خاصا سامان نظر آ رہا تھا۔ اس میں تازہ پھل، جوس اور انرجی ڈرنک کے ٹن تھے۔ میں نے چوبیس گھنٹے سے پانی نہیں پیا تھا اور منہ کسی قدر خشک تھا اس لیے پیاس نہ ہونے کے باوجود میں نے نصف گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور پھر اپنا جائزہ لیا شرت اتار کر دیکھنے پر پتا چلا کہ میرا تقریباً پورا ہی جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا اور جا بجا پٹیاں چسکی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی زخم اور نیل تھے مگر ان پر پٹی لگانے کی ضرورت نہیں تھی اور اب وہ بھرنے والی پوزیشن میں آ گئے تھے۔ اتفاق سے کوئی زخم خطرناک نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن میں یہ بھر جائیں گے اور باقی زخموں کی پٹی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ تین دن بعد ان کے نشانات بھی غائب ہو جائیں گے۔

میں وقت گزاری کے لیے ایک بڑا سیب لے کر بستر پر دراز ہو گیا اور سیب سے شغل کرنے لگا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال آیا کہ ان کی کیا حالت ہوگی جب ان کے سامنے مجھے بے بس کر کے لے جایا جا رہا ہوگا۔ اب وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ میں نے ڈیوڈ شا کے سامنے بڑھک ضرور ماری تھی کہ میرے ساتھی یہاں تک آ سکتے ہیں مگر مجھے امید نہیں تھی کہ ایسا ہوگا۔ ڈیوڈ شا کے آدمی بہت تربیت یافتہ اور ہوشیار تھے۔ وہ مجھے یوں لائے ہوں گے کہ میرے ساتھیوں کو تعاقب کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ یہاں بھی وقت دیکھنے کا بندوبست نہیں تھا۔ مجھے ڈیوڈ شا کی بات یاد آئی کہ درگاہ میں بعد میں ہونے والے واقعات کی خبر مجھے اخباروں سے مل جائے گی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا تو چند لمحوں بعد باسو نے دروازہ کھولا۔ میں نے فرمائش کی۔

”مجھے تازہ ترین اخبارات چاہئیں۔ اگر آج صبح کا وقت ہے تو کل کے اخبارات بھی درکار ہوں گے۔ جتنے بھی مل جائیں سب لے آؤ۔“

اس نے سر ہلایا اور دروازہ بند کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اخبارات کا ایک بنڈل اٹھائے نمودار ہوا اور اس نے یہ بنڈل فرش پر رکھ دیا۔ ”اس میں شہر میں ملنے والا ہر اخبار ہے۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا۔ یہ گزشتہ روز کے اور آج کے تازہ اخبار تھے اس کا مطلب تھا کہ ہاؤن طلوع ہو گیا تھا۔ اردو اور انگریزی کے کوئی درجن اخبار تھے اور پھر ان کی دودن کی کاپیاں تھیں۔ میں نے جن کرکچر معتبر اخبارات نکالے اور ان میں درگاہ سے متعلق خبریں دیکھنے لگا۔ وہاں ہونے والی قتل و غارت گری اور ہنگامہ اتنا بڑا تھا کہ آج کی بیشتر خبریں بھی اسی کے بارے میں تھیں۔ دراصل رات کے آخری پہر تک جاری رہنے والے ہنگامے کی اطلاعات اگلے دن کے اخبارات تک دیر سے پہنچیں اور اکثر اخبارات میں محدود خبر تھی البتہ آج بھر پور کوریج کی گئی تھی۔ مجھے تمام خبریں دیکھنے میں دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا تھا۔

ان خبروں کا خلاصہ یہ تھا کہ درگاہ مرشدیہ پر باہر سے نامعلوم افراد نے حملہ کیا اور وہاں موجود افراد کو قتل کرنے لگے۔ درگاہ کے محافظوں اور وہاں موجود ایسے مسلح افراد جن کے بارے میں پولیس کو یقین ہے کہ ان کا تعلق غیر قانونی قرار دی جانے والی مسلح تنظیموں سے تھا۔ انہوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا مگر وہ تعداد میں زیادہ اور منظم تھے ان کی قیادت فاضلی نامی شخص کر رہا تھا جو کچھ عرصے پہلے تک درگاہ سے متعلق تھا مگر پھر کسی وجہ سے وہ مرشد اور درگاہ کی دشمنی پر اتر آیا۔ فاضلی کے بارے میں یہ بیان یقیناً مرشد نے دیا ہوگا۔ مگر اس نے میرا ذہن نہیں کیا تھا۔ اگر کیا تھا تو یہ خبر ابھی پریس اور میڈیا تک نہیں پہنچی تھی۔

باہمی لڑائی میں تقریباً ایک سو سے زیادہ افراد مارے گئے تھے اور درگاہ اور گردی نشین خاندان سے متعلق دو درجن سے زیادہ لوگ پہلے ہی مارے جا چکے تھے۔ بعض اخبارات نے یہاں ماضی میں ہونے والی ہنگامہ آرائیوں کے بارے میں بھی لکھا تھا۔ اگرچہ بیشتر اخبارات اور خبر نویسوں کا جھکاؤ مرشد کی طرف تھا۔ کیونکہ یہ ظاہر اسے نقصان ہوا تھا اور اس پر حملہ کیا گیا تھا لیکن کچھ سنجیدہ صحافیوں نے سوالات اٹھائے تھے اور اپنی رپورٹس میں اشارے دیئے تھے کہ یہ درگاہ نہ صرف عیاشی کا اڈہ ہے بلکہ یہاں دوسرے غیر قانونی دھندے بھی زور و شور سے جاری رہے ہیں جن سے پولیس چشم پوشی کرتی رہی ہے۔ حکومت اس بارے میں وسیع پیمانے پر تحقیق کرے کہ آخر یہ جگہ اتنے ہنگاموں کا مرکز کیوں ہے؟

پولیس رپورٹ بہت لگی بندھی تھی اور اعلیٰ پولیس افسران نے پریس سے کہا کہ اب تک کسی ملزم کی گرفتاری مل میں نہیں آئی تھی۔ فوج جانے والے حملہ آور پولیس کی آمد سے پہلے فرار ہونے میں کامیاب رہے تھے۔ اس سوال پر کہ پولیس کئی گھنٹے کی تاخیر سے کیوں پہنچی تو ان افسران نے علاقے میں بجلی اور موبائل کیونٹینین کی بندش کو اس تاخیر کا ذمہ دار قرار دیا۔ حملہ آوروں نے تمام رابطے منقطع کر دیئے تھے البتہ وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکے کہ علاقے میں گشت کرنے والی پولیس فائرنگ اور دھماکوں کی آواز سن کر بھی جائے وقوع پر کیوں نہیں پہنچی تھی؟ تفتیش ابھی بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی اس لیے پولیس افسران کے پاس جان چھڑانے کا بہانہ تھا اور بعد میں وہ یہ کہہ کر بات کرنے سے انکار کر سکتے تھے کہ اس سے مجرموں تک رسائی میں مشکل ہوگی اور چند مہینے بعد خود پریس کو اس کیس سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی۔

میں نے محسوس کیا کہ مرشد پر فرو جرم عائد ہونا مشکل ہے۔ ایک تو وہ خود شکار ہوا تھا اور دوسرے کوئی حملہ آور پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ درگاہ کے تمام اہم لوگ اور وہاں باہر سے منگوائے گئے کرائے کے گودیلے مارے جا چکے تھے اور اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی کہ مرشد کا ان کے بارے میں کیا موقف تھا۔ بہر حال وہ شاطر

سیاست وال آدمی تھا۔ وہ جواز گڑھ سلکتا تھا۔ اپنے چچا زادوں کی موت کو بھی وہ اپنے حق میں استعمال کر سکتا تھا اور اس کا الزام فاضلی پر لگا سکتا تھا۔ فاضلی اس کی تردید کرنے کے لیے زندہ نہیں تھا۔ مرشد کا بہت بڑا نقصان ہوا تھا مگر ساتھ ہی اسے اپنے مریدوں اور علاقے کے لوگوں کی مزید ہمدردیاں بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ وہ درگاہ دوبارہ تعمیر کر لیتا اور زیادہ سے زیادہ ایک سال میں سب پہلے کی طرح ہو جاتا بلکہ اب آمدنی میں کوئی شریک بھی باقی نہیں رہا تھا۔ سب مرشد اور اس کی جائز اولاد کا تھا۔

میرے لیے سب سے اچھی بات تھی کہ اس سارے ہنگامے میں میرا کہیں بھی ذکر نہیں تھا۔ کچھ اخبارات میں دشمنی کے حوالے سے میرا مخفی سا ذکر آیا تھا کہ ماضی میں میرا اور مرشد کا ٹکراؤ ہوتا رہا تھا اور اس سے لائینڈ آرڈر کا مسئلہ بھی ہوا تھا۔ مرشد کا بھائی نادر اور میرا بھائی بھی اس تنازعے کی نذر ہوئے تھے۔ میرے خلاف عدالتوں میں مقدمات چلتے رہے جو بالآخر میرے حق میں ختم ہوئے۔ مگر میں نے درگاہ میں ہونے والی قتل و غارت گری میں جو سرگرم کردار ادا کیا تھا اس کا کہیں بھی اشارہ نہیں تھا۔ پولیس کے مطابق درگاہ کے لوگوں کے علاوہ جو وہاں مارے گئے تھے ان میں سے اکثر اشتہاری اور سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب تھے۔ ایسے افراد کی تعداد مارے جانے والے کل افراد کا ساٹھ فیصد تھی۔ ایک سو بارہ افراد میں مطلوب افراد کی تعداد چھپن تھی۔

میں جانتا تھا کہ باقی جو مارے گئے وہ بھی کوئی شریف نہیں تھے۔ مرشد کے خاص افراد تھے جو اس کے جرائم میں برابر کے شریک تھے اور یہی لوگ وہاں کا نظام چلاتے تھے۔ کچھ عام ملازمین تھے جو مارے گئے۔ پولیس اور انتظامیہ نے درگاہ کو سیل کر دیا تھا اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مرشد خاندان کو بھی مرشد ہاؤس منتقل کر دیا گیا تھا اور پولیس وہاں کی سیوری کر رہی تھی۔ اس کے باوجود سو سے زیادہ افراد کی ہلاکت معمولی واقعہ نہیں تھی۔ صوبائی اور وفاقی حکومت نے اس کا نوٹس لیا تھا اور عدالت نے بھی از خود نوٹس کے تحت اس کی رپورٹ طلب کر لی تھی۔ ان سب خبروں کو بد نظر رکھتے ہوئے امید تھی کہ مرشد کی اتنی آسانی سے گلو خلاصی نہیں ہو گی۔ ڈیوڈ شاٹھیک کہہ رہا تھا مگر میں نے بھی اسے بالکل ٹھیک جواب دیا تھا۔ مجھے ٹھوس ضمانت درکار تھی۔ اگر ڈیوڈ شاٹھیک نے اسے یہ سب خبریں دے دیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر میں اپنی زبان سے اس کی موت کی خواہش نہیں کر سکتا تھا۔ اس صورت میں ڈیوڈ شاٹھیک کی ٹوپی میرے سر رکھ دیتا۔

میں ایک بار پھر قید میں تھا لیکن حالات بہر حال اتنے خراب نہیں تھے جتنے کہ فاضلی کی قید میں تھے۔ ڈیوڈ شاٹھیک نے میری جان پر رسک لیا تھا اور اس دوران میں کتنے مواقع ایسے آئے جب موت میرے پاس سے گزری تھی۔ گولیوں اور دستی بموں سے میں کیسے بچا میں خود بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں اب بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ جب میں ڈیوڈ شاٹھیک کے لیے اتنا ضروری تھا تو اس نے مجھے ایک ایسے معرکے میں کیسے جھونک دیا جس میں انسان کی زندگی کے اگلے پل کا پتا نہیں تھا۔ مجھے لگا جیسے ڈیوڈ شاٹھیک لا شعوری طور پر میری موت چاہتا تھا اور شعوری طور پر میری زندگی کا خواہاں تھا۔ اس سے یہ فیصلہ اس کے لا شعور نے کرایا تھا لیکن یہ میرا خیال بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنے تئیں مجھے بچانے کے مکمل انتظامات کیے ہوں۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور باسونا شتے کی ٹرائی اندر لایا۔ وہ اس نے میز کے پاس چھوڑ دی اور خود باہر نکل گیا۔

ٹرائی میں تو س، بکھن، جیم، شہد اور ابلے وتلے ہوئے انڈوں کے ساتھ چائے اور کافی کے سر بہ مہرگ تھے

جن میں دونوں چیزیں گرم حالت میں موجود تھیں۔ ان میں ملانے کے لیے کنڈنسنڈ ملک، چینی اور کریم الگ سے تھی۔ یہ مکمل اور بھرپور ناشتا تھا اور میں نے اس سے پورا انصاف کیا۔ ناشتے کے بعد چائے اور اس کے بعد کافی دونوں سے شغل کرتے ہوئے باقی اخبارات اور ان کی خبروں کا جائزہ لیا۔ ان میں سے بیشتر نے حقائق پر سنسنی خیزی کو ترجیح دی تھی۔ کچھ اخبارات نے تصاویر بھی حاصل کر لی تھیں جو بہت اہتمام سے کلر میں شائع کیں اور ان میں سے بیشتر ناقابل دید مناظر کی تھیں ان میں کئی پھٹی لاشیں اور تباہ شدہ عمارات کی تصاویر شامل تھیں۔ بعض جغادری صحافی خاصی دور کی کوڑیاں لائے تھے اور اس واقعے کے ڈانڈے انہوں نے پڑوسی ملکوں سے لے کر خاصے دور دراز کے ملکوں تک پھیلاتے ہوئے اسے ایک بین الاقوامی سازش قرار دیا تھا۔ سیاسی جماعتوں کی اپنی اپنی تشریحات تھیں اور تقریباً سب نے اسے سازش قرار دیا۔

ناشتے اور اخبارات سے فارغ ہو کر میں آرام کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد باسو اندر آیا اور اس نے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ مجھے ڈاکٹر لینگ کے پاس لایا۔ یہ وہی مشینوں والا کمرہ تھا۔ مگر اس نے مجھے ایک عام سی کاؤچ پر لیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سوائے انڈرویزر کے سب اتار دو اور یہاں لیٹ جاؤ۔“

”وہ کس لیے؟“

”تمہارے زخم دیکھنے ہیں۔“

میں نے اپنا پا جامہ اور ٹی شرٹ اتاری اور کاؤچ پر لیٹ گیا۔ اس نے پٹیاں ہٹا کر میرے زخموں کو دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی قدر حیران تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”تمہارے زخم عام انسانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے بھر رہے ہیں۔“

”ہاں ایسا ہوتا ہے نارمل زخم دو تین دن سے زیادہ نہیں رہتے اور معمولی زخم بارہ گھنٹے میں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔“

میرے جسم پر کوئی دودر جن پٹیاں چپکی ہوئی تھیں اس نے انہیں اتارا تو صرف دو زخموں پر دوبارہ پٹی لگانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ وہ تجسس تھا کہ میرے زخم اتنی تیزی سے کیوں بھرتے ہیں مگر میں نے اسے حکیم قادس اور اس کی دواؤں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ڈیوڈ شا جانتا تھا اگر وہ بتا دیتا تو اس کی مرضی تھی۔ جب سے فاضلی نے مجھے ڈاکٹر لینگ کی اصلیت بتائی تھی کہ وہ کس طرح سے انسانوں پر تجربات کرتا تھا اور اس نے باسو جیسی مخلوق تیار کرنے میں سات بچے مار دیئے تھے اور باسو آٹھواں تھا تو وہ بھی زیادہ سے زیادہ بائیس سال تک زندہ رہتا۔ اس کے بعد اس کا دل اتنے بڑے جسم کو خون پمپ کرنے کا فریضہ انجام دینے سے قاصر ہو جاتا اور وہ کسی وقت بھی پڑنے والے دل کے دورے سے جاں بحق ہو جاتا۔ ڈاکٹر مسیحا ہوتے ہیں مگر ڈاکٹر لینگ انسانوں اور انسانیت کا قاتل تھا۔ مجھے اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ نہ جانے ڈیوڈ شا اسے اپنے ساتھ کیوں لایا تھا۔ کیا وہ بھر ڈاکٹر توفیق جیسے کسی تجربے کا احیا کر رہا تھا۔ ڈاکٹر لینگ اب اپنے تجربات کسی پاکستانی پر کر رہا تھا؟ نہ صرف بیرون ملک بلکہ اپنے ملک کے اندر بھی ہم لوگوں کا پُر سان حال نہیں تھا ہماری دنیا ہمارے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کرنے کے لیے آزاد تھی۔

میں نے نرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”تم کب سے ڈیوڈ شا کے لیے کام کر رہے ہو؟“

”شروع سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرا باپ ڈیوڈ شا کے باپ کا ملازم تھا وہ تائیوان میں برطانیہ کا اولین سفیر بھی تھا۔ جب وہ ریٹائر ہو کر واپس برطانیہ گیا تو میرے باپ کو ساتھ لے گیا۔ میں اس وقت دس سال کا تھا اور میں نے تعلیم برطانیہ میں حاصل کی۔“

”گویا تم خاندانی غلام ہو۔“ میں نے حقیقت بیان کی تو اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

”میں ڈیوڈ شا کا ملازم ہوں۔“

”جیسے تمہارا باپ اس کے باپ کا ملازم تھا۔“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”کیا فرق ہے تم میں اور باسو میں۔ بلکہ وہ بہتر ہے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہے اور تم سوچ سمجھ کر بھی ڈیوڈ شا کے غلام ہی ہو۔“

”میں ملازم ہوں۔“ وہ غرایا۔

”کیا تم ڈیوڈ شا کو چھوڑ سکتے ہو؟“ میرے لہجے میں چیلنج تھا۔

اس کا لہجہ بدلا۔ ”میں کسی وقت بھی ملازمت چھوڑ سکتا ہوں لیکن یہ کام میری مرضی کے مطابق ہے۔“

”یہ خیال ہے تمہارا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مغرب کا استعماری دور آج بھی جاری ہے اور اسے اس

خطے میں اپنے لیے غلاموں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔“

ڈاکٹر لینگ نے ظاہر کیا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں ہو اور باسو سے کہا۔ ”اسے لے جاؤ۔“

میں کھڑا ہو گیا اور اپنا لباس پہننے لگا۔ ”تم شادی شدہ ہو؟“

”ہاں۔“ لینگ نے جواب دیا۔

”بچے ہیں؟“

”میرے تین بیٹے ہیں۔“

”تب ان میں سے کسی کو باسو جیسا کیوں نہیں بنایا۔ یہ بھی تو کسی کی اولاد ہوگا۔“

”تم فضول بکواس بہت کرتے ہو۔“ اس بار ڈاکٹر لینگ کا ضبط جواب دے گیا۔ ”تم لوگوں کے ساتھ کوئی

مسئلہ ہے جو اتنا بولتے ہو۔“

”یہ ہمارا قومی مشغلہ ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”ہم آج کے عملی دور میں بھی قدیم یونانی سائنس کی عملی تفسیر

ہیں۔ زبان سے مسئلہ حل کرنے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے اور عمل کرتے ہوئے ہمیں موت آتی ہے۔“

”تجسسی تم ایشیا میں بھی سب سے پیچھے ہو۔“ ڈاکٹر لینگ نے سچ کہا۔

”مجھے تسلیم ہے اور وجہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“

”چلو۔“ باسو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ میں نے راستے میں اس

سے کہا۔ ”مجھے نچ میں سبزیوں اور چکن کا سوپ درکار ہوگا کنگ سائز پیالے میں۔“

اس نے بغیر کسی رد عمل کے مجھے کمرے میں دھکیل دیا مگر مجھے معلوم تھا کہ سوپ آئے گا اور ایسا ہی ہوا۔ دو

کھنے بعد سبزیوں اور چکن سے بنا ہوا کسی قدر گاڑھا اور مقوی سوپ آ گیا۔ جب میرے زخم تیزی سے بھرتے ہیں تو مجھے خوراک کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے صبح بھر پور ناشتا کیا تھا اور مجھے چند کھنے بعد بھوک لگنے لگی تھی۔

سو پنی کر اور کوئی نصف درجن سیب کھا کر میری تسلی ہوئی تھی۔ اب مجھے آرام کرنا تھا۔ اب تک مجھے دواؤں کی مدد سے سلا یا جاتا رہا تھا اس لیے قدرتی نیند کی کمی بہر حال قائم تھی۔ اس کا اثر جسم پر پڑتا ہے۔ میں لیٹا اور چند منٹ میں گہری نیند سو گیا تھا۔

جب سے میری زندگی بدلی اور میرے دن رات ہنگاموں میں گزرنے لگے تب سے مجھے سکون کے لمحات بہت کم نصیب ہوئے تھے اور جب کبھی سکون ملتا تب بھی ذہن کے کسی گوشے میں خیال ہوتا کہ یہ عارضی ہے ابھی میرے دشمن کوئی چال چلیں گے اور یہ سکون غارت ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ آئے دن میں دشمن کے ہاتھ لگتا تھا اور میری جدوجہد کا بڑا حصہ قید میں ہی گزرا۔ اب بھی میں ڈیوڈ شا کی قید میں تھا لیکن پہلی بار مجھے سکون اور اطمینان کا ایسا احساس ہوا جو پہلے نصیب نہیں ہوا تھا۔ میرے تقریباً تمام دشمن مارے گئے تھے۔ خاص طور سے فاضلی جیسے عیار اور گھنیا دشمن کی موت نے میرے اندر جیسے کوئی پرانی خلش مٹا دی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو گھناؤنا روپ اختیار کیا تھا اس کے بعد واحد حسرت یہ رہ گئی تھی کہ کاش میں اسے اپنے ہاتھ سے مارتا۔ دیکھا جائے تو اس نے خودکشی کی تھی۔ اس نے اپنے طور پر میری موت کا بندوبست کیا تھا مگر ڈیوڈ شا کی عیاری نے اصل میں اس کی موت کا انتظام کیا ہوا تھا۔ پتا نہیں جب اس کی جان نکل رہی ہوگی تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟

مرشد بچ گیا تھا اور مجھے اب فکر تھی کہ ڈیوڈ شانے اسے کیوں چھوڑا تھا کیونکہ جس وقت باسو مجھے لے کر کٹھی سے باہر آیا تو اندر مرشد بے بسی سے کرسی سے بندھا بیٹھا تھا اور باسو کے لیے ذرا مشکل نہیں تھا کہ اسے صرف ایک ہاتھ مار کر موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا اس کا مطلب ہے ڈیوڈ شا کی طرف سے اسے حکم نہیں تھا جس وقت وہ مجھے باہر لارہا تھا تو اسے علم تھا کہ اصل میں کون موت کی طرف جا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ڈیوڈ شانے مرشد کو ایک مہرے کے طور پر برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اگر میں اس کی بات ماننے سے انکار کروں تو وہ مرشد کو اشارہ کرے اور وہ پھر سے میری دشمنی پر کمر بستہ ہو جائے۔ مرشد مجھے اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا تھا مگر فاضلی ایسا دشمن تھا جو پہلی فرصت میں مجھے دنیا سے رخصت کر دینا چاہتا تھا اور اس نے میرے سامنے اقرار بھی کیا۔ اس لیے ڈیوڈ شانے اس سے مرشد کو سزا دینے کا کام لیا اور پھر اس کا پتلا یوں صاف کیا کہ خود اسے بھی اپنی موت کا سبب پتا نہیں چلا ہوگا۔



میری آنکھ کھلی تو ایسا لگا جیسے میں چھ سات گھنٹے تک سو یا ہوں۔ طبیعت کسی قدر سست مگر ٹھیک تھی۔ میں نگرائی لے کر اٹھا۔ واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا۔ چند لمبے بعد دروازہ کھلا تو سامنے باسو کھڑا ہوا تھا اور خلاف توقع اس نے مکمل لباس پہنا ہوا تھا۔ عام قسم کی پتلون اور شرٹ میں وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ پیروں میں لیدر شوز تھے ورنہ میں نے اسے ہمیشہ ننگے پاؤں ہی دیکھا تھا سوائے درگاہ پر حملے کے موقع کے جب اس نے خاص بلٹ پروف جوتے پہنے تھے۔ میں نے اسے اپنی ضرورت سے آگاہ کیا تو اس نے سر ہلا کر ایک طرف ہوتے ہوئے مجھے راستہ ڈیا۔ میں اس کے ساتھ واش روم تک آیا۔ وہاں سے خارج ہوا تو اس نے مجھے ڈیوڈ شا کا پیغام دیا۔

”باس تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

ڈیوڈ شا اپنے اسی کمرے میں تھا۔ ویسے وہ ہمیشہ سے سوٹ بوٹ میں ہوتا تھا لیکن اس وقت میں محسوس کیا کہ وہ کچھ خاص تیار ہے۔ اس کا بڑے سائز کا قیمتی بریف کیس اس کے پاس رکھا تھا۔ اس کا گرگا خا‘ حسب معمول اس کے عقب میں ساکت کھڑا ہوا تھا۔ باسو مجھے اندر چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈیوڈ شا نے چائے کا اہتہ کیا ہوا تھا اور یہ خالص انگریزی انداز کی چائے تھی اس کے ساتھ بہت اعلیٰ درجے کے خستہ بسکٹس اور کو‘ تھیں۔ اس کے گرگے نے اس کے اشارے پر ہم دونوں کے لیے چائے تیار کی اور سرو کی۔ میں منتظر تھا کہ بات چھیڑے جس کے لیے مجھے طلب کیا ہے مگر وہ سکون سے چائے نوشی کرنے لگا۔ چند سپ لینے کے بعد ا نے اچانک کہا۔ ”شہباز میں واپس جا رہا ہوں۔“

میرا دل دھڑکا لیکن میں نے رد عمل نہیں دیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے چند سہ اور لیے اور پھر بولا۔ ”میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے تم وادی آؤ گے اور ستارے کہتے ہیں کہ میرے ساتھ ہی وہاں پہنچو گے۔“

مجھے معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا کچھ پُر اسرار علوم سے واقفیت کے ساتھ ستاروں کا علم بھی جانتا ہے جسے عرف عام میں علم نجوم بھی کہتے ہیں۔ میں نے اسے اپنے کتہ نظر سے آگاہ کیا۔ ”ممکن ہے کہ ایسا ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بے جان ستارے اور سیارے انسان کے افعال پر اثر نہیں ڈال سکتے ہیں۔“

”جب ایسا ہوگا تب تم دیکھ لو گے۔“ اس نے گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔ ”او کے پھر ملاقات ہوگی۔“

اس نے بریف کیس اٹھایا تو میں نے اٹھنا چاہا مگر مجھے لگا جیسے میرے جسم میں جان نہیں ہو، یہ مشکل میرا ذرا سا اوپر ہوا اور دوبارہ صوفے پر گر گیا۔ اس بار میں سیدھا بھی نہیں رہ سکا بلکہ ذرا سا ڈھلک گیا تھا۔ ڈیوڈ میرے پاس آیا اور اس نے جھک کر میرا شانہ تھپکا۔ ”ڈونٹ وری یہ بے ضروری دوا ہے تین گھنٹے بعد تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

مجھے چائے میں کچھ دیا گیا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم چند گھنٹوں بعد اپنے ساتھیوں کے پاس ہو گے۔“

ڈیوڈ شا یہ کہتے ہی کمرے سے نکل گیا اور اس کا گرگا اس کے پیچھے تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب باسو آئے مگر اس کی جگہ دو مقامی آئے اور انہوں نے سب سے پہلے میرے چہرے پر کپڑے کا ایک غلاف چڑھایا اور پھر وہ وہیل چیئر لائے اور اس پر بٹھا کر وہ کسی گاڑی تک لائے اور مجھے اٹھا کر عقبی نشست پر ڈال دیا گیا۔ اگر دوران میں میرا جسم مکمل طور پر بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ دوا یقیناً چائے کے کپ میں پہلے سے موجود تھی لیکن یہ عجیب دوا تھی اس نے میرا جسم مکمل طور پر مفلوج کر دیا تھا حد یہ کہ میں پلکیں بھی نہیں جھپکا پا رہا تھا اور نہ ہی آنکھوں کو اپنی مرضی سے گردش دے سکتا تھا۔ مگر میرا دباغ مکمل طور پر بیدار تھا اور سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت برقرار تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر روانہ ہوئی۔ اندر اے سی کی خشکی تھی اور گاڑی کے باہر اگر ٹریفک تھا بھی تو اس کا شور بہت کم تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد گاڑی کہیں رکی اور مجھے اس سے نکال کر تقریباً بیس پیچیس قدم دور

بایا گیا۔ یہ سفر میں نے دو آدمیوں کے ہاتھوں میں کیا۔ اب پتا نہیں یہ وہی تھے یا کوئی دوسرے دو افراد تھے۔ کے دوران میں انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا تھا اور نہ ہی مجھے پارک کی اس شیخ پر بٹھاتے ہوئے کچھ کہا۔

ایک نے میرے سر سے خلاف اتارا اور دوسرے نے مجھے یوں ٹکا کر بٹھایا کہ میں گر نہ سکوں اور پھر میری رات تلے پا جاوے سے میرا ہی موبائل اٹکا کر وہ چلے گئے۔ بیچ کا رخ ایسا تھا کہ میں دیکھ نہیں سکا کہ وہ کس میں میں مجھے یہاں تک لائے تھے۔ رات کا وقت تھا اور لگ رہا تھا کہ سورج غروب ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی اپنی بناوٹ اور شادابی، نیز بے رونقی سے۔ یہ اسلام آباد کا کوئی پارک لگ رہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق میں لیاقت پارک سب سے بڑا اور اچھا ہے لیکن وہاں اس موسم میں بہت لوگ لٹکے ہوئے ہیں۔ اسلام آباد میں عیسائے رونق تو نہیں رہا ہے لیکن شام ہوتے ہی یہاں سناٹا اور خاموشی چھا جاتی ہے۔ دفاتر اور کمرشل ایریا پر بند ہو جاتے اور کراچی، لاہور یا دوسرے بڑے شہروں کی طرح رات گئے پہل پہل کا رواج نہیں ہے۔ چائے پیئے ایک گھنٹے کا وقت گزر گیا تھا اور یوڈشا کا کہنا تھا کہ تین گھنٹے میں ہمیں ٹھیک ہو جاؤں گا۔

اگر وہ مجھے یوں چھڑوانے کی بجائے میرے ساتھیوں کو اطلاع کر دیتا تو مجھے یہاں بیٹھ کر اذیت ناک نہیں کرنا پڑتا کہ کب میں اس قابل ہوں کہ موبائل سے کال کر سکوں۔ کچھ دیر بعد میرے دائیں طرف سے افراد کے بات کرنے کی آواز آئی مگر میں گردن گھما نہیں سکتا تھا۔ تاک کی سیدھ میں دیکھنے پر مجبور تھا۔ آواز لگ رہا تھا کہ بولنے والوں کو میری موجودگی کا علم نہیں ہے۔ شاید درمیان میں کوئی باڑیا جھاڑی تھی۔ بولنے والے ایک جوڑا تھا جو میاں بیوی کی ثابت ہوئے اور وہ اپنے جوان ہونے والے بچوں کی سرگرمیوں کے بارے میں کوکر رہے تھے جو کچھ یوں تھی۔

خاتون: ”آپ نے عدنان کے گھر آنے کی ٹائمنگ نوٹ کی؟“

مرد: ”نہیں میں تو موئل کے لیے پریشان رہتا ہوں وہ آج کل مغرب کے بعد آتی ہے۔“

خاتون: ”وہ کو چنگ جاتی ہے۔“

مرد: ”عدنان بھی کو چنگ جاتا ہے، وہ بیٹا ہے، بیٹی پر زیادہ نظر رکھنی چاہیے۔“

خاتون: ”بیٹوں پر بھی پوری نظر رکھنی چاہیے۔“

مرد: ”ابھی تم صرف مجھ پر نظر رکھو۔ دیکھو یہاں سناٹا ہے اور موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔“

خاتون ہنس کر: ”کیا بات ہے رومانٹک موڈ ہو رہا ہے۔“

مرد: ”مجھے یاد آ گیا جب میں تمہارے کالج کے باہر کھڑا ہوتا تھا کہ ایک ہی جھٹک نظر آ جائے۔“

خاتون شرم کر: ”اور وہ جو ہم شام کو پارکوں میں ملتے تھے۔“

اس سے آگے کی گفتگو زیادہ رومانی اور زیادہ سنسنی خیز تھی۔ میں ٹھنڈی سانس بھرنے کے قابل بھی تھا۔ جس قسم کے رومان کے بعد انہوں نے شادی کی منزل پائی تھی اپنی اولاد کے بارے میں فکر مند ہونا سمجھتا تھا۔ بالآخر انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔

مرد خفگی سے: ”یہ کون ہے ہماری باتیں سن رہا ہے۔“

خاتون برہمی سے: ”چلیں یہاں سے، یہاں تو کوئی پرائیویسی نہیں ہے۔“

چند منٹ بعد پھر کسی کی آواز آئی۔ ”یہ کون ہے؟“

بولنے والا آواز سے لڑکا اور لنگا لگ رہا تھا۔ دوسرا بھی ویسا ہی نکلا۔ ”آدی ہے تجھے نظر نہیں آ رہا۔“

”وہ تو ہے پر یہ ایسے کیوں بیٹھا ہے۔“

”جاکر پوچھ لے۔“

ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرے کسی قدر عقب میں دائیں طرف تھے۔ مجھے خطرہ تو نہیں تھا مگر وہ مجھے بے بس پاتے تو شیر ہو جاتے اور شاید مجھے لوٹ لیتے۔ لٹنے کے لیے سوائے موبائل کے اور کچھ نہیں تھا میرے پاس اس کے باوجود لٹنا مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جب میری طرف سے کوئی ردِ عمل نہیں دیا گیا تو ان کی ہمت بڑھی اور وہ میرے پاس آئے۔ ایک نے میرا بازو ہلایا مگر میں گرا نہیں۔ دوسرے نے سامنے سے آکر دیکھا۔ ”آنکھیں کھلی ہیں پر لگتا ہے ہوش میں نہیں ہے۔“

”جینے ہوئے ہوگا۔“ پہلا بولا۔ ”دیکھ اس کے پاس کیا ہے؟“

دوسرا میرے لباس پر ہاتھ مارنے لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ موبائل تک پہنچتا۔ پہلے نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اُوئے یہ کہاں سے آ گئے؟“

دوسرے نے سر گھما کر دیکھا اور بولا۔ ”نکل یہاں سے۔“

ایسا لگ رہا تھا کہ ان دونوں سے بھی بڑے بد معاش آ گئے تھے جنہیں دیکھ کر وہ نودود گیارہ ہو گئے تھے۔ آوازیں نزدیک آنے لگیں اور جلد مجھے ان کی گفتگو سے پتا چل گیا کہ وہ پولیس والے تھے۔ وہ کسی مبینہ مجرم کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جو گزشتہ رات ان کی تفتیش کی تاب نہ لاتے ہوئے راہی ملک عدم ہوا تھا اور انہیں اس کی موت کی وجہ ہارٹ ایک بیان کرنی پڑی تھی اس پر لواحقین نے حسبِ معمول ملزم کی موت کو پولیس تشدد کا نتیجہ قرار دیا۔ پولیس والے لواحقین کے شور شرابے پر خفا نہیں تھے۔ وہ تو مبینہ ملزم پر خفا تھے جو اقرار جرم کیے بغیر ہی اور شریکِ جرم ساتھیوں کا نام بتائے بغیر مر گیا تھا۔ ایک گناہ ہے لذت ان کے گلے پڑ گیا تھا۔ وہ شاید کہیں آس پاس کسی ہوٹل سے مالی غنیمت اڑا کر اسے ہضم کرنے اور ہوا خوری کے لیے یہاں آئے تھے کیونکہ ان کی گفتگو میں جتنی گالیاں تھیں اتنی ہی ڈکاریں بھی تھیں۔

میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی کیونکہ میں گل محمد بنا ہوا تھا اور ذرا بھی جنس نہیں تھی۔ پولیس والے بجا طور پر مجھے نشے میں سمجھ سکتے تھے اور اٹھا کر لے جاسکتے تھے۔ وہ نزدیک پہنچ پر آ بیٹھے اور میری پروا کیے بغیر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ وہ آپس میں گفتگو کریں یا یہاں سے دفع ہو جائیں لیکن میری طرف متوجہ نہ ہوں۔ دعا کے بارے میں سنا ہے کہ وہ رایگاں نہیں جاتی ہے یا تو جیسے ماگی جائے ویسے قبول ہو جاتی ہے یا آخرت کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے یا پھر اللہ تعالیٰ مزید بہتر عطا کر دیتے ہیں۔ میری یہ دعا بھی فوری قبول نہیں ہوئی اور بالآخر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ ”اُوئے یہ کون ہے اتنی دیر سے ایسے بیٹھا ہوا ہے؟“ ایک نے کہا۔

”چپک کر زندہ بھی ہے یا کوئی مار کر ادھر بٹھا گیا ہے۔“ دوسرا بولا۔

”چھوڑ یا کوئی بابو ہوا تو بعد میں گلے پڑ جائے گا۔“ تیسرا بولا۔

وہ ڈر گئے کہ اسلام آباد میں ہر تیسرا بندہ کوئی نہ کوئی سرکاری افسر ہوتا ہے۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اب وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ مگر بد قسمتی سے اسی لمحے میرے پاچامے میں اٹکے موبائل نے بیل دی۔ وہ آن تھا اور پتا نہیں کون مجھے اس وقت یاد کر رہا تھا۔ بیل سن کر وہ چونکے اور جب دوسری تیسری بیل بجنے پر بھی میں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تو وہ متوجہ ہو گئے۔ پہلے نے کہا۔ ”اوائے یہ تو ایسے ہی بیٹھا ہے اسے دیکھ جیج نہ مر گیا ہو۔“

”سانس لے رہا ہے۔“ دوسرے نے اعلان کیا۔

”پردیکھنا تو چاہیے۔“ پہلا بولا۔ وہ تینوں اٹھ کر میرے پاس آئے اور میں نے پہلی بار انہیں دیکھا۔ وہ اسلام آباد نہیں بلکہ پنجاب پولیس کی وردی میں تھے۔ جیسا کہ ان کی گفتگو اور گزشتہ رات کی سرگرمیوں سے بھی واضح تھا کہ ان کا تعلق اسلام آباد پولیس سے نہیں تھا۔ میں نے کوشش کی کہ مسکراؤں تاکہ ان کو ذرا معمول کے مطابق لگوں مگر میرے ہونٹوں اور چہرے کے عضلات میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ ایک نے میرے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ میری پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔ موبائل کی بیل بج جیج کر چپ ہو گئی تھی اور چند لمحے بعد دوبارہ بجنے لگی۔ پہلے نے مجھ سے کہا۔ ”میاں جی خیر تو ہے۔“

”میرا خیال ہے پیٹے ہوئے ہے۔“ دوسرا بولا اور میرا منہ سوچنے کی کوشش کی۔ ”پرہو نہیں آرہی۔“

”کوئی اور نشہ نہ کیا ہو۔“ تیسرے نے کہا۔ ”میں تو سوچ رہا ہوں ریسکیو کو کال کرتے ہیں۔“

”اویہ یار پہلے اس ماں کے..... کو چپ کراؤ، دماغ خراب کر رہا ہے۔“ پہلے نے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔

”تو کرا دے، موبائل اس کے پاچامے میں ہے۔“ تیسرا بولا۔ میں نے ان کی آوازوں سے انہیں

شناخت کیا تھا۔ اس پر پہلے نے کہا۔

”اوائے پاچامے کی اولاد، اس میں جیب کہاں ہوتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے خفیہ جیب ہو آج کل لوگ اسی میں موبائل رکھتے ہیں۔“ دوسرا دور کی کوڑی لایا تو بادل

ناخواستہ پہلے والے نے میری فی شرٹ اوپر کی اور پاچامے کی الاسٹک میں پھنسا موبائل نکال لیا۔ اسی لمحے بیل

بند ہو گئی۔ ان کے پاس ٹارچ تھی۔ وہ جلا کر میرا معائنہ کرنے لگا اس نے میری آنکھیں چیک کیں اور بولا۔

”نفسے میں نہیں ہے۔“

”تب بیمار نہ ہو، کوئی دورہ نہ ہو۔“ تیسرے نے کہا۔ ”ریسکیو کو کال کرتے ہیں۔“

”اوائے چپ کر ریسکیو کا ماما۔“ پہلے نے کہا اس نے میری جامہ تلاشی مکمل کر لی تھی۔ ”اس کے پاس اور

کچھ نہیں ہے، بندہ مشکوک ہے اسے تھانے لے چلتے ہیں۔“

”پہلے ہی ایک گلے پڑا ہوا ہے یہ بھی مرمر اگیا تو ذیل مصیبت آئے گی۔“ تیسرے نے فحاشی سے کہا۔

”چھوڑو یار گھر چلتے ہیں۔“ دوسرا بولا۔

”اوائے نہیں مجھے کھاتا پیتا لگ رہا ہے۔“ پہلے والے نے کہا۔ ”مال پانی مل جائے گا۔“

وہ آپس میں بحث کرنے لگے۔ دوسرا اور تیسرا اس تجویز کے خلاف تھے۔ مگر پہلے والے نے مال پانی کا

ڈکر کر کے ان کی مخالفت کو کمزور کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے شاید دوسری مرتبہ تھانے کی زیارت کرنی پڑے گی۔ پہلی بار جب اکرم چشتی کی وجہ سے گیا تھا اور وہاں میرا حشر ہونے والا تھا مگر ندیم نے بڑی وقت پہنچ کر میری گلو خلاصی کرائی تھی۔ اس بار نہ جانے میرے ساتھ کیا ہو۔ انہوں نے آپس کی بحث میں پندرہ بیس منٹ ضائع کیے تھے۔ مگر فیصلہ میرے خلاف گیا۔ وہ مجھے تھانے لے جانے پر متفق ہو گئے۔ وہ بغیر ایف آئی آر کے مجھے حوالات میں ڈال دیتے تب بھی ان کو کوئی نہ پوچھتا۔ ان میں ایک ایس آئی تھا اور باقی دو اے ایس آئی تھے مگر ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ آپس میں دوست بھی تھے ورنہ اس طرح بات نہ کرتے۔

”پر لے کر کیسے جائیں گے؟“ تیسرے نے نکتہ اٹھایا۔ ”مؤثر سائیکل پر بٹھا کر؟“

”ٹیکسی کریں گے۔“ پہلا ہنسا۔ ”اس کا کرایہ بھی بعد میں یہ دے گا۔“

تیسرا ٹیکسی لینے روانہ ہوا۔ میں اپنی قسمت پر افسوس کر رہا تھا کہ ایک مشکل سے نکلتا نہیں ہوں کہ دوسری میں پھنس جاتا ہوں۔ اگر تھانے میں کوئی جان پہچان والا نکل آیا اور وہ مرشد کا وظیفہ خوار بھی ہوا تو میں مارا جاتا۔ پولیس والے مجھے مرشد کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔ موبائل کی بیل پھر بھی تھی اور پہلے والے نے اسے بند کر دیا۔ یہ بات اس کی گالیوں اور باتوں سے ظاہر تھی جو وہ بار بار تیل بجنے پر کر رہا تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی، شاید میرا کوئی ساتھی کال کر رہا تھا۔ اگر وہ ریسپوکر لیتا تو میری بچت کا امکان ہو جاتا مگر اس نے موبائل آف کر کے یہ امکان بھی ختم کر دیا تھا۔ میں اس دوران میں کوشش کر رہا تھا کہ میرا جسم میرے قابو میں آجائے مگر اب تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے کہ میں جسم کے کسی حصے کو اپنی مرضی سے حرکت دے سکتا تھا۔ ٹیکسی تقریباً بیس منٹ بعد آئی اور تب تک مجھے دو استعمال کیے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ٹیکسی لانے والے نے اطلاع دی۔

”چلو اسے اٹھاؤ۔“ پہلے نے حکم دیا۔ ایس آئی وہی تھا۔

”اب اسے ڈھونڈنا بھی پڑے گا۔“ دوسرا کراہا۔ اس نے تیسرے کے ساتھ مل کر مجھے اٹھایا۔ پولیس والوں کو مشق ہوتی ہے بندے اٹھانے کی۔ انہوں نے بھی مجھے آرام سے اٹھایا۔ میں دل ہی دل میں ڈیوڈ شاہ اور اس کے آدمیوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا جو مجھے اس مصیبت میں پھنسا گئے تھے۔ وہ دونوں مجھے اٹھا کر ٹیکسی تک لائے اور اس میں بٹھا رہے تھے کہ نزدیک ہی کوئی دوسری گاڑی آکر رکی اور اس کے دروازے کھلے پھر کسی نے کہا۔

”اسے کہاں لے جا رہے ہو؟“

میں جو چند لمحے پہلے انتہائی بے بسی اور مایوسی کی کیفیت میں تھا یہ آواز سن کر کھل اٹھا۔ میرا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ وہ وہیم تھا۔ مجھے اٹھانے والے تیسرے نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”بتاؤں میں کون ہوں۔“ وہیم غرایا۔ ”یہ ہمارا بندہ ہے۔“

”اوئے..... اوئے یہ کیا؟“ دوسرا بولا۔

”اسے پستول کہتے ہیں۔“ عبداللہ کی آواز آئی۔ ”شاباش بندے کو ادھر لے آؤ، تم بھی ادھر آ جاؤ۔“

عبداللہ نے شاید پہلے کو حکم دیا کیونکہ باقی دو تو مجھے اٹھائے ہوئے تھے۔

”تم پولیس کے کام میں مداخلت کر رہے ہو۔“ پہلے والے نے ذرا بہادر بن کر کہا ورنہ اس کے دو

ساتھیوں کی بولتی بند ہو گئی تھی۔

”تم لوگ ہمارے معاملے میں ناگ اڑا رہے ہو اگر پولیس سے تعلق نہ ہوتا تو تمہیں ساتھ لے جاتے اور تمہیں پتا چل جاتا کہ ہم کون ہیں۔ بہر حال اپنے اصرار سے کہنا کہ کرل مشہدی سے پوچھ لیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”جلدی کرو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“

ان لوگوں نے مجھے میلکس میں ڈالا۔ میں حرکت کرنے سے قاصر تھا اس لیے کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ ان لوگوں کو بھی غلٹ تھی اس لیے میری طرف توجہ دینے کی بجائے وہ وہاں سے نکل لیے۔ پتا نہیں وہ کیسے عین موقع پر وہاں پہنچ گئے جب پولیس والے مجھے لے جانے ہی والے تھے۔ وسیم ڈیر رہا تھا اور اس نے عبداللہ سے کہا۔ ”پیچھے دیکھتے رہو کہیں وہ تعاقب کی کوشش نہ کریں۔“

”یہ ہماری پولیس ہے۔“ عبداللہ ہنسنا۔ ”سلخ افراد کا کبھی غلطی سے پوچھا نہیں کرتی ہے۔“ چند منٹ بعد انہیں اطمینان ہو گیا کہ پیچھا نہیں ہو رہا ہے تو عبداللہ پیچھے آیا اور میری بغض ٹولی۔ ”وائٹل سائن تو ٹھیک ہیں۔“

”اطلاع دینے والے نے کہا تھا کہ کچھ دیر میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“
”میرا خیال ہے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”ادھر ایف سکس میں ایک جانے والا ڈاکٹر کلینک کرتا ہے۔“

”کہاں پر؟“ وسیم نے پوچھا تو عبداللہ اسے گائیڈ کرنے لگا اور پندرہ منٹ بعد کلینک آ گیا۔ عبداللہ اتر کر اندر گیا اور چند منٹ بعد اسٹریچر سمیت آیا اس نے ایک لڑکے کی مدد سے مجھے اسٹریچر پر منتقل کیا اور اندر لے گیا۔ کلینک پوش قسم کا تھا اور وہاں مریضوں کا جم غیر نہیں تھا۔ مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک ڈاکٹر منتظر۔ اس نے فوری طور پر میرا معائنہ کیا۔ آنکھیں اور وائٹل سائن چیک کیے۔ آنکھ کی پتلی میں روشنی ڈال کر دیکھی اور پھر بلڈ پریشر لیا۔ آخر میں اس نے کہا۔

”سب ٹھیک ہے ایسا لگ رہا ہے یہ کسی سن کرنے والی دوا کے زیر اثر ہیں۔“
”یاد رہے تو میں بھی بتا سکتا ہوں۔“ عبداللہ نے اس سے کہا۔ ”اس کا تو ذکر کرو۔“
”توڑ تو میں کر دوں لیکن بعض اوقات اس قسم کی دواؤں کا تو ذکر کرنے سے ان کے آفٹر لیفلٹ رہ جاتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ اثر رہ جائے گا اور وہ بعد میں مسئلہ کرے گا۔ جسم خود اس مسئلے کو اچھی طرح سے حل کر لیتا ہے اور پھر دوا کے اثرات باقی نہیں رہیں گے۔“
”تب کیا کریں؟“

”انتظار..... اس قسم کی دوا کے اثرات چند گھنٹے سے زیادہ نہیں رہتے ہیں۔ کچھ پتا ہے کہ دوا استعمال کیے کتنی دیر ہوئی ہے۔“

”ہمارے پاس سے تو آدھے گھنٹے سے ہیں۔“ عبداللہ بولا۔ گویا مجھے دوا دیے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور ڈیوڈ شانے نے کہا تھا کہ تین گھنٹے بعد میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ”یہ ہوش میں ہیں؟“
”میرا خیال ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد عبداللہ نے جھک کر مجھے دیکھا تو میں بے ساختہ مسکرایا تھا اور میرے ہونٹ پھیل گئے۔ عبداللہ اچھل پڑا اس نے چلا کر ڈاکٹر کو آواز دی۔

”ریحان ادھر آؤ۔“

ڈاکٹر بدحواسی میں آیا۔ ”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“

”یہ دیکھو انہوں نے مسکرا کر دکھایا ہے۔“

ڈاکٹر میری طرف جھکا تو میں پھر مسکرایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کا کہنا غلط ثابت ہوا تھا۔ میں وقت سے پہلے ہی ٹھیک ہو رہا تھا۔ ویسے بھی اس قسم کی دوا میں مجھ پر زیادہ اثر نہیں کرتی تھیں اور میں جلد ٹھیک ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر گلاس میں پانی لے آیا اور چمچ سے میرے منہ میں پٹکایا۔ پانی حلق سے اترتے ہی میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ وہ وقفے وقفے سے پانی ڈالتا رہا۔ آدھا گلاس پی کر میں نے اسے روک دیا۔ ”بس اور نہیں۔“

عبداللہ خوش ہو گیا۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہیں۔“

”بہتر ہوں۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”آپ پانی لیں۔“ ڈاکٹر نے بقیہ گلاس بھی مجھے جبرا پلایا۔ ”جتنا پانی تمہیں گے اتنی جلدی ٹھیک ہوں گے۔ دوا کے اثرات زائل کرنے میں گردے اہم کردار ادا کرتے ہیں اور انہیں فنکشن کے لیے پانی درکار ہوتا ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ عبداللہ نے اس سے گلاس لے لیا اور وہ چلا گیا۔ عبداللہ نے وہیں رکھے ڈھنسرے پانی نکالا اور دس منٹ بعد پھر مجھے ایک گلاس دیا۔ مزید دس منٹ بعد تیسرا گلاس دیا تو میں واش روم جانے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آ گیا تو تقریباً ٹھیک تھا۔ ڈاکٹر ریحان نے پھر میرا معائنہ کیا اور مزید پانی پیتے رہنے کا کہہ کر جانے کی اجازت دے دی۔ میں ٹھیک تھا مگر عبداللہ زبردستی سہارا دے کر باہر لایا۔ وسم نے عقل مندی کی کہ گاڑی میں رہا۔ اس کی اندر ضرورت نہیں تھی۔ اگر پولیس کسی طرح پیچھے آ بھی جاتی تو ہم بے خبری میں نہ مارے جاتے۔ مجھے اپنے قدموں پر آتا دیکھ کر وہ نیچے اترا اور گرم جوشی سے بغل گیر ہو گیا۔

”اب کیسے ہیں آپ؟“

”اللہ کا کرم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم لوگ کیسے ہو کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا میری غیر موجودگی میں؟“

”نہیں اللہ نے یہاں بھی کرم کیا۔“ اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ”آئیں باقی راستے میں بات

ہوگی۔“

میں بیٹھ گیا اور کچھ دیر میں عبداللہ بھی اندر سے آیا تو ہم روانہ ہوئے۔ اگرچہ میں سن چکا تھا کہ انہیں اطلاع ملی تھی لیکن میں پوری بات جاننا چاہتا تھا۔ وسم نے کہا۔ ”جب ہم پارک پہنچے تو آدھے گھنٹے پہلے ایک اجنبی نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ اس پارک میں موجود ہیں۔ آپ کے پاس موبائل کا بھی بتایا تھا ہم کال کر رہے تھے مگر ریسپونڈ نہیں ہو رہی تھی۔ ہم فوری روانہ ہوئے اور بروقت پہنچے۔“

”بالکل ورنہ پولیس والے مجھے لے جاتے اور پتا نہیں تھانے میں میرے ساتھ کیا ہوتا۔ یہ پارٹی گزشتہ رات ہی تفتیش کے نام پر کسی مبینہ ملزم کو پار کر چکی تھی۔“

”ہم آپ کے پیچھے پاگل ہو رہے تھے“ عبداللہ نے بتایا۔ ”وہ دیو قاتم آپ کو لے گیا تھا۔“

”وہ ڈیوڈ شا کا خاص مہرہ ہے۔ درگاہ میں ہونے والی تباہی میں بہت بڑا ہاتھ اس کا بھی تھا۔“

”جب اس نے آپ کے سر پر اپنا بڑا پتول رکھا اور ہم سے کہا کہ وہ صرف لاش چھوڑ کر جاسکتا ہے تو ہمارے پاس پیچھے ہٹنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔“

”تم لوگ وہاں تک کیسے پہنچے؟“

”درگاہ میں موجود ہمارے آدمی نے اطلاع دی تھی۔“ وسیم نے کہا تو میں چونک گیا۔ میرے دماغ سے بالکل نکل گیا تھا کہ درگاہ میں ہمارا بھی ایک آدمی ہے ورنہ میں اس سے رابطے کی کوشش کرتا۔

”وہ اب کہاں ہے؟“

وسیم نے گہری سانس لی۔ ”مارا گیا..... وہ مرشد کی کوٹھی میں تھا جب انہوں نے وہاں حملہ کیا تو وہ بھی پلیٹ میں آ گیا۔“

”افسوس ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”اس رات وہاں سو سے زیادہ آدمی مرے۔ ان میں سے بہت سے میرے ہاتھوں مارے گئے۔“

”آپ کسی وجہ سے شامل ہوئے ہوں گے؟“ وسیم نے درست اندازہ لگایا۔

”بالکل، جب بائیس لوگوں کی زندگی پر آئی تو مجھے فاضلی کی بات ماننا پڑی تھی۔“ میں نے کہا اور پھر بتایا کہ فاضلی نے کس طرح حویلی پر میزائل لگا دیا تھا جو صرف ایک بین دبانے سے پوری حویلی کو تباہ کر سکتا تھا۔

”امکان تھا کہ وہ بلف کر رہا ہے لیکن میں ایک فیصد چانس بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے راضی ہو گیا۔ پھر ڈیوڈ شانے یہاں ایک ڈیوڈس باندھ دی تھی۔“ میں نے کلائی اٹھا کر دکھائی۔ ”یہ مٹی پر پڑیو اس تھی اگر میں اس کے ریسپور کے ایک خاص حد سے زیادہ نزدیک جاتا تو مجھے شدید قسم کا برقی جھک لگتا اور ایک حد سے دور جاتا تو کڑے میں موجود سائٹائیز میرے جسم میں انجکٹ ہو جاتا۔“

”سائٹائیز۔“ عبداللہ نے کہا۔

”پھر آپ کو کیسے چھٹکارا ملا۔“

”یہ ذرا لمبی اور پیچیدہ کہانی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کا کہانی کار ڈیوڈ شا تھا اور اس نے ہمیں استعمال کیا۔ فاضلی مارا گیا۔ مرشد کا اڈہ تباہ ہوا اور اس کے تمام خاص آدمی مارے گئے۔ نیز وہ مصیبت میں پھنس گیا کہ مارے جانے والوں میں مطلوب دہشت گرد بھی شامل ہیں۔ ساتھ میں اس نے مجھ پر ایک طرح سے احسان دھر دیا۔“

”احسان کیسا؟“ وسیم نے اعتراض کیا۔ ”اس نے تو آپ کو موت کے منہ میں جھونک دیا تھا۔“

”اس یقین کے ساتھ کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ فاضلی سے تھا اور ڈیوڈ شا جانتا تھا کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ مجھے نہیں چھوڑے گا اس لیے ڈیوڈ شانے ڈیوڈس کار ریسپور اس کے حوالے کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ استعمال کرے گا اور مارا جائے گا۔“

”مارا کیسے گیا؟“ عبداللہ بے چینی سے بولا۔ دونوں کا تجسس سے بُرا حال تھا۔

”یہ سب میں ایک ساتھ بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میرے جانے کے بعد کیا ہوا تھا؟“

عبداللہ نے بتایا۔ ”مجھے اور سفیر کو ہوش آیا تو سب ویسا ہی تھا سوائے آپ کے، آپ غائب تھے۔ حد یہ کہ جاتے ہوئے ٹوٹا ہوا دروازہ تک چوکھٹ میں لگا گئے تھے۔“

”وہ مجھے لے جانے آئے تھے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”رومانہ اور راشد کی ذیل کیسے ہوئی؟“

”ڈیوڈ شانے براہ راست ہم سے بات کی اور آپ کی زندگی کے بدلے انہیں طلب کیا۔“

”تمہیں یقین ہو گیا تھا کہ اگر ان دونوں کو حوالے نہ کیا تو وہ مجھے مار دے گا؟“ میں نے اعتراض کیا۔

”نہیں اس نے دھمکی دی تھی کہ اس صورت میں آپ کو دماغ ماؤف کرنے والا انجکشن لگا دے گا۔ ہمیں اس بات پر اعتبار کرنا پڑا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس صورت میں آپ کو وادی تک لے جانا اور آسان ہو جائے گا۔“

”ڈیوڈ شانے اصل میں مرشد کو ذلیل کرنے اور سزا دینے کے لیے ان دونوں کو فاضلی کے حوالے کرنا تھا۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”اس اسٹوری کا کسی حد تک علم ہے۔ عبد اللہ نے اندر کے ایک آدمی سے بات کی۔ وہ پولیس انویسٹی گیشن میں ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور انہیں فاضلی کی شیطانیت سے آگاہ کیا وہ بھی دنگ رہ گئے تھے۔ ”انسان اس قدر بھی گر سکتا ہے۔“

”انسان ہی اس قدر گر سکتا ہے۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”شیطان تو پہلے ہی گرا ہوا ہوتا ہے۔“

روٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہم فیض آباد والی کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ عبد اللہ نے کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈیوڈ شانے اچانک آپ کو کیسے چھوڑ دیا؟“

”سمجھ میں تو میری بھی نہیں آیا۔“ میں نے کہا۔ ”شاید وہ اس بارے میں پہلے ہی کوئی فیصلہ کر چکا تھا اور اس نے مجھے صرف اس لیے واپس منگوایا کہ وہ جتنا چاہتا تھا کہ جب چاہے مجھے اپنے قبضے میں کر سکتا ہے۔“

”وہ ممکن طریقے سے آپ پر باؤ ڈال رہا ہے کہ آپ اس کے ساتھ جائیں۔“

”بس اب ایک یہی مسئلہ رہ گیا ہے۔“ میں نے گہری سانس لی۔

”آپ بھول رہے ہیں مرشد ابھی موجود ہے۔“ وسیم نے یاد دلایا۔ ”اگر وہ اس چکر سے نکل آیا تو آگے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ پھر طاقت حاصل کر لے گا اور پھر سے ہمارے خلاف میدان میں آجائے گا۔“

”ابھی وہ زخمی سانپ ہے اور بل میں گھسا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ مجھے اس قسم کی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ میں نے رومانہ کو فاضلی سے بچانے کی کوشش کی تھی اس لیے مرشد کے اندر میرے خلاف دشمنی کا زہر ختم ہو جائے گا۔ وہ اس قسم کا آدمی ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ آخر میں رومانہ کے لیے فاضلی سے کیسے التجا کرنے لگا تھا ورنہ شروع میں تو اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کی بلا سے ان کے ساتھ کچھ بھی ہوتا رہے۔ شاید اس کے اندر کہیں چھپی بیٹی کی محبت جاگ گئی تھی لیکن میرے لیے اس کے اندر کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مجھے صرف یہ امید تھی کہ وہ کمزور اور پھنسا ہوا تھا اور شاید وہ اس مشکل سے نہ نکل پاتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ درگاہ کا معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا اور اس کی اصل طاقت یہی درگاہ تھی۔ اگر وہ واپس بھی آتا تو اسے پھر سے طاقت پکڑنے میں کچھ وقت لگتا۔ ہم کوٹھی پہنچے تو پورچ میں شاہ جی موجود تھا۔ اس نے استقبال کیا۔

”شکر ہے جی آپ کی صورت بھی نظر آئی۔“

”کیوں کیا ہماری صورتیں پسند نہیں ہیں۔“ سفیر اندر سے برآمد ہوا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ ”ٹو پھر بچا کر

آگیا اور سب کا بیڑا غرق کر دیا۔“

”تجھے مارے بغیر نہیں مروں گا۔“ میں نے اس کی کرپڑ مکا مارا تو وہ کراہا۔

”پہلے ہی مرا ہوا ہوں اور ٹو مزید مار رہا ہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”ہوش میں آنے کے بعد سر پر یہ موجود تھا۔“ اس نے سر کے پچھلے حصے میں موجود گومڑ ملاحظے کے لیے

پیش کیا۔ ”اب تک دکھ رہا ہے۔“

”کوئی بات نہیں ٹو بھی شہیدوں میں شامل ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا اور وسیم کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے

آدمی کہاں ہیں؟“

”اسی حویلی میں؟“

”انہیں وہاں سے ہٹالو، پتا نہیں فاضلی بلف کر رہا تھا یا سچ مچ اس نے کوئی میزائل لگایا ہوا ہے۔ اگر وہ غلطی سے بھی چل گیا تو یہ عمارت طے کا ڈھیر بن جائے گی۔“

”میں آس پاس چیک نہ کرا لوں۔“ وسیم نے کہا۔ ”آپ کو یاد ہے تصویروں میں حویلی کا کون سا حصہ نظر آ رہا تھا۔“

میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ ”شاید عقبی حصہ تھا، ہاں یاد آیا تمام تصاویر اسی طرف کی تھیں اور کچھ ذرا ہٹ کر لی گئی تھیں جن میں حویلی کے ساتھ جمیل بھی دکھائی دے رہی تھی۔“

”میں چیک کراتا ہوں جب تک اپنے آدمیوں کو وہاں سے ہٹا دیتا ہوں۔“ وسیم نے کہا اور کال کرنے لگا۔ ہم اندر آئے تو نونج گئے یعنی ڈرنائٹ تھا۔ اندر زبیدہ ڈرن کر رہی تھی اور اس کی خوشبو پورے لاؤنج میں پھیلی تھی۔ میں نے تاک پر زور دیا۔

”ایسا لگ رہا ہے کہ بریانی بن رہی ہے۔“

”صرف بریانی نہیں صاحب۔“ زبیدہ نے کچن سے جھانک کر کہا۔ ”آپ کی پسند کی اور بھی چیزیں

ہیں۔ آپ کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم سب کو ایک بار پھر دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔“

”آپ فریش ہو کر آجائیں تو میں کھانا لگا دوں یا جب آپ کہیں۔“

”ایک گھنٹے بعد لگا دیتا۔“ میں نے کہا اور اوپر آیا۔ میرے جسم پر وہی پاجامہ اور ٹی شرٹ تھی اور میں اس اس کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے میں سب سے پہلے اوپر آیا۔ فی الحال زخموں کی وجہ سے نہ نہیں سکتا تھا اس لیے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوا اور کپڑے تبدیل کر کے سب سے پہلے حویلی کال کی۔ میں نے بابا کا موبائل نمبر یا تھا ان سے بات ہوئی اور پھر ماں جی سے بات ہوئی۔ اتفاق سے شجاع بھائی، بھابی اور بچوں سمیت آئے تھے ان سے بات ہوئی اور پھر میں نے سویرا کا نمبر ملایا۔ وہ منتظر تھی۔ اس سے بات ہوئی اور حسب معمول سوؤں اور ہنسی کے درمیان ہوئی۔ مونا، سادی اور بانو سے کل بات کرنے کا کہا تھا گھر والوں سے بات کر کے بالکل ہلکا ہو کر نیچے آیا۔ بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ شجاع بھائی مجھ سے کچھ خاص بات کرنا چاہ رہے تھے۔ میں دو

گھٹنے بعد انہیں کال کر لوں۔ میں نے سوچا کہ اس دوران میں ڈنر اور ان لوگوں سے منٹ لوں گا۔ میں نیچے آیا تو نشست گاہ میں سب موجود تھے۔

”ایاز بھی آرہا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”میں نے اپنے بندے حویلی سے ہٹا دیئے ہیں اور کل وہ صبح سے میزائل کی تلاش میں لگ جائیں گے۔“

”میں تو کہہ رہا ہوں اس میں رسک ہے۔ بہتر ہے حویلی چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے اگر کل میزائل نہیں ملا تو ہم حویلی چھوڑ دیں گے۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”اب بتائیں کہ درگاہ

میں کیا ہوا؟“

عبداللہ نے بھی سوال کیا۔ ”اس سے پہلے وہ دیو قات آپ کو کہاں لے گیا تھا؟“

”کچھ دیر رک جاؤ ایاز آجائے تو ساتھ ہی سنا تا ہوں۔“ میں نے کہا۔ زبیدہ فالے کا شربت لے آئی

تھی۔ اگرچہ بارش کے بعد موسم خوش گوار ہو گیا تھا مگر فالے کے منہ بستہ شربت نے دوبالا کر دیا تھا۔ دس منٹ بعد ایاز بھی آگیا اور گرم جوشی سے ملا۔

”آپ ٹولانس کی طرح ہو گئے ہیں چند گھنٹے کے لیے آتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ سفیر نے اسے داد دی۔ ”یہ واقعی بس چند دن کے لیے آتا ہے اور پھر دشمنوں کے

پاس دوڑا جاتا ہے۔ پتا نہیں ان کے پاس ایسی کون سی گیدڑ منکھی ہے۔“

”تو کیا میں اپنی خوشی سے جاتا ہوں۔“ میں نے خفگی سے کہا۔ ”وہ لے جاتے ہیں۔“

”اگر ڈیوڈ شایا مرشد دوسری صنف سے تعلق رکھتے تو میں کچھ اور سوچتا۔“ سفیر ہنسا۔ ”خیر ٹوٹھیک کہہ رہا

ہے۔“

”ایاز آگیا ہے اب بتائیں۔“ وسیم نے یاد دلایا تو میں نے وہاں سے شروع کیا جب مجھے ڈیوڈ شا کی قید

میں ہوش آیا تھا۔ فاضلی اور ڈیوڈ شا کے گٹھ جوڑ سے ہم پہلے ہی واقف ہو گئے تھے اس لیے فاضلی کو وہاں پا کر مجھے

تعجب نہیں ہوا۔ البتہ جب میں نے انہیں ڈاکٹر لینگ اور اس کے ایجاد کردہ نمونے باسو کے بارے میں بتایا تو وہ

سب حیران ہوئے تھے۔ وسیم نے سر ہلایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ چینی ایسے کاموں میں ماہر ہوتے ہیں۔“

”میں نے بھی سنا تھا لیکن یقین نہیں کیا تھا اب باسو کو دیکھ کر یقین آگیا ہے۔“

درگاہ پر حملے کی کہانی زیادہ سنسنی خیز تھی۔ البتہ جب میں نے وہاں ملنے والی عورتوں کا ذکر کیا تو سفیر معنی

خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ ”کیا چکر ہے بھائی جہاں جاتے ہو وہاں عورتیں مگر جاتیں ہیں اور پھر تم ہیرو بن کر ان

کو بچاتے ہو کسی نہ کسی دلن سے۔“

”بس قسمت کی بات ہے۔“ میں نے جوابی چوٹ کی۔ ”بعض لوگ تڑپتے ہیں مگر انہیں عورت کیا تالی

بجانے والے بھی نہیں مگراتے ہیں۔“

اس پر وسیم نے بلند آہنگ قہقہہ مارا اور پھر اس کی وضاحت کی کہ ایک بار وہ اور سفیر کہیں جا رہے تھے تو

سگنل پر انہوں نے پیٹھ موڑے کھڑی عورت دیکھی اور سفیر نے اس پر تبصرہ کیا تھا مگر جب وہ ان کی طرف مڑی تو

تیسری دنیا کی مخلوق نکلی تھی۔ سب ہنسے تو سفیر کھیا گیا۔ اس نے خفگی سے کہا۔ ”میں نے اکیلے تو تبصرہ نہیں کیا

”تھا؟“

”میں نے صرف تمہارے خیالات کی تائید کی تھی۔“

یہ نوک جھوک کچھ دیر چلتی رہی لیکن جب میں نے معرکے کا ذکر شروع کیا تو سب ہم تن گوش ہو گئے۔ سنسنی ایسی تھی اور واقعات میں اتنی تیزی تھی کہ بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی میں خود کو پھر اسی ماحول میں محسوس کرتا تھا جب چاروں طرف رقص اجل جاری تھا اور میں خود کتنی بار بچا تھا۔ صورت حال ہر بل بدل رہی تھی اور پھر اس میں مرشد، فاضلی اور رومانہ و راشد شامل ہوئے تو سنسنی مزید بڑھ گئی تھی۔ فاضلی نے اپنے طور پر میری موت کا فیصلہ کیا تھا مگر ڈپوڈ شاکی عیاری سے مات کھا گیا اور خود اجل کا شکار ہو گیا۔ مرشد، رومانہ اور راشد بچ گئے۔ داستان ختم ہوئی تو سب خاموش تھے۔ شاید وہ سب بھی اسی ماحول میں پہنچ گئے تھے۔ اس کیفیت کو زبیدہ نے کھانا لگنے کا اعلان کر کے ختم کیا اور ہم سب ڈائننگ ہال میں آ گئے۔ زبیدہ نے چمچ میری پسند کی کئی ڈشز بنائی تھیں اور مجھے جھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے سب کے ساتھ انصاف کیا۔ کھانے کے دوران میں بھی گفتگو جاری رہی۔ عبداللہ نے کہا۔

”کیا مرشد، رومانہ اور راشد کو معاف کر دے گا؟“

”ابھی کچھ کہنا دشوار ہے فی الحال تو وہ خود پھنسا ہوا ہے اور اسے بہت سی باتوں کی وضاحت کرنی ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”مگر مرشد جیسے لوگ اپنی سرشت نہیں بدل سکتے۔ ممکن ہے ابھی وہ پھنسا ہے تو کچھ نہ کرے مگر آگے جا کر وہ راشد اور رومانہ کو سزا دے۔“

”رومانہ اور راشد اس کے قریبی خون کے رشتے ہیں۔ وہ اسے زیادہ بہتر جانتے ہیں اور وہ شاید اس سے نٹ لیں۔ یعنی اپنی جان بچالیں۔ بہر حال اب وہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔“

”یہ تو ہو گئی پالیسی۔“ سفیر نے کہا۔ ”اب مرشد کا کیا کرنا ہے میرے خیال میں تو وہ کتے کی دُم ہے اور کبھی سیدھا نہیں ہوگا۔ اگر ہم اس کے عمل کا انتظار کریں تو یہ ہماری حماقت ہوگی۔“

”تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟“

”مرشد کا صفایا۔“ سفیر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں نے وسیم اور عبداللہ کی طرف دیکھا تو ان کے چہروں پر تائید لکھی ہوئی تھی صرف ایاز خاموشی سے کھانے میں مصروف تھا۔ ایاز ہمارا ایسا ساتھی تھا جو فیصلوں میں شامل ہونہ ہو عمل میں پوری طرح شامل ہوتا تھا۔ ایک طرح سے اس نے خود کو ہمارے سپرد کیا ہوا تھا حالانکہ ہمارے معاملات کا اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میرے ہاتھ سے یا میرے فیصلے سے کسی کی جان نہ جائے اور میں نے صرف مجبوری کے عالم میں کسی کی جان لی یا اس کا فیصلہ کیا۔ مرشد کا معاملہ ایسا تھا کہ اب وہ اتنا برا خطر نہیں رہا تھا اور ہم نے اسے اس وقت بھی چھوٹ دی تھی جب وہ پوری طرح ہماری جان کا گامک بنا ہوا تھا۔ میں ہچکچا رہا تھا۔ وسیم نے کہا۔

”شہباز صاحب آپ سوچ لیں، یہی وقت ہے جب سانپ قابو میں ہے ایک بار اس کی گردن چھوٹ گئی تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ وہ پھر قابو میں آئے گا یا نہیں۔“

”وہ جانتا ہے کہ اس حملے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔“ عبداللہ نے بھی کہا۔ ”ممکن ہے اس کی

دلی دشمنی میں اس حملے کا حساب بھی شامل ہو گیا ہو اور وہ طاقت حاصل کرتے ہی ایک بار پھر ہمارے خلاف صف آرا ہو جائے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”یاد رہے کہ میں دشمنی میں آخری حد تک جانے کا قائل نہیں ہوں۔“
 ”مرشد ایسا نہیں سوچتا۔“ سفیر نے کہا۔ ”وہ کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔“
 سفیر ٹھیک کہہ رہا تھا مرشد کے بارے میں میرا خیال بھی یہی تھا کہ وہ کبھی اپنی فطرت نہیں بدل سکے گا اس کی مثال سوکھی شاخ کی سی تھی جو ٹوٹ تو سکتی ہے لیکن جھک نہیں سکتی۔ میں نے مزید بحث سے گریز کیا۔ ”ہم اس پر بعد میں بات کریں گے۔“

میں نے کہا تو سفیر نے کچھ کہنا چاہا مگر وسم نے بات بدل دی اس نے کہا۔ ”ایک اچھی خبر اور بھی ہے۔ مانی نے انکل سے بات کر لی ہے اور شاز یہ کارشتہ مانگا ہے۔ انکل نے شاز یہ سے پوچھ کر ہاں کر دی ہے۔“
 میں خوش ہو گیا۔ ”یہ تو واقعی اچھی خبر ہے۔ شادی کب تک ہے۔“

”مانی کا کہنا ہے کہ جیسے ہی ہمارے مسائل حل ہوتے ہیں وہ شادی کر لے گا اس سے پہلے کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“ عبداللہ نے بتایا۔ ”اس نے لاہور میں آفس لے کر اسے سیٹ کر لیا ہے اور اپنی ٹیم بھی جمع کر لی ہے۔ میں نے اسے بیس لاکھ روپے بھیجے ہیں۔ میں زیادہ بھیجنا چاہ رہا تھا مگر اس نے کہا کہ بیس لاکھ کافی ہیں۔“

”اگر وہ اسٹیمپلش ہو جاتا ہے تو جلد شادی کر لے، ہمارا مسئلہ حل ہونے کی شرط کیوں لگا رہا ہے۔“
 ”اس کا کہنا ہے کہ اس کے بغیر مزہ نہیں آئے گا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے بات کی تھی مگر انہوں نے شاز یہ کا رشتہ لے کر جانے سے انکار کر دیا اس لیے اب وہ خود شادی کر رہا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ ہم ہی اس کی فیملی ہیں۔“ وسم نے وضاحت کی۔

”یہ تو اچھی بات ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ شادی دھوم دھڑکے سے ہو۔ سادگی سے شادی سب سے اچھی ہوتی ہے۔“

”یہ تو ٹھیکہ رہا ہے نا آج کل ایسی باتوں کو ماننا کون ہے۔“ سفیر نے تلخی سے کہا۔ ”میں نے سادگی سے کی تھی اس پر آج تک مجھے اپنے گھر میں باتیں سننے کو ملتی ہیں۔“

”بس یار ہم نمود و نمائش کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔“ میں نے گہری سانس لی۔ کھانے کے بعد زبیدہ نے فرمائش پر سب کے لیے چائے اور کافی بنائی تھی۔ میں نے کافی کا انتخاب کیا۔ مجھے مانی کی جرأت اور کردار نے متاثر کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شاز یہ کے ساتھ کیا ہوا تھا اور پھر وہ ماں بننے والی تھی یہ تو قدرت نے اسے بچا لیا۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنا رہا تھا اور ترس کھا کر نہیں محبت سے اپنا رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”ہم اسے جو رقم دے رہے ہیں جب وہ سیٹ ہو جائے گا تو ہم اسے گفت کر دیں گے۔“

”یعنی ہم اس کے بزنس پارٹنر نہیں ہوں گے؟“ سفیر نے پوچھا۔
 ”بالکل نہیں، مگر وہ خود دار لڑکا ہے اس لیے ابھی اسے کچھ مت کہنا، تاکہ اسے مزید رقم کی ضرورت ہو تو وہ بلا جھجک ہم سے لے سکے۔ آئی ٹی بزنس بھی اب بہت پیسا مانگنے لگا ہے اور اسے سیٹ ہونے اور بڑے پیمانے پر

بزنس کرنے کے لیے مزید رقم کی ضرورت ہوگی۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وسیم نے تائید کی۔ ”ہمارے ہاں گورنمنٹ کوئی مدد نہیں کرتی ہے ہم نے آئی ٹی کے میدان میں جو کیا ہے وہ اپنی کوشش سے کیا ہے۔“

”ہمارے مقابلے میں انڈیا نے اپنی آئی ٹی کی صنعت کو اتنی مراعات دی ہیں کہ وہ اب امریکا کا مقابلہ کرنے لگی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں میں نے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کو یہاں کی نسبت بہت آگے پایا ہے۔ دور دراز کے دیہاتی علاقوں میں بھی انٹرنیٹ دستیاب ہے اور میں اسی کی مدد سے تم لوگوں سے رابطے میں رہا۔“

”ہمارے ہاں سارا زور موبائل پر ہے اور وہ بھی خفی سرگرمیوں میں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”ٹائٹ ہیکر نکالے ہی اس لیے مجھے ہیں۔“

”انٹرنیٹ تک کا استعمال بھی کم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اخبار میں ایک رپورٹ پڑھی جو ایک بڑے سرچ انجن کی طرف سے شائع کی گئی اس کے مطابق ممنوعہ سائٹس کے لیے سب سے زیادہ سرچ ہمارے ہاں سے کی جاتی ہے۔“

اس دوران میں دو گھنٹے ہونے والے تھے اس لیے میں اوپر آ گیا۔ شجاع بھائی کا نمبر نہیں تھا اس لیے بابا کا نمبر ملایا۔ موبائل شجاع بھائی کے پاس تھا کیونکہ بابا اس وقت تک سو جاتے تھے۔ ”جی شجاع بھائی آپ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہ رہے ہیں؟“

”شہباز تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مرشد کی درگاہ میں کیا ہوا ہے؟“

”جی جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”آری ٹیلی جیس نے بھی اس سے تفتیش کی ہے کیونکہ درگاہ سے مطلوب دہشت گردوں کی لاشیں بھی ملی ہیں۔“

”کیا مرشد کو ملوث قرار دیا جا رہا ہے؟“

”نہیں کیونکہ اس نے انہیں اپنا آدمی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ شجاع بھائی بولے۔ ”اس نے

الزام لگایا ہے کہ حملہ آوروں کی قیادت تم کر رہے تھے۔“

”اس کے پاس اس الزام کا کوئی ثبوت ہوگا؟“

”نہیں مگر اس کے الزام میں وزن ہے کیونکہ وہ ایک بااثر مگدی نشین اور سیاست دان ہے۔“

”تب وہ مجھے عدالت میں کھینچ لے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”شہباز وہ تمہارے خلاف رپورٹ کر دانا چاہتا ہے۔ تم جانتے ہو ایک بار تمہارے خلاف پھر ایف آئی

آر آگئی تو تمہارے لیے بہت سے مسئلے کھڑے ہو جائیں گے۔“

”شجاع بھائی میں ان سے نمٹتا آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔“

”ڈونٹ بی فوئش۔“ وہ ناگواری سے بولے۔ ”میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ مجھے کوئی مسئلہ ہے۔

مسئلہ تمہارے لیے ہے اور اس حویلی کے لیے ہے۔“

”تب آپ کیا کہتے ہیں؟“ میں نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

”مرشد سے بات کرو اور اس سے کہو کہ بات آگے نہ بڑھائے۔“
 ”بات وہ بڑھا رہا ہے۔“

”وہ اپنا دفاع کر رہا ہے۔“ شجاع بھائی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”تم نے دیکھا ہے جب ایک نیل گائے یروں میں گھر جائے تو وہ بہادر بنتی ہے۔ حملہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مرشد اسی طرح کی کوشش کر رہا ہے ورنہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس پوزیشن میں ہے۔“

”آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے یقین دلاؤں کہ اب میں اس کے لیے خطرہ نہیں ہوں۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”سب کیا دھرم معاف ہے۔ شاید بھائی کا خون بھی بھول جاؤں۔“

”پولیس اس کی انوسٹی کیشن کر رہی ہے۔“

”کیس داخل دفتر ہو چکا ہے۔“

”یعنی کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ شجاع بھائی بولے۔ ”اس صورت میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کیا ذاتی انتقام لیں؟“

”میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ ورنہ مرشد صرف ایک آدمی ہے۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”اگر میں آپ کی بات مان لوں اور مرشد سے صلح کا ڈول ڈال لوں تب بھی کیا ضمانت ہے کہ وہ مان جائے اور بعد میں اپنی بات پر قائم رہے۔“

”ضمانت کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ بولے۔ ”میں نے صورت حال تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ سرکاری سطح پر اس کے خلاف کوئی کارروائی بہت مشکل ہے اور وہ مظلوم بن رہا ہے۔“
 ”آپ کا مطلب ہے کہ اس سے باز نہ آئیں؟“

”نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولے۔ ”کیونکہ حملہ اس پر ہوا ہے اور مارے جانے والے بیشتر لوگ اس کے تھے۔“

”ٹھیک ہے میں آپ کا نکتہ نظر سمجھ گیا ہوں اور اب میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا۔“

”بس اتنا یاد رکھنا، تم جو فیصلہ کرو گے اس کا اثر حویلی اور اس کے ہر فرد پر پڑے گا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا اور کچھ دیر مزید رسمی گفتگو کے بعد فون رکھ دیا۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ شجاع بھائی کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ وہ اپنے کیریئر کے اس حصے میں تھے جہاں انہیں آگے جانا تھا۔ وہ خاصی کم عمری میں کرنل کے رینک تک پہنچ گئے تھے اور بریگیڈئیر کے بعد آرمی میں آگے جانے والے افراد کی صلاحیتوں اور قابلیت کے ساتھ ساتھ ان کا بیک گراؤڈ بھی دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح دوسرے رشتے تھے۔ اجاکی کا ایک نام اور علاقے میں عزت ہے۔ صفران آپا کا سرال جواب شی کا سرال ہونے والا تھا وہ بھی ذی حیثیت لوگ تھے۔ میری وجہ سے ان سب لوگوں پر کہیں نہ کہیں اثر پڑ رہا تھا۔ اس لیے شجاع بھائی نے ڈھکے چھپے انداز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں اس معاملے کو ختم کر دوں۔ مرشد سے صلح کر لوں یا پھر..... میں سوچتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

مجھے وسیم، سفیر اور عبداللہ کی بات یاد آگئی۔ شاید انہوں نے بھی دوسرے لفظوں میں مجھ سے یہی بات کی

تھی جو شجاع بھائی نے کبھی تھی۔ وہ اب اس معاملے کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ قصہ بہت طول کھینچ گیا تھا اور اب سب ہی اس کا خاتمہ چاہتے تھے۔ کہانی کتنی ہی دلچسپ اور سنسنی خیز کیوں نہ ہو بالآخر اسے ختم ہونا پڑتا ہے۔ تو اب سب چاہتے تھے کہ قصہ ختم کیا جائے۔ چاہے دشمنی ختم کی جائے یا دشمن کو ختم کر دیا جائے تاکہ سب اپنی اینڈ سے لطف اندوز ہوں اور اپنی نارمل زندگی میں آجائیں۔ میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ میں اوپر کال کرنے جا رہا ہوں اس لیے کسی نے میرے ساتھ آنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے کال کرنے کے بعد میں اکیلا تھا اور مجھے سوچنے اور دوسروں کے رویے جانچنے کا موقع مل رہا تھا۔ سفیر اور مونا کی اپنی زندگی تھی۔ اسی طرح ویم اور سعدیہ کی اپنی زندگی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ عبداللہ بانو میں دلچسپی لے رہا ہے۔ لازمی اس کی بھی خواہش ہوگی کہ وہ جلد از جلد اُسے اپنالے۔ مانی نے یہی کیا تھا مگر ساتھ ہی حالات کی شرط بھی رکھ دی تھی۔

مجھے سویرا کا خیال آیا اس کا انتظار بھی طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا تعلق ایک اور خاندان سے تھا۔ وہ پہلے شاید بھائی کی بیوی تھی مگر اب اس سے ہمارا کوئی قانونی رشتہ نہیں تھا کہ وہ حویلی میں رہتی۔ یقیناً بہت سے لوگ اس پر بات کر رہے ہوں گے۔ اس کی بھی یہی خواہش ہوگی کہ میں جلد از جلد دشمنی کے چکر سے جان چھڑا لوں اور اسے اپنالوں۔ خود میری ہمیشہ سے خواہش رہی کہ میں اپنی نارمل زندگی میں واپس چلا جاؤں۔ میں نے کبھی اس زندگی کو انجوائے نہیں کیا۔ ہاں میں نے ہمت نہیں ہاری، حالات اور دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ منفی ذہن سے نہیں سوچا اور نہ ہی تقدیر سے شکایت کیے۔ مگر اندر سے میں ہمیشہ آرزو کرتا رہا کہ کاش کسی دن میں سوکر اٹھوں تو ایسا ہو کہ میں خود کو اپنی سابقہ زندگی میں پاؤں اور یہ سب ایک خواب ہو۔ اب شاید تقدیر نے میری استقامت کا صلہ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور میرے دشمن یوں ختم ہو رہے تھے کہ میں حیران تھا۔ اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ سب اوپر والے کی مہربانی تھی۔

اب مرشد اور ڈیوڈ شاپچے تھے۔ مرشد کے بارے میں شجاع بھائی نے بتا دیا تھا کہ اس کی حالت گھر جانے والے جانور کی سی ہو رہی تھی اور وہ اب زندگی چاہتا تھا۔ البتہ ڈیوڈ شاپچھا چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ میں اس کے ساتھ وادی تک جاؤں۔ مجھے ایک فیصلہ بھی شبہ نہیں تھا کہ اس کام کے بعد میں اس کے لیے بیکار ہو جاؤں گا اور عین ممکن ہے وہ مجھے ختم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ میں نے اسے بہت سے موقعوں پر اتنا زچ کیا تھا کہ اگر اسے میری اشد ضرورت نہ ہوتی تو وہ مجھے دیں ختم کرنے کا سوچتا۔ گویا مجھے جتنا خطرہ مرشد سے تھا اتنا ہی ڈیوڈ شا سے بھی تھا۔ اچانک موبائل نے بیل دی تو میں چونکا۔ سویرا کال کر رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی اور خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”سرکار کو اس وقت کیسے خیال آگیا؟“

سویرا نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز میں نے آپ کی اور شجاع بھائی کی بات سنی ہے۔“

میں چونکا۔ ”وہ کیسے؟“

”وہ ڈرانگ روم میں بیٹھے تھے اور میں اتفاق سے اس طرف چلی گئی تھی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تو تم نے ان کی باتوں سے کیا نتیجہ نکالا؟“

”میں نے کوئی نتیجہ نہیں نکالا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے صرف ایک بات کہنے کے لیے کال کی

ہے؟“

میں سنجیدہ ہو گیا مجھے لگا کہ اب وہ بھی کہے گی کہ میں معاملہ ختم کروں۔ مرشد سے صلح کر لوں یا اسے دشمنی کے قابل ہی نہ چھوڑوں۔ ”کہو میں سن رہا ہوں۔“

”آپ جانتے ہیں سب کی اپنی زندگی ہے اور سب اسے محفوظ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی آزادی سے جینا چاہتے ہیں۔“

”اتفاق سے میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔“

”لیکن میری زندگی آپ ہیں۔“ اس نے کسی قدر کھل کر کہا۔ ”آپ کے بغیر مجھے اپنی سانس تک ادھوری لگتی ہے۔“

”سویرا مجھے معلوم ہے۔“

”اس کے باوجود شہباز آپ کبھی یہ سوچ کر کوئی فیصلہ مت کریے گا کہ اس کا اثر مجھ پر آئے گا۔ میرے لیے آپ کی عزت اور آپ کا اطمینان دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ آپ مرشد کے آگے جھک کر صلح نہیں کریں گے، اگر آپ کے نزدیک میری قسم کی کوئی اہمیت ہے تو آپ کو میری قسم ہے۔“ کہتے ہوئے اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ لڑکی جس نے زندگی میں بہت کم خوشیاں دیکھی تھیں۔ اس وقت بھی وہ جیسے خلا میں زندگی گزار رہی تھی اس کے پیروں تلے زمین نہیں تھی۔ میرا ساتھ میری محبت ایک وعدہ تھا جس کا مستقبل واضح نہیں تھا۔ اگر میرے پیاروں میں سے کسی کو میری واپسی کا سب سے زیادہ بے تابی سے انتظار تھا تو وہ سویرا تھی اس کے باوجود اس نے مجھے وہ بات کہی جو کسی اور نے نہیں کہی تھی۔ میں جذباتی آدمی نہیں ہوں لیکن اس وقت جذباتی ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”سویرا اللہ کی قسم میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے مرشد سے جھک کر صلح کرنی پڑے تو میں کر لوں گا میں اپنے ساتھیوں اور پیاروں کو مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔ میں دوسروں کے لیے یہ کر گزرتا مگر اس کے بعد شاید ساری عمر خود سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہتا۔ تم نے میرے دل پر آنے والا بوجھ اتار دیا ہے۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”شہباز میں یہی چاہتی ہوں۔ میں آپ کو جانتی ہوں۔ شجاع بھائی نے آپ سے جس طرح بات کی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کیا سوچ رہے ہوں گے۔“

”صرف شجاع بھائی نہیں اب دوسرے بھی یہی چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ذرا مختلف انداز میں یہی بات کہہ دی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شاید میں ان سب کے دباؤ میں آ کر اپنے ضمیر کے خلاف کوئی فیصلہ کر جا تا مگر تم نے مجھے اس دباؤ سے آزاد کر دیا ہے کیونکہ تمہارا حق سب سے زیادہ ہے۔“

”نہیں آپ کے ماں باپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔“

میں بے ساختہ مسکرایا۔ ”ان کی تو بات ہی مت کرو۔ وہ صرف میرے لیے دعا گو ہوتے ہیں اور مجھ پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے بابا نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں کہا کہ میں یہ چکر ختم کروں، ایک بار وہ بول گئے تھے تو ماں جی ان سے لڑ گئی تھیں۔“

”میں جانتی ہوں کہ آپ پوری آزادی اور پورے اطمینان کے ساتھ فیصلہ کریں۔ میں ہر صورت اور ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہوں۔“

”سویرا مجھے اس سے بڑھ کر تمہارا ساتھ چاہیے۔“

”میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں۔“ اس نے کہا اور پھر ”ہائے اللہ“ کہہ کر کال کاٹ دی۔ اسے اپنی بات پر شرم آگئی تھی۔ میں نے سرشار ہو کر موبائل رکھ دیا۔ چند منٹ پہلے تک میرے دماغ پر جو بوجھ آ رہا تھا وہ اتر گیا تھا اور میں خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اسی کنیت میں کب میری آنکھ لگی مجھے پتا نہیں چلا۔ آنکھ کھلی تو صبح کا وقت تھا اور سورج شاید نکل آیا تھا کیونکہ پردے کے پیچھے سے روشنی جھلک رہی تھی دیے کمرے میں اندھیرا تھا۔ رات کسی وقت کوئی آکر روشنی بجھا گیا تھا۔ میں نے موبائل میں وقت دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر واش روم میں آیا اور ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے پہلے لباس اتارا اور پھر اپنے زخموں پر رہ جانے والی پٹیاں اتاریں۔ ان کے نیچے موجود زخم بھی تقریباً بھر گئے تھے اور اب میں غسل کر سکتا تھا۔ اگرچہ میں صاف سترا ہی تھا مگر کئی دن سے نہ نہانے کی وجہ سے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ نہا کر وہ بے چینی دور ہوگئی۔ میں باہر آیا تو شاہ جی نے دروازے پر دستک دی۔

”جناب ناشتے کا پوچھنے آیا ہوں۔“

”باقی سب کہاں ہیں؟“

”سفیر صاحب سو رہے ہیں۔ دیم صاحب اور عبداللہ صاحب باہر گئے ہیں۔“

”تب ناشتا یہیں لے آؤ۔ دوا بلے انڈے ہوں، چار تو س شہد کے ساتھ اور ایک گلاس دودھ۔“

”چائے کافی جناب؟“

”وہ اس کے بعد جب میں کہوں۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے جانے کے بعد مرشد ہاؤس کا نمبر ملایا اور حسب معمول نشیطق میکر ٹری کے بجائے ایک سریلی آواز والی خاتون نے کال ریسپونڈ کی۔

”مرشد ہاؤس۔“

اس کے انداز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ آپریٹر ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد نے بالآخر ایک ڈھنگ کی فون آپریٹر رکھ لی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ کہاں گیا جو پہلے کال ریسپونڈ کرتا تھا۔ مرشد کا میکر ٹری۔“

”وہ جا چکے ہیں۔“ آپریٹر محتاط انداز میں بولی۔ ”آپ کون ہیں اور کس سے بات کرنی ہے؟“

”میں شہباز ملک بات کر رہا ہوں اور مجھے مرشد سے بات کرنی ہے ویسے آواز تمہاری زیادہ خوب صورت ہے۔ کاش کہ مجھے مرشد سے کام نہ ہوتا۔“

”تھینک یو سر۔“ وہ خوش ہوگئی۔ ”ایک منٹ ہولڈ کریں۔“

مرشد ایک منٹ سے بھی پہلے لائن پر تھا اور اس نے آتے ہی تلخ لہجے میں کہا۔ ”اب کس لیے فون کیا ہے؟“

”مرشد لہجہ درست کرو۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہارے ساتھ جو ہوا وہ تمہارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔“

”تم نے فاضلی کے ساتھ مل کر میری درگاہ پر حملہ کیا۔ کیا ہوا اس کا؟“ اس کا لہجہ الزام دینے والا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔

”مرشد تم کس قسم کے آدمی ہو سب تمہارے سامنے ہوا۔ میں فاضلی کے ساتھ ملا نہیں بلکہ وہ مجھے جبراً لے کر آیا تھا۔ میری کلائی کا کڑا تمہارے سامنے تھا جس کا ریسور فاضلی کی انگلی میں موجود انگوشی تھی مگر ڈیوڈ شانے اسے دھوکا دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ زہر کڑے میں ہے جب کہ زہر انگوشی میں تھا اور جیسے ہی میں اس سے پچاس گز دور گیا زہر اس کے جسم میں الجھٹ ہو گیا۔ اس وجہ سے تم ذلت سے بچ گئے۔ میں نے رومانہ کو بچانے کی پوری کوشش کی تھی۔“

”تم اصل میں میرا خاتمہ کرنے آئے تھے۔“

”یہ مجھے تسلیم ہے شاید موقع ملتا تو میں تمہیں جہنم رسید کر دیتا۔ مگر میں نے وہ سب نہیں کیا جو تم سمجھ رہے ہو۔ اصل پلان ڈیوڈ شا کا تھا جس کے تم ایک زمانے میں جوتے چاٹتے تھے۔ وہ تمہیں تمہاری سرکشی کی سزا دینا چاہتا تھا اور اس نے فاضلی سے یہ کام لیا اور پھر اسے ٹھکانے لگا دیا۔ میرا کردار ایک کٹھ پتلی کا سا تھا کیونکہ میری ڈور فاضلی کے ہاتھ میں تھی۔ بہر حال میں نے تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کال نہیں کی ہے۔ سنا ہے تم میرے خلاف بنی ایف آئی آر کروانا چاہتے ہو یعنی دشمنی کا راز ڈنڈے سے شروع ہو گا۔“

”میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔“ اس نے بے چینی سے کہا۔

”واقعی؟“ میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”یا تمہاری کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔“

”شہباز۔“ وہ تیر لہجے میں بولا۔ ”تم مجھے کمزور مت سمجھو۔“

”میں نے دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھا جب بھی تمہارے خلاف حرکت میں آیا تو یوں آؤں گا جیسے شیر کا شکار کرنے جا رہا ہوں چاہے شیر کی جگہ آخر میں چوہا نکلے۔ میں صرف خبردار کر رہا ہوں اب تمہاری طرف سے ذرا بھی دشمنی کا اظہار بات کو وہاں تک لے جائے گا جہاں اس سے پہلے میں کبھی نہیں گیا اور نہ میں نے اپنے ساتھیوں کو جانے دیا۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئے ہو گے کیونکہ تم عقل مند آدمی ہو۔“

”تم مجھے قتل کی دھمکی دے رہے ہو۔“ اس نے یوں کہا جیسے چاہ رہا ہو کہ میں اقرار کر لوں کہ میں اسے قتل کی دھمکی دے رہا ہوں لیکن میں نے ایسی بے وقوفی نہیں کی۔ یہ کال یقیناً ریکارڈ کی جا رہی ہوگی۔ اس کی بجائے میں نے چالاکی سے کہا۔

”مرشد میں کبھی تمہاری سطح پر نہیں آیا تمہارا بھائی اپنی وجہ سے مرا لیکن میرے بھائی کا خون تم نے کیا۔ میری بات سے تم جو چاہے سمجھو۔“

”تم سمجھ رہے ہو کہ شاید میں مشکل میں ہوں۔“

”مرشد میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ میں ایک بار پھر خبردار کر رہا ہوں۔ اب اگر تمہاری طرف سے کوئی قدم اٹھایا گیا تو تمہیں تمہاری زبان میں جواب دیا جائے گا۔“ میں نے کہتے ہی کال کاٹ دی۔ یہ میری پرانی سمت تھی جس سے میں کئی بار مرشد سے بات کر چکا تھا اور یہ ڈیوڈ شا کے علم میں بھی تھی۔ ہمارا فیض آباد والا ٹھکانا ڈیوڈ شا کے علم میں تھا مگر وہ واپس جا چکا تھا اور مرشد میں فی الحال دم ختم نہیں تھا۔ پھر وہ اس

جگہ سے بھی لاعلم تھا اس لیے میں نے یہیں رہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی تھی۔ ابھی میں نے ڈیوڈ شا کے بارے میں سوچا تھا کہ موبائل نے تیل دی۔ اس پر برطانیہ کا کوڈ نمبر آرہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی تو میرے ذہن میں ایسن کا خیال تھا مگر وہ ڈیوڈ شامیت ہوا۔

”تم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے ہو؟“

”اس کے لیے میں تمہارا کسی قدر شکر گزار ہوں۔“

”نہیں اس کے لیے تمہیں راجا عمر دراز کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس نے خود ہی مجھ سے رابطہ کیا اور تمہیں چھوڑنے کو کہا۔“

”راجا صاحب نے کہا اور تم نے چھوڑ دیا یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہے۔“

”میرے اور اس کے کچھ معاملات ہیں جن میں ہم ایک دوسرے کو رعایت دیتے رہتے ہیں۔“

”کیا تم نے یہی بتانے کے لیے کال کی ہے؟“

”کچھ دیر پہلے میری مرشد سے بات ہوئی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ دشمنی ختم کرنا چاہتا ہے۔“

”تجہی اس نے میرے خلاف رپورٹ کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔“ میں نے فحشی سے کہا۔ ”میں اس شخص پر ایک فیصد اعتبار نہیں کر سکتا۔“

”اس بار وہ ضمانت دینے کو تیار ہے۔“

”کیسی ضمانت؟“

”کچھ مخصوص حلقوں کی ضمانت۔“ ڈیوڈ شانے مبہم انداز میں کہا۔ ”یہ وہ حلقے ہیں جن کی ضمانت کوئی نہیں ٹھکرا سکتا ہے۔“

مجھے شجاع بھائی کی بات یاد آئی۔ انہوں نے بھی یہی کہا تھا کہ ضمانت کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ڈیوڈ شام تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو، میں مفاہمت پسند آدمی ہوں۔ میری ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کوئی درمیانی راستہ نکل آئے۔ اگر مناسب ضمانت ہوئی تو میں بالکل تیار ہوں۔“

”میں تمہیں جانتا ہوں۔“ ڈیوڈ شانے آہستہ سے کہا۔ ”اسی لیے تمہارے ساتھ میرا رویہ دوسروں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اوکے میں تمہیں پھر کال کروں گا۔“

معاملات تیزی سے ایک واضح رخ اختیار کر رہے تھے۔ پہلے صرف میرے اور مرشد کے درمیان معاملات چلتے تھے اور کبھی وہ حاوی ہو جاتا اور کبھی میں حاوی ہو جاتا تھا۔ مگر اب دوسرے زیادہ ملوث ہو رہے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ یہ جنگ ختم کر دی جائے۔ درگاہ پر حملے کے بعد سکیورٹی ایجنسیاں بھی میدان میں آگئی تھیں اور مرشد کے لیے بہت سی باتوں کی وضاحت مشکل ہو گئی تھی۔ اس پر دباؤ آیا تھا اور اسے پہلے جیسا اثر سوخ اور سرکاری حلقوں میں مقام حاصل نہیں رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ جھکنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ اگر مجھے ٹھوس ضمانت مل جاتی کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو کوئی جانی اور مالی نقصان نہیں ہوگا اور نہ ہی مرشد کی طرف سے ہمیں تنگ کیا جائے گا تو میں صلح کے لیے تیار تھا۔ ایسا حل نکل آتا جس میں کسی کو اپنی ناک نیچے نہ کرنی پڑتی تو وہی سب سے بہتر تھا۔



کچھ دیر میں زبیدہ ناشتا لے آئی اور میں نے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد میں نے شاہ جی کے نمبر سے حویلی کال کی اور خواتین پارٹی سے بات کی۔ مونا نے بہت دماغ کھایا کہ اب وہ واپس آنا چاہتی ہیں۔ سادی نے کہا نہیں مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی بھی یہی خواہش ہے۔ بانو بہت خوش تھی اس نے بتایا کہ وہ پھر سے ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔ مونا اور سادی اسے باڈی بلڈر کہہ کر چھیڑتی تھیں اور تمام مشکل اور سخت کام اس سے کراتی تھیں۔ انہوں نے اصرار کر کے حویلی کے بہت سے کام ڈسے لے لیے تھے اس طرح وہ مصروف رہتی تھیں۔ یوں بانو نے کوشش کر کے خود کو پہلے کی طرح نازک اندام کر لیا تھا۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ وہ مجھ سے ملے۔ آخر میں شازیہ نے صرف سلام دعا کی اور حال احوال پوچھا تھا۔ وہ جھجک والی لڑکی تھی اور میری اس سے کبھی زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ حویلی میں امن و سکون تھا اور بابا اور ماں جی ان لوگوں کی وجہ سے بہت خوش تھے کہ حویلی میں رونق لگی رہتی تھی۔ سادی کو ماں جی کی صورت میں تجربہ کار خاتون میسر تھی۔ جس کی اسے ان دنوں اشد ضرورت تھی۔ وہ جان نہیں چھوڑ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے کھنٹے بعد میں نے فون بند کیا۔

پھر ندیم سے ہیلو ہانے کی اور اس کی گالیاں سننے کے بعد اسے مرشد کے نئے عزائم سے آگاہ کیا۔ وہ فکر مند ہو گیا۔ ”یہ بہت بڑا پکڑ ہے ایسا کر تو کہیں اور اپنی موجودگی ثابت کرنے کا بندوبست کر لے۔ بندہ ایسا معتبر ہو کہ اس کی گواہی جھٹلائی نہ جائے ورنہ ٹو پھر مشکل میں پڑ جائے گا اور میری جان عذاب میں رہے گی۔ اپنے کیس چھوڑ کر تیرے چکروں میں عدالتوں میں بھاگتا پھروں گا۔“

”بکواس نہ کر تو نے کتنی پیشیاں بھگتی ہیں میری وجہ سے، شاید درجن بھی نہیں؟“

”پندرہ۔“ اس نے درست تعداد بتائی۔

”اس پر بھی ٹو واویلا مچا رہا ہے۔“

”بیٹے عدالت کے ساتھ ساتھ مرشد اور اس کے لفٹکوں کو بھی بھگتنا رہا ہوں۔“ ندیم نے یاد دلایا۔

”اس کے باوجود سینہ تان کر آزاد گھوم رہا ہے اسی سے اندازہ لگا لے کہ ہمارے ہاں لوگ وکیلوں سے کتنا ڈرنے لگے ہیں۔“

کچھ دیر لمبی مذاق کے بعد ندیم نے فون بند کر دیا۔ وہ عدالت پہنچنے والا تھا۔ اس کی بات سے مجھے راجا صاحب کا خیال آیا۔ وہ ایک ایسے آدمی تھے جن کی گواہی جھٹلائی نہیں جاسکتی تھی۔ بہت دن ہو گئے تھے ان سے بات کیے ہوئے۔ مجھے شرمندگی بھی ہوئی کہ جب ان کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی ان کی یاد آتی ہے۔ میرے پاس ان کے محل کے نمبر نہیں تھے مگر وہ میں عبد اللہ سے ملے سکتا تھا۔ ایک تو مجھے ان کی مدد درکار تھی دوسرے میں ان کی مزاج پرسی بھی کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے مجھے خیال آیا کہ معاملات کو سیٹھ ہونے تک نہیں بیٹھے رہنے کی بجائے منتشر ہو جانا چاہیے۔ دشمن پاس رہے تو آدمی کو کچھ نہ کچھ خیال آتا رہتا ہے۔ اس وقت دوری مناسب تھی۔ جب تک کہ مرشد معاملات کو سنانے کے طریقہ کار پر آمادہ ہو جاتا۔ جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا یہ خیال مناسب لگا اور میں نے فیصلہ کیا کہ راجا صاحب کے پاس جانا ہی مناسب ہوگا۔ اس دوران میں عبد اللہ اور وسیم واپس آ گئے تھے۔ وسیم نے بتایا کہ اس کے آدمیوں نے ایک طرف پہاڑی پر نصب میزائل برآمدہ لگا دی تھیں اسے

جھیل کی تہہ میں ڈال دیا تھا جہاں وہ کسی خطرے کا باعث نہیں تھا۔

”یہ روسی ساختہ میزائل ہے اور بہت خطرناک ہے۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ ”اگر جھیل میں کوئی مسئلہ ہوا تو یہ بلاسٹ نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں بلاسٹ تو یہ صرف ایک میکروم سے ہوتا ہے جب تک وہ حرکت میں نہیں آئے گا یہ پھٹے گا نہیں۔“

پانی میں رہے گا کچھ عرصے بعد ناکارہ ہو جائے گا۔“ وسیم نے وضاحت کی۔

عبداللہ راجا صاحب کے ایک کام سے گیا تھا جو بیگ نے اس کے سپرد کیا تھا۔ راجا صاحب کا ذکر آیا تو میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”مجھے راجا صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”میں ابھی کرا دیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں فون پر نہیں بالمشافہ۔“ میں نے کہا تو سب چونک گئے تھے

”آپ راجا عمر دراز کے پاس جائیں گے۔“ وسیم نے پوچھا۔

میں نے سر ہلایا اور عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”تم جانے کا بندوبست کرو۔“

”ہیلی کاپٹر سے؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”نہیں پائی روڈ اور صرف میں جاؤں گا۔“

”کیوں اکیلے کیوں؟“ سفیر نے اعتراض کیا۔

”اس کی وجہ بتاؤں گا۔“ میں نے کہا اور عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”کوئی چھوٹی جیب لے لو سیکنڈ ہینڈ مگر

بہترین کنڈیشن میں ہو۔ میں پہلے سے موجود کوئی گاڑی استعمال نہیں کروں گا۔“

”ایسی کیا مصیبت آگئی ہے ابھی تو سکون ہوا ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”کچھ دن تو آرام کرو، آئے نہیں اور ہماگ دوڑ شروع ہو گئی۔“

پہلے میرا خیال تھا کہ میں ذرا کھل کر بات کروں گا۔ پھر خیال آیا کہ اس سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھل جائے گا۔ ندیم کی تجویز نے ایک راہ بھادی تھی۔ میں نے ندیم کی تجویز ان کے سامنے رکھی۔ ”اس کا کہنا ہے کہ اس دوران میں اپنی موجودگی کہیں اور ثابت کر دوں تو بچت ہو جائے گی ورنہ پھر کیس میرے گلے پڑ جائے گا۔ راجا صاحب سے معتبر گواہی کس کی ہوگی۔“

”اس کے لیے جانا ضروری تو نہیں ہے۔“ سفیر پھر بولا۔ ”وہ ویسے ہی تیرے حق میں گواہی دے دیں گے۔“

”نہیں یار بہت عرصہ ہوا راجا صاحب کی خیریت بھی نہیں پوچھی۔ یہ کام بھی منٹ جائے گا اور میری غیر موجودگی میں تم لوگوں نے بھی کئی کام نشتا کیے ہیں۔“

”مثلاً؟“ سفیر نے پوچھا۔ وہی بولے جا رہا تھا جب کہ عبداللہ اور وسیم خاموش تھے۔

”بتاتا ہوں یاد تم کو تیکر بن رہے ہو۔“ میں نے چڑ کر کہا تو سفیر بھی خاموش ہو گیا۔ میں نے موضوع بدل اور حویلی میں ہونے والی گفتگو سنائی۔ البتہ رات شجاع بھائی نے کیا کہا تھا اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس بار سب نے موسیٰ سے سنا اور مجھے لگا کہ ماحول کچھ بدل گیا تھا۔ پہلے جیسی بے تکلفی نہیں تھی۔ سب تکلف زدہ انداز میں

خاموش تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سب میرے کمرے میں جمع ہوئے اور میں نے سفیر اور وسیم سے کہا۔ ”تم دونوں فوری طور پر دینی چلے جاؤ۔ وہاں بزنس کے حالات بہتر ہو رہے ہیں۔ اس لیے بزنس سیٹ کرو۔“

”میں ہو کر آیا ہوں بہت سے کام کر لیے ہیں۔“ سفیر نے کہا۔ ”میرے پاس رہائشی ویزا ہے اب وسیم کا بھی بن گیا ہے جب چاہیں وہاں جاسکتے ہیں اور آسکتے ہیں۔“

”یہ اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا اور وسیم کی طرف دیکھا۔ ”تمام آدمیوں کو چھٹی پر گھر بھیج دو۔“

”یہ کام میں کر لوں گا۔“ وسیم نے سر ہلایا۔

”ایاز کے لیے بھی وہیں کام سیٹ کرو اگر وہ یہاں سے جانے کے لیے تیار ہو؟“

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ یہاں خوش ہے اس نے ورکشاپ سیٹ کر لی ہے۔“

وسیم نے بھی تائید کی۔ ”اسے ہمارے ساتھی کی حیثیت سے کوئی نہیں جانتا۔ وہ زیادہ تر پس منظر میں رہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس سے پوچھ ضرور لینا۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے۔“ عبداللہ نے پوچھا۔

”کوئی حکم نہیں ہے ہم سب دوست ہیں اور مل کر فیصلے کرتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم ہمارا ساتھ چلو گے۔“

عبداللہ نے سوچا اور بولا۔ ”باہر جانے کے لیے ماں جی کی اجازت چاہیے ہوگی۔ انہوں نے تو اسلا آباد آنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے دی تھی۔“

”تم ان سے بات کر لو۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تم نے گھر میں بانو کی بات کی ہے؟“

عبداللہ جھینپ گیا۔ ”ابھی نہیں کی ہے۔“

”تو کر لو۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”اس معاملے کو زیادہ دیر مت لٹکاؤ۔ وہ بے گھر لڑکی ہے جتنی جلد اسے گھر کی ہو جائے اس کے لیے اتنا ہی اچھا ہے۔“

”جب میں حویلی چلا جاتا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”یہاں کا کیا کرنا ہے؟“

”یہ کوشی چھوڑ دو۔ کوئی اور جگہ دیکھو۔ شاہ جی کو آگے رکھو اور جگہ اس کے سپرد کر دو۔“

”یہ مناسب رہے گا۔“ وسیم نے تائید کی۔ ”یہ جگہ دشمن کے علم میں آچکی ہے۔“

”چیزوں کے چکر میں مت پڑنا۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی چھوٹی فرنش کوشی دیکھ لو۔ مین شہر سے ذرا ہٹا ہوا اور آس پاس آبادی نہ ہو تو بہتر ہے۔“

”میں اس طرف دیکھتا ہوں۔ کشمیر ہائی وے کے آخری حصے میں کچھ نئی سوسائٹیز بنی ہیں۔“ عبداللہ۔

”یہ آپ نے اچھی تجویز دی ہے کہ شاہ جی اور زبیدہ کو آگے رکھتے ہیں۔“

”بس تو ابھی سے یہ کام شروع کر دو اور گاڑی والا کام ایاز کے سپرد کر دو۔“ میں نے کہا اور سفیر کی طرف دیکھا۔ ”ٹوٹکنس کا انتظام کر، یہ کام نمٹاتے ہی سب سے پہلے موتا اور سادی کو باہر بلانا ہے۔“

”وسیم کر لے گا۔“ سفیر نے کسمسا کر کہا اس دوران میں عبداللہ ایاز کو کال کر رہا تھا۔ اس سے بات کرتے

اس نے آگاہ کیا۔

”وہ کہہ رہا ہے کل تک مل جائے گی۔“

”جتنی جلدی ہو سکے۔“ میں نے کہا۔

عبداللہ اور وسم چلے گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی سفیر میرے سر ہو گیا۔ ”یہ ٹو کیا کر رہا ہے، اتنی ہڑ بونگ مہانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”معاملات سمٹ رہے ہیں اس لیے ہماری طرف سے بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے مرشد کو کال کی تھی اور اسے وارننگ دی ہے کہ اب اس نے ذرا سی بھی دشمنی کا اظہار کیا تو یہ اس کے ڈتھ وارنٹ پر سائن ہوں گے۔“

”ہمیں سائن نہیں اس کا خاتمہ کرنا ہے۔“ سفیر برہمی سے بولا۔ ”اور ٹو آدمیوں کو چھٹی پر بھیج رہا ہے۔“

”یہ کام آرام سے بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دوسرے ناکامی کا امکان بھی ذہن میں رکھو۔ ضروری نہیں ہے کہ مرشد مارا جائے اس صورت میں وہ پوری قوت سے دشمنی پر اتر آئے گا اور ہمیں اس سے بچنا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں اسے وار کرنے کے لیے کم سے کم جگہ ملے۔“

”نہیں ٹو چاہتا ہے کہ ہم تجھ سے دور چلے جائیں اور اپنی اپنی زندگی میں مگن ہو جائیں۔“

”میں صرف تمہارے لیے ہی نہیں اپنے لیے بھی یہی چاہتا ہوں اس لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔“

”وہ دونوں بھی سمجھتے ہیں۔“ سفیر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”لیکن وہ خاموش ہیں۔“

”دیکھ یا وہ کہتے ہی مخلص اور دوست یا رسمی لیکن ان کی اپنی ایک زندگی ہے اور میں ان کو لامحدود طور پر اپنے معاملے میں ملوث نہیں رکھ سکتا۔ تجھے بھی نہیں کیونکہ اب تجھ پر سب سے زیادہ حق مونا کا ہے۔“

”میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”چھوڑنے کو کون کہہ رہا ہے میں چاہتا ہوں کہ اب سب اپنے مستقبل کا پلان کر لیں۔ اس دوران میں حالات بھی دیکھتے رہیں گے۔“

”ٹو اکیلا سپاہی بننے کے چکر میں لگا ہوا ہے۔“ سفیر نے الزام دینے کے انداز میں کہا۔

”اب صرف مرشد باقی رہ گیا ہے اس سے نمٹنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ ایک انسان ایک انسان ہی ہوتا ہے۔“

”درگاہ کی تباہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کمزور ہو گیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

سفیر نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”ٹو صرف اسی مقصد کے تحت راجا صاحب کے پاس جا رہا ہے؟“

”نہیں یار۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹو جانتا ہے کہ راجا عہد راز مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“

سفیر اچھل پڑا۔ ”تو ٹو اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے؟“

”میں جا کر دیکھوں گا کہ اس کی کیا پوزیشن ہے۔ سنا ہے طبیعت بہتر ہوئی ہے لیکن کینسر کا موذی مرض فنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتا۔“ میں نے کہا۔ ”اس حالت کے ساتھ مشکل ہے کہ وہ سفر کر سکے اور وہ بھی اتنا

دش سفر جو بہت فٹ لوگ بھی مشکل سے کرتے ہیں۔“

”انسان کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے بعض اوقات وہ موت کے منہ میں بھی ایسے کام کر جاتا ہے جو زندہ انسان سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔“ سفیر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”جو طے ہو گیا ہے اس پر عمل کرنا ہے۔ میرا خیال ہے تم لوگ دو تین ہفتے میں وہاں کے معاملات سیٹ کر لو گے اور اتنا ہی عرصہ مجھے یہاں لگے گا۔ اس دوران میں مرشد کی طرف سے بھی ردِ عمل سامنے آجائے گا۔ پھر ہم جمع ہو کر سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے؟“

”تب بھی تو کرنا ہوگا تو اب کیوں نہیں؟“

”یار ذرا ٹھنڈے دماغ سے بھی فیصلہ کرنا اچھا ہوتا ہے۔ ابھی مرشد نے ایک تحقیقاتی ٹیم کے سامنے مجھ پر الزامات لگائے ہیں کہ درگاہ کی تباہی میں میرا ہاتھ ہے۔“

سفیر چونکا۔ ”تجھے کیسے پتا چلا؟“

میں نے اسے شجاع بھائی سے ہونے والی گفتگو سنائی تو اس نے شکوہ کیا۔ ”تو اب ہم سے باتیں چھپانے لگا ہے۔“

”چھپانا ہوتا تو ابھی کیوں بتاتا اور میں چاہتا ہوں کہ ایک لائحہ عمل طے کر لیا جائے۔ ان باتوں میں الجھے رہے تو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ صرف یہی نہیں ابھی بہت کچھ سامنے آئے گا۔“

”وسیم اور عبداللہ کو نہیں بتائے گا؟“

”کیوں نہیں بتاؤں گا ان سے چھپایا تھوڑی ہے۔“

عبداللہ اپنے واقف کار ریکل اسٹیٹ والوں سے بات کرنے گیا تھا۔ وسیم نکلس کرانے گیا تھا۔ دونوں شام تک واپس آ گئے۔ اتفاق سے دونوں کامیاب رہے تھے۔ دہنی کے لیے اگلے دن شام کی فلائٹ میں نکلس مل گئے تھے اور ایک اسٹیٹ ایجنٹ نے عبداللہ کو ایک نئی آبادی میں چھوٹا فرنش بنگلا دکھایا تھا۔ یہ سات مرلے پر تھا اور اس میں نیچے تین اور اوپر ایک بیڈروم تھا۔ کرایہ اور ایڈوائس اچھا خاصا تھا مگر عبداللہ مان گیا اور دو دن بعد اس کی چابی مل جاتی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”مکان کا ایگریمنٹ شاہ جی سے کروانا۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ عبداللہ نے اطمینان دلایا۔ ”اچھی جگہ ہے آس پاس کوئی مکان نہیں ہے۔“

میں نے اطمینان محسوس کیا۔ معاملات اسی طرح جا رہے تھے جیسے میں چاہتا تھا۔ جہاں تک ماحول کی بات تھی تو جب حالات بدلتے ہیں تو اس کا اثر ماحول اور لوگوں پر بھی پڑتا ہے برسوں ایک جگہ کام کرنے والے جب ریٹائر ہوتے ہیں تو دفتری کو لیگ سے پھر ان کی پہلے جیسی بے تکلفی نہیں رہتی۔ اگرچہ ہم دفتری کو لیگ نہیں تھے۔ زندگی اور موت کے کھیل میں ایک دوسرے کے ساتھی رہے ہیں۔ سفیر میرا یار اور شروع سے میرے ساتھ رہا لیکن وسیم، عبداللہ اور ایاز اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئے۔ ہمارے درمیان خلوص اور محبت کا رشتہ تھا اس کے باوجود جب ہم نے محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا ہے تو ہمارے انداز میں غیر محسوس تبدیلی آئی تھی۔ ہمارا تعلق لوہا نہیں تھا مگر اس کی نوعیت بدلنے والی تھی اور جب یہ تبدیلی مکمل ہو جاتی اور تعلق نئے سرے سے استوار ہو جاتا تو

مگر سب نارمل ہو جاتا۔ اس لیے میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

شاہ جی اور زبیدہ کو پتا چلا کہ ہمیں یہاں سے جانا ہے تو انہوں نے سامان سیٹنا شروع کر دیا۔ عبداللہ نے بتا دیا تھا کہ صرف وہی چیزیں ساتھ جائیں گی جو گاڑیوں میں آجائیں۔ باقی سب یہیں رہے گا۔ کوشی ہمیں غاصے سامان کے ساتھ ملتی تھی لیکن بہت کچھ یہاں ڈلوایا گیا تھا اور وہ سب بھی یہیں رہ جاتا۔ ہمیں اچانک روانہ ہونا تھا اور پھر واپس نہیں آنا تھا۔ کوشی کا دیا ہوا ایڈوانس عبداللہ اس اسٹیٹ والے کے توسط سے واپس حاصل کرتا جس سے یہ کوشی کرائے پر ملی تھی۔ اس لیے اب سامان کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ رقم والا لا کر اور اسلحہ تو لازمی ساتھ جاتا۔ اس کے علاوہ ہمارا ذاتی سامان بھی ساتھ جاتا۔ باقی چیزوں میں سے انتخاب ہو رہا تھا۔ رات تک ایک ہنگامہ رہا مگر ایاز کی کال آگئی۔

”شہباز صاحب ایک تین سال پرانی جیپ ہے لیکن بہت اچھی کنڈیشن میں ہے۔ ٹیوینا ملٹری ماڈل کا سولین ورژن ہے۔ صاف ستھری گاڑی ہے اور کاغذات میں بھی مسئلہ نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے اسے شاہین کے نام ٹرانسفر کرالو اور ٹرانسفر کب تک ہو جائے گا؟“

”کل صبح یہ کام ہو جائے گا جس سے لے رہا ہوں اس کے جیک ہیں وہ دو گھنٹے میں کام کرائے گا۔“

”بس تو کام کراتے ہی مجھے اطلاع کرو۔ میں جلد از جلد روانہ ہونا چاہتا ہوں۔“

”کل زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک۔“ ایاز نے وعدہ کیا۔ ”مگر آپ ابھی آئے اور اتنی جلدی پھر جا رہے ہیں۔ شاہین ملنے کے لیے کہہ رہی تھی۔“

”گھر تو مشکل ہے، میں کل تمہارے درکشاپ آجاؤں گا۔ گاڑی لے کر دیں آنا۔ میں وہیں سے نکل جاؤں گا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ ایاز خوش ہو گیا۔ ”میں آپ کو درکشاپ بھی دکھاؤں گا۔“

رات کے کھانے کے بعد میں نے وسیم اور عبداللہ کو بھی شجاع بھائی اور پھر مرشد سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا۔ ندیم کا مشورہ تو سامنے تھا۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ موجودہ صورت حال میں انتظار یا عمل کرنے کی بجائے ہم اپنے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کر لیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ مگر وسیم نے ایک سوال اٹھایا۔ ”فرض کریں راجا صاحب آپ سے اصرار کرتے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ چلیں تو؟“

”تب میں اصرار کی شدت دیکھوں گا۔“

”اگر ان کا اصرار شدت کا ہوا تو؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تب شاید میں انکار نہ کر سکوں۔ اب میرے پاس انکار کا جواز بھی نہیں ہے۔“

”یہ پاگل پن ہے۔“ سفیر نے بے چینی سے کہا۔ ”ایک بیمار آدمی ایسا سفر کیسے کر سکتا ہے؟“

”یار مفروضات پر پریشان مت ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”بہت سی باتیں آدمی کی قسمت میں ہوتی ہیں وہ اپنی مرضی نہیں چلا سکتا ہے۔“

”میرا دل کہہ رہا ہے راجا عمر دراز نہیں مانے گا۔“ سفیر نے یقین سے کہا۔ ”وہ بستر مرگ پر بھی وہاں جانا ہے گا۔“

”دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میرا خیال ہے اب آرام کیا جائے کیونکہ کل سب کو بہت کام ہے اور سفر بھی کرنا ہے۔“

”سوائے میرے۔“ عبد اللہ بولا۔ ”میری مصروفیات پرسوں سے شروع ہوں گی۔“

”کوشش کرو کہ کل ہی چائیاں مل جائیں تو تم اور شاہ جی بھی کل شفٹ ہو جاؤ۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ عبد اللہ نے سر ہلایا۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور موبائل آن کر کے سویرا کو کال کی۔ میں جانے سے پہلے اسے بتانا چاہتا تھا۔ وہ سب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اس لیے کال ریسیو نہیں کی کچھ دیر بعد اس نے خود کال کی۔ سلام دعا کے دوران میں، میں نے محسوس کر لیا کہ وہ کچھ پریشان ہے۔ میں نے پوچھ لیا۔ ”سویرا کیا بات ہے سب ٹھیک ہے نا؟“

”نہیں۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ابھی ایک گھنٹا پہلے میرے موبائل پر انجینی نمبر سے کال آئی تو میں نے آپ کی سمجھ کر ریسیو کر لی۔“

”کس کی کال تھی؟“

”فتح خان.....“

”وہ خبیث.....“ میرے منہ سے گالی نکلی۔ ”اس کی جرات کیسے ہوئی تمہیں کال کرنے کی۔“

”میں نے بھی یہی کہا تھا مگر وہ بے غیرتی سے ہنسنے لگا۔ اس نے کہا کہ آپ کو پیغام دے دوں کہ فتح خان ابھی مرا نہیں ہے۔“

”اس بار وہ میرے سامنے آیا تو زندہ نہیں رہے گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے نمبر دو۔“

سویرا ہنسی گئی۔ ”پلیز شہباز وہ خطرناک آدمی ہے آپ اس سے دور رہیں۔“

”میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں مجھے نمبر دو۔“ میں نے کہا تو اس نے مجھے نمبر دیا اسے نوٹ کر کے میں نے پوچھا۔ ”اور کیا کہا اس نے؟“

”اس نے تو بس یہی پیغام دیا مگر میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ اب نہیں بچے گا۔“

”سویرا تم جانتی ہو کہ بیٹہ میرے لیے کیا تھا اور اس کی موت کی ایک وجہ یہ شخص بھی ہے۔ یہ واحد فرد ہے جو زندہ ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ سویرا بولی۔ ”جب میں نے اس کی موت کا سنا تو مجھے لگا جیسے میرا کوئی اپنا مر گیا ہو۔“

اس دن سب رور ہے تھے، ماں جی تک اسے یاد کر رہی تھیں۔ یہاں اس نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

”وہ ایسا ہی شخص تھا۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”بے جگر اور بے غرض۔“

”سویرا شہباز میں نے غلطی سے فتح خان کی کال ریسیو کر لی۔“

”یہ تمہاری غلطی نہیں ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”اب میں تمہیں اسی نمبر سے کال کروں گا یا کسی اور نمبر سے کروں گا تو پہلے تمہیں میسج کروں گا کہ یہ میرا نمبر ہے اس کے علاوہ تم کسی نمبر کی کال ریسیو نہیں کرو گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔

”کل میں راجا عمر دراز کی طرف جا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا تو میں نے اسے بتایا کہ میں کیوں جا رہا ہوں۔ وہ یہ سن کر خوش ہوئی کہ میں یہاں سے اپنے معاملات سمیٹ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔

”یہ ٹھیک ہے آپ وہاں سے آجائیں۔ حویلی کو ایک جوان آدمی کی ضرورت ہے۔ بابا صحت مند ہیں مگر ان کی عمر زیادہ ہو گئی ہے۔“

”ان شاء اللہ میں حویلی ہی آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میرا مزاج زمینداری والا نہیں ہے۔ بہر حال یہ تو مستقبل کی بات ہے۔ اس پر میں وہیں آکر بات کروں گا۔“

میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ راجا عمر دراز سے مل کر حویلی جاؤں گا۔ میں اب تک پُر سکون تھا مگر سویرا نے فتح خان کا بتا کر مجھے ٹینشن میں ڈال دیا تھا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا جو میرے آس پاس ہو اور میں سکون سے رہوں۔ مجھے اس خواب کا خیال آیا جو میں نے ڈیوڈا کی قید میں ہوش میں آنے سے پہلے دیکھا تھا اور جس میں فتح خان تھا۔ یہ خواب تقریباً چھ ماہ پہلے سے میرا خیال تھا کہ اب مجھے فتح خان کی صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ مگر وہاں کے چند دن بعد ہی میرا یہ خیال غلط ثابت ہو رہا تھا۔ جب سویرا نے مجھے فتح خان کی کال کے رے میں بتایا تو بلا مبالغہ میرا خون کھولنے لگا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خون سرد ہو گیا اور اب میں ٹھنڈے دماغ سے سوچ رہا تھا کہ آخر فتح خان نے کیوں مجھ سے رابطہ کرنا چاہا تھا؟ سویرا سے بات کرنے کے کچھ دیر بعد میں نے اس کا دیا وائبر ملایا۔ اس پر بیل جا رہی تھی۔ چند بیل کے بعد کسی عورت نے کال ریسیو کی۔

”کون ہے؟“

”فتح خان سے بات کراؤ۔“

”ادھر کوئی فتح خان نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا اور اسی عورت نے

ملایا۔

”یہ موبائل جس کا ہے اسے دو چاہے اس کا نام کچھ بھی ہو۔“

”وہ سو رہا ہے۔“ عورت کی آواز وہی پڑ گئی۔ ”میں نے اسے اٹھایا تو وہ مجھے مارے گا۔ یہ بہت ظالم

ہی ہے۔“

”جب تم اسے بتاؤ گی کہ شہباز ملک کی کال ہے تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ہاں

سے نہ بتایا تو اس کا نقصان ہوگا اور پھر وہ تمہیں شاید قتل کر دے گا۔“

عورت کی بات سے ظاہر تھا کہ وہ شاید فتح خان کی داشتہ تھی اور اس کے بیڈروم میں تھی۔ چند لمحوں بعد فتح

خان کی پُر شمار آواز آئی۔ ”شہباز خاناں۔“

”فتح خان۔“ میں نے سرد ترین لہجہ میں کہا۔ ”میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ اب

رے اور تمہارے درمیان مروت کا تعلق ختم ہو گیا ہے۔ اب ہمارا سامنا ہوا تو ہم میں سے ایک ہی فرد زندہ رہے

میں تمہارے پیچھے نہیں آؤں گا لیکن تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے دور رہو۔“

”شہباز خان میں خود بھی تمہارے پیچھے نہیں آنا چاہتا، پر کیا کرے مجبوری ہے۔“

میں اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا مگر انجان بن کر بولا۔ ”کسی مجبوری؟“

”تم سمجھتا ہے میں ہیروں کی بات کر رہا ہے۔“ وہ بولا۔ ”میرے کو بس وہ ہیرے مل جائیں۔“
 ”وہ ہیرے تمہیں جہنم میں ملیں گے۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”اور جہنم جانے کے لیے تمہیں میرے
 سامنے آنا ہوگا۔“

”ہم کو جہنم کا پرانا نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”وہ غالب خان نے کیا فرمایا ہے کہ دل خوش رکھنے
 کو یہ خیال اچھا ہے غالب۔“

”وہ غالب نے جنت کے بارے میں کہا ہے۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ویسے مجھے حیرت ہوئی تھی کہ
 فتح خان نے یہ ایک مصرع بھی کہاں سے سن کر یاد رکھا تھا۔ ”ٹھیک ہے تمہیں جنت جہنم کی پروا نہیں ہے لیکن میری
 زندگی کو کیوں جہنم بتا رہے ہو۔“

فتح خان کچھ دیر کے لیے خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔ ”شہباز میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہے۔“
 ”کیسا سودا؟“

”تم ہیرے تلاش کرنے میں میرا مدد کرو، ہیرے مل گئے تو میں تم کو مرشد سے نجات دلا دے گا۔ یہ فتح
 خان کا وعدہ ہے۔“

”فتح خان تم شاید نہیں جانتے کہ بیٹو میرے لیے دنیا کی تمام دولت سے بڑھ کر قیمتی تھا اور وہ کیوں جان
 سے گیا تم یہ بھی جانتے ہو۔“
 ”مجھے اس کا افسوس ہے۔“

”مجھے تمہارے افسوس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آخری بار تمہیں خبردار کر رہا ہوں اب
 میرے سامنے مت آنا ورنہ میں بیٹو کا انتقام لینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

”شہباز میرا بات سنو.....“ فتح خان نے کہنا چاہا لیکن میں نے کال کاٹ کر موبائل بند کر دیا۔ میں نے فتح
 خان کو دھمکی دے دی تھی مگر وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو آسانی سے اپنا ارادہ ترک کر دیتا۔ سویرا سے رابطے کا مطلب تھا
 کہ اس کے ذہن میں میرے حوالے سے کوئی بات ہے۔ اس کی باتوں سے بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ ہیروں کا
 خناس اس کے دماغ سے نکلا نہیں تھا۔ مگر میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے موبائل بھی بند
 کر دیا تھا۔ اب وہ مجھ سے رابطے کا کوئی دوسرا طریقہ نکالتا مگر مجھے امید تھی کہ وہ براہ راست میرے سامنے آنے
 سے گریز کرے گا۔ اسے معلوم تھا کہ میں اپنے الفاظ پر عمل کرنے والا شخص ہوں۔ فتح خان جیسے عیار خود کشی نہیں
 کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر موقع پر جان بچا کر نکلنے میں کامیاب رہا۔ کنور پولیس سے بھی وہ جس طرح فرار
 ہوا تھا وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی نہیں وہ بہت جلد واپس بھی آ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے
 دماغ سے یہ بات نکلی نہیں تھی کہ ہیرے اسے میری مدد سے ہی مل سکتے تھے۔ ورنہ اسے مجھ سے اور کوئی مطلب
 نہیں تھا وہ بس اسی ایک چیز کو لے کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔



رات دیر سے سونے کے باوجود میری آنکھ صبح جلد کھل گئی۔ میں تروتازہ تھا اور غسل کر کے رہی سہی کسل
 مندی بھی دور ہو گئی۔ نیچے آیا تو پتا چلا کہ آج ریڈی میڈ ناشتا ہوگا کیونکہ مکن کا بیشتر سامان بیک کیا جا چکا تھا۔ شاہ

جی باہر سے طلو پوری اور کلچے پائے لے آیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے مختصر میٹنگ کی۔ اس میں ایک بار پھر تمام امور کا جائزہ لیا۔ مجھے سب سے پہلے روانہ ہونا تھا اور زبیدہ نے میرا بیگ تیار کر دیا تھا۔ اس میں میرے چند جوڑے اور ضرورت کی چیزیں تھیں باقی سامان ان لوگوں کے ساتھ نئے بنگلے میں جاتا۔ سب سے مل ملا کر میں دس بجے عبداللہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ مجھے ایاز کی ورکشاپ تک چھوڑ کر واپس آ جاتا۔ ایاز سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ جیپ لے کر وہیں آئے گا۔ پندرہ منٹ میں عبداللہ نے مجھے وہاں چھوڑا۔ وہ میرے لیے ایک اضافی موٹر سائیکل اور دو مزید سیم لے آیا تھا۔ یہ فریش تھیں اور عبداللہ نے انہیں ایکٹو کر لیا تھا۔ میں اب اپنی سم استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ مرشد اور فتح خان دونوں کے علم میں آ چکی تھی۔ میں کم سے کم اس سفر میں اس سم کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایاز جیپ کی رجسٹریشن کے لیے گیا ہوا تھا میں اس کے چھوٹے سے دفتر میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ عبداللہ کو بنگلے کی چابی لینے جانا تھا اس نے اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کر لی تھی اور وہ آج ہی تمام کام کرانے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس لیے عبداللہ مجھ سے مل کر چلا گیا۔ ورکشاپ میں تین نوجوان لڑکے کام کر رہے تھے اور وہ اپنے کام میں ماہر لگ رہے تھے۔ ایاز کی غیر موجودگی میں بھی وہ پوری لگن سے کام میں لگے ہوئے تھے۔ لڑکے ڈیمنگ پینٹنگ اور دوسرے کاموں کے لیے تھے۔ انجن اور اس سے متعلقہ امور ایاز خود دیکھتا تھا اور گاڑی کی الیکٹرک وائرنگ کے لیے اس نے ایک الیکٹریشن ہائر کیا ہوا تھا جو طلب کرنے پر آ جاتا تھا۔ ایاز کے نائب نے میرے منع کرنے کے باوجود چائے منگوائی تھی۔ جب تک میں نے چائے پی ایاز آ گیا۔ وہ ایک گہرے سبز رنگ کی ٹوڈور جیپ میں آیا تھا۔ اس کو فلوادی کبین ایک ہی جیس کا بنا ہوا تھا۔ آگے مضبوط سپر تھا اور عقب میں پیچھے کھلنے والا دروازہ تھا۔ میں دفتر سے نکل کر آیا۔ ایاز نے اتر کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور جیپ کی طرف اشارہ کیا۔

”کیسی ہے جناب؟“

”یہ تو تم بتاؤ گے، دیکھنے میں تو بہت اچھی لگ رہی ہے۔“

”باقی بھی اے دن ہے۔ ابھی لڑکے آدھے گھنٹے میں ہر دس کر دیں گے۔ آئل نیا ہے اور باقی وہ دیکھ لیں گے۔“ ایاز نے کہا اور لڑکوں کو ہدایت دے کر میرے ساتھ دفتر میں آیا۔ یہ چھوٹا سا لکڑی اور شیشے کا بنا کبین تھا۔ اس نے مجھے جیپ کی بک دی۔ یہ شاہین کے نام رجسٹر ہو گئی تھی۔ ایاز ہنسا۔

”جب میں نے شاہین کو بتایا تو وہ ہنسی تھی کہ اسے بھلا گاڑی کی کیا ضرورت ہے۔“

”کیسی ہے وہ اور تم دونوں کا آنے والا ہے بی۔“

”دونوں اے دن ہیں۔“ ایاز نے چپک کر کہا۔

”وسیم اور سفیر دینی جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”عبداللہ بھی شاید حویلی چلا جائے، یہاں تم رہ جاؤ گے اور مجھے تمہاری فکر ہے۔“

”اللہ مالک ہے اور مجھے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔“ اس نے مخصوص بے پردائی سے کہا۔ اس نے حلیہ بدل لیا تھا۔ اپنے لمبے بال کرپوٹ کر لیے تھے اور اب کلین شیو تھا۔

”وہ تو ہے مگر مجھے خدشہ رہے گا۔ ایاز میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ فی الحال یہاں برنس کے

حالات اتنے اچھے نہیں ہیں۔ ٹوریزم ٹھپ ہے۔ شاید میں حویلی چلا جاؤں یا پھر دینی شفٹ ہو جاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی دینی آجاؤ وہاں گاڑیوں کے کام کا بہت اسکوپ ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن یہاں بھی کام اچھا چل رہا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اچھا اور کھل کر کما رہا ہوں۔“

”بات کمائی کی نہیں ہے یا تم ہنرمند آدمی ہو جہاں جاؤ گے کمالو گے تم میرے خدشات کو سمجھو۔ ابھی مرشد کا خطرہ ملا نہیں ہے جب تک معاملہ سیٹ نہ ہو جائے مجھے اس کی طرف سے خطرہ رہے گا اور ظاہر ہے میرے ساتھیوں کو بھی رہے گا۔“

”ٹھیک ہے میں شاہین اور خالہ سے پوچھتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان کے بغیر نہیں جاسکتا۔“

”ان کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے تم وہاں بزنس دیزالو گے اور اپنی فیملی کو بلا سکو گے۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”رہائش کا مسئلہ نہیں ہے جب تک تمہارا اپنا بندوبست نہیں ہو جاتا سفیر کے ساتھ رہو گے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی بڑا گھر لے لیں اور سب ساتھ رہیں۔“

”شاہین کا مسئلہ نہیں ہے وہ تو سب کے ساتھ خوشی سے رہے گی، البتہ خالہ شاید نہ مانیں کیونکہ یہ ان کا آبائی گھر ہے بچپن سے رہ رہی ہیں۔ محلہ اور دوسرے رشتے دار بھی ہیں۔ ان کا سوشل سرکل خاصا وسیع ہے۔“

”تم بات کر کے دیکھو۔“ میں نے کہا۔ اس دوران میں جیب تیار ہو گئی تھی۔ زبیدہ نے کھانے کا پوچھا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ ایاز شاہین سے نکلا بوٹی، پراٹھے اور پلاؤ بنوا لیا تھا یہ سب ایک بڑے سے ہاٹ پاٹ میں تھا۔ اس نے مجھے تھمایا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“

”تھی جناب تب ہی تو شاہین نے ساتھ کیا ہے۔ یہ دوپہر تک تو گرم رہے گا۔“

”کوئی بات نہیں امید ہے میں شام تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”ان دنوں بارشوں کی وجہ سے راستے خراب ہیں۔“ ایاز نے بتایا۔ ”آپ شاید کل ہی پہنچ سکیں رات کو کسی ہوٹل میں رک جائیں تو بہتر رہے گا۔“

”شاید ایسا ہی کروں۔“ میں نے اس کے گلے لگ کر کہا۔ ”شاہین کو شکر یہ کہنا۔“

”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے جناب۔“ ایاز نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اپنا بیگ اور ہاٹ پاٹ پیچھے رکھا وہاں کولڈ ڈرنک کے ٹن، منزل واٹر کی بوتلیں اور ایک عدد تھرماس پہلے سے رکھا ہوا تھا جس میں کافی تھی۔ سب شاہین نے بھجوا دیا تھا۔ گویا راستے کی ضرورت کی ہر چیز تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے نئے موبائل میں نئی سم لگائی۔ عبد اللہ موبائل چارج کر کے لایا تھا۔ پھر یہ جیب کے چارجر سے بھی چارج ہو سکتا تھا اس لیے اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ میں درکشاپ سے نکلا تو سڑک پر مڑتے ہوئے میں نے مخالف سمت میں ایک مارگلہ کار میں ایک قبائلی کو دیکھا۔ میں چونکا کیونکہ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور ہماری نظریں ملیں تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔ میں آگے نکلا اور عقب میں دیکھا تو کار مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ اتفاق تھا۔ دراصل حالات نے مجھے اعصاب زدہ کر دیا ہے اور میں ذرا سی بات سے چونک جاتا ہوں۔ وہ قبائلی صورت

سے فتح خان کے علاقے کا رہنے والا لگ رہا تھا۔ یہ وجہ بھی تھی اور پھر وہ مسکرایا تھا۔



راجا مردراز کے علاقے تک جانے کا مختصر راستہ تو مردان سے گزرتا تھا۔ میں ہری پور روڈ سے اس طرف مڑ جاتا۔ جو اصل میں قراقرم ہائی وے کا آغاز بھی ہے۔ مگر وہاں تک جانے کے لیے مجھے پورا پنڈی، پھر فتح جنگ اور ٹیکسلا کے پاس سے ہوتے ہوئے واہ کینٹ کے نیچے سے نکلنا پڑتا اور یہ خاصا لمبا روٹ تھا جس میں جی ٹی روڈ والا حصہ ہمیشہ خراب ملتا ہے۔ اس لیے میں نے مری ایبٹ آباد والے راستے کو ترجیح دی۔ اس کا بڑا حصہ پہاڑوں سے گزرتا ہے مگر یہ میرے پسندیدہ مناظر ہیں۔ میں روانہ ہوا اور آدھے گھنٹے بعد مارگلہ کو عبور کر کے مری کے پہاڑوں میں داخل ہو رہا تھا۔ مارگلہ کا سلسلہ ہائے کوہ زیادہ بلند نہیں ہے لیکن اس نے اس علاقے کو کسی سانپ کی طرح اپنے گل میں لے رکھا ہے۔ ایک طرف یہ مری کے پہاڑوں تک جاتا ہے اور دوسری طرف ہزارہ پٹی کو ٹھوتاتا ہے۔ پنڈی اور اسلام آباد کو ہری پور، واہ کینٹ اور حسن ابدال کی اہم آبادیوں سے جدا کیا ہوا ہے۔

اگر دامن کوہ سے چند کلومیٹر طویل ایک سرگ نکالی جائے جو دوسری طرف خان پور پر نکلے تو یہ سارا علاقہ ایک ہو جائے گا۔ ہری پور اور انسمہ کی مسافت بہت کم رہ جائے گی اور یہاں رہنے والوں کو پنڈی اسلام آباد آنے کے لیے ایک مختصر راستہ مل جائے گا۔ واضح رہے کہ اس خطے کی آبادی ایک کروڑ سے اوپر ہے اور ان سب کے مفادات آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ نئے راستے نہیں گئے تو معاشی سرگرمیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایاز کا کہنا درست ثابت ہوا جب راستے میں پہلی لینڈ سلائیڈنگ سے واسطہ پڑا۔ مگر یہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ ایک بلڈوزر مٹی ہٹا رہا تھا اور بیس منٹ کے وقفے کے بعد میں دوبارہ روانہ ہوا۔ جیپ چھوٹی لیکن اس کا بارہ سو سی کا ڈیزل انجن طاقتور تھا۔ ایاز نے نہ صرف ٹینک فل کر دیا تھا جو آنے اور جانے دونوں کے لیے کافی تھا مگر ساتھ ہی اس نے بیس بیس لیٹر کے دو بھرے ہوئے جیری کین بھی پیچھے رکھے تھے۔ مری کے قریب پہنچ کر سنگٹل ملے تو میں نے دسم کو کال کر کے اپنے نکل جانے کی اطلاع دی۔

”میں مری تک پہنچ گیا ہوں۔“

”ہم بھی سامان پیک کر رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”شاید عبداللہ اینڈ پارٹی بھی آج ہی نکل جائے۔ جنگل کی چابی مل گئی ہے۔“

”یہ اچھا ہے، ہمیں ملے شدہ کام جلد نمٹا لینے چاہئیں۔“

”میری سادی سے بات ہوئی تھی وہ خوش ہے۔ اسے دینی ویسے ہی پسند آیا تھا اور وہ وہاں رہنا چاہتی ہے۔“

”بس تو تم ان کے لحاظ سے وہاں سیٹنگ کر لو اور پھر انہیں آکر لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میری تو خواہش ہے کہ تم لوگ اب وہیں رہو۔“

”آپ کے بغیر نہیں۔“ دسم نے انکار کیا۔ ”ہاں سو نیا کافون آیا تھا۔ میں ماموں بننے والا ہوں۔“

”مبارک ہو، وہ کہاں ہے؟“

”خیر مہارک۔“ دسم ہنسا۔ ”لاہور میں ہی ہے۔ اس کے صحافی شوہر نے نیا بزنس شروع کر دیا ہے۔ وہ

کیبل آپریٹر بن گیا ہے آدھے لاہور کو وہی کیبل ٹی وی مہیا کر رہا ہے۔“

”یہ تو اچھا ہے ورنہ صفائی بن کر دھکے کھاتا رہتا۔“

”آج کل تو صحافیوں کے بھی مزے ہیں۔ مگر سب کے نہیں اخباروں میں کام کرنے والے آج بھوکے کھاتے ہیں۔“

گرمی کی وجہ سے مری کی طرف جانے والوں کا رش تھا مگر مجھے آگے جانا تھا صرف کال کرنے کے لیے رکھا تھا۔ یہاں مسلسل گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جتنی دیر میں نے کال کی جیب کے آگے پیچھے کئی گاڑیاں جمع ہو گئی تھیں اور مزید آ رہی تھیں۔ ہانوں کے شور سے پہاڑیاں گونج رہی تھیں۔ میں نے جیب نکالنے کی کوشش شروع کی اور آگے پیچھے والی گاڑیاں بھی حرکت میں آ گئیں۔ پیدل چلنے والے پہاڑی ڈھلان کے ساتھ چھوٹے سے کپے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے کیونکہ گاڑیوں کی وجہ سے سڑک پر جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے جیب کو ڈھلان کی طرف کیا تو مجھے اس کپے فٹ پاتھ پر ایک قبائلی نظر آیا۔ اس نے روایتی لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور جب میں نے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا اور پھر اس نے غیر متوقع انداز میں انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا کر مجھے دکھایا۔

میں اسے چند لمحے کے لیے دیکھ سکا تھا اور پھر عقب سے آنے والی گاڑیوں کے دباؤ نے مجھے آگے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ میں آگے بڑھتے ہوئے سائیز مرر میں اس قبائلی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی قدر کھلی جگہ آتے ہی مجھے گاڑی روکنے کا موقع ملا اور میں نے جیب روکتے ہوئے جلدی سے اتر کر دیکھا۔ عقب میں جاتے لوگوں میں مجھے اس حلے کا کوئی آدمی نظر نہیں آیا میں واپس آیا اور ایک مقامی نو جوان کو روکا اور اسے قبائلی کا حلہ بتاتے ہوئے اس سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔“

یہ نو جوان اس قبائلی کے پاس ہی تھا مگر اس نے اسے نہیں دیکھا۔ جب تک میں جیب روک کر آیا وہ غائب ہو گیا تھا ورنہ میں اسے پکڑ کر ضرور پوچھتا کہ اس نے مجھے وکٹری کا نشان کیوں دکھایا تھا۔ کیا اس سے مراد فتح تھی یعنی فتح خان۔ اگرچہ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ وہ قبائلی بلا مقصد بھی یہ حرکت کر سکتا تھا مگر میرے اندر بے چینی سی بھر گئی تھی۔ میں اسے تلاش کرنے لگا اور کچھ دیر میں، ہمیں نے ہر ممکن جگہ دیکھ لیا۔ قبائلی کے یوں غائب ہونے سے میرا شبہ بڑھ گیا تھا۔ فتح خان جیسے شاطر سے ایسی ہی حرکتوں کی امید کی جاسکتی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی میرے ساتھ بلی چوہے والا کھیل کھیلتا رہا تھا۔ یعنی اپنی جھلک دکھانا یا اپنی موجودگی کا احساس دلانا اور پھر غائب ہو جانا۔ ایسا کر کے ایک طرف وہ مجھے بے اطمینانی کا شکار کرتا تھا تو دوسرے مجھے ہنکا کر اپنے پسندے کی طرف لانا چاہتا تھا۔ یہ تو اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے ہیروں کی تلاش میں مدد چاہتا ہے۔ اگر اسے علم ہو گیا تھا کہ میں راجا عمر دراز کے پاس جا رہا تھا تو وہ لازمی اسی سمت میں محو سفر ہوگا، کیونکہ وہ وادی وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے جہاں ہیرے موجود تھے۔

فتح خان کے خطرے کے باوجود مجھے آگے تو جانا تھا۔ چند منٹ بعد میں پُرسکون سڑک پر سفر کر رہا تھا۔ اوپر رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ خالی سڑک دیکھ کر مجھے اندیشہ ہوا کہ آگے پھر کوئی لینڈ سلائڈنگ نہ ہو۔ کچھ دیر بعد ایبٹ آباد کی طرف نکلنے والی سڑک آ گئی۔ ایک زمانے میں یہ سڑک بہت خطرناک اور تنگ ہوتی تھی مگر اب

اسے بھی بہتر کر دیا گیا تھا۔ البتہ مری کی نسبت یہاں پہاڑوں پر درخت کم تھے۔ وجہ وہی ہے، ٹمبر فائیٹ جابجا پورے پورے جنگل صاف کر دیئے ہیں۔ ڈرائیو کرتے ہوئے میں عقب کا بھی خیال رکھے ہوئے تھا۔ مگر مجھے پیچھے کوئی مشکوک گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ چار بجے کے قریب میں ایبٹ آباد پہنچ گیا تھا اور خلاف توقع کہیں لینڈ سلائیڈنگ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

یہیں ایک پارک میں رک کر میں نے لُچ کیا اور پانچ بجے آگے روانہ ہو گیا۔ آج کے دن راجا عمر دراز کے محل تک رسائی نظر نہیں آرہی تھی اس لیے میری کوشش تھی کہ الائی یا بٹام تک پہنچ جاؤں۔ یہ دونوں بہت خوب صورت ہل انشیشن ہیں اور اس کے بعد چند ٹھنڈے کا سفر تھا جو میں اگلے دن بھی کر سکتا تھا۔ مگر ہانسہرہ سے جب میں قراقرم ہائی وے پر مختصر سفر کر کے دوسری سڑک پر آیا تو یہاں سے راستے کی خرابی کا آغاز ہو گیا اور ایک جگہ لینڈ سلائیڈنگ تھی۔ اگرچہ یہ بھی معمولی سی تھی مگر اس کی وجہ سے وقت ضائع ہوا اور میں آٹھ بجے کے قریب سوات ویلی میں داخل ہوا۔ الائی کی بجائے میں نے بٹام میں رکنے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہ مین روڈ پر ہے جب کہ الائی مین روڈ سے ذرا ہٹ کر ہے۔ وہاں سے مجھے واپس دوبارہ مین روڈ پر آنا پڑتا اور پھر بٹام آگے تھا اس لیے میں نے اسے ترجیح دی۔ یہاں سے میں اگلی صبح وقت ضائع کیے بغیر روانہ ہو سکتا تھا۔

بیزن کی وجہ سے یہاں بھی سیاحوں کا رش تھا اس لیے کمرے کی تلاش میں مجھے کئی ہوٹلوں میں گھومنا پڑا اور بالآخر ایک جگہ کرا مل گیا۔ محکم بہت زیادہ تھی اس لیے کھانا کھا کر میں سو گیا۔ اسلام آباد سے نکلنے ہوئے مارگہ میں نظر آنے والے قبائلی کی وجہ سے مجھے خدشہ تھا کہ کوئی پیچھے نہ ہو خاص طور سے فتح خان کی طرف سے اندیشہ آ گیا تھا۔ پھر مری میں ملنے والے اور انگلیوں سے فتح کا نشان بنانے والے قبائلی نے میرے خدشات مزید بڑھا دیئے تھے۔ اس لیے سفر کے دوران میں، میں نے عقب کا خاص خیال رکھا تھا۔ مگر پہاڑی سڑکوں پر کسی کا تعاقب کرنا بہت آسان ہے کیونکہ یہاں راستے محدود ہوتے ہیں اور آپ کو کسی کی منزل کا علم ہو تو آپ آسانی سے فاصلہ رکھ کر پیچھے چل سکتے ہیں۔ اگر فتح خان کو میرے سفر کا علم ہو جاتا تو منزل کا اسے خود پتا چل جاتا اور وہ میرے پیچھے آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اپنے تعاقب کا خیال رکھنا تھا۔ حفاظت کے لیے میرے پاس ایک ہتول اور ایک چھوٹی شاٹ گن تھی۔ دونوں چیزیں میرے بیک میں تھیں۔

رات سونے سے پہلے میں نے صبح آٹھ بجے کا الارم لگایا اور الارم نے مجھے جگا دیا۔ پہلے میں نے عبداللہ کوکال کی اور اس نے اطلاع دی کہ وسیم اور سفیہ بھائی منزل پر پہنچ گئے تھے اور انہوں نے بھی راتوں رات شہنشاہ کر لی تھی۔ یہ سن کر میں نے اطمینان محسوس کیا، میرے ساتھی محفوظ ہو گئے تھے۔ ناشتا کرتے ہی میں آگے روانہ ہو گیا۔ میری کوشش تھی کہ دوپہر تک راجا عمر دراز کے محل تک پہنچ جاؤں۔ مگر ہائی وے پر ذرا آگے نکلنے ہی پھر لینڈ سلائیڈنگ نے راستہ مسدود کر دیا۔ یہ داسو کی طرف جانے والی سڑک تھی۔ اوپر سے مٹی اور پتھروں کا ایک انبار تھا سڑک پر آگرا تھا اور اسے شاید زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کیونکہ مٹی ابھی تک سرک رہی تھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے لے رہا تھا۔ اس طرف صرف چند گاڑیاں تھیں اور سڑک کی صفائی اور راستہ بنانے کے لیے دور دور تک کوئی موجود نہیں تھا۔ حالانکہ یہ مین ہائی وے ہے جو اس علاقے کو نیچے کے علاقوں سے ملاتی ہے۔ مگر یہاں بھی ہنگامی لات میں کام آنے والا عملہ اور مشینری ہمہ وقت دستیاب نہیں تھی۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا جھکی ہوئی

تھا۔ وقت گزاری کے لیے مسافر وہاں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ ہوٹل کا مالک چائے بنا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”آگے جانے کا کوئی اور راستہ ہے؟“

اس نے اپنی میلی قمیص سے اپنا دھواں آلود چہرہ صاف کیا اور بولا۔ ”پکارا راستہ تو نہیں ہے، پر ہے۔“

”کس طرف ہے۔“

”ادھر پیچھے کی طرف واپس جاؤ۔“ اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ”کوئی دو میل پہلے پکارا راستہ اوپر جاتا ہے۔ پر ادھر سے صرف جیب جاسکتا ہے فور وکیل ڈرائیو والے۔“

”میرے پاس ہے۔“ میں نے اپنی جیب کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے جیب کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ چلا جائے گا۔ پر راستہ بہت خراب ہے، خطرہ بھی ہے۔“ چائے نوشی میں آدھا گھنٹا اور گزر گیا تھا اور ابھی تک راستہ صاف کرنے کے لیے بلڈوزر اور عملہ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وہیں گوبھی آلو کا لٹچ کیا اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اس لیے قبول کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں چارپائی پر لیٹا ہوا باقاعدہ اونگھ رہا تھا کہ ہوٹل میں کام کرنے والے لڑکے نے مجھے ہلایا اور جیب کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تمہارا گاڑی ہے؟“

”ہاں؟“

”ادھر صبح کے بعد ایک آدمی آیا تھا۔ اس نے تمہارا گاڑی کا نمبر اور رنگ بتا کر پوچھا تھا کہ یہ گاڑی ادھر سے تو نہیں گزرا ہے۔“

میری غنودگی غائب ہو گئی اور میں چونکا ہوا گیا۔ ”اچھا کیسا آدمی تھا دیکھنے میں کیسا لگتا تھا؟“

”ادھر ہی کا تھا، بوڑھا ہونے والا، لٹکا ہوا مونچھ اور آنکھوں کے نیچے گوشت الگ سے تھا۔“ لڑکے نے خاصی تفصیل سے فتح خان کا حلیہ بتایا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس سفر کے دوران میں جو رہہ کر کھٹک رہا تھا تو اس کھٹک کی وجہ سامنے آ گئی تھی۔ فتح خان میرے سفر سے آگاہ ہو گیا تھا اور پھر وہ میرے پیچھے تھا بلکہ فتح خان میرے آگے سفر کر رہا تھا۔ اس کے آدمی یقیناً پیچھے تھے جو اسے میرے بارے میں اطلاع دے رہے تھے اور ساتھ ہی مجھے نفسیاتی حربوں سے مرعوب کر رہے تھے۔ یہ شروع سے اس کا طریقہ رہا تھا۔ جب وہ میرے چکر میں ہوتا تو جان کر مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ شاید فتح خان کسی وجہ سے سمجھا کہ میں آگے نکل گیا ہوں اس لیے اس نے یہاں پوچھ لیا۔ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ ہر جگہ آدمی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ خود وہ آگے تھا کہ اسے میری منزل کا علم تھا۔ اس حصے میں آ کر وہ میرے بارے میں لاعلم ہو گیا۔ کیونکہ میں رات بشام میں ٹہر گیا تھا اور فتح خان اس سے بے خبر رہا ہو گا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

”کیا وہ آگے چلا گیا تھا لینڈ سلائڈنگ سے پہلے؟“

لڑکے نے سر ہلایا۔ ”وہ ایک گھنٹا پہلے نکل گیا تھا۔ پھر سلائڈ ہوا۔“

لڑکا ہوشیار تھا اگرچہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی شاید وہ تیرہ چودہ برس کا تھا مگر اس میں ہوشیاری تھی۔ میں نے اس کی خدمت کے صلے میں ایک سوکانوٹ انگلیوں میں دبا کر پیش کیا جو اس نے خاموشی سے وصول کیا

اور چلا گیا۔ اس نے اسی امید میں مجھے معلومات فراہم کی تھیں۔ میں جواب تک کسی قدر امن و سکون سے سفر کرتا رہا تھا منزل کے پاس آ کر یک دم ہی جیسے خطرہ سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں کیا کرتا آگے جاتا یا نہیں سے پلٹ جاتا۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ فتح خان میرا آگے کہیں انتظار کر رہا ہوگا۔ مگر اس کے ڈر سے واپس جانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے لڑکے کو تازہ چائے لانے کو کہا۔ میرے پاس ابھی بہت وقت تھا اور میں غلت میں کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے سکون سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

اس دوران میں کئی گاڑیاں اور ان کے مسافر آگے تھے۔ وہ سب ہوٹل کی طرف آئے اور ظاہر ہے ہوٹل کا مالک بہت خوش اور بہت مصروف تھا۔ اس لینڈ سلائڈنگ نے اچانک ہی اس کے کاروبار کو ترقی دی تھی۔ بیٹھنے کے لیے چار پائیاں کم پڑ گئی تھیں اس لیے اب وہ ان مسافروں کی طرف ذرا تاپسندیدگی سے دیکھ رہا تھا جو کھاپی چکے تھے اور اب صرف ستارہ تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اٹھ جائیں تاکہ نئے آنے والے اس کے برنس کی ترقی میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔ شکر ہے میں نے چائے منگوا لی تھی اس لیے اس کی تاپسندیدہ نظروں سے محفوظ رہا۔ ویسے نئے آنے والوں کو بھی جگہ مل گئی تھی۔ اکاڈکاستورات والے بھی تھے مگر خواتین گاڑیوں میں رہیں۔ لڑکا چائے لے کر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”اس کے ساتھ اور کوئی تھا؟“

لڑکے نے سر ہلایا۔ ”ایک عورت تھا جو ان اور خوب صورت۔“

لڑکے کی نظر اس لحاظ سے بھی تیز تھی۔ یہ شاید وہی عورت تھی جس نے میری کال ریسپونڈ کی تھی۔ فتح خان میں یہ عجب محسوس تھا کہ وہ عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بہت سے مواقع پر اسے اس وجہ سے نقصان بھی ہوا مگر وہ باز نہیں آتا تھا۔ میں نے اسے مزید سوکا ایک نوٹ دیا اور آہستہ سے کہا۔ ”یہ بات کسی اور سے مت کہنا، میرے دشمن بہت خطرناک ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ تم نے ان کے بارے میں مجھے بتایا ہے تو وہ تمہیں مار دیں گے۔ میری بات سمجھ رہے ہوں؟“

لڑکے نے سر ہلایا۔ اس کے تاثرات میں خوف شامل ہو گیا تھا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک خیال ذہن میں آیا۔ شروع میں تو بس صرف خیال تھا مگر جیسے جیسے اس پر سوچتا رہا مجھے یہ خیال اچھا لگا۔ دو بجے میں ہوٹل سے نکلا۔ اس وقت تک سڑک بدستور بند تھی۔ میں نے جیب واپس گھمائی اور روانہ ہو گیا۔ اب مجھے ایک اور سڑک کی تلاش تھی۔ وہ سڑک کوئی دس میل پیچھے لی اور میں نے جیب اس پر ڈال دی لیکن یہ سڑک راجا عمر دراز کے محل تک نہیں جاتی تھی۔ ایک گھنٹے بعد میں اس مخصوص ہل تک پہنچ گیا تھا جہاں میں پہلے بھی کئی بار آچکا تھا مگر اس بار ہل سے نیچے ندی میں اترنے والا راستہ پانی کے سبب بند تھا اور پر بارش کی وجہ سے خاصی مقدار میں پانی تھا۔ مجھے جیب کا کچھ کرنا تھا میں اسے یونہی چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ہل کے ساتھ ہی ایک کوٹھری تھی جس میں ہل کا رکھوالا چوکیدار موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی آ موجود ہوا۔

”جی صاحب کوئی حکم کوئی خدمت؟“

”مجھے آگے جانا ہے۔“ میں نے ندی کی طرف اشارہ کیا۔

”ادھر جپ نہیں جائے گی صاحب۔“ اس نے آگاہ کیا۔ ”پیدل کا راستہ بھی مشکل ہے، ندی میں بہت پانی ہے۔“

”مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ میں جپ یہاں چھوڑ کر جاؤں گا۔“

”بالکل صاحب، ہم اس کی رکھوالی کرے گا۔“ اس نے دانت نکال کر کہا۔ ”جیسا چھوڑ کر جائے گا واپسی

میں ویسا ہی ملے گا۔“

میں نے جپ کو ٹھری کے ساتھ کھڑی کی اور اسے دو سو دے کر اس کی چوکیداری پر مامور کیا۔ شہر میں کوئی اس کام کے پانچے کے کم نہ لیتا اور میں اسے پانچ سو دے سکتا تھا مگر اس علاقے میں بعض اوقات فراخ دلی آدمی کے گلے پڑ جاتی ہے۔ لوگوں کو پتا چل جائے کہ آپ کے پاس زیادہ پیسے ہیں تو ان کی نیت بھی خراب ہو سکتی ہے۔ یہ عمومی بات ہے کہ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے دو سو دیئے اور ساتھ ہی اسے خبردار کرنے کے لیے بیک نکالتے ہوئے پستول اور شاٹ گن کی نمائش بھی کی تاکہ اس کے دل میں کسی قسم کی بے ایمانی نہ آئے۔ میں نے بیک پشت پر باندھ کر کہا۔

”میں آگے جا رہا ہوں کل واپس آؤں گا تب تک تم جپ کی حفاظت کرو گے۔“

”ضرور کرے گا صاحب۔“ اس نے تابعداری سے کہا۔ ”ہم ادھر اور کس لیے ہے؟“

میں نے بچا کچا کھانے پینے کا سامان ساتھ ہی رکھا تھا آگے مجھے اس کی ضرورت پیش آتی۔ یہاں موسم خشک تھا اور چیزوں کے خراب ہونے کا امکان کم تھا۔ جھکی ہوئی سے ٹکٹے ہوئے نان بھی لے لیے تھے۔ یہ خشک نان اس وقت کام آتے جب کھانے کے لیے اور کچھ باقی نہ رہتا۔ ساتھ ہی قمراس میں چائے بھر والی تھی۔ پانی کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ مجھے ندی کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ میں نیچے اترا اور ندی کے کنارے آگے روانہ ہوا۔ یہاں پہلے قمر اور جھاریاں تھیں مگر پانی اوپر تک آنے سے مجھے اب ترچھی ڈھلان پر سفر کرنا پڑ رہا تھا جو پھسلواں تھی اور کہیں کہیں اس میں سرکنے والی ریت بھی تھی۔ جب اس پر قدم جما تا تو وہ سلپ کرنے لگتی تھی۔ مگر مجھے اس قسم کے راستوں پر سفر کرنے کا تجربہ تھا اس لیے خاص مشکل نہیں آئی۔ میں نے اس سے کہیں زیادہ خطرناک راستوں پر سفر کیا ہوا ہے جہاں ایک غلط قدم آدمی کو تخت لٹری میں لے جاتا اور وہاں سے زندہ سلامت واپسی کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ندی کا راستہ تو میرے لیے ہموار سڑک جیسا تھا۔

میں پانچ بجے ندی میں اترا تھا اور میری کوشش تھی کہ تاریکی چھانے سے پہلے میں منزل مقصود پر پہنچ جاؤں۔ میرے پاس تاریکی کا سد باب بھی تھا اور ایک طاقتور نارنج کے ہمراہ دو عدد چھوٹی ایربئسی لائٹس تھیں جو آرام سے چھ سات گھنٹے تک چل سکتی تھیں۔ اس کے باوجود میری کوشش تھی کہ میں تاریکی سے پہلے وہاں پہنچوں۔ یہ سفر دو گھنٹے کا تھا اور سورج سات کے کچھ دیر بعد غروب ہو رہا تھا۔ اس لحاظ سے امکان یہی تھا کہ میں پہنچ جاتا۔ مگر میں نے پہلے خشک ندی میں سفر کیا تھا جس میں سفر آسان تھا اور یہاں مجھے ڈھلان پر سفر کرنا پڑ رہا تھا بعض جگہوں پر راستہ نایاب ہو جاتا تو مجھے اوپر سے گھوم کر واپس آنا پڑتا تھا اس میں خاصا وقت ضائع ہو رہا تھا۔ شاٹ گن بیک میں تھی لیکن پستول میں نے پتلون کی بیٹل میں اڑس رکھا تھا۔ میں ایک لمحے کے نوٹس پر اسے نکال سکتا تھا۔

اس لیے جب اچانک اوپر جھاڑیوں میں ہلچل سی مچی تو میں نے سیکنڈ سے پہلے پستول نکال لیا اور ایک پتھر کی آڑ میں ہو گیا۔ جھاڑیوں کی حرکت ایسی تھی جیسے اس میں کوئی زندہ چیز ہو۔ میری نظر جھاڑیوں پر مرکوز تھی اور پھر اس میں سے خرگوشوں کا ایک جوتا نکلا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ پانی پینے نڈی تک آئے تھے۔ پہلے انہوں نے سن گن لی، میں ساکت رہا، خرگوش کی نظر کمزور ہوتی ہے مگر سو گھنٹے اور سننے کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ چند لمحوں کا گھمٹاؤ اور تھنا پھڑکاتے رہے اور پھر پھدک پھدک کر نیچے آنے لگے۔ انہوں نے دھارے کے پاس آ کر پانی پینا شروع کیا اور ایک منٹ بعد وہ دوبارہ اوپر جا رہے تھے ان سے غائب ہونے کے بعد میں حرکت میں آیا اور دوبارہ سفر شروع کیا۔ میں پہلے بھی حرکت کر سکتا تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ ان کی پیاس میں مداخلت کروں۔ میری موجودگی محسوس کر کے وہ پانی پینے بغیر بھاگ جاتے۔

سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور روشنی کم ہو رہی تھی۔ نڈی دو پہاڑیوں کے درمیان میں تھی اس لیے یہاں روشنی اور کم تھی۔ میں خاصے عرصے بعد اس طرف آیا تھا اس لیے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ ابھی منزل کتنی دور ہے۔ بس اتنا یاد تھا کہ آگے جا کر نڈی نیم دائرے میں گھومتی اور یہ اس بات کی نشانی ہوتی کہ میں منزل کے نزدیک پہنچ گیا ہوں۔ پونے سات کے بعد نڈی نے گھومنا شروع کیا اور اب اس میں پانی کم ہو گیا تھا کیونکہ زیادہ پانی لانے والے نالے پیچھے رہ گئے تھے۔ نڈی کا پات بھی کم ہو رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ آخری حصے میں یہ خود رونالے جیسی رہ جائے گی۔ پانی مسلسل کم ہو رہا تھا کیونکہ بارش کا بیشتر پانی بہہ چکا تھا اور اب پیچھے سے آنے والے پانی کی مقدار کم ہو رہی تھی۔ نیم دائرے میں گھومتے ہوئے میں نے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں اس وادی کو دیکھا جہاں وہ خونی بہرے پوشیدہ تھے جواب تک درجنوں لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ وادی کی وسطی کھنڈر نما چٹانیں سامنے میں آچکی تھیں۔ صرف اوپری مشرقی ڈھلان پر روشنی تھی اور وہ بھی تیزی سے غائب ہو رہی تھی۔ میں نالے سے باہر آیا اور مشرقی ڈھلان کی طرف بڑھا۔ دراصل یہ شمال مشرقی ڈھلان تھی۔ مگر میں نے کھلی جگہ آنے سے گریز کیا اور درختوں کے درمیان سے گزرتا رہا۔ مگر جب میں مطلوبہ مقام تک پہنچا تو وہاں تاریکی چھا گئی تھی۔ تاریکی بہت تیزی سے اور اچانک آئی تھی۔ اب درختوں کے نیچے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ کھلی جگہ بہت معمولی سی روشنی باقی تھی۔ میں گہری سانس لے کر درختوں سے نکل آیا اور کھنڈر نما چٹانوں کی طرف بڑھا۔ ان چٹانوں سے ابھی تک تپش نکل رہی تھی۔ مجھے انتظار تھا کہ چاند نکل آئے اور کچھ روشنی ہو تو میں دوبارہ ڈھلان کی طرف جاؤں۔ میں نے سامان اتارا اور بیچ جانے والی بوتلیاں نان کے ساتھ کھائیں۔ چائے بکلی سی گرم رہ گئی تھی مگر اس نے مزہ دیا۔ میں کھاپی کر آرام کرتا رہا۔ گرہائش کی وجہ سے یہاں خشکی کا احساس نہیں تھا مگر صبح کے قریب یہ چٹانیں بہت زیادہ ٹھنڈی ہو جاتیں اور اس وقت آگ کے بغیر گزارا نہیں ہوتا مگر میں آگ جلاتا نہیں چاہتا تھا۔

یہاں آتے ہوئے میرے ذہن کے کسی گوشے میں خیال تھا کہ کسی وقت بھی میرا فتح خان سے سامنا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا کہ وہ یہاں پایا جائے۔ مگر وہ ایسا آدمی تھا جو دوسروں کو حیران کر دیتا تھا اور اسی وجہ سے وہ مجھے اپنے کسی بھی دشمن کے مقابلے میں ہمیشہ زیادہ خطرناک لگا۔ اس لیے میں محتاط تھا اور میں نے خود کو ہلکے سے تک پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی چاند طلوع ہوا اور اس کی روشنی وادی میں داخل ہوئی میں چٹانوں کے

اندرونی حصے میں آگیا۔ میں نے کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑا تھا جس سے میرے بارے میں پتا چلتا۔ اب شاٹ مگن بھی نکال لی تھی اور وہ میرے شانے پر تھی۔ رفتہ رفتہ چاند اوپر آنے لگا۔ نوبے اس کی روشنی خاصی تیز ہو گئی تھی اور کوئی کھلے میں حرکت کرتا تو وہ فوراً نظروں میں آ جاتا۔ یہ سولہویں یا سترہویں کا چاند تھا اس کے باوجود بھی اس وقت خاصا بڑا لگ رہا تھا۔

میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا تھا اور میری ساری توجہ آوازوں پر مرکوز تھی۔ تاریکی چھاتے ہی قسم قسم کے کیڑے مکوڑے اور ذرا بڑی نسل کے جانور آوازیں نکالنے لگے تھے۔ کچھ پرندے بھی بول رہے تھے اور میں ان آوازوں کے درمیان کوئی ایسی آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا جو غیر فطری ہو اور اس جگہ سے باہر سے آنے والے انسان یا چیز سے پیدا ہو مگر فی الحال ایسی کوئی آواز نہیں تھی۔ اوپر کہیں گیدڑ یا اسی قبیل کا کوئی جانور آوازیں نکال کر ماحول کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور مخالف سمت کی ڈھلان سے کوئی آلو اس کا جواب دے رہا تھا۔ میں آرام کرنے کے ساتھ اٹکھ بھی رہا تھا۔ غنودگی کا ہلکا سا جھوٹکا آیا تھا کہ میں چونکا اور مجھے لگا جیسے میں نے کوئی نامانوس آواز سنی ہو مگر میں اس کی نوعیت نہیں سمجھ سکا تھا ہی یقیناً میری چھٹی حس نے چونکا یا تھا اور ہوشیار ہوتے ہوئے میں نے کان پھر سے مرکوز کیے۔ میرا پستول ہاتھ میں تھا اور میں کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔

مگر دس منٹ گزرنے کے بعد بھی کوئی ایسی آواز نہیں آئی جسے میں مشکوک قرار دے سکتا۔ شاید نیند میں، میں نے خیالی آواز سنی تھی۔ یہ سوچ کر میرے چوکس اعصاب پھر سے سُست پڑ گئے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور مجھے مزید دو ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ یہ وقت میں نے اٹکھتے ہوئے گزرا۔ وقت کتنی سُستی سے گزرتا ہے مجھے اس کا تجربہ پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا جب گھڑی کی طرف دیکھو تو اس کی سوئیاں اسی جگہ اٹکی نظر آتی تھیں۔ مگر میں نے اسے اعصاب پر سوار نہیں کیا۔ وقت بہر حال گزر جاتا ہے۔ ایک بار میں نے وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہے تھے۔ میں کھڑا ہوا اور چہل قدمی کر کے اپنا بندھ جانے والا جسم کھولا۔ سنگلاخ زمین پر آرام کہاں سے ملتا اٹا جسم دکھ گیا تھا مگر تھکن ختم ہو گئی تھی اور میرا ذہن چاق و چوبند تھا۔ میں نے ایک جگہ سے جنوب کی طرف والی ڈھلان کا جائزہ لیا۔ یہ اصل میں جنوب مغرب میں تھی اور چاند اس کی طرف جھک گیا تھا اس لیے اب یہاں سایہ تھا۔

ایک چھوٹی سی پٹی تھی جو ابھی تک چاندنی میں تھی۔ مگر یہ ایسی جگہ تھی کہ جب تک چاند پہاڑ کے پیچھے نہ چلا جاتا تب تک یہاں روشنی رہتی اور جب چاند غروب ہو جاتا تو مجھے صبح کی روشنی کا انتظار کرنا پڑتا جب کہ میرا ارادہ تھا کہ روشنی ہونے سے پہلے ہی میں اس جگہ سے نکل جاؤں گا۔ اس لیے میں نے اس پٹی کو چاندنی میں ہی عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ یعنی رسک لیا، اگر کوئی یہاں موجود تھا تو اس کا امکان تھا کہ وہ مجھے دیکھ لے گا۔ میں نے ہر ممکن تیزی سے کام لیا اور جسم جھکا کر بھاگتا ہوا درختوں کے درمیان پہنچ گیا۔ تاریکی میں آنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا تو ادا کے روشن حصوں میں کوئی حرکت نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ میں مخالف سمت کی ڈھلانوں کی طرف دیکھ رہا تھا وہاں چاند کی روشنی تھی اور کسی حد تک منظر واضح تھا۔ جب کہیں سے کوئی حرکت محسوس نہیں ہوئی تو میں محتاط اور خاموش قدموں سے شمال مشرقی ڈھلان کی طرف بڑھا۔

نیم دائرے میں گھومتے ہوئے میں آدھے گھنٹے میں اس ڈھلان تک پہنچ گیا۔ یہیں وہ آخری معرکہ ہوا تھا جس میں برٹ شا اپنی جان سے گیا تھا اور فتح خان کا منصوبہ ناکام رہا تھا جب اس نے ایمن کو اغوا کر کے اس کی مدد سے برٹ شا سے ہیرے نکلوانے کی کوشش کی اور اس کے ایک ساتھی نے غلطی سے برٹ شا کو گولی مار دی تھی اس پر فتح خان نے غصے سے پاگل ہو کر اپنے ساتھی کو گولی مار دی تھی۔ اس کے باوجود اسے اتنا ہوش تھا کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا کیونکہ آخری وقت میں، میں ہی برٹ شا کے قریب تھا اور فتح خان کو شبہ تھا کہ اس نے مجھے ہیروں کی لوکیشن کے بارے میں بتایا ہے اور یہ سچ تھا۔ برٹ شا نے میری رہنمائی کر دی تھی اور میں جان گیا تھا کہ ہیرے کہاں ہیں؟ مگر میں نے فتح خان کو نہیں بتایا تھا کیونکہ مجھے شبہ تھا کہ وہ ہیرے حاصل کرنے کے بعد مجھے مار دے گا۔ اب تک وہ صرف ان ہیروں کی خاطر بدترین حالات میں بھی مجھے مارنے سے گریز کرتا آیا تھا۔ ہیرے حاصل کرنے کے بعد اس کی مجبوری ختم ہو جائے گی اور پھر شاید وہ مجھے نہ بھشتا۔

ہیرے اسی ڈھلان پر ایک درخت کے تنے میں پوشیدہ تھے۔ جب فتح خان نے ایمن کو بارودی چیکنٹ پہنا کر ایک طرح سے ریغمال بنا لیا اور اس کا تادان طلب کیا تو میں ان ہیروں کے چکر میں یہاں آیا تھا اور میں انہیں درخت کے ساتھ زمین اور جڑوں میں تلاش کرتا رہا۔ میں بے خبر تھا کہ فتح خان بمعہ اپنے ساتھیوں کے میرا تعاقب کرتا ہوا وادی تک آیا ہے اور اس کے ایک ساتھی کی غلطی سے مجھے اس کی موجودگی کا علم ہو گیا اور میں نے ہیروں کی جگہ جان لینے کے باوجود انہیں وہاں سے نکلانے سے گریز کیا تھا۔ میرا پاؤں ایک درخت کی کھوکھلی ہو چکے والی جڑوں کے خلا میں چلا گیا تھا اور تب میں سمجھا تھا کہ ہیرے اس میں ہیں۔ اتفاق سے سب سے بڑے تنے والا درخت بھی تھا۔ جڑ کے خلا میں تلاش کے لیے میں شاخ توڑنے کے لیے تنے پر چڑھا تھا تب میں نے تنے میں موجود سوراخ میں ہیروں والا سیاہ بکس دیکھا تھا۔ اب مجھے اسی درخت کو تلاش کرنا تھا۔

جب میں شمال مشرقی ڈھلان تک پہنچا تو وہاں ترجمچی پڑنے والی چاندنی کی وجہ سے کسی قدر اجالا تھا۔ اسی اجالے کے انتظار میں، میں نے اتنا وقت گزارا تھا۔ میں مصنوعی روشنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے اس درخت کی تلاش تھی۔ اس ڈھلان پر وہ سب سے بڑے تنے والا درخت تھا اور پہلے میں نے رستی کی مدد سے تنے کی موٹائی تاپی تھی مگر اب میرے پاس رستی نہیں تھی اور اس کی جڑوں میں موجود گڑھا بھی یقیناً غائب ہو گیا ہوگا۔ اس لیے مجھے اندازے سے اپنا کام کرنا تھا۔ میں درختوں کو دیکھ رہا تھا اور ان کے تنوں کو جانچ رہا تھا۔ لیکن میں اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مذکورہ درخت کون سا ہو سکتا ہے۔ مہینوں پہلے ہونے والی بات یاد رکھنا آسان نہیں تھا۔ ہر وہاں سب درخت ایک جیسے اور ایک ہی نسل کے تھے۔ سب بہت بڑے تھے۔

صرف دیکھ کر اندازہ کرنا بہت مشکل تھا اس لیے میں نے آسان طریقہ نکالا اور تنوں پر سوراخ تلاش کرنے لگا۔ مجھے یاد تھا کہ وہ سوراخ کسی قدر بلندی پر تھا اور مجھے ذرا اوپر ہونا پڑا تھا تب میرا ہاتھ وہاں تک گیا۔ جب میں نے شاخ توڑنے کے لیے ہاتھ اوپر کیا تھا وہ شاید آٹھ فٹ کی بلندی پر تھی اور میں ذرا اوپر چڑھا تھا اب میں نے وہ سوراخ دیکھا اور اس میں ہیروں والا سیاہ بکس بھی دیکھا۔ مجھے یہ یاد تھا کہ درخت درمیانی علان پر اور سوراخ کا رخ ڈھلان کی طرف تھا اس لیے مجھے پورے تنے کو نہیں دیکھنا پڑا تھا مگر ہر درخت کے تنے کو دیکھنا پڑ رہا تھا۔ درمیانی ڈھلان پر درختوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی اور ان سب کو کم وقت میں دیکھنا

آہ نہیں تھا جب کہ چاند کی روشنی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ کئی درجن ناکامیوں کے بعد مجھے جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں یہاں کیوں آیا؟ مجھے ہیروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فتح خان ان کے پیچھے پاگل تھا اور اب میں ان کے چکر میں یہاں چلا آیا تھا۔ میں ہیروں کے پیچھے نہیں بلکہ فتح خان کی کمزوری اپنے ہاتھ میں لینے آیا تھا۔ ایک آفراس نے مجھے کی تھی اور ہیرے حاصل کر کے میں اسے ایک آفر کرتا، مگر ہیرے تھے کہ مل کر نہیں دے رہے تھے۔ ناکامی نے مجھے بیزار کرنا شروع کر دیا تھا۔

کچھ دیر میں روشنی کم ہونے لگی۔ اب تنے واضح نظر نہیں آرہے تھے اور سوراخ دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاتھ مار کر ٹٹولنے سے کیڑے کوڑے مجھ پر چڑھ رہے تھے اور ظاہر ہے کاٹ بھی رہے تھے۔ ایک تو خاصا زہریلا تھا اس کے کاٹنے سے باقاعدہ سوزش ہونے لگی۔ پھر آدھے گھنٹے بعد چاندنی مکمل طور پر بند ہو گئی اور مجھے اپنی تلاش روکنی پڑی تھی۔ میں ایک چٹان سے لگ کر بیٹھ گیا اور تھرماس سے ٹھنڈی ہو جانے والی چائے نکال کر پی جواب بد ذائقہ بھی ہو گئی تھی مگر میرے پاس پینے کے قابل یہی ایک چیز تھی۔ پانی یہاں سے خاصے فاصلے پر تھا اور میں ندی کی طرف اسی صورت میں جانا چاہتا تھا جب میرے پاس ہیروں والا کس ہوتا۔ کچھ دیر آرام کے بعد میں نے نئے سرے سے کمر کسی اور اس بار ایمر جنسی لائٹ جلا کر تنوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی روشنی محدود تھی اور امید تھی کہ وہ دور سے نظر نہیں آتی۔

میں تنوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک تنے کی نئی نکلنے والی شاخ کے اوپر مجھے غلا سا دکھائی دیا۔ یہ تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی پر تھا اور اسی سمت میں تھا جس سمت میں ہمیں نے سوراخ دیکھا تھا۔ شاخ تقریباً ڈیڑھ فٹ تک نکل آئی تھی اور اس کے عین اوپر موجود خلا اسی وجہ سے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے تنے کے ساتھ ابھری جڑوں پر پاؤں رکھا اور اچک کر اوپر ہوا تھا۔ غلاب واضح تھا۔ میں نے پہلے اندر کی طرف روشنی کی تاک کوئی کیڑا کوڑا ہوتو نکل جائے اور پھر دھڑکنے والے دل کے ساتھ اندر ہاتھ ڈالا۔ میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا اور میں اسے ٹٹول رہا تھا کہ اسی لمحے عقب سے تیز روشنی مجھ پر آئی اور فتح خان کی منحوس آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ”شباباش شہباز خان، بالآخر تم یہاں تک پہنچ گیا..... اپنی جگہ سے ہٹنا مت اپنا ہاتھ آہستہ سے باہر لاؤ..... شباباش..... تم میرا رائفیل کے نشانے پر ہے۔“

”فتح خان۔“ میں نے سکون سے کہا اگرچہ اندر سے میں اتنے سکون سے نہیں تھا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے میں نے ہیرے نہیں کچھ اور تلاش کیا ہے۔“

”اپنا ہاتھ باہر لاؤ۔“ فتح خان نے لکار کر کہا۔ اس کے بارے میں میرا خدشہ بالآخر ہمیشہ کی طرح بچ نکلا تھا۔ وہ یوں میرے تعاقب میں تھا کہ میں اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکا مگر مجھے کامیابی کے قریب پا کر وہ سامنے آ گیا تھا۔ اس کے حکم پر میں اپنا ہاتھ آگے لایا اور مڑا۔ روشنی بہت تیز تھی اور میرے ہاتھ میں موجود چیز نمایاں تھی۔ فتح خان نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کا موڈ آف ہو گیا۔ ”شہباز خان یہ کیا ہے؟“

”اسے انڈہ کہتے ہیں۔“ میں نے کہا اور انڈہ واہس سوراخ میں رکھنے کے لیے مڑا تھا کہ اوپر سے ایک غیر انسانی چیخ سنائی دی۔ اسی لمحے میرے پیر تلے جڑیلی اور اچانک اس میں خلا آیا جس میں میرا پاؤں گیا تھا میں نیچے گرنے لگا تھا کہ عقب سے برسٹ چلا اور میرے پہلو میں شدید ٹیس لگی تھی۔



بچے کرتے ہوئے میرا پہلو تھنے کے ایک کسی قدر ابھرے اور بہت زیادہ کھر درے حصے سے ٹکرایا اور اس نے میرا پہلو چمیل دیا تھا۔ مزید یہ کہ پاؤں خلا میں گیا اور گرنے سے مڑا۔ اس میں بھی شدید ٹیس اٹھی تھی۔ ان دو جگہوں پر درد کی وجوہات واضح تھیں اس کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ فتح خان کے چلائے برست نے مجھے چھوڑا تھا یا نہیں۔ بعض اوقات گولی کا زخم ذرا دیر سے اپنا احساس دلاتا ہے۔ میں خود کو ٹٹول رہا تھا۔ اتنے میں فتح خان کی آواز آئی۔ ”شہباز تم ٹھیک ہے؟“

”گولی چلا کر پوچھتے ہو کہ ٹھیک ہے؟“ میں نے خشکی سے کہا۔ اس دوران میں، میں نے تسلی کر لی تھی کہ مجھے گولی نہیں لگی ہے۔

”تم کو نہیں اس خانہ خراب اُلو کو گولی ماری ہے جو تم پر بھٹ رہا تھا۔“ فتح خان نے وضاحت کی۔ ”اب تم آرام سے اپنا پستول اور شاٹ گن سامنے بھینک دو۔ جلدی مت کرنا ورنہ جلدی مر جاؤ گے۔“

مجھ پر دو طرف سے روشنی پڑ رہی تھی یعنی فتح خان کے ساتھ کم سے کم ایک آدمی اور بھی تھا۔ مجھے ان دونوں میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا ایسے میں کسی قسم کا رسک لینا بالکل مناسب نہیں تھا۔ میں نے پہلے شانے سے شاٹ گن اتاری اور آگے بھینک دی۔ پھر پستول بھی نکالا اور اسی سمت اچھال دیا۔ میرا پاؤں خلا میں بری طرح پھنسا ہوا تھا اور میں نے اندر ہاتھ ڈال کر بہ مشکل کھینچ کر اپنا پاؤں خلا سے نکالا۔ مگر مزید حرکت سے گریز کیا تھا۔ میرے سامنے فتح خان جیسا وحشی تھا جس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کب کیا کر گزرے؟ کوئی آگے آیا اور اس نے میرے پھینکے ہتھیار اٹھا لیے۔ فتح خان نے کہا۔ ”اب دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو جاؤ۔“

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہی آدمی آگے آیا اور اس نے میری تھلائی لے کر پرس، موبائل اور جیب کی چابیاں قبضے میں لے لیں۔ میں نے کہا۔ ”فتح خان تم نے بیکار میں زحمت کی میں تمہارے ہی کام سے آیا تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے تم میرا لینے آیا تھا کہ لے کر میرا خدمت میں پیش کر دو؟“ فتح خان نے عیاری سے کہا۔ ”تم فتح خان کو اتنا بے وقوف سمجھتا ہے؟“

”میں نے تمہیں کبھی بے وقوف نہیں سمجھا اور جہاں تک میرے پیش کرنے کی بات ہے تو میں وہ تمہیں ہی دیتا مگر ایک شرط کے ساتھ۔“

”کیسا شرط؟“

”مرشد سے میری جان چھڑا دو۔“

”تمہارا مطلب ہے مرشد کا مرڈ؟“

”یہ میں تم پر چھوڑ دیتا، تم جیسے مناسب سمجھتے یہ کام کرتے اور ہیروں کے لیے تم درجنوں جانیں پہلے ہی لے چکے ہو۔“

”جب میں نے تم کو آفر کیا تو تم نے انکار کر دیا اس وقت تم فتح خان سے انتقام کی بات کر رہا تھا۔“ اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

”فتح خان بیٹو کا حساب باقی ہے اور وہ بھی بے باق ہو گا مگر ابھی میں مجبور ہوں۔“

”ہاں تم میرے ہاتھ آگیا ہے۔“ فتح خان نے کہا۔ ”اب تم کیا کرے گا؟“
 میں نے شانے اچکائے۔ ”کچھ نہیں، میں بے بس ہوں جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے۔“
 ”تم نے ٹھیک جگہ ہاتھ ڈالا؟“ فتح خان نے سوال کیا۔

”نہیں اس میں صرف گھونسلہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب وہ بھی نہیں ہے میرا خیال ہے یہ اسی اُلوکا گھونسلہ تھا جسے تم نے مار دیا۔ باقی تم خود دیکھ لو۔“

”جلال دیکھو۔“ فتح خان نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ وہ آگے آیا اور اس نے سوراخ میں ہاتھ مارا۔ اُلوکود سے گھونسلے نہیں بناتے ہیں بلکہ کسی درخت کے سوراخ میں بسیرا کرتے ہیں یا کسی اور پرندے کے بنے بنائے گھونسلے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ سوراخ میں اُلونے گھونسلے کو آرام دہ بنانے کے لیے خاصا کچرا جمع کیا ہوا تھا اور اس میں انڈے دیئے تھے۔ جلال نے وہ انڈے بیدردی سے باہر پھینک دیئے ویسے بھی اب انہیں خراب ہی ہونا تھا کیونکہ مادہ اُلومر چکی تھی۔ ایک بار روشنی گھومی تو میں نے اس کے ٹکڑے جانے والے جسم اور پروں کی باقیات دیکھی تھیں برسٹ نے اس کے چھتڑے اڑا دیئے تھے۔ انڈوں کے بعد جلال نے گھونسلے کا بقیہ حصہ بھی نکال دیا اور اندراجمی طرح ہاتھ مارنے کے بعد بولا۔ ”خان ادھر کچھ نہیں ہے۔“

فتح خان پشتو میں غریبا اور یہ غراہٹ ناقابل اشاعت تھی۔ اس نے بیک وقت سوراخ اور ہیروں کی شان میں مدح سرائی کرتے ہوئے جو کہا تھا اسے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”شہباز وہ ہیرا کدھر ہے؟“

”میں تو خود تلاش میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب تک کامیابی نہیں ملی ہے۔“
 ”تو تلاش کرو جب تک کامیاب نہیں ہو جاتے۔“ فتح خان نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”اگر تلاش نہیں کر سکتے تو مر جاؤ گے۔ میں تیرے کو اسی وادی میں دفن کر جائے گا۔ جیسے مجھے ہیرا نہیں ملا اسی طرح تمہارے ساتھیوں کو تم نہیں ملے گا۔“

اس دوران میں چاند کی رہی سہی روشنی بھی ختم ہو چکی تھی مگر اب روشنی کی مجبوری بھی ختم ہو گئی تھی۔ فتح خان اور اس کے ساتھی کے پاس تیز روشنی والی نارچیں تھیں۔ ”مجھے تو خدشہ ہے کہ تم ہیرے مل جانے کے بعد بھی میرے ساتھ یہی سلوک کرو گے۔“

”ابھی میں تم کو کوئی ضمانت نہیں دے سکتا اس لیے کام شروع کرو۔“

”میرے پاؤں میں چوٹ آئی ہے۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ویسے ٹیس لگاتی تھی اور اب میں سکون میں تھا یعنی ٹخنے کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ مگر میں نے فتح خان سے کہا۔ ”میں آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا۔“

”شہباز خان تمہارا آواز بتا رہا ہے تم تکلیف میں نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ میں جلال کو بولوں بہتر ہو گا تم حرکت میں آجائے۔“

بادل ناخواستہ میں حرکت میں آیا اور ہم نے نارچوں کی روشنی میں تنوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ روشنی فتح خان دکھا رہا تھا اور ہم تنے دیکھ رہے تھے۔ فتح خان نے کہا۔ ”مجھے یقین تھا کہ اس گورے حرامی نے تم کو ہیروں کا

جگہ بتایا ہوگا اور تم جانتا ہے کہ میرے کہاں ہیں؟“

”برٹ شانے صرف اشارہ دیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے مرنے سے پہلے شمالی ڈھلان اور سب سے بڑے تنے کے الفاظ کہے تھے۔“

”تمہارا مطلب ہے تم ہیروں کی صحیح جگہ کے بارے میں نہیں جانتا؟“

”ظاہر ہے میں جانتا تو یوں ہر درخت کا تانہ چیک کر رہا ہوتا۔ اسی درخت سے ہیرے حاصل کر لیتا جہاں برٹ شانے چھپائے تھے۔ میری معلومات بس اسی حد تک ہیں۔“

”شہباز خان۔“ فتح خان کی آواز شک سے لبریز تھی۔ ”تم جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔“

”تم میرے الفاظ مت سنو میرا عمل دیکھو۔“ میں نے کہا۔ ”میں بلاوجہ تو تے ٹوٹا نہیں پھروں گا؟“

”ہوسکتا ہے تم کو میری موجودگی کا شک ہوا ہو اور تم مجھے دھوکا دینے کے لیے ایسا کر رہا ہو۔“

”فتح خان شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ بہر حال میں ایک بار پھر تمہارے قبضے میں ہوں اور تم اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہو۔“

فتح خان خاموش ہو گیا اور ہم تنے دیکھتے رہے۔ جلال خود دیکھ رہا تھا مگر میرے ساتھ فتح خان لگا ہوا تھا، جب میں کسی تنے کو چیک کرتا تو وہ بھی دیکھتا تھا۔ ظاہر ہے اسے مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ اس لیے میرے سر پر موجود تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں راجا عمر دراز کے پاس جا رہا ہوں۔“

”بس پتا چل گیا۔“ اس نے عیاری سے کہا۔ ”تم کیا سمجھتا ہے کہ فتح خان کی نظروں سے بچ جائے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ اتفاق ہے۔“ میں نے جوابی عیاری کا مظاہرہ کیا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ فتح خان ہمارے ٹھکانوں سے واقف ہو گیا تھا۔ کم سے کم فیض آباد والی کوٹھی سب کی نظروں میں تھی اور عین ممکن ہے کہ فتح خان بھی اس جگہ سے واقف ہو۔ ایک یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ اس لحاظ سے ہم سب کا اس جگہ سے نکل جانا بہتر تھا میں امید کر سکتا تھا کہ ہمارے نئے ٹھکانے سے دشمن ناواقف ہوں گے۔ میں نے موضوع بدل دیا۔ ”فاضلی کا انجام تم جان گئے ہو گئے؟“

”ہاں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”پہلے ڈیوڈ شانے مجھے قربانی کا بکرا بنانے کا کوشش کیا مگر میں نے انکار کیا تو اس نے فاضلی کو پکڑ لیا۔“

”فتح خان جو کام وہ فاضلی سے لے سکتا تھا وہ تم سے نہیں لے سکتا تھا۔“

”کیوں نہیں لے سکتا۔ میں فاضلی سے زیادہ مرشد کو جانتا ہے۔ اس کی ساری خوبی خامی کا مجھ کو پتا ہے۔ پر مجھے معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا آگے کیا کرے گا؟“

”تم کو کیسے معلوم ہوا؟“

”دیکھ شہباز خان! سید حساں بات ہے۔ فاضلی اور مجھ جیسا بندہ ہزار ملتا ہے۔ پر تم اور مرشد خان ہر کوئی نہیں ہوتا ہے۔ ڈیوڈ شا اس گورا کی اولاد ہے جو یہاں سو سال حکومت کر کے گیا اور اسے مرشد جیسے لوگوں کا قدر خوب ہے۔“

”مجھ میں اور مرشد میں فرق ہے۔“

”ہاں وہ بہت برا ہے اور تم بہت اچھا ہے۔“ فتح خان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

”نہیں میری مراد کلاس سے ہے۔ مرشد الگ کلاس کا آدمی ہے یہ کلاس آزادی کے بعد بھی انگریزوں کی غلام رہی ہے لیکن میری کلاس متوسط طبقہ کی ہے۔“

”ہاں پر انگریز میں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ آدمی کی صلاحیت کی قدر کرتا ہے۔ اسے استعمال کرتا ہے۔“

میں ہنسا۔ ”تم بھی انگریزوں سے بہت متاثر لگ رہے ہو۔“

”سچ ہے۔“ وہ بولا۔ ”شہباز خان ذرا تیز کام کرو۔“

”اب تمہیں کس بات کی جلدی ہے؟“

”جلدی ہے۔“ وہ بولا۔ ”جتنا دیر ہوگا تمہاری طرف سے اتنا ہی خطرہ بڑھتا جائے گا۔“

دو گھنٹے میں ہم نے شمالی ڈھلان کے درمیان میں سارے ہی تھے دیکھ لیے تھے اور کہیں بھی کسی تھے میں سوراخ نہیں ملا تھا۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”اب ہمت نہیں ہے کچھ دیر آرام کرنے دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ فتح خان مان گیا مگر کیسے اس نے جلال کو حکم دیا۔ ”اس کا ہاتھ پاؤں باندھ دو۔“

جلال نے اپنے پاس سے جدید قسم کی ہلکی فولاد اور فائبر کی بنی ہوئی جھکڑی اور بیڑی برآمد کیں۔ اس نے میرے ہاتھوں پیروں کو ان سے جکڑ دیا۔ ایسا لگ رہا تھا فتح خان میرے حوالے سے پوری تیاری کر کے آیا تھا۔ مسلسل حرکت میں رہے تھے تو خنکی کا احساس نہیں تھا مگر بیٹھے تو سردی لگنے لگی۔ اس کا علاج انہوں نے آگ جلا کر کیا۔ ویسے بھی اب انہیں کسی کے دیکھ لینے کا خطرہ نہیں تھا۔ میں ایک درخت کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور پھر سو بھی گیا۔ آگ کی حرارت سے خنکی کا احساس ختم ہو گیا تھا پھر میری آنکھ چائے کی خوشبو سے کھلی۔ جلال راگھو جانے والے انگاروں پر چھوٹی سی کیتلی میں چائے بنا رہا تھا۔ فتح خان نزدیک ہی خزانے لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہوٹل والے لڑکے نے اس کے ساتھ کسی خوب صورت عورت کا ذکر کیا تھا اور وہ اس کھر درے اور برچھے قسم کے مرد کو لے آیا تھا۔ وہ عورت کہاں تھی؟ شاید فتح خان اسے کہیں چھوڑ آیا تھا۔

روشنی ہونے پر میں نے جلال کو ٹھیک سے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی مگر جسامت اور چہرے کے نقوش ایسے تھے کہ اسے چالیس کا بھی تسلیم کیا جاسکتا تھا۔ اس نے سیاہ ملیشیا کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور اوپر گرم چادر تھی۔ کیونکہ اب خنکی نہیں رہی تھی اس لیے چادر تہہ ہو کر ایک شانے پر آ گئی تھی۔ اس نے بغلی ہو لشر پہن رکھا تھا جس میں پستول تھا۔ وہ انگاروں کو کریدتے ہوئے پشتوں میں کچھ گنگنا رہا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھا تو وہ چونک گیا۔ میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ ”چائے ملے گی؟“

”کیوں نہیں ملے گی۔“ اس نے کہا اور اپنے تھیلے سے فائبر کا بنا ہوا غیر ملکی مگ نکالا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا تھا اور یقیناً اسمگل ہو کر آیا تھا۔ شمالی علاقے میں پچاس فیصد اشیائے ضرورت اور سو فیصد اشیائے تفریح اسمگل ہو کر آتی ہیں۔ اس نے گرم چائے مگ میں ڈال کر مجھے دی۔ مگر ساتھ ہی وہ پوری طرح ہوشیار بھی تھا اس نے دور رہ کر مگ مجھے تھمایا اور پھر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے بجا طور پر خدشہ تھا کہ کہیں میں گرم چائے اس پر پھینک کر اسے قابو کرنے کی کوشش نہ کروں؟ سچی بات ہے میرے ذہن میں خیال آیا تھا کیونکہ فتح خان سورہا تھا اور میں

ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود کوشش کر سکتا تھا مگر جلال کی احتیاط نے میرے خیال کو خیال ہی رہنے دیا میں اسے حقیقت میں نہ بدل سکا۔ بہر حال قیدی ہونے کے باوجود گرم چائے مل گئی جس کی اس وقت شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ میں نے اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا اور بہت لطف اٹھایا۔ یہی چائے گھر میں ناشتے کی میز پر ایک بھر پور اور پر لطف ناشتے کے بعد وہ مزہ ہرگز نہیں دیتی جو اس نے اس وقت دیا تھا۔ کچھ دیر بعد فتح خان بھی ایک انگڑائی کے ساتھ اٹھ گیا اس نے میری طرف دیکھا۔

”تم زندہ ہے شہباز خان اس کا مطلب ہے تم نے مرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”میں نے کبھی مرنے کی کوشش نہیں کی ہمیشہ زندہ رہنے کی کوشش کی ہے۔“

”شاید اسی لیے تم زندہ ہے۔“ فتح خان بولا اور اس نے اٹھ کر اپنے لیے چائے نکالی۔ ”تم میں اور مجھ میں

یہ بات ایک جیسا ہے۔ میں بھی زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”لیکن تم مٹھی بھر بے جان ہیروں کی خاطر بے شمار بار مرنے کے قریب پہنچ گئے تھے۔“

”میں نے دنیا میں دو ہی چیزوں سے پیار کیا ہے۔ ایک اب دنیا میں نہیں ہے اور دوسرا یہ ہیرا ہے۔“ میں

سمجھ رہا تھا وہ شینا کی بات کر رہا ہے جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے مار دیا تھا اور اس کی ٹوپی میرے سر رکھنے کی

کوشش کی تھی۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا۔ ”ویسے تو تم بھی بہت بار موت کے منہ میں جا کر واپس آیا ہے۔“

”ہاں لیکن اپنے کسی مفاد کی خاطر نہیں، ہاں اپنے کسی پیارے کی خاطر یا دشمنوں نے مجبور کیا ہو تو ایسا ہوا

ہے۔“

جلال نے چائے کے بعد اپنے تھیلے سے روغنی نان نکالے اور ایک ایک سب میں تقسیم کیا۔ ہم نے چائے

کے ساتھ یہ نان کھائے اور ناشتا مکمل کیا۔ بیچ جانے والی چائے انصاف سے ایک بار پھر ہم تینوں میں تقسیم ہوئی

اور فتح خان نے مجھ سے کہا۔ ”برٹ شانے تم کو بتایا کہ ہیرا ادھر ہی کہیں ہے؟“

”میں نے بتایا کہ اس نے مجھے دو اشارے دیئے تھے اور یہ بھی اس کی مجبوری تھی ان درختوں پر نمبر تو

لکھے نہیں ہیں کہ وہ کہتا فلاں نمبر کے درخت میں چھپائے ہیں۔ پھر درختوں کی کوئی واضح نشانی بھی نہیں ہے اس

لیے اس نے شمالی ڈھلان کے سب سے بڑے تنے والے درخت میں ہیرے چھپا دیئے۔ مرتے ہوئے اس

نے مجھے یہی نشانیاں بتائیں۔ میں اسی لحاظ سے تلاش کر رہا تھا کہ تم نے غلط وقت پر انٹری دی۔“

”ہم سمجھا تم نے ہیرا تلاش کر لیا ہے۔“ فتح خان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”جلال اسے کھول دو ہم

اب ہیرا تلاش کرے گا۔“

”تمہیں یاد ہے ہم رات کون سا حصہ دیکھ چکے تھے؟“

”یاد ہے پر اب دن میں سب شروع سے دیکھ گے۔“ فتح خان نے کہا۔ ”اب ہم طریقے سے تلاش کرے

گا۔ جو درخت ایک بار چیک کر لے گا اس پر نشان لگا دے گا۔“

”لیکن اس میں بہت وقت لگے گا۔“

”بے شک لگے، تمہارا کون سا فلاٹ چھوٹ رہا ہے۔“ اس نے چالاکی سے کہا۔ ”ہم بھی فارغ ہے

تو کیوں نا وقت کا اچھا استعمال کیا جائے۔“

میں نے اس کی وقت کے لیے قدر شناسی کی دل ہی دل میں داد دی۔ جلال نے میرے پاؤں اور پھر ہاتھ کھول دیے۔ فتح خان نے بہ ظاہر بے پروائی سے لیکن درحقیقت پوری چوکسی کے ساتھ پستول نکال لیا تھا۔ وہ مجھ پر ذرا بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شمالی ڈھلان کوئی پون کلومیٹر لمبی اور اوپر سے نیچے تک کوئی نصف کلومیٹر چوڑی تھی اور اس میں بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں بلند و بالا درخت تھے۔ ان سب کو نئے سرے سے دیکھنے میں کئی دن کا وقت لگ سکتا تھا۔ مگر فیصلہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ فتح خان نے پوری ڈھلان کی چھان بین کا فیصلہ کیا تھا اس لیے ہم نے ایک سرے سے شروع کیا۔ جلال نیچے وادی سے ایک سفید چوٹے جیسا پتھر لے آیا تھا اسے کسی چیز پر گڑا جاتا تو یہ سفید نشان چھوڑتا تھا اس سے نشان لگانے کا کام لیا جانے لگا۔ احتیاط کے طور پر فتح خان نے ایک وقت میں ایک درخت دیکھنے کی پالیسی اپنائی۔ ہم تینوں مل کر درخت دیکھتے تھے اور پھر فتح خان اس پر سفید پتھر سے نشان لگادیتا۔

سورج چڑھنے کے ساتھ ہی خشکی غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ہلکی سی گرمی کا احساس ہونے لگا خاص طور سے جہاں دھوپ ہوتی تھی وہاں چند سینکڑں میں دماغ گرم ہونے لگتا تھا اس لیے ہم سائے میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موسم گرم ہونے کے ساتھ خشک بھی ہو رہا تھا اس لیے بار بار پیاس لگ رہی تھی اور دو پہر تک ہم پانی کا ذخیرہ تقریباً ختم کر چکے تھے اس لیے فتح خان نے آرام کے وقفے کا اعلان کیا اور جلال کو پانی لینے والے کی طرف روانہ کر دیا۔ اب تک ہم کوئی دوسو درخت دیکھ چکے تھے اور یہ کل درختوں کا دس فیصد بھی نہیں بنتے تھے۔ جلال کے جانے کے بعد میں نے فتح خان سے کہا۔ ”اس عورت کو کہاں چھوڑا ہے جسے تم ساتھ لائے تھے؟“

وہ چونکا۔ ”تم کو کیسے پتا؟“

میں مسکرایا۔ ”میرے بھی ذرائع ہیں۔ اگر تم مجھ پر نظر رکھ سکتے ہو تو کیا میں تم پر نظر نہیں رکھ سکتا؟“ وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ ”شہباز خان تم بلف کر رہا ہے۔ تم نے فون پر عورت کا آواز سنا اور اب مجھے بے وقوف بنانا رہا ہے۔“

”آواز سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ بولنے والی کے بال گولڈن براؤن ہیں۔ قد تقریباً پانچ فٹ چار انچ اور وزن ساٹھ کلو گرام کے آس پاس ہے مگر اضافی وزن موزوں جگہوں پر ہے۔ اس نے نیلا شلوار سوٹ اور اس پر ہلکا نیلا دوپٹا لیا ہوا تھا۔“ میں نے ہوٹل والے لڑکے سے حاصل ہونے والی معلومات روائی سے بیان کیں۔ فتح خان تشویش زدہ نظر آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھ سے پوچھنے کا فائدہ نہیں ہے میں اسے سچ نہیں بتاؤں گا۔ مگر اسے خیال ضرور ہوگا کہ میرا کوئی ساتھی اس کے پیچھے تھا اور اسی نے مجھے یہ ساری معلومات فراہم کی ہوں گی۔ میں معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا اور فتح خان کے خدشات کو تقویت دے رہا تھا کہ اسی میں میری بہتری تھی۔ اب تک فتح خان مجھ پر مکمل حاوی تھا۔ مگر اس کی تشویش سے اس کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”ویسے خاتون ہے کون؟“

”تم کو میرا کزن یاد ہے تمہارا ہم نام تھا اور مرشد کے چکر میں مارا گیا تھا؟“

”بالکل یاد ہے غالباً اسی کی وجہ سے شہباز خان کا لفظ تمہارے منہ پر چڑھا ہے۔“

”کل شاد اسی کا بیوہ ہے۔“

”تم نے کرن کی بیوہ کو اپنی کھیل بنالیا؟“ میں نے ملاٹھ سے کہا۔
 ”نہیں وہ اب میرا بیوی ہے۔“ فتح خان نے اس لہجے میں کہا کہ اس رشتے کی حیثیت خود ہی واضح ہو گئی تھی۔

”تم اسے کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟“
 ”فتح خان کے پاس یہاں ٹھکانوں کی کمی نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”اسے ایک جگہ چھوڑا ہے۔“

”وہ تم سے ڈرتی ہے جب میں نے تمہارے نمبر پر کال کی اور اس نے ریسپونڈ کی تو پہلے تو فتح خان کو بچانے سے انکار کر دیا پھر بولی کہ تم سو رہے ہو اور اٹھایا تو مارو گے۔“
 ”فتح خان مسکرایا۔“ وہ سمجھا د عورت ہے ورنہ اس کے جسم پر میری چوٹ کا نشان رہتا۔ پر وہ پہلا عورت ہے جس پر اب تک میرا ہاتھ نہیں اٹھا ورنہ شہلانے بھی مجھ سے مار کھایا تھا۔“
 ”تم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

”بالکل ٹھیک کیا وہ اسی کا مستحق تھا۔ کیا تم نہیں جانتا کہ وہ کس قسم کا عورت تھا۔“
 ”عورت صرف عورت ہوتی اسے قسموں میں ہم مرد بانٹتے ہیں۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔
 ”تمہارے نزدیک عورت صرف جسم کا نام ہے۔“
 ”تم ٹھیک سمجھا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”فتح خان نے صرف ایک عورت کو عورت سمجھا اس کے بعد یہ میرے لیے بس جسم رہ گیا۔“

”غالباً گل شاد کا حشر بھی بھاگ بھری والا ہو گا۔“
 ”نہیں میرے ساتھ رہے گا پچھمچہ پیدا کرے گا۔ مجھے بھی تو اگلی نسل کا ضرورت ہے۔“
 میرے خیال میں تو اسے خاصی تاخیر ہو گئی تھی کیونکہ وہ پچاس سے اوپر کا تھا اور اگر اس عمر میں اس کا بچہ ہوتا تو امکان تھا کہ وہ اسے جوان دیکھے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو جائے۔ شراب کباب سے بے اعتدال شغل نے اسے نقصان پہنچایا تھا مگر اسے اصل خطرہ اپنے لاتعداد دشمنوں سے تھا جن میں سے ہر ایک اسے دنیا سے رخصت کرنا چاہتا ہو گا۔ اپنی نام نہاد بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم چھوڑ جاتا۔ شاید وہ اس معاملے میں تقدیر پر بھروسہ کرتا تھا کہ جیسے وہ ہل گیا اس طرح اس کے بچے بھی ہل جائیں گے۔ فتح خان نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔ ”تم راجا کے پاس کیوں جا رہا تھا؟“

”وہ بیمار ہے اس کی مزانج پڑی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے طبیعت کا معلوم کرنے جا رہا تھا۔“
 ”وہ ضدی آدمی ہے اس حال میں بھی تم کو ساتھ لے جانے کا بات کرے گا۔“
 ”ہو سکتا ہے۔“

”اگر اس نے کہا تو تم اس کے ساتھ چلا جائے گا؟“
 ”ہو سکتا ہے کیونکہ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ راجا عمر دراز کے مجھ پر خاصے احسانات ہیں۔“
 ”وہ اچھا آدمی ہے لیکن میرا جانی دشمن ہے میں اس کے ہاتھ آیا تو وہ مجھے مروادے گا۔“

”اس کی نظر میں تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے جو وہ خاص طور سے تمہیں تلاش کرائے، ہاں تم خود اس کے ہاتھ آگئے تو تمہارا بچنا مشکل ہوگا۔“

گفتگو کے دوران میں ہمیں خیال نہیں رہا۔ اچانک فتح خان چونکا۔ ”یہ جلال اب تک واپس نہیں آیا؟“

”ہو سکتا ہے اسے پانی ملنے میں دیر ہوئی ہو۔ اوپر کی طرف نالا تقریباً خشک ہو گیا ہے۔“

”پھر بھی اتنا دیر۔“ فتح خان نے کہا اور اپنے لباس سے ایک سیٹی نکال کر بجائی تو کسی پرندے جیسی آواز نکلی تھی۔ کچھ دیر آواز پہاڑوں میں گونجتی رہی پھر ختم ہو گئی۔ چند لمحوں کے وقفے سے فتح خان نے پھر سیٹی بجائی اور ساتھ ہی جلال خان کو ایک لقب سے نوازا جس میں اس کی والدہ کو ایک ناپاک جانور سے خلط ملط کیا تھا۔ دوسری بار بھی جواب نہیں ملا تو فتح خان چونکا نظر آنے لگا اس نے غرا کر مجھ سے کہا۔ ”کھڑے ہو جا۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ ”اور کوئی حکم؟“

”نالے کی طرف چلو۔“ فتح خان نے اشارہ کیا۔ ”میں تمہارے عین پیچھے ہوگا اور گولی مارنے میں ایک سیکنڈ کا دیر نہیں کرے گا۔“

”میرا قصور؟“

”ابھی تو نہیں ہے پر اگر جلال تیرا وجہ سے غائب ہوا تو پھر خیر نہیں ہوگا۔“ فتح خان نے واضح کیا۔ ”اب چلو۔“

میں ڈھلان کے ساتھ ساتھ نالے کی طرف بڑھا۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اور اس بیگار میں ناشتا کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”کلاشن کا گولی ملے گا۔“ اس نے رائفل کی نال گھمائی۔ ”کھائے گا؟“

”اگر تم بھی کھاؤ گے تو میں بھی کھا لوں گا۔“ میں نے گفتگو سے کہا مگر اندر سے میں فکر مند تھا۔ جلال کا غائب ہونا نیک شگون نہیں تھا۔ میں جانتا تھا میرے ساتھی قطعی بے خبر تھے کہ میں اس وقت کہاں ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ کوئی اور پارٹی بھی ہو اور فتح خان سمجھے کہ میرے ساتھیوں نے کچھ کیا ہے۔ راستے میں فتح خان نے دوبار اور پرندے کی آواز والی سیٹی بجائی اور حسب سابق جواب نہیں آیا۔ ہم نالے کے پاس پہنچے۔ اس بار فتح خان نے عقل مندی سے کام لیا اس نے مجھے آگے رکھا مگر خود آڑ میں ہو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”نالے میں دیکھو، پر بھاگنے کا مت سوچنا۔“

”میں سوچوں گا نہیں اگر موقع ملا تو عمل کروں گا۔“ میں نے کہا اور نالے میں اتر گیا۔ میں بھی محتاط تھا اور آواز پیدا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ وہاں اگر کوئی تھا تو ہماری آوازوں سے ہوشیار ہو جاتا۔ فتح خان سمجھ رہا تھا کہ وہاں میرے ساتھی ہو سکتے تھے اس لیے اس نے مجھے ڈھال اور پرغال کے طور پر آگے کیا تھا مگر میں جانتا تھا وہاں میرے کسی ساتھی کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا اگر وہاں کوئی تھا تو اس کے لیے میں اور فتح خان برابر ہوتے اور مجھے اس سے بھی خطرہ ہوتا۔ میرے لیے زیادہ بڑا خطرہ فتح خان تھا جو رائفل بدست میرے پیچھے موجود تھا اور کسی بھی گز بڑ کے موقع پر وہ دوسروں کے ساتھ مجھے بھی ٹھکانے لگانے کی پوری کوشش کرتا۔ اس سے پہلے ہیروں کے جائے وقوع کے بارے میں معلومات صرف میرے پاس تھیں لیکن اب یہ معلومات فتح خان تک پہنچ

گئی تھیں اور میں اس کے لیے پہلے جیسا ناگزیر نہیں رہا تھا۔ نالا یہاں تقریباً بیس بجپس گزرتک بالکل سیدھا تھا اور اس کے دونوں طرف گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نالے کے بالکل وسط میں پتلی سی لکیر کی صورت میں پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے جھک کر ہاتھوں کے پیلے سے پانی پیا اور آگے بڑھا۔ اچانک مجھے ذرا آگے پانی میں کوئی سیاہی چیز دکھائی دی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ یہ سیاہ رنگ کا تعویذ تھا جو سیاہی رنگ کی ٹوٹی ڈوری کے ساتھ تھا۔ یہ تعویذ یہاں گرا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا جلال کے گلے میں ایسا ہی سیاہ رنگ کا تعویذ تھا۔ یہ دھات کا تھا اور ڈوری سے لگ رہا تھا کہ اسے قوت سے کھینچا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ ٹوٹ گئی۔ میں نے مڑ کر فتح خان کو تعویذ دکھایا تو اس نے مجھے واپس آنے کا اشارہ کیا۔ میں واپس آ گیا۔ اب تک کسی طرف سے نہ تو مداخلت ہوئی تھی اور نہ ہی کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی دیئے تھے۔ فتح خان نے قریب آنے پر آہستہ سے کہا۔ ”شہباز یہاں تمہارا آدمی ہے۔“

”میرا کوئی آدمی اگر یہاں ہے تو میں اس سے بے خبر ہوں۔ ویسے لگ رہا ہے جلال کی حادثے کا شکار ہوا ہے۔“

”یہ تعویذ اسی کا ہے۔“ فتح خان نے تعویذ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”ادھر سے چلو یہاں خطرہ ہے۔“
 ”فتح خان تمہارا خیال ہے کہ یہاں میرے آدمی ہیں جب کہ میرا خیال مختلف ہے۔“
 ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم نے ان ہیروں کی بازیابی کے لیے جتنی کوششیں کیں ان سے یہ ہوا کہ یہاں ہیروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لوگ جاننے چلے گئے۔ کیا ان میں سے کوئی تمہارا چمچا کرتا نہیں آ سکتا؟“

”ہیروں کے بارے میں جتنے لوگوں نے جانا ان میں سے زیادہ تر اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔“
 ”لیکن کچھ نہ کچھ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان معاملہ بہت بڑی رقم کا ہے جب یہ ہیروں کے سالوں پہلے غائب ہوئے تو ان کی مالیت بچپس ملین ڈالرز تھی۔ یہ مالیت یقیناً اب کہیں زیادہ ہو گئی ہوگی۔ ایک اور شخص بھی ہے جو ان ہیروں کا دعویدار ہو سکتا ہے لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر آج تک ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔“
 ”ڈیوڈ شا۔“ فتح خان بولا۔ ”اسے ہیروں سے دلچسپی نہیں ہے۔“

”ایسا مت کہو تقریباً ڈھائی ارب روپے مالیت کے ہیروں میں کوئی فرشتہ ہی دلچسپی لینے سے انکار کر سکتا ہے۔ ڈیوڈ شا فرشتہ نہیں ہے۔“

”تب تم کو بھی دلچسپی ہونی چاہیے۔ تم بھی فرشتہ نہیں ہے۔“ فتح خان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ہم دونوں آگے بچھے اسی ڈھلان پر اوپر کی سمت جا رہے تھے اور میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اس طرف کیوں جا رہا تھا۔

”درست کہا۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن تم جانتے ہو میری جان دوسرے معاملات میں الجھی ہوئی ہے اور میں فی الحال کسی نئے چکر میں نہیں پھنس سکتا۔“

”تب تم یہاں کیوں آیا؟“

”میں بتا چکا ہوں میں ان ہیروں کی مدد سے تم پر دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے ان ہیروں سے کوئی

دلچسپی نہیں ہے۔“

دس منٹ میں ہم خاصی بلندی پر آ گئے تھے۔ یہاں پہنچ کر فتح خان نے مجھے زمین پر اٹے منہ لینے کا حکم دیا اور اپنے لباس سے ایک چھوٹی مگر طاقتور دور بین نکال لی۔ اب میں سمجھا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ اس جگہ سے وادی اور اس سے نکلنے والے نالے کا منظر بہتر طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ دور بین سے نیچے دیکھنے کے دوران میں وہ مجھ پر ٹھیک سے نظر نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے اس نے مجھے نیچے لینے اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھنے کا حکم دیا۔ میں نیچے لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے۔ فتح خان دور بین سے نیچے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”ممکن ہے ایسی کوئی چیز آنے والوں کے پاس بھی ہو اور وہ تمہیں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔“

”چپ رہو۔“ اس نے غرا کر کہا۔

”جب دشمن چھپا ہو اور سامنے آنے سے گریز کر رہا ہو تو سمجھ لو وہ تمہارے اعصاب آزار دہا ہے اور اس صورت میں کسی قسم کی غلبت یا بے مبری نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔“

”میں سمجھتا ہے۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ ”تم چپ نہیں رہ سکتا۔“

”ٹھیک ہے میں چپ ہوں۔ بلکہ اجازت ہو تو ذرا سو جاؤں رات بھی بس برائے نام نیند آئی تھی۔“

”میرا طرف سے ہمیشہ کی نیند سو جاؤ۔“ فتح خان نے بھنا کر کہا۔

”وہ میرے دشمن سوئیں۔“ میں نے کہا اور سچ بچ آ نکھیں بند کر لیں مگر اس پوز میں سونا بہت مشکل تھا۔ ذرا سی دیر میں میری گردن دکنے لگی تھی کیونکہ سارا زور اس پر آ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک فتح خان وادی کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اٹھنے کا حکم دیا۔

”شہباز خان۔“ اس نے مجھ پر نظر جما کر کہا۔ ”اگر یہ تمہارا آدمی ثابت ہو تو میں تم کو فوراً شوٹ کر دے گا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے کہا۔ ”اگر میرے آدمی میرے لیے کوشش کر رہے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے مگر میں ایک بار پھر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے آدمی نہیں ہیں۔“

”تب جلال کہاں ہے؟“

”مجھے کیا معلوم؟“

”تم کو معلوم ہے اس کا تعویذ بھی تم نے ڈھونڈا ہے۔“

”فتح خان اب تم پٹھان بن رہے ہو۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”مجھے تم جیسے ذہین آدمی سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔“

اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”یہ اس وقت کون خانہ خراب آ گیا ہے ٹانگ اڑانے۔“

فتح خان ایک بار پھر دور بین سے دیکھنے لگا اور چند منٹ بعد وہ چونکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں نے دیکھ لیا۔“

”کیا اور کہاں دیکھ لیا؟“

”ادھر چٹانوں میں کوئی ہے۔“ اس نے وادی کی وسطی کھنڈر نما چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔

”ممکن ہے کوئی جانور ہو۔“

”اس وقت وہاں جتنی گرمی ہوتا ہے کوئی جانور ادھر کا رخ نہیں کر سکتا۔ کیا تم کو پتا نہیں ہے۔“
وہ درست کہہ رہا تھا اچھے موسم میں بھی یہ چٹانیں دوپہر میں گرم ہو جاتی تھیں اور آج تو ویسے ہی خاصی گرمی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا مجھے دور بین دو گے؟“

اس نے دور بین میری طرف بڑھا دی۔ میں نے آنکھوں سے لگائی۔ دور بین سچ سچ خاصی طاقتور تھی کیونکہ تقریباً پون کلو میٹر دور چٹانیں جیسے آنکھوں کے سامنے آگئی تھیں۔ تقریباً دائرے میں اور کوئی تین سو میٹر قطر میں پھیلی یہ چٹانیں کسی زلزلے کا شکار ہو کر ایسا روپ اختیار کر گئی تھیں اور دور سے دیکھنے پر کسی قدیم شہر کے کھنڈرات کا منظر پیش کرتی تھیں۔ یہاں لبوترے بولڈرز پر مشتمل چٹانوں کی اونچائی دس سے پچاس فٹ تک تھی۔ یہ درمیان سے اونچی تھیں اور کناروں سے کم اونچی تھیں۔ مسلسل بارشوں اور موسموں کا شکار ہو کر یہ اب زیادہ تیزی سے شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھیں اور شاید کچھ عرصے بعد ان کا وجود ہی مٹ جاتا۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔ ”تم نے کس طرف حرکت دیکھی تھی؟“

”دائیں طرف جو نو کیلی چٹان نظر آ رہا ہے اس کے پاس۔“

میں نے دور بین اس طرف مرکوز کی اور تلاش کرنے لگا۔ اس طرف سورج کی روشنی زیادہ تھی اور وہاں معمولی سی چیز بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ دشمن ہی تھا تو اس نے نہایت احتقانہ حرکت کی تھی۔ اس وقت یہاں رہنا جہنم میں رہنے کے مترادف تھا اور پھر یہاں بے پناہ روشنی کی وجہ سے نظروں میں آنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ اتفاق ہے، دھوکا ہے یا پھر دشمن کی کوئی چال ہے۔ اچانک فتح خان نے مجھ سے دور بین واپس لے لی اور بولا۔ ”اُدھر چلو۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ عقل مندی نہیں ہوگی۔“

”اس وقت عقل کا بات مت کرو۔“ اس نے غرا کر کہا۔ ”اگر اُدھر کوئی موجود ہے تو وہ کل کا سورج دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔“

مجبوراً میں حرکت میں آیا اور ہم ڈھلان پر ایک دائرے میں گھومتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ پہلے اس جگہ پہنچے جہاں جلال والا تھیلا موجود تھا۔ نیچے آتے ہوئے فتح خان اور میں نے سیر ہو کر پانی پی لیا تھا۔ ہمارے پاس پانی رکھنے والی واحد چیز پلاسٹک ربڑ کی بوتل جلال لے گیا تھا اور وہ اسی کے ساتھ غائب تھی۔ جب ہم مغربی سمت پہنچے تو یہاں سے چٹانیں زیادہ دور نہیں تھیں۔ ان کی پیش یہاں تک آ رہی تھی۔ ان چٹانوں میں گرمی کا عالم سوچا جاسکتا تھا۔ مجھے کئی بار ان چٹانوں کی گرمی کا تجربہ ہو چکا تھا اور میرے خیال میں یہ نخلستان میں ایک چھوٹا سا صحرا تھا۔ یعنی اس نے محاورہ الٹا کر دیا تھا۔ فتح خان نے مجھے بے بس کرنے کے لیے ایک درخت کی شاخ سے جھکڑی لگا کر مجھے کہا۔ ”اے اپنا ہاتھ میں پہن لو۔“

انکار کا فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے خاموشی سے پہن لیا۔ یہ شاخ کوئی بہت مضبوط نہیں تھی میں اسے زڑ سکتا تھا مگر اس میں کچھ وقت لگتا اور فتح خان یہی وقت چاہتا تھا۔ اس نے پھر دور بین سنبھال لی۔ یہ جگہ بٹانوں سے کوئی دو سو فٹ اوپر تھی۔ فتح خان ایک چٹان پر اوندھے منہ لیٹ کر دور بین آنکھوں سے لگائے ہوئے نا اور اسے آہستہ حرکت دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چٹانوں کے درمیان کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ اب دو بج

رہے تھے اور پیٹ میں باقاعدہ چوہے دوڑنے لگے تھے۔ میں اپنے ساتھ جوزا و راہ لایا تھا وہ بھی ان لوگوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ میرا اسلحہ ان کے پاس نہیں تھا اس کا مطلب تھا وہ انہوں نے کہیں چھپا دیا تھا۔ ورنہ شات گن چھپانا مشکل کام تھا۔ پستول شاید فتح خان یا جلال کے پاس ہوتا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”فتح خان فرض کرو جلال کسی کے ہتھے چڑھ گیا ہے تو کیا اس نے ہمارے بارے میں زبان بند رکھی ہوگی۔“

”جلال پکا آدمی ہے وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔“

”فرض کرو جن لوگوں نے جلال کو قابو کیا وہ ہمارے بارے میں پہلے ہی جانتے ہوں گے۔“

”تب وہ ہمارے پیچھے کیوں نہیں آیا؟“

”ممکن ہے وہ صرف نگرانی کر رہے ہوں کہ کب ہم ہیرے حاصل کرتے ہیں اور جلال کسی غلطی سے ان

کے سامنے آ گیا ہو۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ جلال کو کسی غلطی کی وجہ سے پکڑا ہے۔“

”ہاں، ان کا ارادہ ہوتا تو جلال کے بعد ہمیں قابو کرنا کون سا مشکل کام تھا وہ کہیں بھی آرام سے ہمیں

ہینڈز اپ کرا لیتے۔ تم خود بتاؤ کیا دو تین چھپے مسلح افراد کا مقابلہ کر سکتے ہو۔“

”نہیں۔“ اس نے اقرار کیا۔ مگر اس نے اپنے انداز میں تبدیلی نہیں کی اور بدستور چٹانوں کی طرف دیکھتا

رہا۔

”اگر کوئی اس طرف موجود ہے تو یقین کر لو یہ ٹریپ ہے۔“

”چپ کرو میں بھی عقل رکھتا ہے۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ ”سارا عقل تمہارے پاس نہیں ہے۔“

”یہ تو ہے مگر میں اس کا استعمال ذرا فراخ دلی سے کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو استعمال کرنے سے عقل کم

نہیں ہوتی ہے۔“

اس گفتگو کے دوران میں، میں شاخ کی مضبوطی بھی آزما رہا تھا کہ اگر میں اسے توڑنا چاہوں تو یہ کام کتنی

دیر میں ہو جائے گا مگر یہ مضبوط سبز شاخ تھی اسے توڑنا آسان نہیں تھا کم سے کم فتح خان پر قابو پانے کے لیے توڑنا

ممکن نہیں تھا۔ اسے چوکنا ہونے کے لیے کافی وقت ملتا۔ البتہ کسی ہنگامی صورت حال میں، میں اسے چند سیکنڈ

میں توڑ سکتا تھا۔ فتح خان نے اس کا خیال رکھا تھا کہ میں سامنے نہ ہوں اس لیے اس نے مجھے درخت کے تنے کی

آڑ میں باندھا تھا۔ میں نے شاخ کو اس کی جڑ تک ٹٹولا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”فتح خان میرا مشورہ مانو

تو یہاں سے نکلنے کی کرو۔ اس کا خطرہ بہت زیادہ ہے کہ دشمن تمہاری موجودگی سے واقف ہے اور وہ تمہیں شکار

کرنے کے لیے ہانک رہا ہے۔ ایک بار تم اور میں اس کے ہاتھ آگئے تو شاید ہیرے تمہارے ہاتھ نہ آئیں۔“

”وہ کیسے؟“

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دیکھو میں اور تم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اگر ہم نے ایک

دوسرے کو مارنا ہوتا تو ایسے کتنے ہی مواقع آئے تھے جب ہم ایک دوسرے کو مار سکتے تھے مگر مصلحت نے ہمارے

ہاتھ روک لیے۔ ہر کوئی ایسا نہیں سوچتا ہے۔ اگر اس نے غلط دکھائی تو شاید ہم دونوں ہی مارے جائیں۔“

فتح خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ہیرے لیے بغیر نہیں جائے گا۔“

”فتح خان تم بچکانہ ضد کر رہے ہو اور اتنے بڑے خطرے کو نظر انداز کر رہے ہو۔ تم جلد فیصلہ کر لو میرے حساب سے اب زیادہ وقت نہیں رہا ہے سورج ڈوبتے ہی یہ لوگ حرکت میں آ جائیں گے اور ہم ان کے قابو میں ہوں گے۔“

فتح خان نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مشکوک لہجے میں بولا۔ ”تم کیسے جانتا ہے۔“

”میرا اندازہ ہے اور تم جانتے ہو میرا اندازہ اکثر درست نکلتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے پیچھے کون ہے مگر میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس میں ہیروں کے چکر میں ہے۔ اس کی تم سے کوئی براہ راست دشمنی ہے بھی تو وہ ہیروں کی خاطر تمہیں چھوٹ دے رہا ہے۔ ہاں جب تم اس کے قابو میں آ گئے اور اسے ہیرے لے لے یا نہ لے دوںوں صورتوں میں تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔“

”تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

”ہاں میں گیسوں کے ساتھ گھن کی طرح پسوں گا۔“ میں نے غنڈی سانس لی۔ ”حالانکہ گھن اصل میں تم ہو جو مجھے لگ گئے ہو۔“

فتح خان نے دور بین گلے میں لٹکائی اور ذرا پیچھے ہو کر چٹان پر لیٹ گیا۔ اس نے مجھے کھولنے کی کوشش نہیں کی اور تھیلے سے ایک روٹی نکال کر ایسے ہی کھانے لگا۔ میں نے کہا۔ ”بے شک تم مجھے باندھ کر رکھو مگر بھوکا رکنا کیسے کی ہے۔“

”ہم کمینہ آدی ہے۔“ فتح خان نے دانت نکالے مگر تھیلے سے ایک روٹی نکال کر مجھے بھی تھادی۔

”مجھے کھولو میں ایسے نہیں کھا سکتا۔“

”مت کھاؤ پرا بھی میں نہیں کھول سکتا۔“ اس نے انکار کیا۔ مجبوراً مجھے تنے سے نیک کر کے واحد ہاتھ سے روٹی کھانی پڑی تھی میں نے اسے گول کر کے رول کی شکل دے دی۔ اس طرح کھانے میں آسانی ہو رہی تھی۔ روٹی ختم کر کے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جو اپنے گناہ گار بندے کو ہر حال میں رزق دیتا ہے۔ اگرچہ ایک روٹی نے بھوک ختم نہیں کی تھی مگر پیٹ میں ہونے والی چوہا ریس ختم ہو گئی تھی۔ فتح خان بھی روٹی ختم کر کے سوتا رہا تھا۔ بظاہر اس نے میری بات کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کے رویے میں کوئی عجلت اور پرتوئی نہیں تھی۔

وہ مزے سے لمبی تان کر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”تم تقدیر پر ایمان رکھتے ہو؟“

اس نے طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے ادھر سکون سے ایسے ہی لیٹا ہوا۔“

”تب مجھے کس بات کی سزا ہے؟“ میں نے بھنا کر پوچھا۔

”یہ احتیاط ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”تم کھلا دشمن ہے اور سامنے ہے، تم کو آزاد کر دیتا ہوں۔“

لگتا ہے، جو دشمن سامنے نہیں اور آزاد ہے اسے اوپر والے پر چھوڑا ہوا ہے۔“

”وہی تمہیں جہنم رسید کرے گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کھولو ورنہ میں چلاؤں گا۔ میں اس طرح نہیں رہتا۔“

کھڑے تھک گیا ہوں۔“

حالانکہ میں خاص نہیں تھکا تھا۔ مگر فتح خان پر ظاہر کر رہا تھا کہ میں چل چل کر اور کھڑے رہ رہ کر تھک گیا

ہوں۔ فتح خان کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے ہتھکڑی کھول کر مجھے آزاد کر دیا۔ ہتھکڑی تھیلے میں ڈال کر وہ دوبارہ اسی انداز میں لیٹ گیا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ رانفل پر تھا۔ میں وہیں تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ یہ کم سے کم سات فٹ قطر کا تھا تھا اور درخت کی اونچائی شاید سو فٹ ہوگی یا اس سے بھی زیادہ ہوگی نیچے سے اس کی اونچائی کا درست اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ سورج اب مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا اور تین بج چکے تھے مگر تپش اور دھوپ کی تیزی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ البتہ درختوں کے نیچے گرمی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ شمالی علاقے میں اونچے پہاڑوں اور ادویوں میں گرمی نہیں پڑتی ہے۔ حالانکہ یہاں بھی گرمی پڑتی ہے اور اچھی خاصی پڑتی ہے جہاں جہاں چٹانیں وہاں تو گرمی صحرا کی مانند ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوا کہ چٹانوں میں جانے والا کوئی ٹیکر یا سیاح ڈی ہائیڈریشن سے ہلاک ہو گیا۔ اس وادی کی کھنڈر نما چٹانیں اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھیں کہ تقریباً چھ سات ہزار فٹ کی بلندی پر بھی اذیت ناک گرمی ہو سکتی ہے۔

میری نظریں چٹانوں پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ یہاں سے چٹانوں کے سارے حصے نظر نہیں آرہے تھے مگر اس کا وسطی حصہ اور ہماری طرف والا حصہ واضح دکھائی دے رہا تھا اور اب تک مجھے اس حصے میں کوئی حرکت نظر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فتح خان کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی یا اسے یہاں تک گائیڈ کیا گیا تھا مگر اس وقت وہاں کسی کا موجود ہونا بہت مشکل تھا۔ مجھے یاد ہے ہم جان بچانے کے لیے وہاں رہے تھے اور یہ وقت بڑی مشکل سے گزرا تھا۔ پانچ چھ بجے کے بعد یہ چٹانیں اتنی ٹھنڈی ہوتی تھیں کہ ان میں رہا جاسکے۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی سیاہی چیز چٹانوں کے درمیان تیزی سے حرکت کر رہی ہو۔ مگر یہ جھلک ایک لمبے کے لیے تھی جو دو چٹانوں کے درمیان نظر آئی تھی اور شاید سیکنڈ کے تیسرے حصے کے لیے تھی۔ مگر میری نظروں نے صاف دیکھا تھا۔ مگر یہ واضح نہیں تھا کہ گزرنے والی چیز کوئی انسان تھا یا کوئی جانور، وہ بہت نیچے سے گزرا تھا تقریباً کتے جتنی بلندی تھی۔ اگر کوئی انسان جھک کر بھاگتا تو وہ بھی اسی طرح دکھائی دیتا۔ میں غور کر رہا تھا کہ فتح خان نے دیکھ لیا اس نے پوچھا۔ ”کیا نظر آیا ہے؟“

”جو تمہیں دکھائی دیا تھا۔“ میں نے کہا اور چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس جگہ وہ جو درمیان میں چھوٹا سا گپ نظر آرہا ہے۔ اس سے کوئی سیاہ چیز گزری ہے۔“

فتح خان نے اس طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم سچ کہہ رہا ہے کیا؟ یا مجھ کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”غالباً تم خود یہاں آئے ہو اور پہلے ہی بیوقوف بنے ہوئے ہو اس لیے مجھے کوشش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میں واپس تنے سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ فتح خان مسکرایا۔

”تم برا مان گیا۔“

”میں اس وقت صبح سے برا مانوں گا جب تمہاری وجہ سے مجھے کوئی نقصان ہوگا۔ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے اس لیے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

”اتنا ناراض مت ہو۔“ اس نے گویا مجھے پکار کر کہا۔ ”ابھی میں سوچ رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے دشمن عمل کر رہا ہے اور تم ابھی تک سوچ ہی رہے ہو۔“

”تم فکر مت کرو فتح خان ترنوالہ نہیں ہے۔“

چار بجے کے بعد سورج تیزی سے جھکنے لگا تھا اور اب اس طرف ڈھلان پر اندھیرا آرہا تھا۔ کیونکہ سورج مغرب کی طرف آرہا تھا اس لیے چٹانوں کا مغربی حصہ زیادہ روشن اور واضح ہو رہا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے وہ سیاہ جھلک دکھائی دی ورنہ دوپہر کی تیز روشنی میں جہاں جہاں سائے بن رہے تھے وہ سیاہ تھے اور ان کے ہوتے ہوئے کسی الگ سی چیز کو تلاش کرنا بہت دشوار کام تھا۔ فتح خان نے مجھ سے کہا۔ ”میں مذاق کر رہا تھا مجھے یقین ہے تم نے بھی کچھ دیکھا ہوگا۔“

”تمہاری مہربانی۔“ میں نے تنگی سے کہا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور بہ ظاہر فارغ البال لگ رہے تھے۔ فتح خان نے وقت گزاری کے لیے پوچھا۔

”برٹ شا کا لڑکی ایمن تم سے ملتا ہے؟“

”نہیں لیکن اس سے ایک دوبار رابطہ ہوا۔“

”اچھا لڑکی ہے تم پر مرتا ہے۔“

”خیال ہے تمہارا، گورنمنٹ کبھی اتنے جذباتی نہیں ہوتے کہ محبت کے چکر میں مریں یا مار دیں، یہ تو صرف مولگ ہی اتنے جذباتی ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتا ہے پر وہ لڑکی تم سے محبت کرتا ہے۔“

”تم اسے زیادہ سے زیادہ پسند کہہ سکتے ہو۔“ میں نے تردید کی۔ ”اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو جب مانے اسے تمہارے اور کرم خان کے چنگل سے نکالا تھا۔“

”کرم خان۔“ فتح خان نے سرد آہ بھری۔ ”وہ میرا بچپن کا دوست اور چچا کا بیٹا تھا۔ ان ہیروں کے لیے میرا دشمن بن گیا میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گانا تھا۔“

”اگر کرم خان زندہ ہوتا تو میں سوچتا کہ یہ وہی ہے۔“

”کرم کا ایک ہی بھائی ہے۔ بیرم خان لیکن وہ ادھر نہیں ہوتا۔ بیس سال سے ادھر انگلینڈ میں ہے۔“

”کیا اسے نہیں معلوم کہ اس کے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟“

”ہو سکتا ہے معلوم ہو پر وہ اس قسم کا آدمی نہیں ہے کہ انتقام کے لیے خود کو خطرے میں ڈالے۔“

”کسی کے بارے میں اتنے یقین سے مت کہا کرو خاص طور سے جب الفاظ کے مقابلے میں تمہاری داداؤ پر لگی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”فرض کر لو کہ اس وقت ان چٹانوں میں کوئی ہے تو تم اس کے خلاف کیا کر لو“

”ابھی تم دیکھے گا۔“ فتح خان نے کہا۔ ”چلو اٹھو۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”پانی پی کر آئے گا۔“ وہ بولا۔

مجھے بھی پیاس لگ رہی تھی اور ہم ڈھلان سے گھومتے ہوئے نالے کی طرف روانہ ہوئے۔ ”تمہارے پانی رکھنے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہے کیا؟“

’ہوتی تو یوں خوار ہوتا۔‘

اُدھے گھٹے بعد ہم نالے میں تھے اور ہم نے دل بھر کر پانی پیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب صبح تک پانی نہیں ملے گا۔ ویسے رات میں پیاس کا اتنا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔ جب تک ہم واپس آئے سورج تقریباً پہاڑ کے کنارے پر جا نکا تھا اور کچھ دیر بعد وادی سائے میں آجاتی۔ فتح خان نے واپسی کے بعد مجھے حکم دیا۔ ”ہاتھ آگے کرو۔“ میں نے حکم کی تعمیل کی اور اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور پھر جھک کر پیروں میں بھی بیڑی پہنا دی۔ سب سے آخر میں اس نے تھیلے سے ایک کسی قدر پتلی لیکن بڑی زنجیر نکالی اور اسے ایک چھوٹے سنے والے درخت کے گرد گھما کر اور میرے پیروں سے گزار کر ایک تالے سے لاک کر دیا۔ گویا میں پوری طرح بے بس ہو گیا تھا۔ مگر میں کسی حد تک اس کا مقصد سمجھ رہا تھا۔ ”فتح خان اگر تم کسی ایڈ ونچر پر جا رہے ہو تو مجھے اس طرح باندھ کر کیوں جا رہے ہو؟“

”تا کہ تم واپسی میں اسی جگہ ملے۔“

”اور اگر واپسی نہ ہو سکی تو؟“ میں نے پوچھا۔

”تب کوئی دوسرا آئے گا اور تمہارا قسمت اس کے ساتھ ہوگا۔ ویسے ابھی تم نے پوچھا تھا تقدیر کے بارے میں تو تم خود بھی ایمان رکھتا ہوگا۔“

”ہاں لیکن ہوں تو کمزور انسان نا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ فتح خان نے کھانے پینے اور دوسرے سامان والا تھیلا وہیں چھوڑ دیا تھا البتہ اسے میری دسترس سے دور کر دیا تھا۔ ہاں اس نے روٹیوں والا شاپر نکال کر میرے پاس رکھ دیا۔ ”یہ کھانے کے واسطے ہیں پر احتیاط کرنا اگر کوئی نہ آیا تو تم زیادہ دن زندہ رہ سکے گا۔“ اس کی بات کا مفہوم سمجھ میں آیا تو میرے جسم میں خوف کی لہری دوڑ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی نہ آ تو میں بھوکا پیاسا مردوں گا۔ روٹی ہوگی تو دیر تک زندہ رہوں گا۔ ”فتح خان میں بلاوجہ مارا جاؤں گا۔“

”بلاوجہ تو نہیں اگر تم پہلے ہم کو ہیرے تلاش کر دیتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستا۔“ اس نے اپنی منطق کے مطابق بات کی اس کی سوئی وہیں انگی ہوئی تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ میری بات نہیں سنے گا اور اپنی من مانی کرے گا۔ میں زندگی میں بہت بچھتا یا لیکن اس وقت دل سے بچھتا یا کہ مجھے اس وادی میں آنے کی کیا ضرورت تھی اگر راجا خان راستے میں آیا تھا تو میں کسی اور راستے سے راجا عمر دراز کے پاس چلا جاتا۔ بقیہ میری مت ماری گئی تھی ہ میں نے ایک احمقانہ خیال کے سہارے وادی کا رخ کیا۔ جیسے ہی جنگل کا یہ حصہ اتنے سائے میں آیا کہ سا چٹانوں تک چلا گیا۔ فتح خان حرکت میں آیا اس نے بہت تیزی سے درمیان کا فاصلہ طے کیا اور بھاگتا ہ چٹانوں میں گھس گیا۔ عمر اور اپنی بھاری جسامت سے قطع نظر اس کی رفتار قابل دید تھی اور اسے دوسو میٹر کا فاصلہ طے کرنے میں پون منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور جب وہ کھلی جگہ سے گزر رہا تھا تب نہ تو کسی نے اسے روکا اور نہ ہی اس پر گولی چلائی تھی۔

سائے بہت تیزی سے بڑھ رہے تھے اور چند منٹ بعد ہی چٹانیں پوری طرح سائے میں آچکی تھیں اور اب صرف وادی کی مشرقی ڈھلان پر دھوپ تھی وہ بھی تیزی سے سمٹ رہی تھی۔ میں جہاں بندھا ہوا تھا وہ جگہ تقریباً تاریکی میں آچکی تھی اور اگر کوئی آجاتا تو اسے شاید ہی میں نظر آتا۔ فتح خان اپنے طور پر دشمن کے شکار

روانہ ہوا تھا مگر اس کا پورا امکان تھا کہ دشمن اسے ہی شکار کر لے۔ وہ ایک مفروضے کے ساتھ گیا تھا کہ دشمن اس سے بے خبر ہے لیکن اگر اس کے برعکس ہوتا تو فتح خان کی بحفاظت واپسی مشکل دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے زنجیر کا جائزہ لیا۔ یہ ہلکی لیکن خالص اسٹیل کی بنی ہوئی تھی اور مضبوطی میں کئی گنا موٹی زنجیر سے کم نہیں تھی اسی طرح تالا بھی مضبوط تھا۔ میں کیا کوئی پہلوان بھی اس زنجیر کو نہیں توڑ سکتا تھا۔ بیڑی بھی اسی طرح بہت مضبوط قسم کی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ کیا فتح خان جانتا تھا کہ میں یہاں آؤں گا جو وہ اتنی تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ لیکن وہ کیسے جان سکتا تھا جب کہ خود میرا ارادہ بھی اس طرف آنے کا نہیں تھا بلکہ یہ خیال تو مجھے لینڈ سلائیڈنگ کے بعد آیا تھا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ دراصل فتح خان یہی سمجھ رہا تھا کہ میں ہیروں کے چکر میں وادی کی طرف جا ہا ہوں اور وہ اسی لحاظ سے تیاری کر کے آیا تھا مگر جب میں ہائی وے سے وادی جانے والے راستے کی طرف میں مڑا تو فتح خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ پھر میرے پیچھے آیا اور غلطی سے آگے نکل گیا کیونکہ میں رات نام میں رک گیا تھا۔ فتح خان اس سے بے خبر تھا۔ اب بتا نہیں وہ لینڈ سلائیڈنگ کھلنے پر واپس میرے پیچھے آیا یا پھر اس نے کسی اور کچھوڑا ہوگا جو اس راستے پر نگرانی کر رہا ہوگا اور اسی نے فتح خان کو اطلاع دی ہوگی کہ پھی دانے پر آ گیا ہے اور وہ دوڑا ہوا میرے پیچھے آیا۔ اس دوران میں اس نے گل شاد کو کہیں چھوڑ دیا ہوگا۔ اس نے مجھے گھیر لیا اور اب میں بے بسی کی حالت میں بندھا ہوا تھا۔ مگر مجھے کچھ کرنا تھا۔ کچھ کرنے کے پسے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ تالا کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں نے چٹلون کے ساتھ جیکٹ اور جوتے پہنے ہوئے تھے اور ان میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کی مدد سے میں تالا کھول سکتا تھا۔ میں نے تمام چیزوں کا جائزہ لیا تو میری توجہ چٹلون کی بیلٹ کی طرف گئی۔ اس کا بکل لرنے والا ہک نوکیلا تھا۔ میں نے ذرا سی کوشش کر کے بیلٹ اتار لی اور پھر اس کا ہتھکے جیسا دھاتی ہک تھام کر ، پاؤں کی بیڑی کھولنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اتنی دیر میں اندھیرا ہو چکا تھا اور مجھے سب نٹول کر کرنا پڑ رہا تھا۔ بارتالے کے سوراخ سے ہک پھسل جاتا تو بیڑی مشکل سے تلاش کرنے پر ملتا تھا اور پھر اس سے بھی زیادہ ل سے میں اسے سوراخ میں داخل کرتا تھا۔ مگر میں لگا رہا۔ مسلسل ایک پوزیشن میں بیٹھ کر ایک ہی جیسا کام نے سے جسم دیکھنے لگا تھا۔ جب دھکن زیادہ ہو جاتی تو میں کچھ دیر آرام کر لیتا تھا۔ ابتدائی جوش و خروش کے بعد ، مسلسل ناکامی نصیب ہوئی تو خالی ذہن کے عالم میں مشینی انداز میں لگ گیا۔



میری نظر چٹانوں کی طرف تھی۔ ان کا سفید رنگ تاریکی میں نمایاں ہو رہا تھا۔ فتح خان کو گمے ہوئے مھے گھسنے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اور اب تک اس کی یا اس کے مبینہ دشمنوں کی طرف سے کوئی رد عمل دیکھنے بس آیا تھا۔ نہ ہی فتح خان کے جانے کے بعد کوئی حرکت دکھائی دی تھی۔ پھر اچانک ایک فائر ہوا اور مجھے کے درمیان ہلکی سی روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ فائر کے شعلے کی چمک تھی اور اسی لمحے بیڑی کے تالے مک کی آواز آئی اور تالا کھل گیا۔ میں اس معزز فتن یعنی تالے وغیرہ کھولنے میں قطعی اتنا زنی ہوں۔ البتہ فتن کو اکثر دیکھا کہ وہ محض ایک تاری مدد سے پیچیدہ تالے وغیرہ بھی کھول لیتے ہیں۔ یہ قطعی اتفاق تھا کہ نے تالا کھول لیا اور مجھے اس کی بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ میں نے ہلکی سی قلعکاری ماری اور جلدی سے زنجیر

پہروں سے نکالی۔ ایک تالا کھلا تھا یعنی ایک پاؤں کھلا تھا دوسری میں بدستور بیڑی تھی۔ وقت نہیں تھا کہ میں اسے بھی کھولتا اس لیے مجھے اس کے ساتھ ہی حرکت کرنی تھی۔

میں نے جلدی سے ہیلت واپس پتلون میں پہنی اور کھل جانے والی بیڑی اس کی ساتھی بیڑی کے ساتھ موڑ کر پتلون کے پانچے میں اڑس لی۔ ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں کھولنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ کیونکہ پہلی کامیابی بھی اتفاق سے ملی تھی اور اتفاق ہر بار نہیں ہوتا ہے دوسرے میں جلد از جلد اس جگہ سے دور جانا چاہتا تھا۔ میں نے تھیلا چیک کیا یہ دیکھ کر میری پہلے سے کھلی بانٹھیں مزید کھل گئیں کہ تھیلے میں میرا پستول تھا۔ اس کے ساتھ دو عدد اضافی میگزین بھی اسی میں تھے۔ مگر مجھے مزید کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے میں اپنی ہتھیاریاں کھول سکتا۔ البتہ ایک عدد امیر جنسی لائٹ کم ٹارچ نکل آئی۔ میں نے اس کے شیشے پر ہتھیلی رکھ کر اسے چیک کیا اور یہ کام کر رہی تھی۔ میں نے اسے بھی رکھ لیا۔ جیکٹ کی جیبوں سے آسانی ہو رہی تھی ایک جیب میں پستول اور دوسری میں اس کے اضافی میگزین آگئے تھے۔ ٹارچ میں نے جیکٹ کے اندر سینے سے لگائی۔ کچھ روٹیاں بھی نکال کر جیکٹ میں ڈال لیں۔ بھوک تھی مگر فی الحال اور بھی غم تھے زمانے میں روٹی کے سوا۔

میں ڈھلان سے اتر کر جھگ کے کنارے تک آیا۔ پہلے فائر کے بعد نہ تو مزید کوئی فائر، واقعہ اور نہ ہی کوئی اور آواز یا حرکت سنائی یا دکھائی دی تھی۔ چٹانیں اوپر سے نمایاں لیکن اندر سے تاریک تھیں۔ ان میں اب کوئی حرکت کر بھی رہا تھا تو وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں آزاد ہو گیا تھا اور مسلح بھی تھا۔ مگر یہاں فتح خان سمیت نامعلوم تعداد میں ایسے افراد تھے جن پر دوستی کا گمان بھی مشکل تھا۔ ایسے میں سب سے آسان تدبیر یہ تھی کہ میں نو دو گیارہ ہو جاتا۔ مگر مسلسل مشکل حالات سے گزر کر میرے اندر ایک پتکے کی عادت سی آگئی تھی۔ وہ مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں ذرا اس کھیل کا مشاہدہ کروں جو ان چٹانوں کے درمیان کھیلا جا رہا تھا۔ پہلے فائر کے بعد خاموشی تھی شاید دونوں طرف سے محتاط رویہ اپنایا جا رہا تھا۔ میں دوسرے فریق کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر وہ فتح خان سے واقف تھا تو اسے اب تک اس پر قابو پا لینا چاہیے تھا اور اگر وہ اس سے بے خبر تھا تو اسے ان چٹانوں کا رخ کرنا نہیں چاہیے تھا۔ دن میں یہ غیر محفوظ اور بے پناہ گرم ہو جاتی ہیں۔

اچانک مجھے چٹانوں کے درمیان کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ وہاں سے دو افراد نکلے تھے۔ لیکن نہیں ان میں ایک تیسرا فرد بھی تھا۔ وہ ان کے پیچھے تھا۔ میں نے آنکھوں پر زور دیا کہ کیا فتح خان نے دو افراد کو قابو کیا ہوا ہے۔ مگر نہیں پیچھے موجود شخص فتح خان سے زیادہ طویل قامت تھا۔ جو دو آگے تھے ان میں سے ایک لڑکھڑا رہا تھا اور دوسرا اسے سنبالے ہوئے تھا اور وہ تینوں میری طرف ہی آرہے تھے۔ میں احتیاط سے پیچھے ہٹا اور درختوں کے درمیان میں جانے لگا۔ فتح خان نے ان پر قابو پایا تھا یا خود ان کے ہمتے چڑھ گیا تھا دونوں صورتوں میں اس پارٹی کو اس طرف آنا تھا جہاں فتح خان مجھے قید کر کے گیا تھا۔ میں نے دو ایسے درختوں کے درمیان جگہ سنبھالی جن کے تنے نہ صرف آس پاس تھے بلکہ ڈھلان والی طرف ایک بڑی چٹان تھی۔ مورچے کے لحاظ سے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ میں پستول نکال کر اس مورچے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

وہ تینوں کچھ دیر بعد درختوں میں داخل ہوئے یہاں تاریکی زیادہ تھی اس لیے بس ان کے ہیولے محسوس کیے جاسکتے تھے۔ وہ اسی طرف بڑھے جہاں میں موجود ہوتا اگر زنجیر کا تالا نہ کھلتا۔ اس جگہ کے نزدیک پہنچ کر

انہوں نے آپس میں کچھ تبادلہ خیال کیا۔ ان کی دھیمی آوازیں مجھ تک آئیں اور پھر ان میں سے ایک کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا گیا اور جب اس نے بلند آواز میں کراہ کر گرانے والے کو گالی دی تو میں نے شناخت کر لیا وہ فتح خان تھا اور اب پتا چلا کہ وہ ان کا قیدی ہی نہیں زنجی بھی تھا۔ البتہ گالی کے بعد اس نے جو نام لیا اس نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے جلال کو گالی دی تھی۔ جواب میں جلال نے اسے ٹھوکر ماری۔ ”چپ کرو خنزیر کا بچہ، میں تمہارا نوکر ہے جو ایسے بات کرتا ہے۔“

”تُو غدار ہے۔“

”وہ کدھر ہے۔“ طویل قامت نے مداعت کی۔ ”یہ دیکھو زنجیر کھلی ہے اور وہ غائب ہے۔“

”میں نہیں جانتا میں اسے باندھ کر گیا تھا۔“ فتح خان بولا۔ اتنی دیر میں مجھے کسی قدر نظر آنے لگا تھا اور میں نے دیکھا کہ فتح خان نے اپنا دایاں شانہ تمام رکھا تھا۔ پتا نہیں اسے گولی لگی تھی یا کوئی اور زخم آیا تھا۔ طویل قامت فتح خان کی طرف آیا۔ وہ صاف لہجے میں اردو بول رہا تھا مگر لہجہ کہیں کہیں چغلی کھاتا تھا کہ وہ چشتی بولنے والا ہی تھا۔ اس نے جھک کر فتح خان سے کہا۔

”فتح تم جاننے ہو اس دنیا میں مجھ سے زیادہ تمہارے خون کا پیسا کوئی نہیں ہوگا۔“

”خیال ہے تمہارا۔“ فتح خان نے اس حالت میں بھی استہزاء لہجے میں کہا۔ ”گلتا ہے انگلیں جا کر بھی تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھا۔“

میں چونکا کیونکہ انگلیں کا حوالہ اس نے کرم خان کے بھائی ہیرم خان کے بارے میں بات کرتے ہوئے دیا تھا۔ طویل قامت کہہ رہا تھا۔ ”فتح تم بہت فضول باتیں کرتے ہو۔ کام کی بات کرو۔“

”کام کا کیا بات کرے ہیرم خان۔“ فتح خان بولا۔ ”کام کا بندہ تو بھاگ گیا۔“

”یہی میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟“

”تم انگلیں پلٹ کر بھی جاہلوں کا سابات کر رہا ہے۔ اگر قیدی آزاد ہو جائے تو وہ کہاں جاتا ہے۔ وہ بھاگ گیا ہوگا۔ اب تک تو نالے میں پہنچ گیا ہوگا۔“

”تم نے کہا تھا اس کے پیروں میں بھی کف ڈالی ہے۔“

”تم پھر احقانہ بات کر رہا ہے یہ زنجیر دیکھ رہا ہے یہ بند ہے تو اس نے بیڑی ہی کھولا ہوگا نا، اس کا مطلب ہے اب وہ بھاگ سکتا ہے۔“

ہیرم خان خاموش ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کچھ دیر پہلے ہی ہیرم خان کے بارے میں فتح خان نے فرمایا تھا کہ وہ اس چکر میں نہیں پڑے گا مگر حالات بتا رہے تھے کہ وہ اسی چکر میں تھا اور کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ جلال جسے فتح خان اپنے اعتماد کا آدمی قرار دے چکا تھا وہ اب ہیرم خان کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ گویا وہ شروع سے ہیرم خان کا آدمی تھا۔ نہ جانے فتح خان نے اس پر کیسے اعتبار کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہیرم خان بولا۔ ”مجھے ہر قیمت پر وہ ہیرے چائیں۔“

”تو لے لو، ابھی تک تو نہیں ملا ہے، اس کتے نے تم کو سب بتا دیا ہوگا۔“ فتح خان نے جلال کی طرف اشارہ کیا تو وہ غرانے لگا تھا۔

”ہو سکتا ہے جب جلال تمہارے پاس سے نکلا ہو تو تم کو ہیرے مل گئے ہوں۔“

فتح خان نے اس بار قہقہہ مارا۔ ”اگر مجھے ہیرے مل گئے ہوتے تو میں تمہارے پیچھے آتا۔ اس جیسے دس کتوں پر لعنت بھیج کر ادھر سے جا چکا ہوتا۔“

جلال بے قابو ہو کر فتح خان کی طرف جھپٹا اور اس نے بے دریغ اس کے زخمی شانے پر ٹھو کریں رسید کیں۔ فتح خان کو خاصی تکلیف ہوئی ہوگی مگر وہ جلال کو چڑانے کے لیے ہنستا رہا اور جب وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹا تو فتح خان نے حقارت سے کہا۔ ”تیرا کیا خیال ہے تو فتح خان سے معافی کی امید رکھتا ہے۔“

ہیرم خان نے مدبرانہ انداز میں ہاتھ بلند کیا۔ ”بس، جاہلوں کی طرح لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جاہل تم ہے۔“ فتح خان نے اسے ترکی بد ترکی جواب دیا۔ ”جو بندہ پڑھ لکھ کر بھی ایسا کرے وہ زیادہ بڑا جاہل ہوتا ہے۔ ہم تو اُن پڑھ آدمی ہے۔ ایسا کرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے۔“

”تم جانتے ہو انشام ہمارے خون میں ہے۔“ ہیرم خان دھیمے لہجے میں بولا۔ ”ہم دنیا کی ہر چیز چھوڑ سکتے ہیں لیکن بدلہ نہیں چھوڑ سکتے۔“

”جب تم کو اب خیال آرہا ہے۔“

”نہیں یہ خیال کبھی میرے دل سے نہیں نکلا مگر میں موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ میں یہاں کے حالات اور تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا اس لیے معلومات حاصل کرنے اور تمہارے ارد گرد بندے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا تھا۔“

”مگر تم کو بس یہی ملا ہوگا۔“ فتح خان نے پھر حقارت سے جلال کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں تمہارے آس پاس سارے ہی لوگ لالچی نکلے، ان کو نوٹ کی جھلک دکھائی تو سب بکنے کو تیار ہو گئے تھے۔ مگر میں نے اسے چنا کیونکہ یہ تمہارے سب سے قریب تھا۔ ویسے کیا تم کوئی نیکی کا کام کر رہے ہو جو اپنے آدمیوں سے وفاداری کی توقع رکھتے ہو۔ تم بھی تو پیسے کے لیے سب کرتے ہو۔“

”سب پیسے کے لیے کرتا ہے۔“ فتح خان نے اپنا دفاع کیا۔ ”تم نے بولا تھا کام کا بات کرلو، وہ کر لیا اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ بدلہ لینا ہے تو لو اور جاؤ، وقت کیوں ضائع کرتا ہے۔“

”کیا تمہیں مرنے کی جلدی ہے؟“ جلال بولا۔ ”خان کی رحم دلی سے فائدہ اٹھاؤ۔“

جواب میں فتح خان نے قہقہے کے ساتھ جو فرمایا اسے لکھنے سے میرا قلم معذور ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنا بے جگر ہو رہا تھا اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اس کے سامنے اس کی جان کا دشمن تھا اور وہ ایک لمحے میں اسے دبو سے رخصت کر سکتا تھا۔ مگر فتح خان کو جیسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے جلال کو خان کی رحم دلی کے حوالے سے ایک ناقابل بیان مشورہ دیا تھا۔ ہیرم خان مشتعل نہیں ہوا اور جلال پہلے ہی اپنا غصہ اتار چکا تھا اس لیے فتح خان مزید چوٹوں سے محفوظ رہا۔ ہیرم خان نے کہا۔ ”فتح خان تم نے ٹھیک کہا تھا کہ پڑھ لکھ کر بھی آدمی جاہلوں کی سی حرکت کرے تو یہ زیادہ جہالت ہوتی ہے اس لیے میں تمہیں اپنے ہاتھ سے نہیں ماروں گا۔“

”مجھے معلوم ہے تعلیم نے تم کو بزدل بنا دیا ہے، شاید خون دیکھ کر تم کو اٹنی آتا ہوگا۔ تم اس سے بولے گا۔“

اسی لیے خریدا ہے اسے۔“

”نہیں، میں تمہیں یہاں اسی زنجیر سے باندھ جاؤں گا اور تم بھوک پیاس سے مر دو گے۔“
 فتح خان ایک لمحے کو چپ ہوا پھر بولا۔ ”یہ کیسا انتقام ہے دشمن کو تو اپنے ہاتھ سے مار کر جین آتا ہے۔“
 ”یہی انتقام ہے۔“ ہیرم خان عیاری سے بولا۔ ”یہ کیا کہ ایک گولی ماری اور آدمی ختم، مزہ تو اس وقت ہے جب دشمن سسک سسک کر زیادہ دیر میں جان وے۔“

”تم باندھ کر چلا جائے گا؟“

”نہیں میں یہیں رکوں گا اور اس دوران میں جلال کے ساتھ مل کر ہیرے تلاش کروں گا۔ یہاں کتنے درخت ہیں شاید دو ہزار ہوں۔ اگر ہم روز سو درخت بھی دیکھیں تو بیس دن میں یہ سارا جنگل چھان سکتے ہیں چلو مہینا لگ جائے گا۔ کم سے کم پچاس ملین ڈالر کے ہیروں کے لیے ایک مہینا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس دوران میں تم کو مرتے ہوئے دیکھتا رہوں گا۔“

”تم زیادہ سے زیادہ تین دن اس شوکو دیکھ سکتا ہے۔“ فتح خان نے خوفزدہ ہوئے بغیر کہا۔ ”اس کے بعد کیا کرے گا؟“

مگر ہیرم خان جیسے سب طے کر کے آیا تھا اس نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو میں تم کو پانی دیتا رہوں گا صرف کھانے کو کچھ نہیں ملے گا تب تم کو مرتے میں بہت وقت لگے گا۔ کم سے کم تین ہفتے لگے گا تمہیں مرنے میں۔“
 فتح خان کو تو نہیں پتا لیکن میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ ہیرم خان کا منصوبہ نہایت خوفناک تھا اور اگر اس پر عمل کیا جاتا تو فتح خان کو مرتے میں بچ بچ اتنا وقت لگ جاتا اور یہ موت بہت خوفناک ہوتی۔ ہیرم خان کے اشارے پر جلال نے فتح خان کو زنجیر سے یوں باندھا کہ پہلے اس کے ہاتھ میں پھنکڑی ڈالی اور پھر اس کے دوسرے کڑے میں زنجیر ڈال کر اسے دوبارہ تالے سے بند کر دیا۔ اب فتح خان اسی طرح درخت کا قیدی بن گیا تھا جیسے اس نے مجھے بنایا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے دونوں ہاتھ پاؤں پھنکڑی اور بیڑی سے بند تھے جب کہ فتح خان کے صرف ایک ہاتھ میں پھنکڑی تھی اور اس کے پاؤں بیڑی سے آزاد تھے مگر وہ بھی میری طرح درخت کا قیدی بن گیا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں وقت نے پلٹا دکھایا۔ جو آزاد تھا وہ قیدی بن گیا اور جسے قیدی بنایا تھا وہ آزاد ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے؟ میری بلا سے فتح خان کے ساتھ کچھ بھی ہوتا رہے۔ مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟

فتح خان میرا دشمن تھا اور اس نے بہت سے مواقع پر مجھے زچ کیا تھا۔ اس نے فشی دل جی جیسے خبیث دشمن کا ساتھ دیا اور اس کا نتیجہ بالآخر بیڑی کی موت کی صورت میں نکلا مگر فتح خان اس میں براہ راست ملوث نہیں تھا۔ بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا حالانکہ وہ مسلح تھا اور چاہتا تو مجھے آسانی سے شوٹ کر سکتا تھا مگر اس نے صرف فرار کو ترجیح دی۔ اس کا یہ بوجھ مجھ پر باقی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ بوجھ اتار دوں۔ ہیرم خان نے فتح خان کو بے بس کرنے کے بعد اپنے سامان سے ایک کبل نکال کر بچھایا تھا اور اب اس پر محو آرام تھا۔ ظاہر اس نے فتح خان کے لیے سزاجویز کی تھی لیکن اس کے پس پشت اصل میں اس کا مقصد ہیروں کا حصول تھا شاید اس کے ذہن میں تھا کہ ہیرے فتح خان کے پاس تھے اور جب وہ بھوک پیاس سے ٹھہرا ہوا جائے گا تب وہ اس سے ہیروں کا پوچھے گا۔ ساتھ ہی وہ خود بھی ہیروں کی تلاش جاری رکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اسے ہیرے مل گئے تو وہ فتح خان کو

قتل کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں کرے گا۔

مجھے پیاس لگ رہی تھی لیکن فی الحال یہاں سے ہلنا مناسب نہیں تھا۔ بیرم خان اور جلال دونوں چوکنا تھے اور اگر میرے پاؤں کی بیڑی کھنک جاتی تو وہ میری موجودگی سے واقف ہو جاتے۔ اس لیے مجھے انتظار کرنا تھا اور دست گزاروں کے لیے میں خشک نان چبانے لگا۔ میری سرگزشت پڑھنے والے اکثر قارئین شکوہ کرتے ہیں کہ میں لذیذ کھانوں کا ذکر کچھ زیادہ ہی کرتا ہوں۔ مگر کسی اللہ کے بندے یا بندی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ جب میں دشمن کی قید میں فاقے کھاتا ہوں یا اس طرح خشک نان چباتا ہوں تو مجھ سے اظہار ہمدردی ہی کر لے۔ دو نان حلق سے اتار کر پیٹ کو تو فاقہ ہو گیا تھا مگر حلق میں جیسے کانٹے پڑنے لگے۔ خشک نان رہی سہی نمی بھی چوس گئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ رات کے نونچ چکے تھے۔ جلال نے ایک عدد لالین نما امیر جنسی لائٹ جلا کر ایک ایسی جگہ رکھ دی تھی جہاں سے اس کی روشنی ان کے پڑاؤ کو منور کر رہی تھی۔ پھر انہوں نے الاؤ جلا یا اور کھانا گرم کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ بیرم خان کے پاس ٹن بند کھانے تھے اور وہ مچھلی کا ایک ٹن کھول کر اسے ہلکا گرم کر کے کھا رہا تھا۔ جلال وہی روٹی اور چائے سے گزارا کر رہا تھا۔ فتح خان بندھا ہوا اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے شانے کے زخم کے بارے میں نہ تو اس نے بات کی تھی اور نہ ہی ان لوگوں نے کوئی بات کی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زخم گولی کا نہیں ہے ورنہ وہ اسے اتنا ہلکا نہ لیتے اور گولی کا زخم ویسے ہی جلد خراب ہونے لگتا ہے۔ اتنی دیر میں فتح خان کی حالت غیر ہو جاتی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور کبھی کبھی دیہی آواز میں کچھ گنگنا تا بھی تھا۔

پیاس کی شدت میں اضافہ ہوا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ کھانے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ دیر میں یہ شدت دوبارہ کم ہو جائے گی۔ میں نے دوپہر میں اچھی طرح پانی پیا تھا اور اس بات کو سات گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس لیے مجھے ڈی ہائیڈریشن کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ صرف ایک نفسیاتی پہلو تھا میرے پاس چونکہ پانی نہیں تھا اس لیے مجھے پیاس کا خیال آ رہا تھا۔ کسی قدر حقیقی پیاس بھی تھی۔ کچھ دیر بعد جج پیاس کی شدت کم ہونے لگی۔ بیرم خان کھانے ہی لیٹ چکا تھا۔ جب کہ جلال الاؤ کے پاس بیٹھا ہوا فتح خان کی نگرانی کر رہا تھا۔ فتح خان نے اس سے کہا۔ ”میرا آدمی جانتا ہے تم میرے ساتھ تھا جب میں واپس نہیں جاؤں گا تو وہ تم کو تلاش کرے گا۔“

”کوئی تلاش نہیں کرے گا۔“ جلال نے اطمینان سے کہا۔ ”آج کل کوئی کسی کا پروا نہیں کرتا ہے۔“

”تم سب کو اپنے جیسا دوغلا سمجھتا ہے۔“ فتح خان حقارت سے بولا۔ ”میرا آدمی میرے اشارے پر اپنا جان قربان کر سکتا ہے۔“

”آج صبح تک تم بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہو گے۔“ جلال ہنسا۔ ”کیا میں نے جان قربان کی، نہیں کیا نا..... فتح خان آج کل کوئی کسی کے لیے جان قربان نہیں کرتا۔ بڑا خراب دور ہے۔ لوگ بھائی کے مرنے کے بعد اس کی بیوی پر قبضہ کر لیتے ہیں۔“

جلال کا اشارہ یقیناً کل شاد کی طرف تھا۔ فتح خان اس کا طنز سمجھا یا نہیں لیکن وہ خاموش ہو گیا تھا۔ بیرم خان کچھ دیر بعد خرابے لینے لگا۔ جلال بھی جمائیاں لے رہا تھا مگر وہ لیٹا نہیں۔ مجھے بھی اٹکھ آ رہی تھی مگر میں

سونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی میرا راز فاش کر دیتی۔ میں ان لوگوں سے بیس گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس لیے میں نیند کے جھونکوں سے ہوشیار رہا۔ میں نے اپنی پشت کھروری چٹان سے لگا لی تھی اور یہ بے آرامی مجھے جگائے رکھنے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ کچھ دیر میں چاند طلوع ہو گیا۔ مگر یہ زوال پذیر چاند تھا اور روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی خاص طور سے درختوں تلے اس کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا البتہ سفید چٹانیں روشن ہو رہی تھیں۔ میں کبھی کبھی ان چٹانوں پر بھی نظر دوڑا لیتا تھا۔

ایک بار میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے لگا وہاں کوئی چیز ہے جو حرکت کر رہی ہے۔ میں نے واضح نہیں دیکھا تھا۔ مگر مجھے احساس ہوا تھا اس بار میں نے نظر جما کر دیکھا۔ چند لمحوں بعد دوسرے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ وہ چٹانوں کے درمیان تھے اور جھک کر چل رہے تھے۔ ان کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ بلکہ وہ شمالی ڈھلان کی طرف جا رہے تھے۔ میں چونکا ہوا ہوا۔ یہ کوئی نئی مصیبت تھی یا فتح خان کے آدمی تھے جو اب آئے تھے۔ اگر وہ بیرم خان کے آدمی ہوتے تو انہیں اس طرح چھپ کر حرکت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ایک جگہ جہاں جھاڑیاں زیادہ تھیں وہاں سے میدان عبور کیا اور شمالی ڈھلان پر پہنچ گئے۔ میں چونکا ہوا ہوا۔ یہ جگہ لالین کی روشنی کی وجہ سے نمایاں تھی اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان دو افراد نے اس روشنی کو نہ دیکھا۔

میری نظر اب شمالی ڈھلان کی طرف تھی مگر درختوں تلے بالکل اندھیرا تھا اور اگر کوئی یہاں حرکت کرتا تو بھی اس کا نظر آتا محال تھا صرف آواز سے کسی آنے والے کا سراغ لگ سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں جنوب کی طرف تھا اس لیے یہ امکان نہیں تھا کہ وہ میرے پیچھے سے آتے۔ اس کے باوجود میں آس پاس سے چونکا تھا۔ مگر آنے والے بہت ہی محتاط تھے۔ وہ اس وقت نظر آئے جب وہ لالین کی روشنی کی حد میں آ گئے تھے۔ ان کے سائے درختوں کے درمیان حرکت کر رہے تھے۔ پھر وہ ایک جگہ رکے اور الگ الگ ہو کر دائیں بائیں چلے گئے۔ ایک میری طرف آیا تھا مگر وہ مجھ سے کچھ دور ایک درخت کی آڑ میں رک گیا اور دوسرا اس سے مخالف سمت میں کسی قدر نیچے تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ان لوگوں کو گھیر رہے تھے۔ ان کے پاس خود کار رائفلیں تھیں۔ جلال اب اونگھ رہا تھا اس لیے اس کو قطعی خبر نہیں ہوئی۔

مجھے آنے والے خطرناک لگ رہے تھے۔ عین ممکن تھا وہ میرے پاس آ جاتے اور مجھے دیکھ لیتے۔ اس لیے میں نے جلال کو خبردار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے ایک عدد پتھر تلاش کیا اور اسے پڑاؤ کی طرف اچھال دیا۔ پتھر لاؤ کے پاس گرا اور جلال نے بھڑک کر اپنی رائفل اٹھائی تھی۔ اس دوران میں، میں نے دوسرا پتھر جلال کے اوپری حصے کی طرف پھینکا جس طرف وہ دونوں موجود تھے اور آواز آتے ہی جلال نے اس طرف ہلکا رست مارا۔ بیرم خان بھی بڑبڑا کر اٹھا تھا اور اس دوران میں جلال نے پھرتی سے لائٹ بجھا دی۔ فوراً ہی اوپر سے برست چلا اور تاریکی میں پتا نہیں چلا کہ کون نشانہ بنا اور کون بچ گیا۔ ایک کے بعد دوسرا برست چلا اور حلوں سے اندازہ ہوا کہ اوپر والے دونوں افراد محفوظ تھے اور اپنی اپنی کمین گاہوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔

میں نے جوابی فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ بیرم خان اور جلال بھی بچ گئے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اوپر والوں میں سے کوئی مورچہ بنانے کے لیے اس طرف نہ آئے۔ کیونکہ یہ جگہ بڑی

موزوں تھی اور یہاں سے پڑاؤ کو زیادہ آسانی سے نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا جو آدمی میری پناہ گاہ کے نزدیک تھا وہ اس طرف آیا۔ میرے پاس بالکل موقع نہیں تھا اور میں اسے ذرا موقع دیتا تو وہ مجھے شوٹ کر دیتا اس لیے میں نے پہلے یہ کام کیا۔ جیسے ہی وہ تنوں کے درمیان نمودار ہوا میں نے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ وہ ڈر کر پیچھے گیا مگر خوش قسمتی سے اس وقت فائرنگ کا بے پناہ شور جاری تھا اس لیے کسی نے ایک پسمل فائرنگی آواز نہیں سنی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا تو میں نے اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا اور پھر ٹٹول کر اس کی رائفل اپنے قبضے میں لے لی۔ مزید تلاشی پر اس کے پاس سے ایک عدد اضافی میگزین نکلا تھا۔ اس کے حلق سے آتی ہلکی سی خرخراتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ دم توڑ رہا ہے۔ گولی دل سے ڈر کر بے لگی تھی اور جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ اس کے پاس دوسری چیز پانی کی ایک بوتل نکلی تھی اور مجھے پانی کی ضرورت تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کر کے اس میں سے ایک گھونٹ لیا اور رائفل سنبھال کر لڑائی کی طرف متوجہ ہوا۔ پڑاؤ میں الاؤ آخری دموں پر تھا۔ کیونکہ آگ بجھ گئی تھی اور اب انگارے بھی بجھ رہے تھے۔ ان کی ہلکی روشنی فائرنگ کے شعلوں کے سامنے بھج سی گئی تھی۔ مارے جانے والے کا دوسرا ساتھی اوپر سے بے دریغ گولیاں برسا رہا تھا اور پھر اس کی فائرنگ کام آئی۔ جلال جو بے احتیاطی سے کھلے میں آیا تھا وہ نشانہ بنا اور الٹ کر انگاروں پر آکر اور پھر وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا تھا۔ دوسرے برسٹ نے اسے وہیں ٹھنڈا کر دیا مگر اس کی لاش انگاروں پر روست ہونے لگی اور چند لمحے بعد فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔ بیرم خان ایک درخت کی آڑ میں تھا۔ اس نے جلال کے مرنے کے بعد اوپری سمت چند فائر کیے اس کے پاس زیادہ بڑا ہتھیار نہیں تھا اور اوپر والے کو اس لحاظ سے برتری حاصل تھی۔

اوپر والا اب بالادست تھا۔ کیونکہ نیچے صرف ایک رہ گیا تھا اور وہ بھی پستول سے مسلح تھا۔ اس لیے وہ نیچے آنے لگا۔ وہ تیزی سے ایک درخت کی آڑ میں آیا۔ پھر دوڑ کر ذرا نیچے موجود دوسرے درخت کی آڑ میں آنے والا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گرا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکا اور لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ بیرم خان نیچے آتے ہوئے اس پر مسلسل گولیاں برسا رہا تھا اور بالآخر وہ نیچے آکر اور اس کے ساتھ ہی بیرم خان کا پستول خالی ہو گیا۔ مجھے کلک کی آواز آئی۔ شاید بیرم خان میگزین بدل رہا تھا کہ دوسرے آدمی نے اپنی رہی سہی ہمت جمع کر کے اس پر برسٹ مارا اور وہ فوراً ہی مارا گیا کیونکہ وہ الٹ کر گرا تھا اور پھر ساکت ہو گیا۔ میں دم بخود سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے رائفل حاصل کر لی تھی مگر اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

دوپہر استعمال کر کے میں نے اپنے چار ممکنہ دشمنوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ دشمن نے آپس میں ایک دوسرے کا کام تمام کر دیا تھا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ مگر میں نے حرکت نہیں کی۔ زنجیر چھنکی تو اندازہ ہوا کہ فتح خان زندہ ہے۔ یہ اس کی قسمت تھی ورنہ وہ اس میدان جنگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بے تحاشہ فائرنگ ہوئی تھی اور کوئی بھی گولی اس کا رخ کر سکتی تھی۔ مگر وہ محفوظ رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”لگتا ہے خدائی خوار سب مر گیا۔ اب مجھے کون آزاد کرے گا۔“

میں آزاد کر سکتا تھا مگر فی الحال میرا یہاں سے ہلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہ ظاہر سب مر گئے تھے لیکن کیا کہا جاسکتا تھا کہ کوئی زندہ ہو اور مرتے مرتے بھی کسی ایک کو ساتھ لے جانے کی کوشش کرے۔ جلال کے

انگاردوں پر مگر کرنے سے رہی سہی روشنی بھی ختم ہو گئی تھی میرے پاس ٹارچ تھی مگر اسے استعمال کرنے کا مطلب اپنی موجودگی کا راز خود فاش کرنا تھا۔ دوسرے مجھے ایک خدشہ اور تھا کہ اگر ان دو کے پیچھے کچھ افراد اور ہوئے تو وہ جلد یا بدیر یہاں تشریف لے آتے۔ بے شک میں اب زیادہ مسلح تھا مگر بندھے ہاتھوں سے میں اپنا دفاع اور حملہ بہت اچھے انداز میں نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے محتاط رہنا تھا اور فی الحال اپنی موجودگی ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے کوئی غلطی بھی نہیں تھی۔ میں کھاپی چکا تھا اور اس جگہ آرام سے تھا۔ اپنے کھینے کی لاش میں نے آرام سے دھکیل کر تنوں سے باہر کر دی تھی۔

اب مجھے صبح کی روشنی کا انتظار تھا۔ فتح خان اپنی جگہ بے بسی سے بندھا ہوا تھا اور وہ بھی آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ شروع میں اس نے زیر لب کچھ کہا تھا مگر اب خاموش تھا۔ غالباً اسے بھی صبح کی روشنی کا انتظار تھا۔ میں کچھ دیر تو جاگتا رہا مگر پھر سکون اور خطرہ نہ ہونے کے احساس نے مجھ پر غلبہ پالیا اور میں سو گیا۔ درمیان میں ایک بار آنکھ کھلی اور حالات کو جوں کا توں پا کر میں دوبارہ سو گیا۔ دوسری بار آنکھ کھلی تو مشرقی افق سرخ ہو رہا تھا۔ سورج طلوع ہونے والا تھا۔ میں نے انگڑائیاں لے کر اپنا جسم کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر ابھی تک تاریکی تھی مگر ہیولے نظر آرہے تھے۔ اچانک فتح خان کی آواز آئی۔ ”شہباز خاناں صبح ہو گئی ہے اب باہر آ جاؤ۔“

میں دنگ رہ گیا تھا کہ اسے یہاں میری موجودگی کا پتا کیسے چلا؟ مگر میں نے جواب نہیں دیا خاموش رہا تو اس نے کچھ دیر بعد پھر کہا۔ ”شہباز میں جانتا ہے تم یہاں ہے سوتے میں تم نے کچھ آواز نکالا تھا اس لیے اب ڈراما چھوڑو اور سامنے آ جاؤ۔“

”میں سامنے آؤں گا لیکن جب تم مجھے نظر آؤ گے۔“ میں نے اب بات کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ فتح خان یا ان دونوں کے ساتھ اور کوئی ہوتا تو وہ اب تک یہاں آچکا ہوتا۔

”میں سامنے ہے۔“

”ممبر فتح خان، ذرا روشنی ہو جانے دو۔“ میں نے کہا۔ ”اتنی جلدی کی ضرورت کیا ہے۔ آخر میں کل رات سے یہاں بیٹھا ہوں اور سکون سے ہوں۔ ویسے جب تک روشنی نہیں ہو جاتی ہم آپس میں کچھ تبادلہ خیال نہ کر لیں۔“

”کیسا تبادلہ خیال؟“

”پہلی بات تو یہ کہ یہ دونوں کون ہیں جو مارے گئے ہیں۔“

”بیرم خان میرا چچا کا لڑکا اور جلال۔“

”میں ان دونوں کی بات کر رہا ہوں۔“ اس بار میں نے ہر دلچسپی میں کہا۔ ”جو خاموشی سے یہاں آئے

تھے۔“

”میں ان کے بارے میں نہیں جانتا۔“ فتح خان نے صاف انکار کر دیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے فتح خان، یا تو یہ بیرم خان کے ساتھی تھے یا پھر تمہارے ساتھی ہوں گے۔“

”میں نے کہا نا میرا ساتھی نہیں ہے۔“ فتح خان اپنے انکار پر قائم رہا۔

”اگر یہ بیرم خان کے ساتھی ہوتے تو اس پر حملہ نہ کرتے۔“

”ہوسکتا ہے کوئی تیسرا پارٹی ہو۔“ وہ عیاری سے بولا۔

”فتح خان بات حلق سے اتر نہیں رہی ہے۔ بہر حال جو بھی حقیقت ہوگی جلد سامنے آجائے گی۔“

مشرق اب زیادہ روشن ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ روشنی نیچے کی طرف آرہی تھی کیونکہ ہم مغربی ڈھلان پر تھے اس لیے پہلے یہ روشن ہوتی۔ روشنی بتدریج بہتر ہو رہی تھی اور میں نے اٹھ کر پہلے اپنا جسم کھولا۔ رات بھر ایک محدود جگہ بیٹھے رہنے سے بند سا گیا تھا۔ پھر ٹھنڈ کا اثر بھی تھا۔ پانچ چھ منٹ کی محنت سے دو ایک سرساز نے مجھے چاک و چوبند کر دیا تھا۔ اب روشنی اتنی تھی کہ آس پاس سب صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو فتح خان درخت کی اوٹ میں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”فتح خان سامنے آؤ۔“

”میں سامنے نہیں آئے گا۔“ اس نے انکار کیا۔

”اس صورت میں تم یہیں بندھے رہو گے اور میں روانہ ہو جاؤں گا۔“ میں نے اسے دھمکی دی تو وہ سوچ

میں پڑ گیا۔ پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔

”کیا ضمانت ہے کہ تم ہم پر گولی نہیں چلاؤ گے۔“

”کوئی ضمانت نہیں۔“

”اچھا میں سامنے آتا ہے۔“ فتح خان نے کہا اور زنجیر چھنکا تا ہوا سامنے آ گیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور زنجیر

اس کے ہاتھ میں بندھی پھٹکڑی کے دوسرے حلقے سے گزر رہی تھی۔ میں نے پستول تھام لیا کیونکہ کلاشنکوف بندھے ہاتھوں سے استعمال کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ فتح خان مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم آس پاس ہی ہوگا۔“

”تمہیں توقع ہوگی کہ میں تمہیں بچاؤں گا۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں

تھا۔“

”مجھے توقع نہیں ہے لیکن تم کو جانتا ہے تم رک گیا کہ دیکھے معاملہ کیا ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے اسی تجسس نے روک لیا تھا ورنہ اس حالت میں فرار بھی مشکل نہیں تھا۔ میں نے

پستول اسی کی طرف رکھا اور پوچھا۔ ”پھٹکڑیوں اور بیڑی کی چابی کہاں ہے؟“

”اس کے پاس ہوگی۔“ فتح خان نے مردہ بیرم خان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے میری تلاشی لے کر

سب لے لیا تھا۔“

”تم اس کے ہاتھ کیسے آئے؟“

”اس نے دھوکا کیا۔ لیزر لائٹ سے ایسا دھوکا دیا کہ میں آدمی سمجھا اور اس پر فائر کر دیا۔ پیچھے سے اس

داؤس نے مرا قتل کا بٹ مارا جو شانے پر لگا۔ گوشت پھٹ گیا اور ابھی تک یہ ہاتھ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔“ اس

نے اپنے زخمی شانے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جلال کا بتایا تھا کہ اس نے اس پر راقل کا بٹ آزمایا تھا۔ جلال

کی لاش اور اس کے نیچے انگارے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ بیرم خان کے سینے پر پورا بڑسٹ لگا تھا اور وہ شاید فوراً ہی

مر گیا تھا مگر اوپر سے آنے والے نے خاصی مشکل سے جان دی تھی کیونکہ دو گولیاں اس کے پیٹ اور ران پر لگی

تھیں اور وہ خون بہنے سے مرا تھا۔ اسی وجہ سے اسے اتنا موقع ملا کہ وہ بیرم خان کو مار سکے۔ بیرم خان حلیے اور

چہرے مہرے سے پڑھا لکھا فحش لگ رہا تھا۔ وہ یقیناً انگلینڈ میں اچھی زندگی گزار رہا ہو گا مگر لالچ اور انتقام کی خواہش نے اسے مروا دیا تھا اور اب اس کی لاش یہاں بے گور و کفن پڑی تھی اور اگر اس کے اہل خانہ تھے تو ان کو کچھ علم نہیں تھا۔ میں فتح خان سے مطمئن نہیں تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے ہتھیاروں کا جائزہ لیا کہ ان میں سے کوئی اس کے ہاتھ تو نہیں لگا ہے پھر حفظ ماتقدم اس کی تلاشی لی۔ مگر اس کے پاس کچھ نہیں تھا اس کے بعد میں ہیرم خان کے پاس آیا اور اس کے خون آلود لباس سے ہاتھ بچاتے ہوئے بہ مشکل اس کی جیبوں کا معائنہ کیا اور بالآخر چابی برآمد کر لی یہ ایک ہی چابی تھی جس سے تمام تالے کھلتے تھے۔ میں نے ہاتھوں اور پیروں کو آزاد کر کے بے انتہا سکون محسوس کیا۔ اس کے بعد میں نے سب سے پہلے اپنا سامان تلاش کیا۔ مجھے پرس، موبائل اور جیب کی چابیاں جلال کے پاس سے ملیں۔ مگر افسوس موبائل کی اسکرین اس کے نیچے دب کر ٹوٹ گئی تھی یہ بیکار ہو گیا تھا۔ میں نے سم نکال کر اسے وہیں پھینک دیا اور باقی چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ فتح خان نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”میرے کو پانی دو۔“

میں نے بوتل اسے تھما دی اس کے بعد میں نے مارے جانے والے افراد کا اسلحہ جمع کیا۔ اس میں چار عدد خود کار رائفلیں اور تین عدد پستول تھے۔ ان سب کو اپنی پناہ گاہ میں لے کر ڈال دیا۔ میرے لیے ایک رائفل اور ایک پستول کافی تھا۔ پھر میں نے چاروں لاشیں بھی اسی جگہ ڈال دیں۔ ان کو ایسے ہی چھوڑنا مناسب نہیں تھا کیونکہ گمرکی تھی اور آسمان پر چلیں منڈلا رہی تھیں۔ میں نے آس پاس سے پتھر جمع کر کے ان کو ڈھانپ دیا۔ اس کام میں خاصا وقت لگا مگر مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب لاشیں مردار خور پرندوں اور جانوروں کی دسترس سے دور تھیں۔ میں واپس آیا تو فتح خان پوری بوتل خالی کر چکا تھا۔ بہر حال وہاں اور پانی بھی تھا۔ میں نے چائے کا پانی چڑھایا اور ہیرم خان مرحوم کے خوراک کے ذخائر کا جائزہ لیا۔ اس میں بہترین ٹوٹا فاش، فرنی آلو، مٹر، حلال گوشت اور اناس کے پیکٹ، کولڈ ڈرینک اور کافی چائے دونوں کا مکمل سامان تھا۔ میں کافی دیکھ کر خوش ہو گیا اور فوراً چائے بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کافی تیار کر کے میں نے ایک مگ فتح خان کو دیا اور دوسرا خود سنبھال لیا۔ اس نے منہ بنا کر گھونٹ لیا اور بولا۔

”اب تم کیا کرے گا؟“

”سوچا نہیں ہے ممکن ہے تمہیں اسی طرح چھوڑ جاؤں یا پھر ایک گولی مار کر تمہارا قصہ پاک کر دوں۔“

اس نے اپنی منگوں جیسی آنکھیں سیڑ کر پوچھا۔ ”تم اپنی دھمکی پر عمل کرے گا۔“

”میں دھمکی نہیں دیتا ہاں جو کرنا ہوتا ہے وہ کر گزرتا ہوں۔ فتح خان میں نے تم کو بہت چھوٹ دی۔ بار بار

کہا کہ میرے راستے میں مت آؤ مگر تم نہیں مانے۔ ایک احمقانہ خیال کے تحت تم میرے پیچھے لگے رہے۔ ٹھیک ہے ہیرے اس وادی میں ہیں لیکن انہیں صرف میں ہی تلاش کر سکتا ہوں۔ تمہارے اس خناس نے مجھے بہت مشکلات سے دوچار کیا۔ صرف مجھے نہیں میرے ساتھیوں کو بھی اور وہ اس بات پر برا فروختہ رہے ہیں کہ میں تمہیں چھوٹ کیوں دیتا رہا ہوں۔“

”چھوٹ تو میں بھی دیتا رہا ہوں۔“

”ہاں لیکن اپنے مفاد کے تحت۔“ میں نے کہا۔ ”میرا تم سے کوئی مفاد نہیں تھا۔ تم نے مجھ پر ذاتی حملے کیے۔ میری حویلی میں گھس کر سویرا کو اغوا کیا۔“

”تم نے بھی ہینا کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ وہ بولا۔ ”میں نے حساب برابر۔۔۔۔۔“

”کواس مت کرو۔“ میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”سویرا اور ہینا کا موازنہ مت کرو اس کا کردار تم خود بھی جانتے ہو اور اسی لیے تم نے اسے قتل کیا۔ پھر تم مسلسل میرے ساتھیوں کے پیچھے پڑے رہے۔ کبھی تم مرشد اور کبھی ڈیوڈ شا کے گماشتے بن کر میرے خلاف میدان میں رہے۔ حد یہ کہ تم نے منشی دل جی جیسے گھنیا شخص سے بھی اتحاد کر لیا۔ تمہاری وجہ سے ہمارا منصوبہ ناکام ہوا۔ سو سے زائد افراد مارے گئے اور سب سے قیمتی فرد بیٹو تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے میں ہمیشہ کی طرح یہ سب بھول جاؤں گا۔ شاید میں بھول بھی جاتا لیکن فتح خان اب میں اپنے ساتھیوں پر مزید کوئی افتاد برداشت نہیں کر سکتا۔“

فتح خان خاموشی سے سن رہا تھا۔ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو شاید میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ اس نے دھمے لہجے میں کہا۔ ”تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان اب میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ قصہ اب یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔“

”کیا کرے گا مجھے بھوکا پیاسا مرنے کے لیے یہیں چھوڑ جائے گا؟“ اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔

”میں کسی انسان کے ساتھ اتنا انسانیت سوز سلوک نہیں کر سکتا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اس کے مقابلے میں ایک گولی استعمال کرنے کو ترجیح دوں گا۔“

”تب دیر کس بات کا ہے گولی استعمال کرو اور جاؤ۔“ فتح خان نے کہا۔ میں اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ناشتے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے چائے بنائی اور نان کے ساتھ فتح خان کو دی اور خود بھی کھائی۔ اس دوران میں دھوپ یہاں تک آچکی تھی اور آس پاس خوب روشنی ہو چکی تھی۔ ناشتے کے بعد میں کھڑا ہوا تو فتح خان کا چہرہ ست گیا تھا اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”شہباز کیا تم سچ مجھے قتل کرو گے؟“

”کیا تمہیں شک ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اپنی آخری خواہش بیان کرو۔“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور پھر ہنسا۔ ”تم کیا سرکار ہے جو سزائے موت دینے سے پہلے آخری خواہش پوچھ رہا ہے؟“

”میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں اپنی آخری خواہش بیان کرو۔ میرے بس میں ہوا تو میں ضرور پوری کروں گا۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”اگر ایسا ہے تو شہباز خان مجھے ہیرا لا دو۔ یہ میرا آخری خواہش ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”فتح خان اب بھی وقت ہے سوچ لو اور کوئی اور خواہش کر دو۔“

”نہیں میرا یہی خواہش ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”تمہاری مرضی۔“

میں شامی ڈھلان کی طرف بڑھتا تھا کہ فتح خان نے عقب سے پوچھا۔ ”شہباز تم ہیرالانے جا رہا ہے؟“
 ”ہاں تمہاری آخری خواہش پوری کرنے۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ شامی ڈھلان ابھی تک سائے
 میں تھی مگر درختوں تلے روشنی ہو گئی تھی۔ مجھے اس درخت تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی جس کے تنے
 کے سوراخ میں اُلونے گھونسلایا ہوا تھا اور اسی اُلوکے باقیات وہاں زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے جڑ کے خلا
 میں ہاتھ ڈالا اور کسی قدر دقت سے وہ سیاہ دھاتی بکس نکال لیا جس میں وہ نا ارب ہیرے تھے جو روس کی ملکہ
 کیتیرین کے خزانے میں شامل تھے۔ انہیں ملکہ کے آنسو کہا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ تیس نایاب اور قیمتی ہیرے
 تھے۔ یہ ہیرے ایک روسی جنرل کے ہاتھ لگے اس نے افغانستان میں کمانڈ کی تھی۔ ان ہیروں کا سونہر لینڈ کے
 کسی دولت مند سے سودا کیا اور برٹ شامی نے ان ہیروں کو پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی۔ مگر برٹ شامی کی شامت
 کہ اس نے فتح خان جیسے شخص کی خدمات حاصل کیں اور نہ صرف ہیروں بلکہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو لیے
 تھے۔

میں اس سیاہ بکس کو دیکھ رہا تھا جو سالوں سے تنے کے سوراخ میں پڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اس میں
 ہاتھ ڈالا تب بھی وہاں موجود تھا مگر جب فتح خان نے مجھے لکارتو میں نے سیاہ بکس کی بجائے انڈا نکالا اور جب
 اسے رکھنے لگا تو صفائی سے سیاہ بکس نکال لیا۔ میرا پاؤں جڑ کے خلا میں گیا تو میں نے گرتے ہوئے پاؤں کھینچنے
 کے بہانے سیاہ بکس اس خلا میں ڈال دیا یہی وجہ تھی کہ وہ جلال کو تنے کے سوراخ میں نہیں ملا تھا۔ میں اسے لے
 کر واپس روانہ ہوا۔ اصولاً یہ ہیرے ایجن کو ملنے چاہیے تھے اگرچہ اس کی ملکیت بھی نہیں تھی۔ اس کے باپ کو
 کسی کو پہنچانے تھے۔ مگر مجھے برٹ شامی ساکھ اور اس سوئیس دولت مند کی کوئی پروا نہیں تھی جو ان ہیروں کی
 قیمت ادا کر چکا تھا۔ میں واپس آیا تو فتح خان کی حالت دیدنی تھی سیاہ بکس دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ ”یہ تمہارے پاس
 تھا تم دھوکا دے رہا تھا؟“

”فتح خان مجھے اس دولت یا اس سے کہیں زیادہ دولت کے لیے بھی کسی کو دھوکا دینے کا کوئی شوق نہیں
 ہے۔ اس سے ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ قیمتی میری جان ہے۔“ میں نے سیاہ بکس اس کی طرف اچھال دیا۔ اس
 نے کچکچ کیا اور مایوسی سے بولا۔

”فائدہ جب میں مرجاؤں گا۔“

”فتح خان موت کی صورت الگ ہوتی ہے اور وہ صرف میری نہیں کسی بھی صورت میں آسکتی ہے۔ اسے
 اپنے وقت پر آنا ہوتا ہے اور انسان اس وقت سے ناواقف ہوتا ہے۔“

”تم نے کہاں چھپایا تھا؟“

میں نے اسے بتایا کہ سیاہ بکس کہاں تھا اور میں نے اس کے ساتھ کیا ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔

”اب تم کیا کرے گا مجھے مارے گا اور ہیرالے جائے گا؟“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”ظاہر ہے جب تم مرجاؤ گے تو یہ تمہارے لیے بیکار ہو جائیں گے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تب میں انہیں

لے جاؤں گا۔“

”شہباز خان یہ تو چالاکی ہوا۔“

”نہیں فتح خان چالاکی تم نے کی۔ میں نے تم سے آخری خواہش کا اسی لیے پوچھا تھا کہ میں اسے پورا نہ کر سکوں تو تم بیچ جاؤ مگر تم نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ہیرے مانگ لیے جو تمہارے خیال میں، میں نہیں لاسکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں موقع دیا اور تم نے اصرار کر کے وہ بھی گنوا دیا۔ تو چالاکی میں نے کی یا تم نے؟“

”ٹھیک کہا تم نے چالاکی میں نے کی اور اب سزا بھی مجھے ملے گی۔“ فتح خان نے سنجیدگی سے کہا۔

”شہباز مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہے کیونکہ میں ایک بہادر دشمن کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا۔“

میں نے پستول نکالا اور فتح خان کے پاس چلا آیا اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا تھا میں نے پستول کا رخ اس کے سر کی طرف کیا تو نہ جانے کیوں میرے ہاتھ میں لرزش آئی تھی۔ اس سے پہلے جب میں نے کسی پر گولی چلائی تو میرا ہاتھ نہیں لرزتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں جو قتل کر رہا ہوں وہ اپنی زندگی کے لیے کر رہا ہوں اور مجھے اپنے دفاع کا حق بھی ہے۔ مگر اس بار میں خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا تھا۔ فتح خان نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے لگا تار تین گولیاں چلائی اور پلٹ کر چل پڑا۔ میں مزید نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بس آخری منظر یہ تھا کہ فتح خان گر گیا ہے۔ میرا سر گرم ہو رہا تھا اور قدم خود بخود تیز اٹھ رہے تھے۔ میں نے ہیروں والا بکس نہیں اٹھایا تھا۔ مجھے ان ہیروں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو نہ جانے کتنے انسانوں کی موت کی وجہ بنے تھے۔ نا لے تک آیا تو اس میں پانی نایاب تھا۔ پانی کی تلاش میں مجھے کچھ آگے جانا پڑا تھا۔ ایک جگہ کچھ پانی جمع تھا۔ میں نے جھک کر اس سے منہ پر چھینے مارے اور سر پر ڈالا تاکہ میرے سر کی گرمی کچھ کم ہو۔ کچھ دیر میں اس بخ پانی سے خود کو سرد کرتا رہا اور پھر کھڑا ہوا۔ پانی نے میری گرمی دور کر دی تھی اور اب میں پُر سکون تھا۔ میں بوتل ساتھ نہیں لایا تھا کیونکہ آگے مجھے پانی ملتا رہتا۔ ذرا آگے جا کر نالا گھومنا شروع ہوا تو اس میں دائیں بائیں سے آنے والے کچھ نالوں کا پانی شامل ہونے لگا تھا اور اب اس نے ندی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد پل تک پہنچ جاؤں اور پھر اس جگہ سے روانہ ہو جاؤں کیونکہ مجھے اس سے وحشت ہو رہی تھی۔ ندی میں پانی کم ہونے سے مجھے سفر کرنا آسان لگ رہا تھا۔ آگے پانی زیادہ ملتا تو مجھے کناروں پر سفر کرنا پڑتا اور اس سے رفتار ذرا کم ہو جاتی۔ ایک گھنٹے بعد میں نصف راستہ طے کر چکا تھا۔ اس سے آگے پل تک پہنچنے میں مجھے مزید ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا اور تب تک آسمان بادلوں سے بھر گیا تھا۔ یہ گزشتہ دو دنوں سے پڑنے والی تیز دھوپ اور گرمی کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس سے پہلے کہ بارش شروع ہوتی میں پل کے چوکیدار کی کوٹھری تک پہنچ گیا تھا۔ جیب اپنی جگہ موجود تھی۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا اور فوراً ہی اندر سے ایک کراہت آمیز بو آئی۔ یہ سڑتے ہوئے خون اور گوشت کی بو تھی۔ اندر کھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے اندر جھانکا تو چوکیدار اپنے خون میں غلطاں فرش پر اوندھ منہ پڑا ہوا تھا۔ اسے مرے ہوئے کم سے کم تیس پینتیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب نہیں معلوم کہ یہ فتح خان کا کام تھا یا حیرم خان کا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر پیچھے ہٹا تھا کہ کسی نے عقب سے میرے سر پر وار کیا اور بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے سنا۔ ”قاتل کا بچہ کیسے ہاتھ آیا؟“



لگ ایسا رہا تھا کہ پیچھے بیرم خان یا فتح خان کا کوئی آدمی رہ گیا تھا اور اسی نے میرے سر پر وار کر کے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کیا تھا۔ مگر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو تھانے میں پایا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے مجھے اس کا پتا چل گیا تھا کیونکہ تھانے میں دن دہاڑے ایک چور سے اعتراف کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ اس نے خان کی گھوڑی چرائی ہے۔ اعتراف جرم کرانے والے اس سے گھوڑی برآمد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مبینہ ملزم کے ساتھ زور و شور سے تفتیش جاری تھی۔ زور پولیس والوں کا تھا اور شور مبینہ ملزم کا۔ ہر لڑ پر جس کی آواز الگ سے سماعت تک آ رہی تھی وہ دل خراش چیخ کے ساتھ دہائی دیتا اور مصرع طرح کے طور پر دہراتا۔ ”اف ام مرگئی..... بالکل مر گئی۔“

یہاں کی مقامی زبان پشتو تھی مگر تھانیدار پنجاب سے آیا ہوا تھا اس لیے ملزم اردو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ وہ خالص سلطان راہی اسٹائل میں بڑھکیں مار رہا تھا۔ مگر گالیاں وہ پولیس ڈکشنری سے ہی دے رہا تھا۔ اس شور سے مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا سر یک دم بہت نازک ہو گیا ہو اور شور کسی ٹھوس شے کی طرح اس سے ٹکرا رہا ہو۔ مارنے والے نے رحم دلی کو بالائے طاق رکھ کر وار کیا تھا اور غالباً اسے میرے پاس موجود خطرناک اسلحے سے خدشہ تھا کہ وار ہلکا رہ گیا تو میں جوانی کا ردوائی میں اسے یقینی طور پر فوت کر دوں گا اس لیے اس نے میرا سر پھاڑ ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو حوالات کا کمر ایک لمحے کو گھوما تھا اور پھر اپنی جگہ قائم ہو گیا۔ سر سے بہنے والا خون میری گدی تک آیا تھا اور یہ اچھی بات تھی ورنہ وار کی قوت اتنی تھی کہ اگر میرا سر نہ پھٹتا تو اندرونی جریان خون کا مسئلہ ہو سکتا تھا۔ میں بہ مشکل اٹھ کر بیٹھا اور پھر کونے میں رکھے پانی کے گھڑے سے پانی نکال کر پیا تو طبیعت میں بہت افاقہ ہوا تھا۔ اسلحہ سمیت میرا پرس اور تمام چیزیں غائب تھیں۔ صرف کپڑے اور جو تے ان لوگوں نے پتا نہیں کیسے چھوڑ دیے تھے۔

میں پانی پی کر ایک طرف دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا کیونکہ اس دیہاتی تھانے کے حوالات میں فرش پر درمی بھی نہیں تھی۔ سوال یہ تھا کہ مجھے یہاں لایا کون تھا؟ آیا کہ یہ کارنامہ خیر پولیس والوں نے خود انجام دیا تھا یا چوکیدار کے لواحقین نے مجھے قاتل سمجھ کر بے ہوش کر کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ بہر حال یہ طے تھا کہ میں لازم کی حیثیت سے یہاں آیا تھا اور میرے کسی بھی عمل کا رد عمل بہت شدید ہو سکتا تھا۔ اس لیے مجھے جو کرتا تھا اگے کا سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔ میں نے خود سے شور کرنے اور آتیل مجھے مار کہنے سے گریز کیا۔ کچھ دیر بعد ایک ہائیبیل نے اندر جھانکا اس کی قمیص آدمی چتلون سے باہر تھی اور اس نے بیلٹ بھی نہیں باندھی ہوئی تھی۔ وہ وتے سے اٹھ کر آیا تھا اور مجھے بیدار دیکھ کر اس نے پہلے بلند آواز سے جہاں لی اور اس سے بھی بلند آواز سے لا۔ ”بندے کو ہوش آ گیا ہے۔“

”میں کہاں ہوں؟“ میں نے سوال کیا تو اس نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا۔

”تجھے باہر شور سنائی نہیں دے رہا اور یہ وردی دکھائی نہیں دے رہی ہے کیا؟“

”میرا مطلب ہے کہ میں کون سے تھانے میں ہوں؟“

”تجھے جلد پتا چل جائے گا۔“ اس نے کہا اور اپنی قمیص چتلون میں کرتا چلا گیا۔ غالباً تھانے میں ملزم کم اور ان کو تختہ مشق بنانے کے لیے کم لوگ ملتے تھے اس لیے میری باری جلد آگئی۔ دو سپاہی آئے ایک نے

لاکر آپ کا دروازہ کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی میں باہر آیا دوسرے نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔
 ”آرام سے میں بھاگ نہیں رہا اور نہ ہی بھاگنے والوں میں سے ہوں۔“ میں نے ذرا دنگ لہجے میں کہا۔ مگر اس میں بد معاشی کا تاثر شامل کرنے سے گریز کیا۔
 ”کون اے تم جو اس طر بات کرتا ہے۔“ مجھے پکڑنے والے سپاہی نے کسی قدر مرعوب ہو کر کہا۔
 ”مجھے ایس ایچ او کے پاس لے چلو۔“

”اس کے پاس ہی لے جا رہے ہیں۔“ دوسرا معنی خیز انداز میں بولا۔ ایس ایچ او خالص پولیس والا تھا۔ اس کی تو ندکا حجم بتا رہا تھا کہ اس کی پرورش کیسے کی گئی تھی۔ وہ ایسی سفید رنگت رکھتا تھا جس میں اعمال کی سیاہی شامل ہو گئی تھی۔ کسی قدر بڑھی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ خطرناک تھانیدار لگ رہا تھا۔ جب تک مبینہ ملزم کے ساتھ تفتیش جاری تھی اس نے لُج میں سالم مرغا تناول فرمایا تھا اور اس وقت ماچس کی تیلی سے خلال میں مصروف تھا۔ گھوڑی چور غالباً عارضی رخصت پر تھا اور اس دوران میں مجھے طلب کر لیا تھا۔ میں نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

”مجھے کس الزام میں پکڑا ہے۔“

”الزام بھی بتا دیں گے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”پہلے اپنا تعارف تو کراؤ۔“

”میرا نام شہباز ملک ہے اور میں یہاں سیاحت کے لیے آیا ہوں۔“

”اس پل کے آس پاس کون سی جگہ ہے سیاحت والی؟“ اس کے لہجے کی معنی خیزی بڑھ گئی۔

”میں ندی کے ساتھ ساتھ ٹریک پر گیا تھا۔ اپنی جیب پل کے چوکیدار کی رکھوالی میں چھوڑ گیا تھا۔ واپس آیا تو کوٹھری میں اس کی لاش پڑی تھی اور پھر کسی نے مجھے سر پر دار کر کے بے ہوش کر دیا۔“

”اپنے شریف شاہ نے کام کیا تھا۔“ ایس ایچ او نے مجھے لانے والے سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بڑا ظالم ہاتھ مارتا ہے۔“

”اگر تمہارا خیال ہے کہ میں نے چوکیدار کو قتل کیا ہے تو تم غلطی پر ہو یہ کام کسی اور کا ہے اور میں اپنی جیب

لینے آیا تھا۔“

”صرف چوکیدار کو قتل نہیں ہوا ہے۔ اس کی نبی بیوی بھی غائب ہے۔ اسے کہاں لے گئے تم اور اس کے ساتھ کیا کیا؟“ کہتے ہوئے ایس ایچ او کے اندر کی خباثت لہجے میں آ گئی۔ ”وہ کہاں ہے مر گئی ہے یا کہیں پڑا ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں چوکیدار کی بیوی کے بارے میں نہیں جانتا۔ دو دن پہلے میں یہاں آیا

اور جیب اس کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔“

”ملک صاحب ایسے کام نہیں چلے گا۔“ ایس ایچ او نے چالاکی سے کہا۔ ”تمہارے پاس کوئی شاخ

دستاویز بھی نہیں ہے۔ اسلام آباد نمبر کی جیب لے کر گھوم رہے ہو۔“

”میرے شناختی کاغذات جیب سے ندی میں گر گئے۔“

”جیب بھی کسی شاہین ایاز کے نام پر ہے۔“

”ایاز میرا دوست ہے اور شاہین اس کی بیوی ہے جیب اسی کے نام پر ہے۔“

ایس ایچ اواب تک مجھ سے محتاط انداز میں بات کر رہا تھا غالباً اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں چلتا پھرتا آدمی نہیں ہوں۔ یہ چھوٹا دیہاتی علاقہ تھا اور یہاں وہ کسی اثر و رسوخ والے بندے کے ساتھ زیادتی کر جاتا تو اسے آگے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ اس نے میز کے نیچے سے رائفل اور پستول اٹھا کر سامنے رکھ دیئے۔

”تمہارے پاس سے یہ اسلحہ نکلا ہے۔ اس کا لائنس کہاں ہے؟“

”بد قسمتی سے لائنس بھی کاغذات کے ساتھ ندی میں ہی گر گیا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہاں ہر دوسرا

بندہ ایسے ہی اسلحہ لے کر گھومتا ہے ان سے پوچھا کبھی۔“

”ادھر والوں کو اجازت ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ملک صاحب مجھے مطمئن کر دو ورنہ میں

تین سو دو اور انگوٹے ایف آئی آر کاٹنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

یہ تو اس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ کس قسم کا اطمینان چاہتا تھا۔ اسے چوکیدار یا اس کی گم شدہ بیوی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی سمجھ رہا تھا کہ اس کیس میں پھنسانے کے لیے اسے ایک ایسا مرغا ہاتھ آگیا جس سے وہ خاصا مال کھینچ سکتا تھا۔ اس جگہ مال کمانے کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ یہاں جن کے پاس پیسہ تھا وہ اس جیسے تنہا دار کو جوئے کی نوک پر رکھتے ہوں گے اور باقی غریب غربا کے پاس کیا تھا زیادہ سے زیادہ اسے یہاں مرغ مسلم مل جاتا ہوگا۔ یقیناً اسے اپنی کسی غلطی کی وجہ سے یہاں پھینکا گیا تھا۔ ایسا کیس تو مہینوں میں جا کر ایک بار ہاتھ آتا تھا۔ میرے پاس سے تقریباً ساٹھ ہزار کی رقم برآمد ہوئی تھی اس لیے وہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ جو صرف جیب میں اتنی رقم لے کر گھوم رہا ہو وہ اونچی پارٹی ہوگا۔ میں راجا صاحب کا حوالہ دے سکتا تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ اس قسم کے معاملات میں انہیں ملوث کروں اور بلا وجہ کا احسان سرفروں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کرتے ہوئے سر ہلایا اور بولا۔ ”میں اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ایس ایچ اوانے اسلحہ واپس میز کے نیچے رکھ دیا۔ اور سپاہی اس کے انداز سے سمجھ گیا تھا اس لیے خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ایس ایچ اوانے برا منایا تھا مگر منہ سے کچھ کہا نہیں۔ میں نے کہا۔ ”میرے پاس سے جو رقم نکل گئی۔“

”اسے بھول جاؤ۔“ اس نے صاف کہا۔ ”آگے بات کرو۔“

”دیکھو میں نہیں چاہتا کہ یہاں رہنے والے اپنے واقف کار کو زحمت دوں۔ ورنہ تمہیں رقم بھی واپس لرنی پڑے گی اور میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا تاوان بھی دینا پڑے گا۔“

”بادشاہ و مسلمان چودھری آج تک کسی کی دھمکی میں نہیں آیا۔“ اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ”ادھر اور میں بھی دو پھنپھن خان تھے۔ دونوں کو مقابلے میں لڑھکا دیا۔ اسی لیے آج یہاں بیٹھا ہوں۔“

”میں پھنپھن خان نہیں ہوں۔ شریف آدمی ہوں اور کسی جرم میں ملوث نہیں ہوں۔“ میں نے بدستور نرم بے میں کہا۔ ”تم خود سوچو کہ میں نے قتل کیا ہوتا تو میں اسے آوازیں دیتا ہوا کوٹھری تک آتا۔ اپنے آدمی سے بے ہوش کیا میں چوکیدار کو آواز دے رہا تھا کہ اپنی جیب لے جاؤں۔ کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا جواب نہیں ملا تو ذرا سا کھولا تھا وہیں سے میں نے چوکیدار کی لاش دیکھی تھی۔ میں تو اندر تک نہیں گیا تھا۔“

”ٹھیک پر ملک صاحب آپ ادھر گئے کیوں تھے وہ جگہ تو اجازت جنگل ہے۔“

”میں سیاح ہوں اور میری ایک ٹورسٹ کمپنی ہے۔ میں یہاں کسی اچھے ٹریک کی تلاش میں گیا تھا۔“

سلمان چودھری نے دانتوں میں خلالا بند کیا۔ ”اس اسلحے کی کیا وضاحت کرو گے۔ صرف مقامی لوگ

ایسے اسلحے رکھتے ہیں باہر سے آنے والوں کو اجازت نہیں ہے۔“

درحقیقت مجھے کلاشنکوف نے پھنسا دیا تھا اگر پستول ہوتا تو اس کی وضاحت آسانی سے ہو جاتی۔

کلاشنکوف ممنوعہ اسلحے میں آتی ہے اور اس کا لائسنس عام دستیاب نہیں ہے صرف وی آئی پی حضرات کو ملتا ہے۔

میں اعتراف کر چکا تھا کہ میرے پاس لائسنس تھا جو ندی میں گر گیا ہے۔ یہ حقاقت تھی اگر میں کہہ دیتا کہ کلاشنکوف

میں چوکیدار سے کرائے پر لے کر گیا تھا تا کہ اپنا دفاع کر سکوں تو یہ شاید معقول بات ہوتی۔ مگر سر کی چوٹ نے

شاید میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر اثر ڈالا تھا۔ میں نے کہا۔ ”چودھری صاحب آپ جانتے ہیں کہ کاروباری

لوگوں کی دشمنیاں بھی ہوتی ہیں اور بندے کو اپنی حفاظت کے لیے ایسی چیزیں رکھنی پڑتی ہیں لیکن یہ صرف یہیں

کی حد تک ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں مگر لیکن بہر حال ایک لاش تو ہے اور آپ اسی کے پاس سے پکڑے گئے

ہو۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اتنی آسانی سے چھٹکارا تو نہیں ملے گا۔“

”آپ جو چاہتے ہیں کھل کر کہیں۔“ میں نے کہا۔

”دس لاکھ روپے۔“ وہ ذرا جھک کر دھیمے لہجے میں بولا۔

”یہ بہت زیادہ ہیں۔ میں کاروباری ہوں کوئی جدی پشتی دولت مند نہیں ہوں۔“

”دس لاکھ سے ایک روپیہ بھی کم نہیں ملک صاحب۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہاں یا نہ میں

جواب دو۔“

دس لاکھ مسئلہ نہیں تھے مگر میں اس کے منہ میں دس لاکھ ڈال دیتا تو وہ آگے پھر کوئی مسئلہ کھڑا سکتا تھا۔ اس

لپے میں نے بھی اسی جیسا رویہ اپنایا۔ ”ٹھیک ہے دس لاکھ..... مگر اس کے بعد ایسا ہونا چاہیے جیسے میں یہاں کبھی

آیا ہی نہیں تھا میرا نام نہ آئے اور نہ کہیں کوئی ذکر ہو۔“

”منظور ہے۔“

”رقم میرا وکیل لے کر آئے گا اور آگے وہی تم سے بات کرے گا۔“

”منظور ہے۔“ اس نے پھر جواب دیا۔

”مجھے کوئی موبائل دو، کاغذات بچانے کے چکر میں موبائل بھی پانی میں گر گیا اور نوٹ بھی گیا تھا اسے

پھینک دیا تھا مگر سم میرے پرس میں ہے وہ بھی دو۔“

اس نے میرا پرس برآمد کیا اور اس میں موجود سم ایک کھٹارے موبائل کے ساتھ میرے حوالے کر دی۔

میں نے سم موبائل میں لگائی اور ندیم کا نمبر ملایا۔ اس نے پہلی تیل پر اٹھا لیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ”ٹو زندہ

ہے۔“

”حسب معمول اور اللہ کے فضل سے۔“

”مارکو پولو کے گھوڑے، ابن بطوطہ کے فخر سنا ہے تو آتے ہی دولتیاں جھاڑتا ہوا شمالی علاقے کی طرف بھاگ نکلا۔ اب کہاں ہے؟“

”تھانے میں۔“ میں نے کہا تو ندیم نے اتنا بلند بانگ قہقہہ مارا کہ تھانیدار نے بھی سنا۔

”مجھے معلوم تھا تیرا یہی انجام ہوتا ہے ایک دن، جتنے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔“

”بکو اس مت کر، یہاں ایک چودھری صاحب کرتا دھرتا ہے اور تین سو دو کے کیس میں مجھے شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ مغویہ کا معاملہ بھی ہے، مگر یہ زیر دفعہ دس لاکھ کے تحت بات ختم کرنے کو تیار ہیں۔“

ندیم سنجیدہ ہو گیا اس نے کہا۔ ”میری بات کرا۔“

میں نے موہاں سلمان چودھری کی طرف بڑھا دیا۔ پہلے تو ان دونوں میں گرما گرمی ہوئی کیونکہ دونوں نے اپنی اپنی اوقات جتانے کی کوشش کی پھر ذرا اعتدال میں آئے اور بالآخر نرمی سے بات کرنے لگے۔ جب بات قہقہوں اور گپ شپ تک آئی تو میں نے اشارے سے سلمان چودھری کو یاد دلایا کہ موہاں میں بیلنس بھی ہوتا ہے جو خرچ ہو جاتا ہے۔ بادل نا خواستہ اس نے موہاں میرے حوالے کیا اور ندیم نے کہا۔ ”میں نے سیٹنگ کر لی ہے تیرے کسی گھوڑے کو دوڑاتا ہوں۔ بارہ گھنٹے مزید یہاں رہ اور مرے کر۔“

”وہ تو کر رہا ہوں سر پھٹا ہوا ہے اور خون تک صاف نہیں ہوا ہے۔“

”سب ہو جائے گا، ٹو بے فکر ہو جا، بندہ واقف کار نکل آیا ہے۔ بڑی حرامی چیز ہے میں اسے اچھی طرح

جاننا ہوں۔ بہر حال اب تیرے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔“

میں نے سم نکال کر موہاں اسے واپس کرنا چاہا تو اس نے کہا۔ ”رکھیں جی ہو سکتا ہے آنے والا ساتھی آپ سے رابطہ کرے۔“

ایک گھنٹے بعد میں مرہم پٹی کے بعد بیٹھا ہوا مرغ مسلم کے مزے اڑا رہا تھا۔ یہ دیکھی مرغ تھا مگر کسی ماہر فن نے تلا تھا۔ اس کے ساتھ شمالی علاقے میں ملنے والی گاڑھے دہی جیسی لسی تھی۔ یہ میرا لچ بھی تھا اور ڈنر بھی جو میں نے شام کے وقت کیا۔ خوش قسمتی سے میرا لباس صاف تھا اس لیے دوسرے کپڑوں کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مجھے ایک چار پائی دی گئی تھی اور کھانے کے بعد میں دو عدد پینا ڈول لے کر اس پر مچو استراحت ہو گیا۔ اس دوران میں عبداللہ سے بات ہوئی تھی اور وہی رقم لے کر آ رہا تھا۔ میں نے احتیاطاً صرف کام کی بات کی اور وادی کے ایڈوینچر کا ذکر کرنے سے گریز کیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ صبح تک پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ رات کسی قدر سردی لگی مگر گزارا ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کے ساتھ مجھے باقی سہولتیں بھی مہیا کی گئی تھیں مگر ہر جگہ ایک سپاہی میرے ساتھ لگا رہا۔ جیپ تھانے کے احاطے میں موجود تھی۔ خلاف توقع رات سکون سے گزری کیونکہ یہاں تفتیش دن میں ہو جاتی تھی۔

صبح فجر کی اذان پر آنکھ کھلی تو میں نے اٹھ کر سوتے سپاہی کو بلایا اور اس سے وضو کرانے کو کہا۔ وہ مجھے تھانے کے ہاتھ روم تک لایا۔ وضو کر کے میں نے نماز پڑھی اور دوبارہ سو گیا۔ دل مطمئن تھا کہ آج اللہ نے نماز کی توفیق دی۔ پھر میری آنکھ سپاہی کے ہلانے سے کھلی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اٹھ جائیں جی تھانیدار جی بلاتی ہے۔“

تھانیدار جی کو مرغ سے خاص دلچسپی تھی کیونکہ ناشتے میں بھی مرغ پراٹھے تھے۔ اس نے مجھے ناشتے پر مدعو

کیا تھا۔ مرغ پراٹھے، پھر لکی اور آخر میں شیرہ جیسی دودھ پتی کی چائے نے مزہ دیا۔ ندیم سے بات کرنے اور معاملہ طے پانے کے بعد سلمان چودھری کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا نو رزم کا بزنس کہاں تک پھیلا ہوا ہے اور میں اسے مزید کہاں تک پھیلا نے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس نے کہا: ”ادھر سوات تک تو سارا بزنس تباہ ہو گیا تھا۔ اب کچھ رونق لگی ہے ورنہ دہشت گردی کے ڈر سے لوگوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔“

میں نے چوکیدار کے بارے میں کراید اتو اس نے مبہم انداز میں بتایا کہ اس کی لاش مقامی اسپتال پہنچادی گئی تھی اور پوسٹ مارٹم کے بعد اسے لواحقین کے حوالے کر دیا جاتا۔ البتہ اس کی بیوی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اب مجھے ایک خدشہ ستانے لگا تھا کہ کہیں اگر پولیس والے ندی کے ساتھ ساتھ ہوتے وادی تک چلے گئے تو انہیں وہاں مزید کئی عدد لاشیں ہاتھ آ جاتیں اس کے بعد میری گلو خلاصی پھر کھٹائی میں پڑ جاتی۔ اسے قاتل کی فکر نہیں تھی کیونکہ اس علاقے میں قاتل جلد یا بدیر پکڑا ہی جاتا ہے۔ چوکیدار کی لازمی کسی سے دشمنی تھی۔ اب یہ خاندانی تھی یا بیوی کی وجہ سے تھی کیونکہ اس کے قتل کے بعد وہ بھی غائب تھی۔ پیسا اس میں طوٹ نظر نہیں آتا تھا۔ اس لیے سلمان چودھری بھی کیس پر توجہ دینے کی بجائے جلد از جلد مجھ سے معاملہ کر لینا چاہتا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ اس کا امکان تھا کہ جلد وادی کی لاشیں مل جائیں گی اور پھر سلمان چودھری کا دھیان میری طرف جائے گا مگر اس کے پاس صرف ایک نام ہوگا۔ ندیم کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ اس کا رخ کرتا تو ندیم خود اس کے گلے پڑ جاتا۔ البتہ میں راجا عمر دراز کا نام لے لیتا تو اس کے پاس ایک سرا ہوتا۔

عبداللہ نوجے آیا۔ وہ مسلسل ڈرائیو کرتا رہا تھا اور تھکا ہوا تھا۔ مجھ سے گلے ل کر اس نے سلمان چودھری سے کہا: ”مجھے ندیم صاحب نے بھیجا ہے میں ان کا نائب اکرم چشتی ہوں۔“

عبداللہ نے روانی سے جھوٹ بولا اور میرے ایک دشمن کا نام لیا جو اتفاق سے ایس ایچ او کا بیٹی بھائی تھا۔ سلمان چودھری نے حریص نظروں سے اس کے ہاتھ میں موجود بیگ دیکھا۔ ”بسم اللہ جی۔“

”مجھے میرا سامان دیا جائے۔“ میں نے مطالبہ کیا۔ اس نے بلا حیل و حجت ہتھیار، ایمونیشن، پرس اور جیب کی چابیاں سامنے رکھ دیں۔ میں نے پستول لے کر بیٹل سے لگایا اور کلاشکوف سامنے کر لی مگر دونوں بغیر گولیوں کے تھیں اس لیے سلمان چودھری مطمئن تھا۔ مزید اطمینان کے لیے باہر ایک مسلح سپاہی موجود تھا۔ عبداللہ نے بیگ اس کے سامنے رکھا۔

”اپنی تسلی کر لیں ایس ایچ او صاحب۔“

اس نے بیگ کھول کر دیکھا اور پھر اندر موجود ہزار کی گڈنیوں کا جائزہ لیا۔ مطمئن ہو کر اس نے بیگ بند کر دیا۔ ”ٹھیک ہے ملک صاحب ڈیل ہو گئی۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سر پھٹا، رات تھانے میں گزرا تا پڑی اور دس لاکھ روپے بھی دیئے مگر میری پولیس سے جان چھوٹ گئی تھی۔ سلمان چودھری نے گرم جوش سے رخصت کیا اور ساتھ ہی پیشکش بھی کی کہ اب میں جب یہاں سے گزروں تو اس کا مہمان ہوں گا اور اس کے تھانے کی حدود میں مجھے کوئی مسئلہ ہوا تو وہ ذمے دار ہوگا۔ باہر آتے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اب یہاں سے گزروں گا بھی نہیں۔ عبداللہ جس گاڑی میں آیا تھا یہاں آتے ہوئے اس نے اس کی نمبر پلٹش بدل لی تھی اور واپسی کے سفر میں دوبارہ بدل لیتا۔ میں نے اسے

مختصر حالات بتائے اور یہ بھی کہ فتح خان سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ وہ خوش ہوا تھا کہ یہ قصہ بھی ختم ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ تفصیلات میں جاتا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”سب جلد از جلد اس علاقے سے نکل جاؤ اور ندیم سے کہنا کہ سلمان چودھری کی کال کے لیے تیار رہے اسے ٹوپی کرانی ہے۔“

”میں بتا دوں گا۔“ عبداللہ نے کہا اور مجھ سے مکمل کر رخصت ہو گیا۔ جب ٹھیک ٹھاک حالت میں تھی۔ اس میں میرا سامان بھی جوں کا توں تھا۔ پرس والی رقم بھی گئی تھی اس لیے میں نے عبداللہ سے کوئی تیس ہزار روپے لیے تھے۔ اگرچہ خاص ضرورت نہیں تھی مگر کہیں کام بھی پڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں ہر ممکن تیزی سے راجا عمر دراز کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبداللہ پہلے ہی مخالف سمت جا چکا تھا۔ دن کی تیز روشنی میں مجھے تیز رفتار ڈرائیونگ کرنے میں مدد ملی تھی اور دو گھنٹے بعد میں اس کچی سڑک تک پہنچ گیا تھا جو راجا عمر دراز کی وادی تک جاتی تھی۔ درے کو کراس کر کے میں نے وادی میں قدم رکھا جہاں میں برسوں پہلے آیا تھا۔ یہاں کے ایک مخلص رہائشی نے مجھے اپنا مہمان بنایا تھا اور دھینا اس کے معذور بوڑھے باپ کی تیسری بیوی تھی۔ اسی وادی سے میری مشکلوں کا آغاز ہوا تھا۔ اگرچہ مرشد اور نادر کا اس وادی سے کوئی تعلق نہیں تھا جو میری اور میرے ساتھیوں کی پرسکون زندگی میں عذاب بن کر آئے تھے۔ مگر بہت سے معاملات کا تعلق تو یہیں سے تھا۔

وادی میں داخل ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہاں اب پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتری آئی تھی۔ اتفاق سے میرا جب بھی آتا ہوا تو پانی ائیر ہوا یا پھر رات کے وقت آیا گیا تھا اس لیے وادی کی حالت دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آبادی تو اتنی ہی تھی اور لوگوں کا طرز زندگی بھی تقریباً وہی تھا یعنی گھٹے ہوئے ہوا بند گھروں میں رہنا، البتہ کیمتوں و باغات کی سرسبزی و شادابی میں اضافہ ہوا تھا۔ اب کھیت اور باغات پہاڑوں پر زیادہ اوپر تک چلے گئے تھے۔ پانی کی نالیوں میں اضافہ ہوا تھا اور مجھے کئی مقامات پر اسکول کی نئی عمارت نظر آئیں۔ جب میں راجا عمر دراز کے محل کی طرف جانے والی پختہ سڑک پر پہنچا تو اسے شاندار حالت میں پایا۔ یہ پتھروں اور سینٹ سے بنائی ہوئی بہت مضبوط سڑک تھی اور یقیناً مقامی کاوش سے تیار ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی سڑکیں تھیں۔

محل سے ذرا نیچے ایک عمارت پر اسپتال اور ڈسپنسری کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ خاصی بڑی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے خوشنما بنگلے بھی بنے ہوئے تھے جو یقیناً یہاں کام کرنے والے ڈاکٹروں کے لیے تھے۔ یہ سب راجا عمر دراز نے کرایا تھا۔ محل کے گیٹ پر حسب معمول دو مقامی افراد گاڑی کی وردی میں مستعد موجود تھے۔ ان میں سے ایک اندر رہا اور دوسرا باہر آیا۔ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور اس نے بھی شاید پہلی بار مجھے دیکھا تھا اس لیے ادب سے بولا۔ ”جی صیب آپ کا نام کیا ہے کس سے ملنا ہے؟“

”میرا نام شہباز ملک ہے اور مجھے راجا عمر دراز صاحب سے ملنا ہے۔“

اس نے اندر والے گاڑی کو بتایا اور خود مستعد ہو کر گیٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی لیکن جدید ماڈل کی ایس ایم جی تھی۔ چند منٹ بعد گیٹ کھلا اور گاڑی نے مجھ سے کہا۔ ”صاحب آپ وہ سفید عمارت تک جاؤ۔“

محل کی عمارت سرخ کھریل والی تھی مگر اب دائیں طرف باغ کے ساتھ ایک چھوٹی سفید عمارت بھی بن گئی تھی۔ پتھروں اور سفید ہی رنگ کے کھریل سے بنی چھت کی اس دو منزلہ عمارت کا رقبہ چھ سات مرلے سے

زیادہ نہیں تھا اور یہ ظاہر یہ گیسٹ ہاؤس جیسی لگ رہی تھی۔ میں نے جیب اس کے سامنے روکی تو اندر سے ایک خادم برآمد ہوا جس نے راجا کے محل کے خادموں والی مخصوص یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور جب میں نیچے اترتا تو اس نے پوچھا۔ ”جناب سامان ہے؟“

”ہاں پیچھے موجود ہے۔“

اس نے عقبی دروازہ کھول کر میرا بیگ نکال لیا۔ اسلحہ دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور پھر اس نے بدستور ادب سے کہا۔

”جناب یہاں کسی باہر سے آنے والے کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔“

میں پہلے ہی اس استقبال پر کھٹکا ہوا تھا اور اس کی یہ بات سن کر میرے اندر غصہ سرسرا نے لگا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں پہلی بار نہیں آیا ہوں اور میں نے ہمیشہ اپنا اسلحہ اپنے پاس رکھا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب لیکن اب اصول بدل گیا ہے۔ آپ کو یہ اسلحہ یہاں جمع کرانا ہوگا آپ کو واپسی میں مل جائے گا۔“

”اسلحہ جمع کرانے کی بجائے میں واپس جانے کو ترجیح دوں گا۔“ میں نے کہا۔ میرا غصہ بڑھنے لگا تھا۔

”میرا بیگ واپس رکھ دو۔“

”جناب آپ غصہ نہ کریں۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔ ”اچھا ایسا کریں آپ بیگ صاحب سے بات کر لیں۔“

”اگر بیگ صاحب کو مجھ سے بات کرنی ہوتی تو وہ خود یہاں موجود ہوتے۔“ میں نے کہا اور اس سے لے کر اپنا بیگ واپس جیب کے عقبی حصے میں ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجا عمر دراز کے محل میں میرا استقبال یوں ہوگا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار میرے ساتھ یہاں براسلوک ہوا تھا مگر وہ حالات اور واقعات کی مناسبت سے تھا۔ مگر اس طرح میرا استقبال کبھی نہیں ہوا تھا کہ صرف ایک خادم مجھے ریسیو کرے اور مجھے ایک الگ تھلگ عمارت میں لے جایا جائے۔ جب میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا تو میں نے خادم کو ایک چھوٹے واکی ٹاک فون پر کسی سے بات کرتے پایا۔ میں نے جیب موڑی اور گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا مگر جب وہاں پہنچا تو گیٹ بند تھا اور میرے ہارن دینے پر بھی نہیں کھلا۔ یہ آٹومیک مشین سے کھلنے اور بند ہونے والا گیٹ تھا۔ پہلے یہ مینول ہوا کرتا تھا مگر اب اسے آٹومیک کر دیا گیا تھا۔ دوبارہ ہارن دینے پر چھوٹی سی چوکی سے گارڈ باہر آیا اور اس نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”جناب بیگ صاحب خود یہاں آرہے ہیں۔ ان کی درخواست ہے کہ آپ ایک منٹ ان کا انتظار کر لیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن ایک منٹ بعد یہ گیٹ کھل جانا چاہیے۔“

اس وقت میرا سر گرم ہو رہا تھا اور شاید چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ایک منٹ تو نہیں مگر دو منٹ بعد بیگ اپنا عیابیا نمازنگین گاؤن لہراتا ہوا وہاں آن موجود ہوا اور اس نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز صاحب پلیز میرے ساتھ آئیے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ نے جو بات کرنی ہے یہیں کر لیں۔“

”ان ملازموں کے سامنے۔“

”اب تک سب ملازموں کے سامنے ہی ہوا ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تو اب کیا مانع ہے بات کرنے میں ہے۔“

غالباً بیگ ملازموں کے سامنے معافی تلافی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی سبکی کا معاملہ تھا۔ مگر میرے ساتھ جو ہوا تھا اس کے بعد میں اسے اتنی آسانی سے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ ایک طرف لے جا کر مجھے منا لے گا مگر میں چاہتا تھا کہ وہ یہ کام سب کے سامنے کرے۔ بیگ کے چہرے پر مسکیت تھی۔ اس نے پھر التجا آمیز نظروں سے دیکھا مگر میں سامنے دیکھنے لگا۔ بادل نا خواستہ اس نے کہا۔ ”شہباز صاحب آپ کو میری وجہ سے جو زحمت ہوئی ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ واپس چلیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں اس شرط پر واپس جاؤں گا کہ جلد از جلد راجا صاحب سے میری ملاقات کرا دی جائے میں صرف ان کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔“

”آپ اندر تو آئیے۔“ اس نے کہا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر آگیا۔ میں نے جیب پھر واپس موڑی اور شکوہ کیا۔

”بیگ صاحب یہاں میرے ساتھ ہمیشہ غلط سلوک ہوتا ہے جب کہ راجا صاحب سے میرا خلوص عیاں ہے۔“

”میں جانتا ہوں اور اس کے لیے بھی معذرت خواہ ہوں۔“ بیگ نے حسب معمول محتاط انداز میں کہا۔

”بعض اوقات طریقہ کار کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے مگر مقصود آپ کی تضحیک نہیں ہوتی ہے۔“

”اس بار مجھے اسی عمارت تک لے جایا گیا ہے۔“

”یہ مہمانوں کے لیے بنی ہے۔“ اس نے صفائی پیش کی۔ ”محل میں جو گیٹ ہاؤس ہے وہاں راجا صاحب کے کچھ رشتے دار مقیم ہیں اس لیے آپ کو یہاں بھیجا گیا اور کیونکہ آپ کی آمد غیر متوقع تھی اس لیے میں خود استقبال کے لیے نہ آسکا۔“

”مجھ سے اسلحہ طلب کیا گیا جب کہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔“

”شہباز صاحب آپ جانتے ہیں کچھ عرصے سے راجا صاحب کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور ایک موقع پر یہاں آنے والے مہمان کا پستول غائب کر کے اس سے راجا صاحب کی جان لینے کی کوشش کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد سے یہاں سوائے گارڈز کے کسی کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ حد یہ کہ میں بھی نہیں رکھ سکتا کیونکہ ہم گارڈز کی طرح ہمد وقت اسلحہ اپنے پاس نہیں رکھتے ہیں اور اس کے چوری ہونے کا امکان ہوتا ہے۔“

ظاہر ہے یہ محل کا پرنٹوکل تھا اور مجھے بھی اس کی پابندی کرنی تھی اس لیے اسلحہ بھی جمع کرنا تھا۔ میں نے جیب اسی عمارت کے سامنے روکی وہی خادم منتظر تھا اس نے پیچھے سے بیگ اور میرا دوسرا سامان اٹھایا۔ میں نے پستول اپنے پاس رکھا اور کلاشنکوف بیگ کے حوالے کر دی۔ میں نے کہا۔ ”پستول چوبیس گتھے میرے پاس ہوتا ہے اور اس کے چوری یا گم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔“

بیگ بادل نا خواستہ اس کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”لیکن پستول سامنے نہ ہو۔“

یوں معاملات سیٹ ہو گئے۔ ہم اندر آئے اور خادم نے ایک پر تعیش قسم کے کمرے میں میرا بیگ رکھا اور مجھ سے چائے پانی کا پوچھا۔ بارہ بج رہے تھے ابھی لُنج میں وقت تھا۔ بیگ مجھ سے کچھ رکھی گفتگو کر کے رخصت ہو گیا مگر اس نے راجا عمر دراز سے میری ملاقات کے بارے میں بھاپ نہیں نکالی تھی اس معاملے میں اس کا رویہ حسب سابق تھا۔ میں نے خادم سے قبوہ لانے کو کہا اور خود بستر پر دراز ہو گیا۔ چند دن کی تھکن تھی جواب تک جسم میں موجود تھی۔ چند منٹ بعد قبوہ آگیا اور ساتھ ہی خادم نے دریافت کیا۔ ”جناب آپ لُنج کب پسند کریں گے؟“ خادم کے پوچھنے سے ظاہر تھا کہ لُنج مجھے اکیلے کرنا تھا ورنہ مجھے وقت بتایا جاتا۔ ”ایک بجے اور یہیں کمرے میں۔“

اس نے سر ہلایا اور رخصت ہو گیا۔ قبوہ محل کا خاص مشروب تھا اور اسے پی کر طبیعت تازہ دم ہو جاتی تھی۔ میں نے بیگ سے دوسرے کپڑے نکال کر استری کروائے اور غسل کر کے جسم سے میل اتارا۔ تازہ دم ہوا تھا کہ لُنج ٹھیک ایک بجے آگیا اور بہت پُر تکلف قسم کا تھا۔ میں نے اس سے بھرپور انصاف کیا۔ اس کے بعد فطری طور پر غماز طاری ہونے لگا۔ سونے سے پہلے میں نے عبداللہ کو کال کر کے اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دینا چاہی تو پتا چلا کہ موبائل پر سگنل نہیں ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں موبائل سروس نہیں ہے۔ محل میں تمام تر رابطہ لینڈ لائن فون، انٹرنیٹ اور سیٹلائٹ فون سے تھا۔ حالانکہ اس وادی کی اچھی خاصی آبادی تھی اور یہاں موبائل کی سروس ہونے چاہیے تھی کیونکہ یہاں بے شمار لوگ ملازمت کے لیے باہر گئے ہوئے تھے اور ان کا رابطہ موبائل سے ہی آسانی سے ہو سکتا تھا۔

میں اٹھ کر کال کرنے کا ارادہ کر کے سو گیا۔ میں تقریباً دو بجے سویا تھا۔ میں چھ سات بجے تک آرام سے جاگ جاتا۔ مجھے دن میں اس سے زیادہ سونے کی عادت نہیں تھی۔ مگر جب میری آنکھ کھلی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ میں حیران ہوا تھا کیونکہ مجھے دن میں اتنی طویل نیند کی عادت نہیں تھی اور نہ ہی تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں بے خبر سو تا رہتا۔ بہر حال ذہن اور جسم ہلکا ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور نیل بجا کر خادم کو طلب کیا۔ اس بار دن والے خادم کی بجائے دوسرا خادم تھا۔ میں نے اس سے بیگ کے بارے میں پوچھا کہ براہ راست راجا عمر دراز کے بارے میں پوچھنا پر ڈو کوئل کے خلاف تھا۔ مگر اسے بیگ کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تب بیگ صاحب کے بارے میں کیسے علم ہو؟“

”آپ انٹرکام سے ایک نمبر دبا کر پوچھ سکتے ہیں۔“ اس نے میری رہنمائی کی اور میں نے انٹرکام اٹھا کر ایک دبا دیا۔ دوسری طرف سے کسی سریلی آواز والی لڑکی نے پوچھا۔

”سر میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

”مجھے بیگ سے ملنا ہے۔“

”سوری سران کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ سونے چلے گئے ہیں۔“

میں جھنجھلا گیا۔ ”تب میں راجا صاحب سے ملنا چاہوں گا۔“

”سر راجا صاحب سے ڈاکٹر نے ملاقات پر مکمل پابندی عائد کی ہوئی ہے۔“ آپریٹر نے جواب دیا۔

”اس کے باوجود کوئی ان سے براہ راست نہیں مل سکتا۔“

یہ سب میں پہلے سے جانتا تھا مگر اس وقت میں جھنجھلا رہا تھا اور بچتا رہا تھا کہ مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی اس سے اچھا تھا کہ میں حویلی چلا جاتا۔ بعض اوقات مروت بھی آدمی کو ذلیل کر دیتی ہے۔ شاید میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ راجا عمر دراز مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہوگا اور میں اس کے محل کے گیٹ میں بھی داخل نہیں ہوں گا اور وہ ملاقات کے لیے مجھے طلب کر لے گا۔ مگر راجا تو دور کی بات تھا بیک بھی دستیاب نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا اور ٹھٹھکتا رہا۔ دس بجے جب خادم نے ڈنر کی یاد دلائی تو میں نے اس سے کچھ ہلکا پھلکا لانے کو کہا۔ میرا باقاعدہ کھانے کا موڈ نہیں رہا تھا۔ اس نے سینڈویچز کا پوچھا۔ میں نے اس سے کلب سینڈویچز لانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد وہ کلب سینڈویچز اور کافی لے آیا۔ سینڈویچز سے ڈنر بھگتا کر میں نے کافی پی اور پھر ٹھٹھکتا لگا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر کل صبح ناشتے کے بعد بیک نے راجا صاحب سے ملاقات کے حوالے سے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تو میں واپس روانہ ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد میری ساری توجہ مرشد سے معاملات نمٹانے پر مرکوز رہے گی اور میں مزید کسی چکر میں نہیں پڑوں گا۔ اگر یہاں میرے لیے مشکلات کم نہیں ہوں گی تو میں دینی شفٹ ہو جاؤں گا اور شادی کر کے سویرا کو بھی وہیں لے جاؤں گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں پُر سکون ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اب میں راجا عمر دراز کا شکر گزار تھا کہ اس نے خود مجھے اس فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی کہ اب میں اس کی کوئی احمقانہ بات تسلیم نہیں کروں گا۔

میں لیٹنا اور سو گیا۔ ساری رات سوتے گزری اور صبح میری آنکھ دس بجے کے قریب کھلی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ میں اتنا سونے کا عادی نہیں تھا بہت تھکنے اور دیر تک جاگنے کے بعد بھی میں سات آٹھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھ جاتا تھا اس سے زیادہ دیر لیٹنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ رات کو ہلکا کھانے کی وجہ سے اس وقت میرے پیٹ میں بھوک کا جن اگڑائیاں لے رہا تھا اور اسے جلد کھانے کو کچھ چاہیے تھا۔ میرے ساتھ کچھ گڑ بڑ تھی۔ شاید میں نے فتح خان کے ساتھ جو کیا تھا اس نے مجھے ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ میں نے خادم کو بلانے کی بجائے انٹرکام پر ایک کاغذ دیا تو اسی سریلی آواز والی لڑکی نے جواب دیا۔ ”سر میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“ میری جگہ کوئی ٹھکر ہوتا تو اس کے اس انداز سے پوچھنے پر اپنی کئی تمام حسرتوں کو پورا کرنے کی فرمائش کر سکتا تھا۔ مگر میں نے صرف بیک کی فرمائش کی۔ ”میں بیک صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”سوری سر وہ اب تک اپنی رہائش گاہ سے نہیں نکلے ہیں۔“

میں نے دل میں سوچا کہ وہ اب ساری عمر وہیں رہے اور انٹرکام رکھ دیا۔ خادم کو بلا کر اسے بھرپور ناشتا لانے کو کہا۔ میرا کل کا اتارا ہوا لباس دھل کر اور استری ہو کر سیلو فین میں بیک آگیا تھا۔ میں نے اسے بیک میں رکھا اور واش روم میں آیا۔ جب تک میں غسل سے فارغ ہوا ناشتا آگیا تھا۔ میں نے اس سے انصاف کیا اور پھر خادم کو بلا کر اس سے کہا۔ ”مجھے روانہ ہونا ہے۔ میں نے یہاں آنے کے بعد جو رانگل جمع کرائی تھی اسے گیٹ پر بھجوا دو میں وہاں سے لے لوں گا۔“

”یہ کام بیک صاحب کر سکتے ہیں۔“ اس نے ادب سے جواب دیا یہ کل دن والا خادم تھا۔ ”وہی اسلحہ لیے اور دینے کے مجاز ہیں۔“

راجا عمر دراز کے اس مجازی سیکرٹری نے صحیح معنوں میں میرا ناک میں دم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری

رائفل اس کے پاس تھی اور وہ خود غائب تھا اپنے حجرہ خاص سے نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے پھر نمبرون کو کال کی اور اس سے کہا۔ ”بیک صاحب کی غیر موجودگی میں معاملات کون دیکھتا ہے؟“

”کوئی نہیں سر۔“

”اگر خدا نا خواستہ بیک صاحب دنیا سے اچانک پردہ فرما جائے تو کیا تب بھی کوئی ان کی جگہ نہیں لے گا؟“

وہ بے ساختہ ہنسی اور بے ساختہ ہی رک گئی۔ غالباً اسے اپنی حرکت کا احساس ہوا تھا۔ ”سوری سر..... میں اس بارے میں کسی پردہ سحر سے لاعلم ہوں۔“

”کیا میں انٹرکام پر راجا عمر دراز سے بات کر سکتا ہوں؟“

”سوری سر۔“ اس نے پھر کہا۔ ”یہ بھی ممکن نہیں ہے۔“

”یہ بھی ممکن نہیں ہے تو پھر کیا ممکن ہے وہی بتا دو۔“ میں بھنا گیا تھا۔ ”یہ راجا صاحب کا محل ہے یا پاکستان جس کا کوئی پُرسان حال ہی نہیں ہے۔“

”سر آپ جو کہہ رہے ہیں وہ میرے بس میں نہیں ہے۔ پلیز آپ کچھ دیویٹ کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ریسپور رکھ دیا اور اپنے لیے کیتلی سے تازہ چائے نکالے

لگا۔ سیکرٹری بیک عمر میں راجا سے بڑا تھا اور وہ تھا بھی نحیف و زارسا، اس لیے طبیعت کی خرابی انہونی نہیں تھی۔ مگر اس کا حال بھی ہمارے سیاست دانوں اور سرکاری باپوں جیسا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے اختیارات نہیں چھوڑتا اور کسی کو جانفین بنانے کی کوشش بھی نہیں کرتی ہے۔ راجا عمر دراز کی طبیعت خرابی کی اطلاع جہاں ایک طرف تشویش ناک تھی وہیں مجھے یہ اطمینان بھی ہوا کہ فی الحال اس کی طرف سے کسی ایڈونچر کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں باہر نکل آیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں یہاں شاید بارش ہوئی تھی کیونکہ پودے بہت صاف سترے ہوئے تھے۔ ویسے تو یہاں مٹی شاذ ہی نظر آتی ہے مگر بارش کے بعد پودوں کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ الگ سے ہی محسوس کی جاسکتی ہے اور یہاں بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔

دو گھنٹے مزید گزر گئے اور میرے صبر کا پیمانہ ایک بار پھر لبریز ہونے لگا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں ایک ایسی رائفل کے چکر میں بیٹھا ہوا ہوں جو اصل میں میری نہیں تھی اور میں اس پر با آسانی لعنت بھیج کر یہاں سے جاسکتا تھا تو مجھے اب انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ راجا عمر دراز سے ملاقات نہ کرنے کا فیصلہ میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ میں نے اندر آکر اپنا بیک اٹھایا تھا کہ خادم آگیا۔ اس نے کہا۔ ”جناب بیک صاحب آپ سے ملاقات کے منتظر ہیں۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جب میں جانے والا تھا تو وہ آگیا۔ بہر حال اب میں انکار تو نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس کے ساتھ روانہ ہوا اور محل کے اس حصے میں آیا جو دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بیک وہاں اپنے دفتر میں میرا منتظر تھا اور وہ چہرے سے سچ سچ پتلا لگ رہا تھا۔ میں نے مزاج پُر کسی کی جیسے اس نے ٹالنے والے انداز میں لیا اور بولا۔ ”معذرت شہباز صاحب، میں طبیعت خرابی کی وجہ سے کل جلد سونے چلا گیا تھا اور آج دیر سے آیا۔“

”اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہوگئی کیونکہ میں جانے والا ہوں۔“

”اوہ۔“ اس نے کسی قدر مصنوعی سے انداز میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ راجا صاحب سے آپ کی

ملاقات نہیں ہو سکی ویسے اگر آپ کل تک رک جائیں تو شاید ان کی حالت اتنی بہتر ہو جائے کہ وہ آپ سے ملاقات کر سکیں۔“

”بیگ صاحب، کیا آپ کھل کر مجھے راجا صاحب کی حالت بتا سکتے ہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بد قسمتی سے کینسر اپنی جڑیں پھیلا رہا ہے اور افاقہ عارضی ثابت ہوا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کے پاس وقت کم ہے اور شاید اب دو مہینے بھی نہیں ہیں۔“

”اوہ۔“ مجھے افسوس ہونے لگا۔ ”لیکن اسلام آباد میں تو مجھے کچھ... بیا گیا تھا۔“

”وہ مجبوری تھی کیونکہ راجا صاحب خود رابطے میں تھے اور ان کے سامنے کوئی بھی ایسی بات نہیں کرتا جس سے ناامیدی جھلکے۔ ہم ہر جگہ یہی کہہ رہے تھے کہ راجا صاحب صحت یاب ہو رہے ہیں۔ مگر اس وقت میں آپ کے سامنے غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ اس وقت محل میں نہ صرف راجا صاحب کی تمام اولادیں بلکہ دور قریب کے تمام ہی رشتے دار موجود ہیں۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو آپ کی آمد سے صرف میں واقف ہوں کیونکہ باقی نہ تو آپ سے واقف ہیں اور نہ ہی وہ آپ کی حیثیت جانتے ہیں۔ اس لیے کسی سے ملاقات مناسب نہیں ہوگی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں اس اعتماد کے لیے شکر گزار ہوں۔ لیکن کیا راجا صاحب بھی میری آمد سے بے خبر ہیں۔“

”نہیں کل رات جانے سے پہلے میں نے انہیں آپ کی آمد کے بارے میں بتا دیا ہے۔ ڈاکٹر نے صرف ایک گھنٹا ملاقات کی اجازت دی ہے۔ وہ بھی آدھے آدھے گھنٹے کے دو ادوار میں اور ہر دور میں کم سے کم چھ گھنٹے کا فرق لازمی قرار دیا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت کس حد تک نازک ہے۔“

”اب میں سمجھ رہا ہوں۔“

”تو کیا میں سمجھوں کہ آپ کل تک رکنے پر آمادہ ہیں؟“ بیگ نے پُر امید لہجے میں پوچھا۔ مکمل وضاحت کے بعد اور پھر بیگ کے لہجے پر میرا دل پہنچ گیا تھا اور میں نے اس سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کل تک دیکھ لیتا ہوں۔“

”میں ذاتی طور پر آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ بد قسمتی سے یہاں صرف میں اور راجا صاحب آپ کی اہمیت جانتے ہیں۔“

”میری کوئی اہمیت نہیں ہے یہ اوپر والے کی مہربانی کے بعد آپ لوگوں کا حسن ظن ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہاں سوبائل سٹنل کام نہیں کر رہے ہیں کیا میں لینڈ لائن سے اسلام آباد کال کر سکتا ہوں۔“

”بد قسمتی سے کل رات بارش کے دوران میں بجلی گرنے سے محل کے کیونیکیشن ٹاور کو نقصان ہوا ہے اور فی الحال لینڈ لائن سمیت باہر سے تمام رابطے منقطع ہیں۔“

”لینڈ لائن بھی؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں کیونکہ بجلی گرنے سے وائرنگ جل گئی ہے اور اب پوری دائرہ پیچھے تک تبدیل ہوگی تب لائن ٹھیک ہو

گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آج شکایت کرا دی ہے کل تک عملہ آجائے گا۔“

”اور سیٹلائٹ فون؟“

”محل کے دو سیلائٹ فون دودن سے مسلسل استعمال ہونے کی وجہ سے فی الحال ری چارج نہ ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ مواصلاتی رابطہ نہیں ہے کہ ان کو ری چارج کے لیے کال کی جاسکے۔“ بیک نے اس کا بھی معقول جواب دیا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ یہ جوابات کہیں مجھے اسلام آباد رابطے سے روکنے کے لیے تو نہیں ہیں۔ مگر پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ بیک کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ کام کی بات ہوگئی تھی اس لیے میں اس کے پاس سے اٹھ گیا اور واپس مہمان خانے آ گیا۔ میرا ارادہ پھر بدل گیا تھا۔ یہ سارا دن بھی آرام کرتے گزرا تھا اور دوپہر کا کھانا کھا کر میں ایک بار پھر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ جب جاگا تو شام کے سات بج رہے تھے۔ جسم سسٹ اور ذہن جیسے اونگھ میں تھا۔ کسی قدر سرد پانی سے غسل کے بعد میں چاک و چوبند ہوا مگر ایک بار پھر مجھے اپنی کیفیت پر تعجب ہوا تھا۔ میں نے نارمل حالات میں کبھی خود کو نیند کا اتنا رسیا اور سسٹ نہیں پایا تھا۔ ذہن کو چوکنا کرنے کے لیے میں نے چائے کی جگہ سیاہ کافی طلب کی اور اس سے میری حالت سچ بج بہتر ہوئی تھی۔

میں باہر آیا تو موسم سرد ہو رہا تھا اور لان میں لائٹس روشن تھیں۔ محل میں جدید ترین لائٹس تھیں جن کے گرد لوہے کے تاروں کی باریک جالی تھی اور اندر خاص روشنی والے بلب روشن تھے۔ اڑنے والے کیڑے کوڑے اس روشنی پر کھینچے آتے تھے اور لوہے کی باریک جالی سے ٹکرا کر کرنت سے مر جاتے تھے۔ جب ڈھکراتے تو ہلکی سی چرچاہٹ کی آواز آتی اور جلتے لیپ کی روشنی ذرا مدھم ہو جاتی تھی۔ کھلی جگہ پر ایسے کیڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے کسی نہ کسی طرف سے چرچانے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ باہر کے ملکوں میں دق کرنے والے کیڑوں اور خاص طور سے پھمروں سے نجات کے لیے اس قسم کے لیپ عام ہیں مگر ہمارے ہاں اب تک باہر کی لائٹس میں ان کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالانکہ یہ پھمروں اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے سدباب کا ایک آسان اور ماحول دوست طریقہ ہے۔ جب کہ اسپرے اور سٹگنے والے تمام پھمروں کو ماحول کو آلودہ کرتے ہیں اور جو لوگ ان کے قریب ہوتے ہیں ان کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

جہل قدمی کر کے میں واپس آیا تو ڈنکا وقت ہو گیا تھا اور خادم نے اس بار بھی اکیلے ڈنکا نوید سنائی۔ مگر بیک مجھے بتا چکا تھا کہ محل میں موجود افراد میرے بارے میں بے خبر تھے۔ ڈنر کے بعد میں نے کافی کی بجائے چائے کا انتخاب کیا اور اس کے کچھ دیر بعد مجھے پھر جمائیاں آنے لگیں۔ میں فکرمند ہوا تھا مگر زیادہ نہیں ہوسکا کیونکہ آنکھیں بند ہوئیں اور میں سو گیا۔ اس بار میری آنکھ کھلی تو میں کچھ دیر بے حس اور سن کر دینے والی کیفیت میں رہا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی جیسے سلب ہوگئی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے سوچنے کی صلاحیت بحال ہوئی تو میں نے آس پاس دیکھا۔ میں اسی کمرے میں تھا۔ گھڑی میں صبح کے دس بج رہے تھے۔ لیکن نہیں یہ صبح کے نہیں رات کے دس بجے تھے۔ کیونکہ کھڑکی کے باہر اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ کیا میں چوہیں کھنسنے سوتا رہا تھا؟ میرے ساتھ آخر ہو کیا رہا تھا؟

میں نے اٹھ کر انٹرکام اٹھایا تو اس سے ٹون نہیں آرہی تھی۔ وہ مہر چکا تھا پھر میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ دروازہ بھی باہر سے بند تھا اور میں اسے اندر سے نہیں کھول سکتا تھا۔ دروازہ کھکھٹایا اور چلا کر آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ دروازے سے مایوس ہو کر میں کھڑکی کی طرف آیا مگر اس سے باہر جانا بھی ممکن نہیں

تھا کیونکہ شیشوں کے باہر مضبوط فلادی گرل تھی۔ انچ ہاتھ تھا اور اس سے بھی باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کل سے میرے اندر جو ایک دوسرے سا ڈیرے ڈال رہا تھا وہ اچانک پوری طرح حقیقت بن کر سامنے آ گیا تھا۔ بیک کا رویہ اور پھر ہر کھانے کے بعد نیند آنا اور میرا خوب سونا۔ یہ سب نارمل نہیں تھا۔ اگرچہ ایسا بھی نہیں تھا کہ مجھے شبہ ہوتا کہ کھانے میں کچھ شامل کر کے دیا گیا ہے۔ یہ سب بہت ہوشیاری اور پلاننگ سے کیا گیا تھا۔ یہاں موہاں میں سکتل نہیں تھے اور مجھے لینڈ لائن استعمال کرنے نہیں دی گئی۔ حالانکہ تار ہے تھے کہ بیک نے اس ہارے میں جھوٹ بولا تھا۔ مگر کیوں کہا گیا تھا میں سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ یہ تو دشمنی والا رویہ تھا اور میرا اس جگہ رہنے والوں سے گمان میں بھی دشمنی کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے دوبارہ دروازہ بجانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا پستول جو میں بیڈ کے ساتھ سائیڈ دراز میں رکھ کر لہا تھا وہ غائب تھا۔ یہی نہیں اس کمرے میں اب کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ حد یہ کہ پھل کاٹنے والی چھری جو کل تک پھل والی ٹوکری کے ساتھ رکھی تھی اب وہ بھی غائب تھی۔ خود کو ہڈ سکون کرنے کے لیے میں نے سرد پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ دانت صاف کیے اور دوسری ضروریات سے فارغ ہوا۔ رات رات میرا دماغ سکون میں آنے لگا۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ میں یہاں قید ہوں اور کیوں قید ہوں؟ جلد یاد پیراس کی وجہ سامنے آجائے گی۔ میرے جذباتی ہو کر شور مچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ ہی میں نازن یا ہرکولیس ہوں جو دروازہ توڑ کر یہاں سے نکل سکوں۔ اول تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں دروازہ توڑنے کے بعد بھی یہاں سے نکل سکوں۔ محل کی سیوری کا مجھے اچھی طرح علم تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ سوتا رہا اور لازمی بات ہے کہ اس دوران میں بے ہوشی کا دورانیہ کسی طریقے سے بڑھایا گیا ہوگا کیونکہ نارمل حالت میں انسان کسی بھی دوا سے آٹھ گھنٹے سے زیادہ بے ہوش نہیں رہ سکتا اس دوران میں جسم دوا کا توڑ کر ہی لیتا ہے۔ اس لیے دوبارہ دوا دینا لازمی ہوگی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا مگر کوئی نشان نہیں تھا شاید مجھے گیس انجکشن سے دوا دی گئی تھی۔ یہ انجکشن کی جدید ترین قسم ہے اس میں سوئی نہیں ہوتی ہے بلکہ سرخ کا منہ سکے کی طرح چپٹا اور گول ہوتا ہے اسے جلد پر رکھ کر ٹین دبانے سے انجکشن کے پیچھے موجود نائٹروجن گیس زبردست پریشر ڈالتی ہے اور اس پریشر سے دوا ماسوں سے گزر کر براہ راست جسم اور خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا کوئی نشان نہیں پڑتا اور نرس تلاش کرنے کی زحمت بھی نہیں کرنا پڑتی ہے صرف وہ خاص انجکشن جو نرس میں ہی دیئے جاتے ہیں وہ اس طریقے سے نہیں دیئے جاسکتے۔ نیند کی دوا کا انجکشن مسلز میں بھی دیا جاسکتا ہے جہاں سے یہ بتدریج خون میں شامل ہو جاتا ہے۔

دروازہ کھلا تو میں چونکا۔ سامنے سر سے پاؤں تک خاص لباس میں چھپے دو افراد کھڑے تھے اور انہوں نے انہوں میں ٹیز رگن تھام رکھی تھی۔ یہ مغرب میں خاص پولیس اور ایجنسیوں کے افراد استعمال کرتے ہیں جب کسی اہم کو زندہ پکڑنا ہو۔ وہ دونوں اپنے انداز سے بہت تربیت یافتہ لگ رہے تھے اور بیک ان کے پیچھے تھا۔ میں کھڑا ہوا تو وہ دونوں چونکنا ہو گئے اور ان کی گتوں کا رخ میرے سینے کی طرف ہو گیا۔ میں نے بیک کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں اس رویے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“

”مجبوری۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”شہباز صاحب مجھے افسوس ہے مگر بعض حالات کی وجہ

سے آپ سے ایسا رویہ اختیار کرنا پڑا۔“

”حالات سے کیا مراد ہے، کیا آپ کا مرشد یا ڈیوڈ شا سے کوئی سمجھوتا ہو گیا ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں نے کہا ناں کہ مجبوری ہے اور آپ یہاں سے جانا ہوگا۔“

”میں خود یہاں سے جا رہا تھا تب مجھے کیوں روکا گیا؟“

”اس کی بھی وجہ ہے جو فی الحال بتائی نہیں جاسکتی مگر اب محل کے آدمی آپ کو اس علاقے سے باہر تک چھوڑ کر آئیں گے۔“

”شاید آپ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اب میں دوبارہ یہاں کا رخ نہ کروں؟“ میرا الجھن تلخ ہو گیا۔

”میں ایسی کوئی بات نہیں کہہ رہا۔“ بیگ نے کہا اور ان دونوں کو اشارہ کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ نیز گمنوں والے آگے آئے اور ایک نے ہتھکڑی نکالی۔

”سر یہ پہن لیں۔“

میں نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور جیسے ہی اس نے ان میں ہتھکڑی ڈالنا چاہی میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پیچھے اور اسے گھماتے ہوئے گردن سے جکڑ لیا۔ اسی لمحے دوسرے نے فائر کیا اور تار آکر جکڑے آدھ کے سینے سے چپکا۔ اسی لمحے میں نے اسے چھوڑ دیا اس لیے مجھے معمولی سا جھٹکا لگا مگر وہ کرنٹ کا شکار ہو گیا اور نیچے گر کر لرزنے لگا۔ دوسرے نے بدحواس ہو کر جلدی سے پستول سے تار نکالا اور مجھ پر پھر فائر کرنے جارہا تھا کہ میں نے تپائی اس پر کھینچ ماری۔ دوسرا فائر کہیں اور گیا۔ عام نیز رگن ایک ہی فائر کر سکتی ہے یا اسے جسم سے اُ کر بٹن دبانا پڑتا ہے مگر یہ رائفل قسم کی نیز رگن تھی جو کئی فائر کر سکتی تھی۔ تیسرے فائر سے پہلے میں نے بیٹھے ہوئے لات گھمائی اور وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ اس حالت میں بھی اس نے گن نہیں چھوڑی اور پھر فائر کرنے کا کوشش کی تھی کہ میں نے اگلی لات رائفل پر ماری اور وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرائی۔

میں نے پہلے شکار کی رائفل اٹھائی اور اس کا رخ دوسرے کی طرف کیا تھا کہ کوئی چیز میرے سینے سے آکر لگی اور مجھے شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ میں نیچے گر کر بالکل اپنے شکار کے انداز میں لرزنے لگا۔ یہ کام بیگ نے کیا تھا اس کے پاس بھی گن تھی۔ جب میں اس کے گر گوں سے نمٹنے میں مصروف تھا تو اس نے موقع سے فائدہ اٹھ کر وہ کام کیا جو ان دونوں سے نہیں ہو سکا تھا۔ شدید برقی صدمے نے میرے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ دوسرے نے اٹھ کر جلدی سے میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے۔ مزید گارڈز آگئے تھے اور مجھے دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا گیا اور چلا تے ہوئے لے جا کر کسی گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھا دیا۔ اس وقت میں رو بونے بنا ہوا تھا اور میری لگام دوسروں کے ہاتھ میں تھی۔ مجھ میں مزاحمت کی سکت نہیں تھی۔ پھر گاڑی اشارت ہوئی اور روانہ ہو گئی۔



رات کا وقت تھا اور سناٹے میں، میں نے ایک دوسری گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنی۔ یہ میری جیپ تھی۔ وہ بھی ساتھ جا رہی تھی۔

چند منٹ بعد برقی صدمے کے آثار کم ہونے لگے اور رفتہ رفتہ میں سنبھل گیا مگر میں ظاہر یہی کر رہا تھا کہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں ہوں۔ ایک گھنٹے بعد گاڑی رکی اور مجھے اس سے اتارا گیا تھا۔ حالات نے پلٹا کھایا تھا اس بار وہ لوگ مخالف کے روپ میں سامنے آئے تھے جنہیں میں نے ہمیشہ دوست اور شفیق پایا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال تھی اور کچھ زیادہ ہی کام کر رہی تھی۔ اس لیے اس سفر کے دوران میں ایک ممکنہ مفروضے پر پہنچ گیا تھا کہ شاید راجا عمر دراز کی ضد نے بیک اور خاندان کے باقی افراد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور راجا عمر دراز کو مجبور کرنے کے ساتھ انہوں نے یہ کام بھی کیا کہ میرے ساتھ دشمنوں والا سلوک کر کے وہ راستہ ہی بند کر دیا جس سے گزر کر راجا اپنی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی۔ مجھے جیب میں بٹھا کر میری جھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ میرا ہسٹول، رائفل اور دوسری چیزیں جیب میں پہلے ہی پہنچا دی گئی تھیں۔ مجھے جیب میں بٹھا کر وہاں پہنچانے والے نے معذرت کی۔

”معاف کرنا صاحب ہم حکم کے ملازم ہیں کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔“

میں نے جواب نہیں دیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ حکم کا غلام تھا۔ اس کی ڈور بیک اور راجا عمر دراز کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے لانے والے تین افراد تھے اور انہوں نے مجھے راجا عمر دراز کے علاقے سے تقریباً باہر نکال دیا تھا۔ یہاں سے مجھے خود آگے جانا تھا۔ جیب میں ڈیزل فل تھا اور میں آرام سے واپس اسلام آباد پہنچ سکتا تھا۔ وہ واپس اپنی گاڑی میں بیٹھے اور گھوم کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ عقب میں میرے بیک کے ساتھ کھانے پینے کا ایک بنڈل اور اس کے ساتھ ایک لفافہ بھی تھا۔ میں نے اندر کی لائٹ آن کر کے لفافہ کھولا۔ اس میں ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔

”شہباز صاحب، اس سلوک کے لیے معذرت کا لفظ یقیناً چھوٹا ہے لیکن میں نے بتایا کہ میری مجبوری ہے اور میں زندگی میں کبھی اتنا مجبور نہیں ہوا۔ شاید وقت حقیقت آپ کے سامنے لے آئے، مخلص، بیک۔“

میں نے رقعہ مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر جیب سے کھانے پینے والا بنڈل نکال کر باہر سڑک پر رکھ دیا۔ میں اسے کھائی میں اچھال دینا چاہتا تھا مگر میرے دل میں رزق کا احترام ہے اس لیے میں چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ میں نے یہاں رکھ دیا تھا کہ کسی غریب کا بھلا ہو جائے گا مگر میرے لیے اب راجا عمر دراز کا کھانا پینا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے جیب آگے بڑھانے سے پہلے موبائل نکال کر چیک کرنا چاہا تو پتا چلا موبائل جیب میں نہیں ہے۔ میں نے اسے شاید سائڈ دراز پر رکھ دیا تھا اور اسے اٹھایا نہیں تھا۔ ان لوگوں کو بھی خیال نہیں رہا جب کہ میری ہر چیز واپس رکھ دی تھی۔ حد یہ کہ اسلحہ بھی تھا۔ صرف موبائل رہ گیا تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھائی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مگر طویل نیند کے بعد اب مجھے آرام کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی البتہ بھوک لگ رہی تھی کیونکہ چوبیس گھنٹے سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد جیب ایک جمرے کے پاس سے گزری تو میں نے پانی پیا۔ مگر صرف پیاس بجھانے کی حد تک۔

میں نے سوچا اور اس سڑک سے نہ گزرنے کا فیصلہ کیا جس پر وہ پولیس اسٹیشن تھا جہاں میں رات گزار چکا تھا اور عین ممکن تھا کہ وادی میں لاشیں ملنے کے بعد میری تلاش پھر سے شروع ہو چکی ہو۔ اس لیے اس علاقے

دور رہنا ہی مناسب تھا۔ مگر سیدھی اور صاف سڑک یہی تھی اس کے علاوہ باقی سڑکیں بہت خراب اور بس گرے لائق تھیں۔ بعض مقامات پر تو سڑک ہی غائب ہوتی تھی اور کچے راستے پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ میں نے متبادل سڑک پر مڑنے کے بعد خراب حصہ آتے ہی پڑاؤ ڈال دیا کیونکہ اب سفر کرنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے جپ محفوظ جگہ روک کر بیگ سے جیکٹ نکال کر پہن لی۔ سردی کا یہی علاج تھا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ پھر سیٹ جہاں تک ہو سکی پیچھے کی اور نیم دراز ہو کر آرام کرنے لگا۔ نیند نہیں آرہی تھی مگر اگلے آگے لگی۔

اچانک مجھے لگا کہ کوئی عورت ہنسی ہو۔ میں چونک کر بیدار ہوا۔ مگر اب ہنسی رک گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ آواز سچ آئی تھی یا پھر میرا دہم تھا۔ بعض اوقات ان دیرانوں میں ہوائیں ایسی چلتی ہیں کہ ان پر ایسی ہی انسانی آوازوں کا گماں ہوتا ہے۔ مگر چند لمحے بعد ہنسی کی آواز پھر آئی اور یہ بالکل واضح تھی۔ کوئی عورت بڑے دل سے ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں خوشی اور جذبات کی کیفیت بالکل نمایاں تھی۔ میں چونکا ہو گیا اور پستول نکالنے ہوئے آس پاس کا جائزہ لیا مگر ہلکی چاندنی میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس ہنسی نے ایک پرانی یاد تازہ کر دی جب میں حویلی سے فرار ہو رہا تھا اور راستے میں نہر کے ساتھ گزر رہا تھا تب ایسی ہی ہنسی نے مجھ پر خوف طاری کر دیا تھا۔ ذہن میں چٹیلوں کے قصے تازہ ہو گئے تھے مگر قصہ مختصر یہ نکلا کہ کوئی جوڑا گھر والوں سے چھپ کر نہر کے ساتھ جھاز یوں میں منہ کالا کر رہا تھا۔ کیا اس بار بھی وہی چکر تھا۔

میں آہستہ سے نیچے اتر آیا۔ آواز ڈھلان کی طرف سے آئی تھی مگر یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا پہاڑوں میں آواز اس طرح گونجتی ہے کہ سمت کا تعین ذرا دشوار ہو جاتا ہے میں ایک درخت تک آیا اور اس سے ٹک کر آواہ کے پھر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر اس بار آواز نہیں آئی بلکہ وہ خود آئی اور اس طرح آئی کہ میں دم بخود رہ گیا۔ وہ سامنے سڑک سے نمودار ہوئی اور ہلکی چاندنی میں اس کا چاندنی جیسا بدن یوں دکھ رہا تھا کہ وہ جسم چاندنی کی بنی ہوئی لگ رہی تھی۔ یہ تشبیہ یوں دینا پڑی کہ اس کے بدن ایک سفید باریک کپڑے کا ایسا لباس تھا جس کے آواز آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ اس لباس میں اس کا ایک ایک انگ یوں نمایاں تھا کہ دیکھنے کے لیے ذرا بگڑت کرنا نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ عجیب سے انداز میں چلتی ہوئی جپ کی طرف آرہی تھی اس کی چال کو بیک وقت رقص اور کیٹ واک سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ چلتی ہوئی جپ تک آئی اور اس کے ہونٹ پر سر جھکاتے ہوئے پھر اسی انداز میں ہنسی۔ تب مجھے لگا وہ نشے میں تھی۔ پھر اس نے سر گھما کر بہت دعوت انگیز انداز میں میری طرف دیکھا اور بوجھل لہجے میں بولی۔

”ادھر کیا کرتا ہے میرے پاس آ..... تا۔“

کوئی زاہد خشک بھی اس کی اس آفر کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کر سکتا۔ اب تک میں اگر اس قسم کی ترغیبات سے بچتا آیا تھا تو یہ صرف اللہ کا کرم اور توفیق تھی کہ اس نے مجھے گناہ سے محفوظ رکھا۔ سچی بات ہے اس کی بات اور لہجے پر میرا جسم سنسنیا گیا تھا اور رگوں میں خون کی روانی تیز ہو گئی تھی۔ صرف جسم ہی نہیں اس کا چہرہ بھی حسین ترین تھا۔ اوپر سے اس کی ادائیں اور آوازیں۔ لیکن میں جن حالات سے گزر رہا تھا اس وقت میں اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں پستول آگے رکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

اس نے پستول کی طرف ایک لمحے کو نہیں دیکھا تھا، براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”جتنے کیا نظر آتی ہوں؟“ اس نے اٹھلا کر پوچھا تو اس کے گداز بدن میں لہریں سی پیدا ہوئی تھیں۔ میں نے بہ مشکل نظر کو ہٹکنے سے روکا اور پستول اس کی گردن سے لگا کر دبایا تو اس نے گردن اوپر کر لی۔ یہ ایک اور مصیبت تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی ہر حرکت دوسروں کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ مجھے ایک بار پھر نظروں کو روکنا پڑا تھا اور میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”فضول باتیں مت کر، ٹو اس چلے میں اور اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے۔“

”ٹو بتا کیا کر سکتی ہوں؟“ اس نے ایک بار پھر خود کو نمایاں کیا تھا۔

”تیرے ساتھ اور کون ہے؟“

”بس میں ہوں۔“ اس نے پھر ایک اداسے کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس قسم کی عورت کا اکیلے وجود کم سے کم اس علاقے میں ممکن نہیں تھا۔ ہمارے ہاں کوئی عورت چاہے وہ کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو۔ اس چلے میں باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔ شہلا رضوی جج بہت آزاد خیال تھی اور اس کا لباس واپیاتی حدود کو چھوتا تھا مگر باہر نکلتے ہوئے وہ بھی خود کو ڈھک لیتی تھی۔ یہ عورت یہاں اکیلی نہیں تھی بلکہ کسی دوسرے کی موجودگی بھی لازمی تھی۔ یہ کسی چکر میں تھی۔ میں سوچ میں تھا اور ساتھ ہی چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے اسے خاصی زور کا تھپڑ مارا اور وہ الٹ کر سڑک پر جا گری تھی۔ اسی لمحے چاروں طرف سے آہٹیں سنائی دیں اور چند سیکنڈ سے بھی پہلے مجھے تین عدد چلے سے خطرناک نظر آنے والے مسلح افراد نے گھیر لیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں خود کار رائفلیں تھیں۔ ایک گھنی داڑھی والے نے گرج کر کہا۔

”تیری جرات کیسے ہوئی اسے ہاتھ لگانے کی؟“

”کیوں کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ میرے سامنے تھا اور باقی دودائیں بائیں سے آئے تھے۔ عورت کو یقیناً چکر آ گیا تھا۔ وہ سنبھل کر اٹھ رہی تھی اور پھر اس نے داڑھی والے سے کہا۔

”شیر خان اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے اس کے ہاتھ توڑ دے۔“ عورت کہتے ہوئے میرے اور شیر خان لے درمیان میں آئی تھی اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شیر خان پر گولی چلا دی۔ گولی عورت کے پاس سے زر کر اس کے بازو پر لگی تھی۔ فائر کے ساتھ ہی میں جھکا اور گھوم کر جیب کے پیچھے آ گیا۔ مجھے ڈھلان کی طرف بے آنے والے سے خطرہ تھا میں اس کی زد میں تھا مگر اس نے کسی قدر تاخیر سے فائر کیا اور گولی جیب پر آ کر لگی۔ آڑ میں آتے ہی میں نے جوابی فائر کیا تو وہ غلت میں بھاگ کر ڈھلان سے اتر گیا۔ وہ اتنی تیزی سے گیا کہ مجھے لگا وہ نیچے ہی لڑھک گیا ہوگا۔ اوپر کی طرف سے آنے والا جیب کے دوسری طرف تھا اور وہ میری بے سود فائر کر رہا تھا کیونکہ میں مکمل طور پر آڑ میں تھا۔ شیر خان اور عورت بھی بھاگ رہے تھے۔ اس وقت ترقص نما چال بھول گئی تھی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا چاہتی تھی مگر اس کا میکی نما لباس رکاوٹ بن رہا تھا۔ نے بلا تکلف اسے کھینچ کر رانوں تک کیا اور تیز دوڑنے لگی۔ میں نے ڈرانے کے لیے ان کی طرف دو فائر اور

کیے اور پھر پیچھے کی طرف سے جیب میں گھسا۔ سر نیچے رکھتے ہوئے میں نے چابی لگا کر انجن اشارٹ کیا۔ ڈیزل انجن کی وجہ سے انجن جلدی اشارٹ نہیں ہوا۔ یہ گرم ہونے پر ہی اشارٹ ہوتا۔ میں نے چابی دبا کر رکھی اور بالآخر انجن اشارٹ ہو گیا۔ میں نے پیچھے کا گیسر لگایا اور جیب پیچھے لے جانے لگا۔ سامنے سے برسٹ آیا اور کچھ گولیاں بونٹ سے پھسل کر گزر گئیں۔ وڈ اسکرین بج گئی تھی مگر دوسرے برسٹ نے اگلے دونوں ڈھیل برسٹ کر دیئے اور جیب آگے کی طرف بیٹھ گئی۔ میرے منہ سے ناگفتنی نکل گئی تھی۔

ایک تو میری قسمت ایسی تھی کہ جب پرانے دشمن ذرا سانس لینے کا موقع دیتے تو کوئی نہ کوئی نیا دشمن آجاتا جو بلا وجہ گلے پڑ جاتا۔ یہ لوگ بھی کچھ ایسے ہی لگ رہے تھے۔ عورت کے انداز سے لگ رہا تھا کہ یہ لٹیروں کا کوئی گردہ تھا۔ عورت اپنے حسن کا جادو چلا کر مسافروں کو روک لیتی ہوگی اور پھر یہ لوگ آکر اسے اس کی حسن پرستی کی سزا دیتے ہوں گے۔ بہت سے شریف مار کھا جاتے ہوں گے۔ میں تو پہلے ہی رکا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ مجھے غیر ملکی لگے تھے۔ خاص طور سے عورت کے نقوش اور بالوں کا رنگ ہمارے ہاں نظر نہیں آتا ہے وہ شاید یورپ یا روس سے تعلق رکھتی تھی۔ جیب بیکار ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا بیگ لیا۔ اس میں سے کلاشکوف نکالی اور پیچھے سے نیچے اترا اور اوپری ڈھلان پر چڑھ گیا۔ اسی جگہ میں ان لوگوں سے محفوظ رہ سکتا تھا جو خود کار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

جیب ناکارہ کرنے کے بعد ان لوگوں کی طرف سے فائرنگ رک گئی تھی۔ مگر وہ بھاگے نہیں تھے بلکہ یہیں کہیں موجود تھے۔ چاند مغرب کی افق کی طرف جھک رہا تھا اور گزشتہ تین دن میں مزید چھوٹا ہو گیا تھا اس کی روشنی بس تاروں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ اس لیے ڈھلان پر تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا البتہ سڑک نمایاں تھی۔ میں دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا جہاں ان کی موجودگی کا امکان تھا۔ اگرچہ یہ آہٹل مجھے مار کہنے والی بات تھی مجھے مخالف سمت کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ موجود تھے اور میرے خلاف مزید کیا ارادہ رکھتے تھے؟ میں دبے قدموں چل رہا تھا اور تقریباً پچاس گز کے بعد مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ شیر خان ہی ہو سکتا تھا جس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ پھر میں نے عورت کی آواز سنی۔ ”مجھے پٹی باندھنے دو خون بہہ رہا ہے۔“

”چھوڑو۔“ شیر خان غرایا۔ ”میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔“

”مجھے یہ شخص خطرناک لگ رہا ہے۔“ عورت کی سہی آواز آئی۔ ”یہ نہ تو مجھ سے متاثر ہوا اور نہ ہی تم

لوگوں سے ڈرا۔“

”چپ کر۔“ شیر خان نے اسے پھٹکارا۔ اب میں نے عورت کی آواز سنی تو مجھے لگا کہ وہ سچ سچ غیر ملکی

ہے۔ ”اسے پکڑنا ہے ورنہ پارٹی کو کیا جواب دے گا؟“

میں چونکا تھا۔ یہاں کوئی پارٹی نکل آئی تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ لٹیروں کے نہیں تھے بلکہ کسی کے لیے انہوں نے مجھے روکا تھا۔ البتہ طریقہ نہایت احقانہ تھا۔ شاید میری فرمائش کرنے والوں نے انہیں میرے بارے میں بریف نہیں کیا تھا ورنہ شاید وہ اس عورت کو یوں استعمال نہ کرتے۔ اس کی بجائے وہ مجھے سوتے میں خاموشی سے پینڈز آپ کرا لیتے تو میں ان کے قابو میں آجاتا۔ مجھے پہلے بیگ کا خیال آیا مگر اسے ایسا کرنے کی ضرورت

نہیں تھی۔ اس نے عملاً بہت بے آبرو کر کے راجا کے کوچہ محل سے رخصت کیا تھا۔ یہ کوئی اور پارٹی تھی۔ فتح خان کے آدمی خود ان سے کم نہیں تھے یعنی انہیں کسی کو ہار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر کون رہ جاتا تھا۔ مرشد سے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی تیزی سے حرکت میں آئے گا۔ مگر کیا کہا جاسکتا تھا ہو سکتا ہے کہ مرشد نے سچ بچ اس ٹولے کو ہار کر لیا ہو کیونکہ اس کے اپنے بد معاش دنیا سے چپکے تھے اور اسے افراد کی کمی کا سامنا تھا۔

میری نظر تاریکی سے مانوس ہوئی تو میں نے شیر خان اور عورت کو دیکھا۔ وہ اس کے بازو کی مرہم پٹی کر رہی تھی اور اس کے لیے اس نے اپنے لباس سے ایک پٹی الگ کر لی تھی۔ فی الحال اس کے اوپری جسم پر ایک ہلکی جیکٹ نظر آ رہی تھی۔ ستر پوشی سے زیادہ سردی سے بچاؤ کے لیے جیکٹ لی تھی۔ ورنہ نچلا حصہ بدستور عریاں تھا۔ ان کے دونوں ساتھی غائب تھے اور وہ غالباً سڑک پر میرے لیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جب میں نے شیر خان پر فائر کیا اور وہ بھاگا تو ڈھلان سے آنے والے نے مجھ پر جو فائر کیا وہ خاصی دور سے گزر گیا تھا۔ اس دقت میں سمجھا کہ نشانہ خطا گیا ہے مگر اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ مجھے مارنے یا لوٹے نہیں بلکہ پکڑنے آئے تھے اور اسی لیے بچا کر صرف ڈرانے کے لیے فائر کیا تھا۔ بازو پر پٹی بندھوا کر شیر خان کھڑا ہو گیا اس نے عورت سے کہا۔ ”زینی ٹو ہمیں رک، ہم اسے گھیرتے ہیں۔“

زینی وہیں رک گئی اور شیر خان ڈھلان سے اتر گیا۔ زینی ایک درخت سے ٹیک لگا کر سٹ کر بیٹھ گئی تھی اسے یقیناً سردی لگ رہی تھی۔ یہ جگہ بلند تھی یا پھر گزشتہ روز ہونے والی بارش کا اثر تھا سردی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ شیر خان کے جانے کے بعد میں دبے قدموں زینی کی طرف بڑھا اور عقب سے آتے ہوئے میں نے اوپر سے اس کے سر پر کلا شکوف کی نال لگائی اور جیسے لہجے میں بولا۔ ”آواز نہ نکلے۔“ وہ ساکت ہو گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم بیکار کوشش کر رہے ہو ہم صرف چار نہیں ہیں اور بھی آدمی ہیں۔“

”تب تم لوگوں سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہے۔ مجھے آرام سے گھیر کر پکڑ لیتے تمہیں کیٹ واک کرانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”پتا نہیں یہ شیر خان کا پلان تھا؟“ وہ بولی ہم سرگوشی میں بات کر رہے تھے اور اس نے آواز بلند کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بار میں نے اس کا لہجہ سمجھ لیا اور پوچھا۔

”تم ریشم ہو؟“

”جاریمن۔“ اس نے جواب دیا۔

”او کے شیر خان اور اس کے ساتھی کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔“

”ہم اپنے لیے کام کرتے ہیں۔“

”میرا مطلب ہے کہ میرے لیے کس نے تمہیں ہار کیا ہے؟“

”یہ بات شیر خان جانتا ہے۔“

”تم لوگ مجرم ہو؟“

”تم جو چاہے سمجھو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ویسے وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ اچانک میرے سر سے کوئی

چیز آکر لگی اور پھر شیر خان کی آواز آئی۔
”باقی میں بتاؤں گا۔“



ابھی شیر خان کی رائفل سر پر موجود تھی کہ سامنے سے نارچ کی روشنی مجھ پر پڑی تھی۔ پھر دوسری نارچ آن ہوئی۔ میں ہر طرف سے گھر گیا تھا۔ زبنی مجھ سے ذرا دور سرک کر کھڑی ہوئی تو روشنی میں اس کی سڈول لمبی ٹانگیں نمایاں ہوئیں اور میں اس حالت میں بھی لاجول پڑھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شیر خان نے حکم دیا۔ ”تھیار آرام سے آگے ڈال دو جلد بازی مت کرتا۔“

”اگر میں جلد بازی کروں اور تم مجھے شوٹ کر دو تو ان لوگوں کو کیا جواب دو گے جنہوں نے مجھے زندہ سلامت لانے کو کہا ہے؟“

”انہوں نے ہم سے اپنی جان کی قیمت پر زندہ لانے کو نہیں کہا ہے۔ اگر ہمیں خطرہ ہوا تو ہم گولی چلانے میں دیر نہیں کریں گے۔“ شیر خان بولا۔ ”تھیار پھینک دو۔“
اس بار میں نے رائفل پھینک دی۔ ”مزید کوئی حکم؟“
”تمہارے پاس پستول بھی ہے۔“
”وہ جیکٹ میں ہے خود نکال لو۔“

شیر خان نے مجھے ٹولا اور جیکٹ سے پستول نکال لیا۔ اس نے میری مزید تلاشی لی اور باقی سب چیزیں بھی نکال لیں۔ زخمی، دھنکے کے باوجود اس کا دم خم قابلِ تعریف تھا۔ شاید گولی اس کے بازو کو چھوئی گزر گئی تھی۔ ورنہ وہ اتنے سکون میں نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ ”بقول اس خاتون کے تمہارے ساتھ اور افراد بھی ہیں تو تم نے مجھے اتنے گھٹیا انداز میں گرفتار کرنے کی کوشش کیوں کی؟“

”ہم بس چار ہی لوگ ہیں۔“ شیر خان نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں یہ غلطی کی مگر بہر حال تم قابو میں آئی گئے۔ اب اپنے ہاتھ پیچھے کرو۔“

میں نے ہاتھ پیچھے کیے تو اس نے پلاسٹک تار کی کس جانے والی جھکڑی سے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیے۔ شیر خان لمبے سے نہ تو قبائلی لگ رہا تھا اور نہ ہی اس طرف کا رہنے والا۔ البتہ اس نے حلیہ ضرور ایسا بنایا ہوا تھا۔ اس نے ڈھیلی شلوار قمیص اور اوپر پگڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے باقی دو ساتھیوں کا حلیہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔ مجھے بے بس کرنے کے بعد ان میں سے ایک کہیں گیا اور چند منٹ بعد ایک عجیب و غریب کے ساتھ نمودار ہوا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے لایا گیا اور جب کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ دو میرے دائیں بائیں آگئے۔ شیر خان نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور ڈرائیونگ زبنی کے حصے میں آئی جو بدستور اسی حلیے میں تھی۔ یہ لوگ مادر پدر آزاد لگ رہے تھے۔ البتہ سردی سے بچنے کے لیے اس نے ایک شال لے لی تھی۔ میرا اسلحہ اور دوسرا سامان انہوں نے میری ناکارہ ہو جانے والی جیب میں ڈال دیا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کی بندش کی مضبوطی کا اندازہ کر رہا تھا اور جلد میں نے محسوس کر لیا کہ اسے کھولنا ممکن نہیں تھا زور لگانے سے یہ میری کلائیوں میں گڑ رہی تھی۔ اس کی بندش ویسے ہی بہت سخت تھی اور ذرا سی دیر میں خون رکنے لگا تھا۔

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

ان کا رخ نیچے کی طرف تھا یعنی وہ میدانی علاقے کی طرف جا رہے تھے مگر کیا کہا جاسکتا تھا۔ اس دشوار گزار علاقے میں بعض اوقات شمال کی طرف جانے کے لیے کئی بار جنوب کا رخ بھی کرنا پڑتا تھا کیونکہ سڑکیں اور راستے نایاب تھے۔ کنتی کی چند سڑکیں ہیں جو اس پورے علاقے کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم الائی سے کچھ ہی دور تھے۔ یہاں سے جیپ مغرب کی طرف مڑ گئی۔ یہ سڑک یٹکورہ کی طرف بھی جاتی تھی اور اگر اس پر دائیں طرف مڑ جاتے تو چترال کی طرف بھی جاسکتے تھے۔ صبح قریب تھی۔ میں ایک بجے سویا تھا اور ساڑھے تین بجے اٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد یہ چکر شروع ہوا اور اسے بھی اب ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ مشرقی افق پر سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اب ان لوگوں کا رویہ بہت پروفیشنل لگ رہا تھا۔ ذرا دیر میں روشنی ہونے لگی۔

میں سیٹ سے سر نکالے بہ ظاہر آرام کر رہا تھا مگر نیم وا آنکھوں سے آس پاس کے مناظر دیکھ رہا تھا تاکہ مجھے معلوم رہے کہ یہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ چھ بجے ہم اس سڑک پر آ گئے جس کے ایک طرف یٹکورہ تھا اور دوسری طرف چترال کو راستہ جاتا تھا۔ جیپ دوسری سمت مڑ گئی۔ گویا یہ مزید شمال کی طرف جا رہے تھے۔ میں کسی قدر مشکل میں تھا کہ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے میں پوری پشت نہیں لگا سکتا تھا اور نہ ہی آرام دہ طریقے سے بیٹھ سکتا تھا۔ دو گھنٹے کے سفر میں میرے بازو اکڑ گئے تھے۔ ان لوگوں سے پوچھنا بیکار تھا وہ اپنی منزل پر پہنچ کر ہی رکتے۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مرشد یا کوئی اور دشمن نہیں ہو سکتا تھا جو مجھے یوں اٹھواتا۔ پھر اس طرف جانے کا کیا جواز تھا۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا۔ مجھے کرنل عبدالرحمن کا خیال آیا۔ کیونکہ وہ ایک بار اسی علاقے میں مجھے بلوا کر بھارتیوں کے حوالے کر چکا تھا۔ مگر اس سے میرا اب کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ بلکہ آخری بار اس نے میری مدد بھی کی تھی۔ پھر یہ کون ہو سکتے تھے؟

بھارتیوں سے خیال آیا کہ کہیں ان لوگوں کو بھارتیوں نے ہار تو نہیں کیا تھا۔ پڑوسی ملک میں ہمارے اس ازلی دشمن نے اپنے نچے گاڑ لیے تھے اور اب انہیں مضبوط کر رہا تھا۔ جگہ جگہ اس کے کونسلیٹ تھے جو اصل میں ”را“ کے اڈے تھے۔ بھارتی سرگرم تھے اور میں ان کو مطلوب تھا۔ یہ سوچ کر میرے جسم میں پھریری سی آگئی تھی۔ میں اس قوم اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ بھیڑی کھال میں بھیڑیا اور چرخ صفت قوم ہے۔ جب آپ کی زد پر آتی ہے تو قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے اور جب آپ کو اپنی زد میں لے لے تو رحم و مروت کرنا گناہ عظیم سمجھتی ہے۔ صرف نصف صدی کے عرصے میں اس نے پے در پے ہمیں نقصانات اور صدمات سے دوچار کیا اور اس کے باوجود ہم اتنے سادہ ہیں کہ اب بھی اسے دوست بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ جب کہ وہ ہمیں برباد کرنے اور پاکستان کا نام دنیا کے نقشے سے مٹانے کے لیے ذرا بھی کوتاہی سے کام نہیں لے رہا۔ پتا نہیں کب ہمیں یہ بات سمجھ آئے گی۔ خوف اس کا ہے کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔

اچانک جیپ دھچکے سے رکی تو میں چونک کر خیالوں سے نکل آیا۔ جیپ سڑک کے ساتھ ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے رکی تھی اور شیر خان نے اتر کر لوہے کا گیٹ کھولا۔ زمینی جیپ اندر لے آئی اور شیر خان نے عقب میں گیٹ بند کر دیا۔ میرے دائیں طرف موجود شخص اتر ا اور اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے بھی نیچے اتارا۔

دوسرا اپنی طرف سے اتر آیا۔ زینی اب اندر جا رہی تھی۔ میں نے استہزایہ انداز میں کہا۔ ”تم بٹے کٹے مرد پورے لباس میں ہو اس بے چاری نے کیا قصور کیا ہے؟“

”کیپ کو ایٹ۔“ میرے ساتھ موجود نو جوان نے کہا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ وہ پہلی بار بولا تھا اب تک شیر خان یا زینی ہی بولتے آئے تھے۔ نو جوان کا لہجہ شہری اور تعلیم یافتہ تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہ نہیں تھے جو خود کو ظاہر کر رہے تھے۔ بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے اوپری حصے میں شاید ایک ہی کمر تھا کیونکہ اس کی چھتیں ترچھی اور لکڑی کی بنی ہوئی تھیں البتہ نیچے کی مکانیت زیادہ لگ رہی تھی۔ زینی نے لاک کھولا اور اندر چلی گئی۔ میں ان تینوں کے ساتھ اندر آیا۔ وہ میرے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ شیر خان نے چاقو سے میری بندشیں کاٹیں اور انہوں نے مجھے ایک کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کمر اچھوٹا تھا اور اس میں ایک سنگل بیڈ اور ایک طرف دیوار گیر الماری تھی۔ فرش پر قالین اور ایک کھڑکی پر اس کے ہم رنگ پردے لٹک رہے تھے، میں نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کا معائنہ کیا تو اسے مضبوط گرل سے کور پایا۔

ظاہر ہے وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتے تھے کہ مجھے فرار کا راستہ عنایت کرتے۔ میں بازوؤں کو حرکت دیتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ یہاں میرا قیام مختصر تھا اور جلد یا تو میرے خریدار مجھے لینے آجائے یا پھر مجھے آگے پہنچایا جاتا۔ انہوں نے جس طرح مجھے اپنا ٹھکانہ دیکھنے کا موقع دیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ یا تو یہ ان کا عارضی ٹھکانہ تھا۔ اس خوب صورت پہاڑی علاقے میں بے شمار ایسے بنگلے اور کوفٹیاں ہیں۔ جو شہروں اور میدانوں میں رہنے والے صاحب ثروت لوگوں نے بنوا رکھی ہیں اور وہ سال میں چند مہینے یا چند ہفتے یہاں گزارتے ہیں باقی سارے سال یہ کوفٹیاں اور بنگلے خالی پڑے رہتے ہیں۔ چونکہ وہاں ہوتے ہیں مگر وہ آرام سے اپنے گھر میں بیٹھ کر نگوشت لیتے ہیں اس لیے ان جگہوں کو استعمال کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

دوسرا امکان یہ تھا کہ میری واپسی نہ ہوتی اور ان سے کوئی حساب نہیں لیتا اس لیے انہوں نے مطمئن ہو کر مجھے یہ ٹھکانہ دیکھنے کا موقع دیا تھا۔ ذرا آرام کے بعد میں نے اٹھ کر ہلکی پھلکی ایکسر سائز شروع کی تاکہ میرا جسم چاق و چوبند رہے۔ رات آرام کی کمی سے جو کسبل مندی تھی وہ دور ہو جائے۔ دس پندرہ منٹ کی ایکسر سائز کے بعد میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ کھڑکی کی طرف تھی اس لیے دھوپ اندر آئی اور کمر روشن ہو گیا۔ میں نے الماری کھولنے کی کوشش کی تو وہ لاکڈ نکل میں نے بلا تکلف اس کا ہینڈل پکڑ کر جھٹکا دیا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ لاک ٹوٹ گیا۔ اگر آواز باہر تک گئی تھی تب بھی مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مگر الماری سے کوئی ایسی چیز ملنے کی خواہش خواہش ہی رہ گئی جس سے میں آزادی حاصل کر سکتا۔ نہ کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی ایسی کوئی چیز۔ اندر صرف مردانہ اور زنانہ کپڑے تھے۔ نچلے حصے میں جوتے رکھے تھے۔ ایک دراز میں رومال، بنیان اور مردانہ انڈر ویئر تھے۔ دوسری دراز کھولی تو اس میں سے زنانہ اشیاء نکل آئیں۔ میں نے اسے بند کر کے مردانہ حصے کا جائزہ لیا۔

مردانہ کپڑے زیادہ تر مقامی ساخت تھے اور زنانہ ملبوسات بھی شریفانہ تھے۔ یعنی فیشن ایبل نہیں تھے۔ شاید میرا پہلا خیال درست تھا کہ یہ جگہ ان لوگوں کی نہیں تھی۔ یہ باقاعدگی سے زندگی گزارنے والے لوگ نہیں لگ رہے تھے۔ میرا نہیں خیال کہ زینی جیسی عورت اس قسم کے لباس استعمال کرتی ہوگی اس اور الماری کے

پت بند کر کے میں واپس بیڈ پر آ بیٹھا۔ انہوں نے میری گھڑی بھی لے لی تھی۔ راستے میں مجھے جیب کے ڈیش بورڈ پر لگی گھڑی سے وقت کا پتا چلا رہا تھا۔ ہم تقریباً سات بجے یہاں پہنچے تھے اور مجھے بند ہوئے ایک گھنٹا مزید گزر گیا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ اگرچہ مجھے نہ تو بھوک پیاس لگ رہی تھی اور نہ ہی کوئی دوسرا مسئلہ تھا مگر میں نے دروازہ بجانے میں حرج نہیں سمجھا۔ دوسری بار بجانے پر زینی کی آواز آئی۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ فطرت کا ہے مس زینی۔“ میں نے ذرا فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”تم جانتی ہو تا جب فطرت آدمی کو آواز دیتی ہے تو اسے کہاں جانا ہوتا ہے۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ”دس منٹ روکو، ہم ذرا مصروف ہیں۔“

”او کے دس منٹ۔“

جب میرے خیال میں دس منٹ پورے ہو گئے تو میں نے پھر دروازہ بجانا شروع کر دیا اور اس وقت تک بجاتا رہا تھا جب تک وہ کھل نہیں گیا۔ سامنے ایک کلین شیو خوبرو نوجوان تھا جو مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اس نے غرا کر کہا۔ ”تمہیں مسئلہ ہے؟“

”بالکل بھی نہیں کیونکہ میں اس صاف ستھرے کمرے کو ہاتھ روم کی جگہ استعمال کرنا نہیں چاہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تمہاری جون ہی بدل گئی ہے۔ داڑھی مونچھیں ہٹا کر بہت چمکنے لگے ہو۔“

ایک لمحے کو اس کی آنکھیں سرخ ہوئی تھیں مگر اس نے سر دلچھ میں صرف اتنا کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

نوجوان نے جیئر اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ باقی پارٹی ڈرائنگ روم میں تھی اور کھانے پینے سے شغل کر رہی تھی ان کا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ داڑھی مونچھیں غائب تھیں اور وہ پینٹ شرٹ میں تھے۔ زینی نے بہت کسی ہوئی جیئر کے ساتھ نہایت ڈھیلی موٹے میٹ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا گلا ایک شانے سے ڈھلک کر بازو تک آ گیا تھا۔ میز پر کھانے پینے کی تیار چیزیں تھیں۔ ان کے ساتھ بیئر کی بوتلیں اور کولڈ ڈرنک کے ٹن تھے۔ نوجوان مجھے ساتھ والے کمرے کے واش روم تک لایا اور اس نے کہا۔ ”جلدی کرو جو کرنا ہے۔“

”ذرا دیر لگے گی۔“ میں نے کہا اور اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ مگر جب میں نے واش روم کا جائزہ لیا تو وہاں سے بھی نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ ایک نہایت چھوٹا سا روشن دان تھا اور اس پر بھی شیشہ فکس تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سرد پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور ضروریات سے فارغ ہوا۔ پھر باہر آیا تو نوجوان وہیں موجود تھا۔ وہ مجھے لے کر واپس آیا تو زینی نے آواز دی۔

”ایک منٹ اسے بھی کھانے کو دے دو، آگے طویل سفر ہے۔“

مجھے ایک ٹھنڈا چھوٹا پیزا اور چند نان خطائیوں کے ساتھ کولڈ ڈرنک کا ایک ٹن عنایت کیا گیا اور واپس بند کر دیا گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک لگتا تھا کہ یہاں قیام عارضی تھا۔ انہیں آگے جانا تھا مگر کہاں جانا تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ اس خبر نے میرے خدشات کو بڑھا دینے تھے کہ کہیں مجھے پھر بھارتیوں کے حوالے کرنے کا کوئی پلان تو ردِ عمل نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بھارتی دو بار مجھے لے جانے کی کوشش کر چکے تھے اور انہیں دونوں کوششیں خاصی مہنگی پڑی تھیں جب انہیں اپنے ہیلی کاپٹر ز اور کمانڈوز سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ یہاں سے اگرچہ

افغانستان کی سرحد زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر خط مستقیم میں سفر کیا جائے تو فاصلہ ساٹھ کلومیٹر زبھی نہیں بنتا تھا لیکن دشوار اور پہاڑی راستوں کے گھماؤ پھراؤ کی وجہ سے یہ تین گنا بھی ہو سکتا تھا۔ شاید اسی لیے زینی نے کہا تھا کہ دور جانا ہے۔ کھانے کے دوران میں نے سوچا کہ کہیں میں کچھ زیادہ تو نہیں سوچ رہا ہوں ممکن ہے یہ مجھے یہاں سے کسی میدانی علاقے کی طرف لے جائیں۔ آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور شیر خان کے ساتھ زینی اور وہی خوبرو نوجوان موجود تھے۔ وہ مسلح اور چوکنا تھے۔ شیر خان نے کہا۔

”باہر آؤ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔“

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر پوچھا۔ ”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو اور کن کے حوالے کرو گے؟“

”سوال مت کرو۔“ خوبرو نوجوان غرایا۔ ”شرافت سے باہر آ جاؤ۔“

”اگر میں نہ آؤں تو تم کیا کرو گے؟ مجھے گولی مار دو گے؟“ میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں تمہارے گھنٹے پر گولی ماریں گے اور پھر تمہیں کھینچ کر لے جائیں گے۔ زندہ لانے کو کہا ہے۔“ ضروری نہیں ہے کہ سلامت بھی ہو۔“ شیر خان نے اپنی رائفل کا رخ میرے پیر کی طرف کر دیا۔ ”میرے تین تک گھنٹے سے پہلے فیصلہ کر لو کہ کس طرح جاؤ گے؟“

”اوکے۔“ میں نے اس کے تین کہنے سے پہلے ہاتھ اٹھا دیا۔ ”میں آ رہا ہوں لیکن مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کن لوگوں نے اٹھوایا ہے۔“

”جلد تمہارے سامنے آ جائے گا مسٹر شہباز۔“ زینی بولی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ لباس بھی تم پر بیچ رہا ہے لیکن رات تو تم قیامت لگ رہی تھیں۔“

”شٹ آپ۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”جھوٹی تعریف مت کرو۔ میں جان گئی ہوں تم عورت سے متاثر ہونے والے آدمی نہیں ہو۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ میں نے کہا اور باہر آیا تو ایک بار پھر میرے دونوں ہاتھ پشت پر پلاسٹک ڈور سے باندھے گئے۔ اس کی گرفت اور سختی اذیت ناک ہوتی ہے جو دوران خون روک دیتی ہے اور کھلنے کے بعد بھی خاصی دیر ہاتھ کسی قائل نہیں رہتے ہیں۔ وہ باہر آئے اور مجھے جیب میں بٹھایا۔ کل رات کی طرح ڈرائیونگ زینی نے سنبھالی تھی۔ اس وقت اس نے اپنی سنسنی خیز شرٹ پر ایک ہلکی جیکٹ پہن لی تھی۔ شیر خان اس کے برابر میں تھا اور اس کے دونوں ساتھی میرے دائیں بائیں تھے۔ وہ سب ہی نوجوان اور خاصے خوب صورت تھے۔ عمریں تیس کے اندر تھیں۔ میں نے شیر خان سے کہا۔ ”کیا میرے کچھ اور سوالوں کے جوابات مل سکتے ہیں؟“

”کیسے سوالات؟“

”تم لوگوں کے بارے میں۔“

”پوچھو اگر دے سکا تو دوں گا۔“

”تمہارا تعلق پاکستان سے ہے؟“

”میرا ہے۔“ شیر خان بولا۔ ”یہ تینوں باہر سے ہیں۔“

”لیکن تم چاروں ایک ٹیم ہو؟“

”ہاں ہم چاروں ایک ٹیم ہیں۔“ اس نے تسلیم کیا۔

”اسی قسم کے کام کرتے ہو؟“

”ظاہر ہے۔“ شیر خان نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کافی سوالات ہو گئے ہیں۔“

”مہربانی تمہاری کہ تم نے جواب کی زحمت کی۔“

”میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں اس لیے ذرا فکر مند بھی تھا کہ تم شاید اتنی آسانی سے ہاتھ نہ آؤ جتنی

آسانی سے آ گئے۔“

”میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”تمہارا مکمل بیک گراؤنڈ۔“ شیر خان بولا۔ ”سچی بات ہے میں تم سے متاثر بھی ہوا تھا؟“

”گو یا اب نہیں ہو؟“

”نہیں اب بھی ہوں۔“ وہ یوں بولا جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ انسان کو اپنا خیال اتنی جلد ہی نہیں بدلنا چاہیے

ورنہ وہ اب تک بدل چکا ہوتا۔

”لگتا ہے تمہیں میرے بارے میں کچھ غلط معلومات ملی ہیں میں ایک عام آدمی ہوں بس ذرا مختلف طرز

زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔“

شیر خان چپ رہا۔ جیب کا رخ میری توقع کے مطابق شمال کی طرف تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

”شیر خان اور زینی کیا یہ اصل نام ہیں؟“

”میرا نام اصل ہے۔“ زینی بولی۔ ”لیکن یہ یک نیم ہے۔“

”وہ تو ظاہر ہے، اس کا مطلب ہے شیر خان اصل نام نہیں ہے؟“

”ہاں میرا نام کچھ اور ہے مگر تم چاہو تو مجھے شیر خان ہی کہہ سکتے ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارے بازو کا زخم کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے کوئی چھوٹی ہوئی گزرتی تھی۔“

وہ چاروں یقیناً کل شام سے اس مشن پر تھے انہیں اس جگہ پہنچنے اور مجھے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا ہو

گا۔ پھر وہ مجھے یہاں لائے اور اس کے بعد بھی آرام نہیں کیا۔ اپنا گیٹ آپ تبدیل کیا اور کھاتے پیتے رہے۔ اس

کے باوجود وہ چاروں تازہ دم لگ رہے تھے۔ شاید انہوں نے کوئی دوا استعمال کی تھی۔ آج کل ایسی دوا میں عام

ہو گئی ہیں جو انسان کو بہت بری حالت میں بھی یوں چاق و چوبند کر دیتی ہیں جیسے وہ بھرپور آرام کر کے اٹھا ہو۔

اگرچہ ان دواؤں کے سائیڈ ایفیکٹس بھی ہوتے ہیں مگر وقفے سے استعمال کرنے سے خاص اثر نہیں پڑتا ہے۔

دسم نے مجھے ان دواؤں کے بارے میں بتایا تھا جو وہ طویل مشن کے دوران استعمال کرتے تھے۔ یہ تھکن اور اس

کے اثرات غائب کر کے انہیں چاق و چوبند کر دیتی تھیں۔ اس میدان میں جدید ایجادات کا فائدہ شیر خان جیسے

لوگ زیادہ اٹھا رہے ہیں کیونکہ وہ اس سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ اب دہشت گرد ایسی ادویات کا

فائدہ اٹھاتے ہیں جو ان کے مشن میں کارآمد ہوں جیسے بہتے خون کو روکنے والی دوائیں، نیند اڑانے اور تھکن

بھگانے والی دوائیں، ایسٹرائیزز جو کچھ دیر کے لیے انسان کو سپر مین بنا دیتے ہیں۔ اب سنا ہے حواس تیز کرنے

والی دوائیں بھی میدان میں آگئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد ہم انسان اور مشین کا ملاپ یعنی سائی بورگ بھی اپنی زندگی میں دیکھ سکیں۔

جیپ اسی سڑک پر تیزی سے آگے جا رہی تھی۔ اگرچہ راستہ بہت اچھا نہیں تھا مگر جیپ کا طاقتور انجن اور بہترین ریڈیل ٹائرز کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی اچھی کوالٹی کی ہائی وے پر سفر کر رہے ہوں۔ زینی اچھی ڈرائیور تھی۔ اسپیدومیٹر کی سوئی مستقل چالیس کے آس پاس تھی مگر اس نے ایک بار بھی گاڑی کو قابو سے باہر ہونے نہیں دیا تھا۔ ورنہ یہاں بہت تنگ اور یوٹرن ٹائپ موڑ تھے۔ ایک جگہ سڑک کا تقریباً ایک کلومیٹر کا ٹکڑا بارش کی وجہ سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا صرف اسی حصے میں رفتار ذرا کم ہوئی تھی اور اس کے بعد جیپ پھر اپنی رفتار سے دوڑنے لگی۔ یہاں بلندی بھی کم زیادہ ہو رہی تھی۔ ایک مقام پر ہم نو ہزار فٹ کی بلندی سے بھی گزرے اور اکثر مقامات چھ سے سات ہزار فٹ بلند تھے۔ بلندی پر سردی بڑھ جاتی تھی اور نیچے آتے تو موسم معتدل ہو جاتا۔

راجا عمر دراز سے ملاقات کا فیصلہ مجھے مسلسل مہنگا پڑ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک مصیبت میں گرفتار ہوتا رہا اور اللہ کے فضل سے اس مصیبت سے نکلتا رہا۔ مگر اس آخری مصیبت سے چھٹکارے کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ جیپ کے ٹائر برسٹ ہو جانے کے بعد اگر میں تجس میں پڑنے کی بجائے فرار کو ترجیح دیتا تو شاید اس مصیبت میں نہ پڑتا۔ بہر حال یہ مقدر میں بھی تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم گھوٹے اور مغرب کی طرف جانے لگے مزید آدھے گھنٹے بعد ہمارا رخ جنوب مغرب کی طرف ہو گیا یعنی اب ہم الٹی سمت میں جا رہے تھے۔ سڑک نازک اور پتلی ہوتی جا رہی تھی مگر اس پر بھی ٹریفک تھا۔ بڑے ٹرکوں سے لے کر مسافر بردار کوچر، وین اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سیزن کی وجہ سے سیاح بھی محو سفر تھے اور درے کھل جانے کی وجہ سے آنے والے سرما کے لیے ابھی سے سامان زندگی جمع کیا جا رہا تھا۔ سارے سال باہر رہ کر کمانے والے گرمیوں میں اپنے علاقے میں آتے جاتے تھے۔

شکرا ل کے پاس رک کر جیپ کا انجن ٹھنڈا کیا گیا اور ان لوگوں نے بھی ہاتھ پاؤں کھولے مگر مجھے نیچے اترنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ نیچے اترنے پر بھی ان میں سے ایک میرے پاس ہی رہتا تھا۔ جب شیر خان کی باری آئی تو میں نے اس سے گپ شپ شروع کر دی۔ ”تم تعلیم یافتہ لگتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر کیا ہے۔“

”لیکن یہ ہندو زیادہ نفع بخش لگا ہوگا؟“

”دوست کہا تم نے، دو سال ملازمت میں جھک ماری۔ اتنی تنخواہ بھی نہیں تھی کہ اپنا بی گزارہ کر سکتا۔ اس لیے یہ لائن پکڑ لی۔“

”تم تربیت یافتہ لگ رہے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے ایک سال کی ٹریننگ حاصل کی ہے۔“

”کہاں سے؟“

”ہیمن سے، باہر کے لوگ آئے تھے انہوں نے بے شمار لوگ ہائر کیے، ہمیں تربیت دی، کچھ کام لیے اور

پھر واپس چلے۔ اب میں اور مجھ جیسے دوسرے بے شمار لوگ آزاد ہیں۔“

”نہیں وہ اب بھی غلام ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ اس ملک کو انتشار اور افراتفری کی نظر کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے بے شمار افراد کو مسلح تربیت دے کر آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اب ان کا روزگار گمن سے وابستہ ہے۔ جیسے کہ تمہارا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”فرق تو پڑتا ہے پہلے جرائم کم ہوتے تھے مگر اب جرائم زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس سے معاشرے کا ایک مجموعی تاثر کیا جاتا ہے؟ ملک کا کوئی گوشہ خرابی کا روایوں سے خالی نہیں ہے۔ جن لوگوں نے تمہیں تربیت دی انہوں نے ساتھ ہی یہاں اسلحے کی بھرمار بھی کی ہے۔“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم کیسی باتیں کر رہے ہو کیا تم گمن استعمال نہیں کرتے۔“ اس نے اپنا پٹی بندھا بازو آگے کیا۔ ”یہ کس نے کیا ہے؟“

”یہ میں نے اپنے دفاع میں کیا ہے۔ میں نے آج تک گمن سے کوئی نفع یا مفاد نہیں کمایا۔ صرف اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کیا ہے۔ اگر میں تمہیں بتا دوں کہ میں نے چند دن پہلے کیا چھوڑا ہے تو تم یقیناً مجھے پاگل سمجھو گے۔“

”میں بھی اپنا دفاع کر رہا ہوں بھوک اور افلاس کے خلاف۔“ اس نے سر دلچے میں کہا۔

”غلط، جب تم جاب کر رہے تھے تو بے شک تم کو کم تنخواہ مل رہی تھی مگر یہ تنخواہ ہمیشہ اتنی نہیں رہتی۔ ایک وقت آتا جب تمہیں تمہارے تجربے اور قابلیت کے مطابق تنخواہ ملتی۔ یہاں نہ ملتی تو تم میری دن ملک جاسکتے تھے۔ مگر تم نے آسان راستہ اختیار کیا۔“

”یہ آسان راستہ ہے؟“ اس نے ایک بار پھر اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا وہ برافروختہ نظر آیا تھا۔

میں نے سر ہلایا۔ ”ہاں دوسری دنیا کی طرف آسان راستہ۔ آدمی جلدی اور بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور ان سے چلنے کو کہا۔ اس بار ڈرائیونگ میرے ساتھ بیٹھے خوبرو نوجوان نے سنبھال لی اور زینی اس کی جگہ آگئی۔ وہ جان بوجھ کر مجھ سے ذرا لگ کر بیٹھی تھی۔ عورت ہونے سے قطع نظر وہ ان تینوں کے لیے صرف ایک ساتھی تھی اس لیے کسی کو نہ تو اس کے عریاں ہونے پر اعتراض ہوا تھا اور نہ ہی میرے ساتھ لگ کر بیٹھنے پر۔ میں کسمسایا اور اسے زری سے پیچھے دھکیلا تو وہ مسکرانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چیلنج تھا کہ ایک عورت سے ڈرتے ہو اور میں نے آنکھوں میں اعتراف کیا کہ عورت سے ہی ڈرتا ہوں کیونکہ وہ کبھی شکست تسلیم نہیں کرتی ہے اور بالآخر مرد کی عقل کو گھاس چرنے بھیج دیتی ہے۔ انسان کو موت سے اتنا نہیں ڈرنا چاہیے جتنا کہ بے باکی پر آمادہ عورت سے ڈرنا چاہیے۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے شیر خان سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہم دیر کی طرف جا رہے ہیں۔“

”ہماری منزل اس سے آگے ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

دیر سے آگے چترال کی طرف جاتے ہوئے بہت وقت لگتا لیکن اگر ان لوگوں کی منزل افغانستان تھا تو ہم شام سے پہلے سرحد پار کر سکتے تھے۔ آج سے چند سال پہلے یہ سارا علاقہ دونوں طرف فوجوں کے اجتماع کی وجہ سے متحرک سرحد بن چکا تھا۔ آئے دن سرحد پار سے حملے اور جانی نقصان معمول کی بات تھی۔ جو پاکستان کو اتحادی کا درجہ دیتے ہیں وہ اس کی فوجی چوکیوں پر فضائی حملے کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ کسی زمانے میں یہاں صرف نام کی سرحد ہوتی تھی اور دونوں طرف بسنے والے لوگ یوں سرحد پار آتے جاتے تھے جیسے ہم پنڈی سے اسلام آباد آتے جاتے ہیں۔ کاروبار سے لے کر رشتے دار یاں تک سب چلتی تھیں۔ مگر فی الحال یہ سب بند تھا۔ ہر ایک بار خدشہ میرے ذہن میں سرسرا نے لگا کہ مجھے بھارتیوں کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

دوبارہ روانہ ہونے کے بعد سب میں لُچ تقسیم ہوا۔ یہ خشک ہو جانے والے میٹھے روغنی نان اور کولڈ ڈرنکس پر مشتمل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان لوگوں کو چائے کافی کا شوق نہیں تھا۔ کیونکہ جنگلے میں بھی ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی جب کہ وہاں چائے کافی کا سامان ہو سکتا تھا۔ انہوں نے راستے کے لیے آسان خوراک رکھی تھی جو سادہ بھی تھی اور توانائی بخش بھی۔ ان کے پاس پانی بھی تھا مگر کولڈ ڈرنک کی بہتات تھی ایک پورا ایک کولڈ ڈرنک کنوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے بیک میں بیڑی کی بوتلیں تھیں مگر ان سے صرف وہی مشغل کر رہے تھے جنہوں نے ڈرائیو نہیں کرتی تھی۔ یعنی شیر خان اور میرے برابر میں بیٹھا ہوا دوسرا آدمی۔ میں نے بندھے ہاتھوں سے یوں لُچ کیا کہ زہنی مجھے کھلاتی اور پلاتی رہی۔ انہوں نے میرے ہاتھ نہیں کھولے تھے۔ تین بجے تک ہم دیر اور چترال جانے والی سڑک پر آگئے تھے۔ دیر کا علاقہ شروع ہو گیا تھا مگر چترال یہاں سے خاصا آگے تھا۔

سڑک زیادہ خراب ہو رہی تھی اور اب جھٹکے لگنے لگے تھے۔ کہیں کہیں یہ اتنی تنگ ہو جاتی تھی کہ اس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ مگر ایسے کلوڑے زیادہ طویل نہیں تھے۔ عام طور سے سڑک ایسی ڈھلان پرنگ ہوتی تھی جو بہت ترچھی ہو اور اس پر چوڑی سڑک بنانا ممکن نہ ہو۔ یہاں بہت گھنے اور آسمان سے باتیں کرتے درختوں پر مشتمل جنگلات تھے اور جنگل سے بہت انوکھی مہک اٹھ رہی تھی۔ اب یہاں کثرت سے چشے نظر آنے لگے تھے اور بیشتر سڑک سے گزر رہے تھے۔ بعض مقامات اتنے حسین اور نظروں آواز تھے کہ دل چاہتا آدمی وہیں رک جائے۔ مگر وہ رک نہیں سکتے تھے اور میں ان کا قیدی تھا۔ میں کئی بار اس سڑک پر سفر کر چکا تھا۔ دیر سے اوپر ایک راستہ افغانستان کی طرف جاتا تھا۔ اس سڑک سے یہاں بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی اور اسمگلنگ کی جاتی تھی۔ مگر جنگ کے بعد صورت حال بدل گئی تھی۔ اب اس راستے کی بجائے خفیہ راستے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر اسمگلنگ پہلے جیسی کھلی نہیں رہی ہے۔ البتہ مقامی ضرورت کے تحت کی جاتی ہے اور سرحدی حکام اس سے چشم پوشی بھی کرتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کی مجبوری ہے۔

اب یہ سڑک زیادہ تر فوجی نقل و حرکت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس لیے جب یہ سڑک گزر گئی تو میں سمجھا کہ یہ آگے چترال کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ مگر آدھے گھنٹے بعد جیب ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی جھنکوں کا آغاز ہوا۔ جھٹکے بھی ایسے تھے کہ کبھی ہم بائیں طرف گرتے تھے اور کبھی دائیں طرف۔ آگے جانے سے روکنے کے لیے مجھے پاؤں استعمال کرنے پڑتے تھے۔ مین دوہری مصیبت میں تھا کیونکہ ہاتھ پشت

پر بندھے تھے اور ہر جھکے پر پاؤں میں زینی پر گرتا تھا یا وہ مجھ پر آتی تھی اور مجھے خاصے امتحان سے گزرتا پڑتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے بدن کے نرم و نازک حصے مجھ سے پوسٹ کر دیتی تھی۔ چند بار ایسا ہی ہوا تو میں نے تکلف بالائے طاق رکھ کر دونوں پاؤں اوپر کیے اور سیٹوں کی پشت پر جمادیئے اور یوں میں ایک جگہ پوز ہو گیا۔ اگرچہ یہ بھی مشکل تھا کیونکہ پیچھے بندھے بازوؤں پر زور آ رہا تھا۔ بعض مقامات پر یہ پوز بھی لڑھکنے سے نہیں بچاتا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر جیپ کا ڈھانچا بول رہا تھا اور اس کی آوازوں سے، رہا تھا کہ جیپ کو کتنے مشکل مراحل سے گزرتا پڑ رہا تھا۔ ایک بار خود کو روکنے کے باوجود زینی پر گرنا تو اس نے مجھے واپس دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تم بیکار کی کوشش کر رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے کوشش نہیں کرتا۔“ میں نے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس بار جھکا آیا تو میں پورے وزن سمیت اس پر گیا اور اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے مجھے برہمی سے دھکیلا۔

”یہ کیا ہے؟“

”بیکار کی کوشش نہ کرنے کا انجام۔“ میں نے جواب دیا۔ شکر ہے اسی وقت دشوار راستہ گزر گیا۔ سڑک ابھی بھی کچی تھی مگر ہموار ہو گئی تھی اور اب جیپ بنا آواز کے چل رہی تھی۔ ”ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“

میرے سوال پر شیر خان نے جیپ کا کپاس دیکھا اور بولا۔ ”ٹھیک مغرب کی طرف۔“

”یعنی افغانستان کی طرف، کیا میرے طلب گار وہاں بیٹھے ہیں۔“

”پتا نہیں کیونکہ تمہاری ڈیوری یہیں ہوگی۔“

”باپ رے۔“

”ڈرومٹ۔“ زینی ہنسی۔ ”یہ دوسری ڈیوری کی بات کر رہا ہے۔“

”تم سخت واہیات عورت ہو۔“ میں نے جڑبڑھوتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے تم نے عورت تسلیم کیا۔ ورنہ میں سمجھی کہ تم مجھے مرد سمجھ رہے ہو۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

جیپ جس راستے پر چل رہی تھی اس کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ اس پر انسانوں اور گاڑیوں کی آمد و رفت باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ راستے میں ایک جگہ نشیب میں آبادی بھی دکھائی دی تھی مگر جیپ اس کے اوپر سے گزر گئی۔ اب تک کسی انسان کی صورت نظر نہیں آئی۔ ایک بڑا جنگل آیا اور اس سے گزرنے کے بعد جیپ ایک وسیع چراگاہ میں داخل ہوئی جو دو پہاڑوں کے درمیان تقریباً ایک کلومیٹر چوڑی پٹی میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میدان سے بے شمار ندیاں گزر رہی تھیں اور دیوار اونچی گھاس میں لاتعداداں بھیڑیں، بکریاں اور دوسرے پالتو جانور چر رہے تھے۔ انسان یہاں بھی چند ایک ہی تھے اور انہوں نے سرسری سی نظروں سے ہمیں دیکھا تھا۔ جیپ چراگاہ سے بھی گزر کر ایک دریا کے کنارے چلنے لگی۔ موسم کی مناسبت سے دریا میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ کچھ دیر دریا کے ساتھ چلتے رہے۔ یہ افغانستان اور پاکستان میں بہنے والا دریا کنہار تھا۔ جو کبھی سرحد کے اس طرف ہوتا ہے اور کبھی دوسری طرف چلا جاتا ہے اور بالآخر بعد میں اس کا پانی پاکستانی دریا سیٹلم میں شامل ہو جاتا ہے۔

سفر جس طرح جاری تھا صاف لگ رہا تھا کہ ان کو اپنی منزل اور وقت کا علم تھا۔ وہ کسی مرحلے میں نہ تو کے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی سے رابطہ یا آپس میں کوئی مشورہ کیا تھا۔ سب پہلے سے طے شدہ تھا۔ جیپ

ایک خستہ حال پل کی طرف مڑی اور بہت احتیاط سے اسے کراس کر لیا۔ پل رسوں اور لکڑی کے مونے ٹختوں کا بنا ہوا تھا اور اس سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ جب تک جیب پل سے گزرتی رہی سب دم سادے بیٹھے رہے اور پل کے بعد سانس میں سانس آئی تھی۔ پل کراس کرنے کے بعد ہم ایک نشیبی جنگل سے گزرنے لگے۔ اس کے چاروں طرف بلندی تھی اس لیے بارش کا پانی اس جگہ جمع ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ یہاں بزرے اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اونچے درخت بھی تھے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ آبادی سے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے یہاں پرندوں کی بہتات تھی۔ خاص طور سے چکور اور بیئر دکھائی دیے تھے۔ پاس آبادی ہوتی تو شکاری انہیں کہاں پہنچتے۔

جنگل کے بعد ایک ندی آئی اور سفر جاری رہا۔ اب سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور کچھ دیر میں رات ہو جاتی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ان پر بے شمار ندیاں بہہ کر اوپر سے نیچے دریا کی طرف جاری تھیں مگر کوئی ندی اتنی بڑی نہیں تھی کہ رکاوٹ بنتی۔ ان لوگوں نے راستے میں جیب میں پیٹرول بھردالیا تھا اور پیچھے دروازے کے ساتھ تین عدد بڑے جیری کین بندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں دس گیلن پیٹرول تھا۔ اس لیے وہ آرام سے سفر کر رہے تھے۔ سورج ڈوبنے تک سفر جاری رہا اور پھر انہوں نے ایک ندی کراس کی اور رک گئے۔ مغرب سمت میں اونچا ہوتا پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر برف نظر آرہی تھی اور کئی مقامات پر آبشاریں گر رہی تھیں۔ دامن میں گھنا جنگل تھا۔ جیب درختوں کے درمیان روک کر انہوں نے اسے جھاڑیوں اور شاخوں سے ڈھک دیا۔ وہ کمیوفلاج کر رہے تھے۔ یہ علاقہ غیر تھا اور وہ یہاں بغیر اجازت کے آئے تھے اس لیے احتیاط لازمی تھی۔

ہم جس طرح سفر کرتے رہے تھے میرا اندازہ تھا کہ ہم افغانستان کی سرحد کے پاس کہیں تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی یہ لوگ احتیاط کر رہے تھے۔ انہوں نے جیب کے عقبی حصے سے سلپنگ بیگز نکالے۔ اترنے کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ کھول دیے تھے۔ مگر اب وہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ کھانے میں وہی میٹھی روغنی روٹیاں اور کولڈڈرک تھی۔ میں نے چائے کافی کا پوچھا تو جواب ملا کہ ایسی عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کھانے کے فوراً بعد مجھے سلپنگ بیگ میں جانے کا حکم ملا۔ خود میرا تھکن اور بازوؤں میں دکھن سے حال اچھا نہیں تھا۔ میرا بایاں ہاتھ جو یکسہم قاعد کے علاج سے فوج گیا تھا اور تقریباً ٹھیک ہو گیا تھا اس وقت سن ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک یہ حرکت کے قابل نہیں رہا تھا میں مسلسل اس کی مائش کرتا رہا تب کہیں جا کر یہ ٹھیک ہوا تھا۔

حکم ملنے پر میں سلپنگ بیگ میں داخل گیا۔ یہ ہلکا گرم تھا اور اصل میں کھردری زمین اور کیڑے مکوڑوں سے بچاؤ کے لیے تھا۔ اس کا نصف اوپری حصہ نیٹ پر مشتمل تھا۔ نیچے دیز تہ کی وجہ سے جسم کو آرام ملا تھا۔ ہمارے سلپنگ بیگز پاس پاس اور درختوں کے نیچے تھے۔ لگ رہا تھا کہ وہ اپنا قیام خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جگہ بھی ایسی منتخب کی تھی جہاں سے کسی کا گزرنہ ہو۔ کچھ دیر بعد ان میں سے دو سلپنگ بیگز میں لیٹ گئے تھے اور باقی دو پہرے پر تھے۔ وہ مجھ پر اور آس پاس نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں لیٹا اور چند منٹ بعد سو گیا۔ پھر رات کسی پہرے پر باؤ آیا تو میں جاگ گیا۔ میں نے زپ نیچے کی تو نزدیک موجود زینی چونکی اور اس نے رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”کیا ہے؟“

”پھر سے..... فطرت کی پکار۔“

”ہے بڑی۔“ اس نے امریکن اسٹائل میں اپنے ساتھی کو آواز دی۔ ”اے نیچر کال کر رہی ہے۔“
بڑی وہی خوبرونو جوان تھا۔ وہ مخالف سمت سے آیا اور اس نے زینی سے کہا۔ ”آواز کم رکھو۔“
میں سلپنگ بیگ سے نکل آیا۔ نو جوان مجھے ایک طرف لے آیا اور دودرختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”جو
کرنا ہے یہیں کرو اور صرف دو منٹ میں۔“

ہم واپس آئے تو میں سلپنگ بیگ میں جانے کی بجائے اس پر بیٹھ گیا۔ زینی نے کہا۔
”اندر جاؤ۔“

”میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں رات میں بھی ہوا نہیں چل رہی۔“
”ہوا پہاڑ کے دوسری طرف ملے گی۔“ اس نے کہا۔
”تم نہیں سوئیں؟“

”میں سو کر اٹھ گئی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی صبح کے چار بج رہے ہیں۔“
”یعنی کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے ہم سرحد کے پاس ہیں۔“
”صرف ایک کلومیٹر دور ہیں۔“
”آگے تم لوگ جاؤ گے یا وہ آئیں گے؟“

”صبح پتا چلے گا۔ حالات دیکھ کر فیصلہ ہوگا۔“ اس نے مبہم انداز میں کہا جیسے واضح جواب دینے سے گریز
کر رہی ہو۔

”تم جارحین ہوتی دور کہاں سے آگئیں؟“ میں نے موضوع بدل دیا۔
”میں آئی نہیں لائی گئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جب یہاں امریکی آئے تو دوسری گند گیون کے
ساتھ یہاں جسم فروشی کا کاروبار بھی چمک اٹھا۔ ڈالر کے لیے عورتیں خود بھی آئیں اور زبردستی لائی گئیں۔“
”تم زبردستی لائی گئیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”اس وقت میں صرف چودہ سال کی تھی۔ میرا کزن ہی مجھے بہکا کر لے گیا۔ بعد میں پتا
چلا کہ وہ ان لوگوں کا ایجنٹ تھا۔ مجھے ایک افغان وار لارڈ کو فروخت کیا گیا۔ میرے ساتھ بارہ لڑکیاں اور تھیں
جن میں سے مجھ سمیت تین اس وار لارڈ کے حصے میں آئیں۔“
”اس کے چنگل سے کیسے نکلیں؟“

میں تین سال اس کے پاس رہی اور یہ میری زندگی کے بہت مشکل تین سال تھے۔ پھر میں نے پہلا قتل
کی وار لارڈ کا کیا۔ اس کے ساتھ اس کے چھ اہم ترین ساتھی بھی مارے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کی
کلاشکوف کا پورا میگزین ان پر خالی کر دیا اور فرار ہو گئی۔ کچھ عرصے چھپتی رہی پھر یہاں آ گئی۔ مجھے شیر خان مل گیا
ن نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔“

”اب تم مطمئن ہو؟“

”انسان کسی حال میں مطمئن نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”صرف مطمئن ہونے کا

دھکا دیتا ہے۔“

”تو تم دھوکا دے رہی ہو؟“

”سب دیتے ہیں۔“ اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔ ”صرف میں ہی نہیں ہوں۔“

اس وقت مجھے لگا کہ اس کے ظاہری روپ سے قطع نظر اس کے اندر بہت تلخی بھری ہوئی تھی۔ شاید اس نے استحصال کا جو وقت دیکھا تھا یہ اس کا فطری ردِ عمل تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بھی شاکِ ہو۔ عورت کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو وہ استعمال ہونا پسند نہیں کرتی ہے۔ یہ لوگ اسے استعمال کر رہے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم اپنے ساتھیوں سے خوش نہیں ہو؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”یہ تمہیں استعمال کر رہے ہیں جیسے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کیا۔“

”مگر تم ہوئے نہیں۔“

”میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ دوسرے میں جن حالات سے گزر رہا ہوں اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ورنہ تم میں اور تمہاری کوشش میں کوئی کمی نہیں تھی۔“ وہ مسکرائی۔ ”تم نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس گن ہوتی تو تم ابھی زندہ نہ ہوتے۔“

”تب مجھے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہارے پاس گن نہیں تھی۔“

باتوں کے دوران میں صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ زینی اور اس کا ساتھی رات دو بجے اٹھ گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے چھ گھنٹے تک سوتے رہے تھے اور اب ان لوگوں کی باری تھی۔ روشنی ہوئی تو زینی نے نوجوان کو بلایا اور میرے سر پر چھوڑ کر خود جیب کی طرف گئی۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا برز اور دھات کی کیٹلی تھی۔ اس نے پانی بھر کر کیٹلی برز پر رکھی اور جب پانی کھولنے لگا تو اس میں چائے کی پتی ڈال دی۔ چند لمبے بعد فضا میں چائے کی خوشبو تیرنے لگی۔ جب زینی نے کانڈ کے مگ میں مجھے بھی چائے دی تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جو اپنے بندے کی فضول عادات بھی یوں پوری کر رہا تھا۔ چائے بہت اچھی بنی تھی اگرچہ دودھ اور چینی کے بغیر تھی۔ میں چینی لیتا ہوں مگر اس وقت اس چائے نے بھی بہت مزہ دیا۔ سات بجے شیر خان اور اس کا دوسرا ساتھی اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے سلپنگ بیک واپس جیب میں ڈال رکھے۔

سب نے باری باری ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھوئے۔ میں شیر خان کے ساتھ گیا۔ ٹھٹھے روغنی نان سے ناشتا کیا گیا اور پھر انہوں نے سفر کی تیاری شروع کی مگر یہ سفر بیدل تھا۔ انہوں نے اپنا اسلحہ لے لیا اور میرے ہاتھ پھر پشت پر باندھ دیئے۔ پھر وہ اس طرح آگے بڑھے کہ سب سے آگے شیر خان تھا اور پیچھے زینی۔ اس کے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے باقی دو تھے۔ میں ایک بار پھر مضطرب ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اب تک مجھے کوئی موقع نہیں دیا تھا لیکن میں نے سوچ لیا کہ اگر معاملہ بھارتیوں کا ہو تو میں اپنی جان پر کیل کر بھی فرار کی کوشش کروں گا چاہے آگے نتیجہ جو بھی نکلے۔ بھارتیوں کے ہاتھ آنا مجھے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔ پہاڑی ڈھلان کے گھنے جنگل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم ایک کھلی مگر چھوٹی داوی میں نکلے۔ شیر خان نے ہمیں روک دیا۔ اس نے کہا۔ ”بس یہیں رک جاؤ۔ ہمیں یہیں رک کر انتظار کرنا ہے۔“

میں نے شیر خان سے کہا۔ ”تم نے جو کام کیا ہے کیا اس کا معاوضہ لے لیا ہے؟“
”جہیں اس سے کیا؟“ وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

”کیونکہ سودا میرا ہو رہا ہے۔ لیکن میرا بچھنے کا مقصد کچھ اور ہے۔ تم جس طرح مجھے زیادہ نہیں جانتے اسی طرح میرے دشمنوں سے بھی واقف نہیں ہو گے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی قسم کا معاوضہ دینے کی بجائے چند گولیاں خرچ کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر تمہیں معاوضہ نہیں ملا ہے تو ہوشیار رہو کہ ادائیگی کا طریقہ کار تمہاری توقع کے خلاف نہ ہو۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا لیکن پھر اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ درختوں میں غائب ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد زینی بولی۔ ”تم کس کی باتوں میں آ رہے ہو؟“

”احتیاط کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ شیر خان نے دانش مندی کی بات کی۔

زینی نے اختلاف جاری رکھا۔ ”یہ ہمارا قیدی ہے ہمیں کبھی ٹھیک مشورہ نہیں دے گا۔“

”تم میرے براہ راست دشمن نہیں ہو صرف پیسوں کے لیے کام کر رہے ہو۔“

زینی مجھے گھور رہی تھی۔ حالانکہ صبح اس نے مجھ سے بہت مکمل کر گفتگو کی تھی۔ مگر اس وقت اس نے میری مخالفت کی تھی۔ نونج رہے تھے۔ شیر خان کی گھڑی پر میری نظر تھی۔ سورج بلند ہوتے ہی خشکی تیزی سے غائب ہو رہی تھی اور گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید یہ جگہ سطح سمندر سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اچانک شیر خان کے پاس سے ہلکی سی ٹون کی آواز آئی اور اس نے اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹا واک ٹاکی برآمد کر کے اس کا مٹن دبا یا۔ ”ہم پہنچ گئے ہیں۔“

اس نے صرف ایک یہی جملہ کہہ کر واک ٹاکی واپس رکھ لیا۔ پھر اس نے ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ یہ اشارہ یقیناً اپنے چھپے ساتھیوں کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا کہ زینی بھی پیچھے ہٹی اور ایک طرف درختوں میں چلی گئی۔ اب وہاں میں اور شیر خان تھے۔ ہم جس جگہ تھے اس کے تین طرف پہاڑی ڈھلان اور جنگل تھا صرف جنوبی سمت خالی تھی۔ چند منٹ بعد اسی سمت سے چار افراد نمودار ہوئے۔ میں چونکا کیونکہ انہوں نے پتلون شرٹ پر بلٹ پروف پہن رکھی تھیں اور وہ پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ دور سے ان کی چال و حال بتا رہی تھی کہ وہ تربیت یافتہ تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ گورے تھے۔ مگر نزدیک آنے پر پتا چلا کہ وہ مقامی تھے۔ شاید افغانی تھے۔ مگر بہت گورے چٹے تھے اس لیے دور سے سفید فام لگ رہے تھے۔ چاروں کے سر پر چھوٹے بال تھے جیسے کوفوجیوں کے ہوتے ہیں۔ نزدیک آنے پر ان میں سے ایک آگے آیا اور اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”شیر خان، اسے ہمارے حوالے کرو۔“

مجھے شبہ ہوا کہ وہ پاکستانی تھا کیونکہ اس نے یہ جملہ بہت اچھی اردو میں کہا تھا۔ شیر خان نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارا آدمی یہ رہا لیکن پہلے مجھے معاوضہ دیا جائے۔“

”معاوضہ مل جائے گا لیکن پہلے میں تصدیق کروں گا۔“ اس نے کہا اور آگے آیا۔ وہ شاید ان کا پاس تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا آلہ نکالا جو سائز میں موبائل فون جتنا تھا مگر اس سے مختلف تھا اس کے اوپر حصے میں ایک چھوٹا سا لینس لگا ہوا تھا۔ اس نے لینس میری دائیں آنکھ کے سامنے کیا اور بولا۔ ”اس میں دیکھو۔“

میں نے آنکھ بند کر لی اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”فکر مت کرو یہ تمہاری پتلی کی تصدیق کرے گا۔“ اس نے کہا۔ ”اپنی آنکھ کھولو۔“

میں نے آنکھ کھولی اور لینس میں دیکھا۔ چند لمحے بعد اس کے نیچے موجود بزنس لائٹ آن ہو گئی اور اس نے آلہ بند کر کے واپس رکھ لیا۔ اس کے تاثرات سپاٹ تھے اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ تصدیق ہوئی ہے یا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری آنکھ کی پتلی کا نقشہ کس کے پاس ہو گا۔ یہ کسی آدمی کی تصدیق کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے۔ جس طرح ہر آدمی کے فکر پر نٹ جدا ہوتے ہیں اسی طرح ہر آدمی کی پتلی کے اندر بنا ہوا ڈیزائن بھی مختلف ہوتا ہے۔ آج کل اس سے بھی آدمی کی تصدیق کی جاتی ہے۔ آنکھ کی پتلی بھی انسان کے بائیومیٹرکس میں شامل ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو فکر پر نٹ لینے اور رکھنے کا نظام بھی ڈھنگ کا نہیں ہے۔ آنکھ کی پتلی سے تصدیق ابھی دور کی بات ہے۔ باس کے تین ساتھی ذرا فاصلے پر اور بہت چوکنا موجود تھے۔ اگرچہ ان کی رائفلوں کا رخ نیچے کی طرف تھا مگر ان کی انگلیاں ٹریگرز سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ باس نے شیر خان سے پوچھا۔ ”تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟“

”تمہیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“ شیر خان بولا۔ ”آدمی لو اور معاوضہ دو۔“

اچانک ہی میرے اندر سے جھٹٹی حس نے اشارہ کیا اور میرا جسم سنسناتا اٹھا تھا۔ یہاں کچھ ہونے والا تھا۔ میری نظر ان چاروں پر تھی لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا اس کی بجائے اچانک جنگل کی طرف سے تڑتڑاہٹ کی آواز آئی اور ایک مردانہ چیخ گونجی جس میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ فوراً ہی کسی دوسری رائفل نے موت کا نغمہ گایا۔ شیر خان چونکا تھا کہ باس نے اس کے پیروں پر برسٹ مارا۔ وہ شاید اسے مارنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اوپر فائر کرتا۔ شیر خان دھاڑ کے ساتھ نیچے گرا اور باس نے آگے بڑھ کر اس کی رائفل لات مار کر دور پھینک دی پھر جھک کر اس کی ہیلت سے بندھا ہوا پستول نکال لیا۔ اس کے باقی تین ساتھی تیزی سے جنگل کی طرف بڑھے تھے جہاں اب دور رائفل رہ رہ کر گرج رہی تھیں۔ میری جھٹٹی حس نے درست خبردار کیا تھا۔ وہاں زندگی و موت کا کھیل جاری تھی اور لگ رہا تھا کہ اس کھیل میں شیر خان اینڈ کمپنی کو موت نصیب ہوگی۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ چند لمحے بعد ہی جنگل کی طرف سے دوسری چیخ سنائی دی اور یہ بھی مردانہ تھی جس میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ اب صرف زینی باقی رہ گئی تھی۔ مگر دوسری چیخ کے بعد فائرنگ رک گئی تھی۔

شیر خان کی دونوں ٹانگیں چھلنی ہو گئی تھیں۔ خاص طور سے گھٹنے چکنا چور ہو گئے تھے اور وہ شدید اذیت میں تھا۔ اگر اسے فوری طور پر کسی بہت اچھے آرتھرو پیڈک سرجن کی خدمات حاصل ہو جاتیں تب بھی اس کا امکان بہت کم تھا کہ وہ دوبارہ پہلے کی طرح اپنے پیروں پر چل سکے۔ مگر فی الحال تو اس کی زندگی کا امکان بھی کم ہی نظر آ رہا تھا۔ باس اس کی اور میری طرف سے پوری طرح چونکا تھا۔ شیر خان ہوش میں تھا اور کراہ رہا تھا میں نے ذرا جھک کر افسوس سے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا تا تم نے آسان راستہ اختیار کیا ہے انجام کی طرف۔“

جواب میں اس کے منہ سے جو کلام سب ناگفتی تھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا کہ دم توڑتے آدمی کو کیا کہتا۔ ایک منٹ بعد درختوں کی طرف سے زینی نمودار ہوئی اور آنے والے تینوں افراد اس کے پیچھے تھے۔ ایک لمحے کو لگا کہ زینی کو ہیڈ زاپ کر کے لایا جا رہا ہے۔ مگر پھر میری نظر اس کے ہاتھ میں موجود رائفل پر گئی اور وہ

فلکست خوردہ نہیں بلکہ فاتحانہ انداز میں آرہی تھی۔ میں نے شیرخان سے کہا۔ ”تمہاری ایک اور شکست..... ذرا دیکھنا زینی کیسے آرہی ہے۔“

شیرخان نے سرگھبرا کر زینی کو دیکھا اور اس کی ناگفتنی کارخ اس کی طرف مڑ گیا۔ زینی نے اس کا جواب ہل دیا کہ اتے ہی اس کے ہاتھ پر گولی ماری اور شیرخان فوراً مر گیا۔ مجھے اس کی جوان مرگی کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ ایسے لوگ اسی طرح دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ میں زینی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا کوئی آج کل مطمئن نہیں ہوتا صرف دھوکا دیتا ہے۔ جیسا کہ تم نے دیا۔“

”اسے لے چلو۔“ زینی نے سرد لہجے میں کہا تو ان چاروں نے مجھے گھیر لیا اور ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ زینی ایک طرف ہو کر اگ چل رہی تھی۔ اس کا تھکنا نہ رویہ اور ان چاروں کی نیاز مندی بتا رہی تھی کہ اب وہ پاس تھی۔ سفر طویل نہیں تھا اور ہم آدھے گھنٹے بعد پہاڑ کی ڈھلان کے اوپری حصے میں پہنچ گئے تھے یہاں ایک باقاعدہ راستہ تھا جو صدیوں سے اس راہ پر چلنے والوں نے بنایا تھا۔ دور مجھے پاکستان کا پرچم لہراتا دکھائی دے رہا تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر افغانستان کا پرچم تھا۔ گویا یہ سرحد تھی مگر ہم اس سے فاصلے پر تھے۔ ہم ڈھلان سے اترنے لگے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ہم پاکستان کی حد میں تھے یا افغانستان کی حد میں داخل ہو چکے تھے۔ اوپر چڑھنا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا مگر نیچے اترتے ہوئے مجھے مشکل پیش آنے لگی۔ بندھے ہاتھوں سے توازن بگڑ رہا تھا۔ بعض جگہ قدم لڑکھڑاتے تو خود کو سنبالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔

”میرے ہاتھ کھلو اور نہ نیچے گرنا تو شاید ہڈیوں اور گوشت کا ڈھیر طے تم کو لے جانے کے لیے۔“ وہ رکی اور پھر اپنی جیکٹ سے خنجر نکال کر میری طرف آئی اور ہاتھوں کی بندشیں کاٹ دیں۔ ”تھینک یو۔“ میں نے ہاتھ مل کر کہا۔

ہم ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ زینی نے اب سر پر بڑی سی ادنی ٹوپی پہن لی تھی جس سے اس کے نہری بالوں کی پونی نیل چھپ گئی تھی۔ غالباً وہ اپنی نسوانی شناخت چھپانا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس کی کچھتی چال ہی رہی تھی کہ اس کا تعلق کس صنف سے ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنی چال بدل لیتی مگر شاید وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں تھی۔ آنے والے چاروں افراد پوری طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی زینی کی طرف متوجہ ہونے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ایسا لگ رہا تھا۔ وہ اس سے مرعوب لگ رہے تھے اس کے تیور بھی کچھ ایسے ہو گئے تھے جیسے وہ اس کے بہت ادنی درجے کے خادم ہوں۔ ڈھلان سے اترتے ایک مختصر لیکن بہت ترچھی چڑھائی آئی اور اس پر چڑھتے ہوئے صحیح معنوں میں کوہ پیما کی کرنا پڑی تھی۔ اکثر مات پر چاروں ہاتھوں بیروں سے اور پتھروں یا درختوں کا سہارا لے کر چڑھنا پڑ رہا تھا۔

جب اوپر پہنچے تو سامنے پیالہ نما وادی نظر آئی جو آخری حصے میں جا کر دو پہاڑوں کے بیچ آگئی تھی۔ ہم اترنے لگے اس طرف ڈھلان شریفانہ تھی اور ہم آرام سے اتر گئے اور دس منٹ بعد وادی سے نکل رہے۔ وادی پھر چوڑی ہونے لگی اور اس کے دونوں طرف بلند پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے لگا کہ ہم سیدھے نے کی بجائے بہت گھوم پھر کر جا رہے تھے اور غالباً ایسا اس لیے کیا جا رہا تھا کہ کسی سرحدی چوکی سے مڈبھڑنہ مگر وادی کے آخری حصے میں جو پہاڑ نظر آ رہا تھا وہ خاصا بلند تھا اور اس کے سب سے اوپر والے حصے میں

برف کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی یعنی یہ پہاڑ کم سے کم پندرہ ہزار فٹ بلند تھا تبھی اس پر گرمیوں میں بھی برف تھی۔ ہم نے چڑھنا شروع کیا۔ اس سفر نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے جب خطرناک والی چڑھائی شروع ہوئی تو زمینی نے آدھے گھنٹے کے لیے رکنے کا اعلان کیا۔

میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں سائے میں خشکی تھی جب کہ دھوپ میں ذرا گرمی محسوس ہوتی تھی۔ شاید ابھی ہم سات یا آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ سب کے پاس پانی کی ڈھائی لیٹر والی بوتلیں تھیں۔ اس لیے پانی کی کمی نہیں تھی۔ میں نے راستے میں آنے والی تمام ندیوں سے دل کھول کر پانی پیا تھا اس لیے پیاس نہیں تھی مگر جیسے جیسے بلندی پر جاتے پیاس لگتی۔ سب مختلف جگہوں پر اس طرح بیٹھے تھے کہ میں ان کے درمیان میں تھا یعنی مجھے گھیرا ہوا تھا۔ زمینی ایک کسی قدر بلند چٹان سے نکلی کھڑی تھی اس نے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سورج سر پر آگیا تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی پھر اس نے آدھا گھنٹا پورا ہوتے ہی کہا۔ ”ایلیس مود ناؤ۔“

اس بار مجھے اس کے لہجے نے چونکا دیا کیونکہ اس نے بہت صاف اور نستعلیق انگریزی لہجے میں یہ بات کہی تھی۔ مشرقی یورپ کے رہنے والے فی کوئی بولتے ہیں جب کہ اس نے فی ہی کہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جیسے اس کی شخصیت پُر فریب نکلی تھی کیا اس کی جارحیت ہونے والی بات بھی غلط تھی؟ ہم نے اوپر چڑھنا شروع کیا اور اس بار چڑھائی خاصی مشکل ثابت ہوئی کیونکہ یہ ایک مسلسل چڑھائی تھی اور اس میں راستے بھی نایاب تھے۔ ہمارے قدم ان راستوں پر پڑ رہے تھے جن پر شاید پہلے کبھی کوئی انسان نہیں گزرا تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف جا رہے تھے سردی بڑھ رہی تھی اور سائے میں سے گزرتے ہوئے باقاعدہ سردی لگتی تھی۔ خدا خدا کر کے ہم اس پہاڑ کے اوپری حصے میں پہنچے یہاں سے ایک راستہ نشیب کی طرف جا رہا تھا اور دوسرا پہاڑ کی چوٹی تک تھا۔ ظاہر ہے ہمیں نیچے کا رخ کرنا تھا۔

اب سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور جب سانس کھینچتے تو ہوا جیسے خالی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا جیسے سینے میں کم ہوا لگی ہو۔ میرا تجربہ بتا رہا تھا کہ ہم دس ہزار فٹ کے آس پاس کہیں تھے۔ مگر اب نیچے اترنا تھا اور ہماری منزل دور تک نشیب میں پھیلے تہہ در تہہ پہاڑوں میں کہیں تھی۔ ذرا نیچے آئے تو ایک پگ ڈنڈی مل گئی جو انسانی قدموں سے آشنا تھی۔ اس لیے اس پر سفر آسان ثابت ہوا۔ ہم ایک اور چوٹی کے نیچے سے گزرے جس پر برف جمی تھی اور اس کی خشکی یہاں تک آ رہی تھی۔ اس شفاف برف سے بہہ کر آنے والا پانی برف سے زیادہ سرد تھا مگر اسے پی کر میں تروتازہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک ایسے راستے پر چلنے لگے جو ٹیل صراط سے مشابہ تھا اور اس کے دونوں طرف تاحد نگاہ ڈھلان تھی مگر یہ سیدھی ڈھلان نہیں تھی بلکہ گرنے کی صورت میں بہت سادہ آدی کو ہوا میں طے کرنا پڑتا۔ جس کا لازمی نتیجہ فوجی کی صورت میں نکلتا۔ اس لیے سب بہت محتاط ہو کر ایک قطار میں اس ڈھلان سے گزر رہے تھے۔

ٹیل کو عبور کر کے ہم نے ایک اور ڈھلان پر قدم رکھا جس پر ایک بار پھر اونچے درخت نظر آنے لگے تھے اور اس سے ہوتے ہیں بالآخر ایک چوڑی وادی میں داخل ہوئے۔ یہ وادی اصل میں دریا کا پاٹ تھا مگر فی الحال پانی اس کے وسط میں کسی ندی کی طرح بہہ رہا تھا۔ تھکن سے سب کا برا حال تھا اس لیے ایک اسٹاپ آدھے گھنٹے

کا اور دیا گیا اور اس دوران میں ہم نے گڑے خشک چنوں سے پیٹ بھرا۔ یہ تو اتنی بخش کھانا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد پھر سے روانہ ہوئے۔ دریائی وادی کے ساتھ چلتے ہوئے۔ ہم شام پانچ بجے کے قریب ایک مکی سڑک تک پہنچے جہاں ایک بڑی آرمی جیپ ہماری منظر تھی۔ یہ اس قسم کی جیپ تھی جیسی امریکی فوج استعمال کرتی ہے مگر اس پر نشانات نہیں تھے اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سویلین افغانی بیٹھا ہوا تھا۔ اب میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ چاروں بھی افغانی تھے۔

یہاں آتے ہی انہوں نے اپنی بلٹ پروف جیکٹس اتار دیں اور روشن خیال افغانیوں والے حلے میں آگئے۔ وہ سب کلین شیو تھے اور سروں پر چھوٹے بال تھے اس لیے انہیں سروں پر اڑتے ڈرون طیاروں سے خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر دوسرے خطرات تو تھے۔ پورے افغانستان میں جا بجا مزاحمتی گروپس ہیں۔ وار لارڈز اور ڈرگ لارڈز ہیں۔ ان کے علاوہ جرائم پیشہ گروہوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر فرد مسلح ہوتا ہے اور سامنا ہونے پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا سانسے بندوق بدست فحش جو چلا آ رہا ہے وہ کوئی ڈاکو ہے یا پھر شریف آدمی۔ چل چل کر سب کا برا حال ہو گیا تھا اس لیے گاڑی دیکھ کر مجھ سمیت سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ہم اس کے عقبی وسیع کیمین میں آگئے جس میں آٹھ سانسے نشستیں لگی تھیں۔ زینی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آگئی۔ جیپ آگے بڑھی اور کچے راستے پر اس کی رفتار سست مگر ایک گھنٹے بعد ایک کسی قدر پختہ سڑک آگئی اور اس کی رفتار بڑھ گئی تھی میں نے زینی سے کہا۔ ”ہم یقیناً افغانستان میں ہیں؟“

”ہاں تم اس وقت افغانستان میں ہو۔“

”رات میں بھی سفر جاری رہے گا؟“

”نہیں آج رات ہم ایک جگہ رکھیں گے۔“ زینی نے کہا۔ ”یہاں رات کے وقت سفر کرنا مناسب نہیں

ہوتا ہے۔“

جیپ سورج غروب ہونے کے بعد بھی چلتی رہی تھی۔ یہ علاقائی سڑک تھی مگر اس کا معیار بہت اچھا تھا۔ امریکیوں نے آنے کے بعد سب سے پہلے ذرائع مواصلات پر توجہ دی تھی اور یہاں بننے والی سڑکیں عالمی معیار کی تھیں۔ تاریکی چھانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد جیپ ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوئی۔ یہاں اس وقت بجلی نہیں تھی مگر جزیرہ زچل رہے تھے اور روشنی کے لیے دوسرے ذرائع سے بھی کام لیا جا رہا تھا۔ یہاں خاصی چہل پہل تھی اور بازار کھلا ہوا تھا۔ جیپ ایک چھوٹے دو منزلہ ہوٹل کے سامنے رکی اور ہم اتر کر اندر آئے۔ انہوں نے تین کمرے لیے۔ ایک زینی کے لیے تھا اور باقی دو ہمارے لیے تھے۔ کھانا اور پانی طلب کیا تھا۔ جب اس نے رقم دی تو مجھے پتا چلا کہ اصل مہنگائی تو یہاں تھی۔ تین کمروں اور رات کے کھانے کے چار سو امریکی ڈالرز چارج کیے گئے تھے یعنی چالیس ہزار پاکستانی روپے، اتنے میں تو پاکستان میں ہم فائو اسٹار نہ سہی فور اسٹار ہوٹل میں قیام کر سکتے تھے۔ امریکیوں کے بارے میں بالکل درست کہا ہے کہ یہ جہاں جاتے ہیں چیزوں کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

کھانے میں دہنے کا بھنا گوشت اور خاص طریقے سے پکی ہوئی روٹی تھی۔ کھانا بے شک مہنگا تھا مگر اتنا ہی لذیذ بھی تھا۔ اس کے بعد قہوہ آیا۔ میرے لیے اسپیشل آیا تھا کیونکہ قہوہ ختم کرتے ہی میرے ذہن پر نیند نے

یلغار کی تھی اور جب تک میں سوچتا کہ کیا ہوا ہے میں سوچتا تھا۔ ظاہر ہے یہ انتظام مجھے سکون سے سنانے کے لیے تھا تا کہ وہ بھی آرام سے سوئیں یا آرام ہی کر لیں کیونکہ اس سفر نے سب کے انجمن خیز ڈھیلے کر دیئے تھے۔ میں بے ہوشی جیسی نیند میں تھا مگر فائرنگ کی آواز نے میرے شعور کو جھنجھوڑا اور میں نے محسوس کیا کہ آس پاس شور ہو رہا تھا۔ بہ مشکل میں نے آنکھ کھولی اور جھومتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ میرا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ کمرابھی خالی تھا اور ہوٹل کے آس پاس سے رہ رہ کر فائرنگ کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر تاریکی تھی یعنی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک چھوٹا انرجی سیور روشن تھا اور دیوار گیر گھڑی صبح کے چار بج رہی تھی۔ جاگنے کے باوجود میرے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت فی الحال خوابیدہ تھی۔ مگر میرا شعور اشارہ کر رہا تھا کہ آس پاس گڑبڑ ہے اور دراصل اسی نے مجھے بیدار کیا تھا ورنہ میری بیدار ہونے والی حالت نہیں تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور زینی اندر آئی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

”چلو یہاں گڑبڑ ہے؟“

”کیسی گڑبڑ؟“ میں نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

”پتا نہیں کچھ لوگ آگئے ہیں میرے آدمی مقابلہ کر رہے ہیں مگر ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

عجیب بات تھی میرا رد عمل تو یوں ہونا چاہیے تھا کہ میں سب سے پہلے اسے ہی دشمن سمجھتا اور قابو کرنے کی کوشش کرتا۔ یا پھر فرار کی راہ تلاش کرتا مگر اس کی بجائے میں اس کے ساتھ کھچا چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم آپس میں دوست اور ساتھی ہیں۔ باہر آتے ہی اس نے ہوٹل کے اوپری حصے کا رخ کیا اور ککڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر ہم چھت پر آئے۔ آس پاس گولیوں کے شعلے چمک رہے تھے اور حملہ آوروں نے دو طرف سے ہوٹل کو گھیرا ہوا تھا۔ زینی کے آدمیوں کی طرف سے جوابی کارروائی جاری تھی۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہتھیاروں سے لگ رہا تھا حملہ آوروں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ شاید اسی لیے زینی مجھے یہاں سے نکال لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ہم کس طرف جائیں یہاں تو دشمن ہیں۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ بولی اور برابر والے مکان کی طرف بڑھی۔ یہ بھی دو منزلہ تھا مگر ہوٹل سے ذرا نیچا تھا۔ زینی نے مجھ سے کہا۔ ”نیچے اتر جاؤ اور پھر سہارا دے کر مجھے اتار دو۔“

میں دیوار سے لٹک کر آرام سے چھت پر اتر گیا اور پھر میں نے ہاتھ اوپر کیا تو زینی میرے بازوؤں میں آگئی۔ میں نے اسے نیچے کیا تو اس نے پھر میرا بازو پکڑا اور زینوں کا رخ کیا۔ اس بار بھی میں نے بلاچوں چر اس کا ساتھ دیا مگر میرے اترنے سے نیچے موجود افراد کو پتا چل گیا تھا کہ کوئی چھت پر آیا ہے۔ زینوں پر ایک نوجوان آدمی نمودار ہوا اور زینی کی رائفل کا رخ اپنی طرف دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ زینی نے آہستہ سے کہا۔ ”شور مت کرنا ہم صرف یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں پیچھے ہمارے دشمن آ رہے ہیں۔ وہ آگئے تو تم بھی مارے جاؤ گے۔“

نوجوان نے سر ہلایا اور بولا۔ ”تم دونوں چلے جاؤ۔“

ہم نیچے آئے تو ایک کمرے میں بستر پر ایک لڑکی چادر میں دبی ہوئی تھی ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف آیا اور اس نے چادر مزید مضبوطی سے خود پر لپیٹ لی۔ شاید وہ اس نوجوان کی بہن تھی۔ اس فلور پر بس دو

کمرے تھے اور ان میں یہی دو افراد تھے۔ معمولی سا فرنیچر اور ساز و سامان تھا۔ ہم اسے دیکھ کر نچلے والے فلور پر آگئے۔ یہ حصہ بند تھا صرف سیڑھیوں اور باہر جانے والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ یہاں کوئی اور رہتا تھا یہ مشکل سے ستر اسی گزرتے پر بنا ہوا گھر تھا۔ جس میں آنے جانے کا راستہ مشترک تھا۔ زینی نے نوجوان سے کہا۔ ”اب تم جاؤ اور اپنے فلور پر رہو وہاں سے باہر مت آنا۔“

نوجوان سر ہلاتا ہوا اوپر چلا گیا۔ زینی نے باہر جھانکا تو سامنے ہی دو مسلح افراد ایک کنکریٹ کی دیوار کی آڑ سے ہوٹل کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ میں ان کو دیکھ رہا تھا کہ کب زینی نے پستول پر سائنلر لگایا اور پھر اس نے ہاتھ آگے کر کے ایک فائر کیا اور دیوار کے پیچھے موجود افراد میں سے ایک غائب ہو گیا۔ دوسرا اسے دیکھنے کے لیے جھکا اور پھر اس نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر جوش میں ہوٹل کی طرف پورا برست مارا اور اس کے خاتمے پر خود بھی مارا گیا۔ زینی نے اس کے سر میں گولی ماری تھی اور اس کا نشانہ بہترین تھا کوئی تیس گز کے فاصلے سے اس نے دونوں افراد کو ایک ایک گولی سے نشانہ بنایا تھا۔ پھر اس نے جھانک کر باہر دیکھا اور بولی۔ ”آؤ راستہ صاف ہے۔“

ہم باہر نکلے اور ہوٹل سے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ ہم جھکے ہوئے تھے اور رفتار تیز تھی۔ ایک گلی تک پہنچے تھے کہ عقب سے فائر ہوا اور ہم تیزی سے گلی میں گھس گئے۔ ہم بال بال بچے تھے کیونکہ چلائی جانے والی گولیاں ہمارے پاس سے گزری تھیں۔ عقب میں ہونے والی فائرنگ کے شور میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ گلی میں مڑتے ہی زینی نے دوڑنا شروع کر دیا اور میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اب تک میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میری دشمن ہے مجھے قیدی بنا کر لائی ہے اور اب میرے پاس موقع ہے کہ میں آزادی حاصل کر سکوں مگر میں بنا سوچے سمجھے اس کا ساتھ دے رہا تھا جیسے وہ کہہ رہی تھی ویسا ہی کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ مجھے فرار ہونا چاہیے یا اسے قابو کر لینا چاہیے۔ میں یوں اس کے ساتھ لگا ہوا تھا جیسے ہم ایک ہی ہوں اور دشمن وہ ہے جو ہمارے پیچھے آیا ہے۔ یہ گلی چوڑی تھی مگر آگے زینی جس گلی میں مڑی وہ تنگ تھی۔ ہم قصبے کی اندرونی آبادی میں گھس گئے تھے۔

یہاں دشمن نہیں تھے مگر وہ پیچھے ضرور آتے۔ اس لیے زینی تیز رفتاری سے گلیاں کر اس کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس آبادی سے واقف تھی۔ یہ چھوٹا سا قصبہ پہاڑوں کے درمیان میں دریا کے کنارے تھا۔ کچھ دیر بعد ہم ایسی جگہوں سے گزرنے لگے جہاں مکانات فاصلے پر تھے اور درمیان میں باغات اور خالی جگہیں تھیں۔ فائرنگ کی آواز اب پیچھے رہ گئی تھی مگر وہ رہ کر رہی تھی۔ بھاگ دوڑ سے میری غنودگی غائب ہو گئی تھی مگر ذہن کون کرنے والی کیفیت برقرار تھی۔ اب بھی میں کچھ سوچنے سے قاصر تھا۔ ہم جس سڑک سے آئے تھے وہ دریا کے دوسری طرف تھی اور قصبہ دریا کے اس طرف تھا اس لیے ہمیں ہائی وے تک جانے کے لیے دریا کر اس کرنا پڑتا۔ درختوں اور کھیتوں کا ایک مختصر حصہ آیا اور اس کے بعد قصبہ کا دوسرا حصہ سامنے آیا جو اصل میں دریا کے بالکل ساتھ تھا اور اس سے ایک۔ دو۔ تین گز کے فاصلے پر تھا۔ ہمیں قصبہ میں جاری تھی جہاں دریا پر پل تھا اور وہاں سے اسے کر اس کیا جاسکتا تھا۔ زینی نے صبح کی نمودار ہوتی روشنی میں پل کی طرف اشارہ کیا۔

”ہمیں وہاں جانا ہے۔“

”وہ“ میں نے کہا۔ ”ہمیں گاڑی کی ضرورت ہوگی۔“

”یہاں گاڑی نہیں ہے ہمیں پیدل جانا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”چلو میرے ساتھ۔“

ہم درختوں اور مکانوں کی آڑ میں اس طرف روانہ ہوئے۔ فاصلہ ایک کلومیٹر سے کچھ کم تھا۔ اب فائرنگ کی آوازیں محکم کی تھیں اور اگر دشمن ہمارے پیچھے آیا تھا تو وہ ہمارا نشان کھو چکا تھا۔ جب ہم ہل کے پاس پہنچے تو روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ ہل پر موجود ایک گاڑی اور اس کے آس پاس موجود مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چونکنا تھے جیسے کسی کے منتظر ہوں۔ زینی نے تشویش سے کہا۔ ”یہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ان کو کیسے پتا کہ ہم یہاں آئے ہیں؟“

”اب تک ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہوگا اس لیے ان لوگوں کو اطلاع مل گئی ہوگی۔ یہ ہمیں دریا کر اس کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔“

”تب ہم پار کیسے جائیں گے؟“

”تیر کر۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں نے اس بار بھی کوئی اعتراض نہیں کیا کہ دریا کا پانی بے پناہ سرد ہوگا اور ہماری قلبی جم سکتی تھی۔ درحقیقت میں اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس وقت زینی مجھ سے کہتی کہ میں آگ کے دریا میں کود جاؤں تو میں سوچے سمجھے بغیر اس کی بات پر عمل کرتا۔ زینی ذرا پیچھے آئی اور اس نے اپنے جوتے اتار کر کمر سے باندھ لیے۔ میں نے جوتے نہیں اتارے۔ اس نے اسلحہ اپنی پشت پر بندھے بیگ میں ڈال لیا تھا اور پھر ایک جھوٹی سی رشتی نکال کر اسے اپنی اور میری پتلون کی بیلٹ سے باندھ لیا تاکہ ہم دریا میں الگ نہ ہو جائیں۔ پانی میں اترنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ ”تم تیرنا جانتے ہو؟“

”بہت اچھی طرح۔“ میں نے کہا۔ مگر جب ہم دریا میں آئے اور ٹھنڈے پانی نے استقبال کیا تو اندازہ ہوا کہ میدانی دریاؤں اور پہاڑی دریاؤں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس پانی نے ہمارے جسموں کی حرارت چوسنا شروع کر دی اور جب ہم دریا کے وسط تک پہنچے تو ٹھنڈے ٹھار پڑ چکے تھے۔ جسم کی طاقت جیسے سلب ہو گئی تھی اور ہمارے ہاتھ اب سلوموشن میں چل رہے تھے اور آگے جانے کی بجائے ہم دھارے کے ساتھ کھینچ رہے تھے۔ زینی کی حالت بھی بری ہو رہی تھی۔ اس سے یوں بھی مشکل سے تیرا جا رہا تھا کہ اس کے پشت پر دس بارہ کلو گرام وزنی بیگ تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے غوطے کھانا شروع کر دیے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اپنی تیراکی کی صلاحیت کا درست اندازہ نہیں تھا۔ خاص طور سے جب واسطہ ایسے شوریدہ سرد دریا سے ہوتا۔ ایک بار وہ پانی کے اندر گئی تو مجھے اس کو کھینچنا پڑا تھا اور اس کے بعد میں ہی اسے سنبھالنے لگا۔ مگر ہم تیرنے کی بجائے خود کو سطح پر برقرار رکھ رہے تھے۔ اس لیے کنارے کی طرف جانے کی بجائے دھارے کے ساتھ بہنے لگے اور اب ہل کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے زینی سے کہا۔

”ہل نزدیک آ رہا ہے۔“

”وہ... دیکھ لیں..... گے۔“ زینی نے اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”ان کی نظروں سے بچنا۔“

نیچے دریا میں ابھی نیم تاریکی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ زینی نے کسی قدر شوخ اور رنج رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی

تھی۔ یہ پانی میں نمایاں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے گھما کر اپنی آڑ میں کر لیا۔ میں آگے تھا اور وہ میرے پیچھے تھی۔ میری جیکٹ نیا لے رنگ کی تھی اور دریا کے پانی سے ہم رنگ ہو رہی تھی۔ اس کی جیکٹ مزید چھپانے کے لیے میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ یوں وہ پانی میں زیادہ اندر چلی گئی تھی اور اس کی جیکٹ چھپ گئی تھی۔ اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ عجیب سچویشن تھی کہ ذہنی لحاظ سے میں اس کے بس میں تھا مگر جسمانی طور پر اس نے خود کو مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ ہم پل کے نزدیک آئے تو میں نے دیکھا ایک آدمی کنارے پر کھڑا ہوا تھا مگر وہ نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر قصبے کی طرف تھی۔ پانی پل سے کوئی تیس پینتیس فٹ نیچے تھا۔ عین اس وقت جب ہم پل کے نیچے آرہے تھے اس آدمی نے نیچے دیکھا اور اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ فوراً ہی اس کے چلانے کی آواز آئی۔

”وہ دریا میں ہیں۔“

”مگر بے سانس لو اور سانس روک لو۔“ میں نے زینی سے کہا اور خود بھی مگر بے سانس لینے لگا اور پھر پھپھڑوں میں ممکنہ حد تک ہوا بھر کر میں نے زینی سمیت پانی میں غوطہ لگا دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم پل کے دوسری طرف نکلے تو پانی کے اندر تھے۔ مگر فروانی ہمارے آس پاس گولیاں برسنے لگی تھیں۔ فائرنگ کی آواز تو نہیں آرہی تھی مگر جب گولی پانی میں اترتی تو مرغولے دار لکیری کھینچ جاتی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ مزید نیچے جاؤں۔ زینی تیزی سے سانس خارج کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے مسلسل بلبلے نکل رہے تھے۔ جب کہ میں نے اپنی سانس اب تک روک رکھی تھی۔ ہمیں پانی میں آئے ہوئے دو منٹ ہو گئے تھے اور زینی نے اپنی سانس مکمل خارج کر دی تھی اب وہ سطح پر جانے اور سانس لینے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی مگر گولیاں ہمارے آس پاس گر رہی تھیں یعنی ہم فائرنگ کی زد میں تھے۔ اس لیے میں زینی کو اوپر جانے سے روک رہا تھا۔ ایک خطرہ یہ تھا کہ وہ پانی پی لے گی اس لیے میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جمالیا۔ وہ سانس کے لیے پھلنے لگی۔ مگر میں اس کا منہ نہیں چھوڑ سکتا تھا ورنہ پانی اس کے پھپھڑوں میں چلا جاتا اور اس کا پچنا مشکل ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد اس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ تیسرے منٹ تک ہم پل سے اتنا دور نکل گئے تھے کہ اب گولیاں ہم تک نہیں آرہی تھیں۔ اس لیے میں نے اوپر آنا مناسب سمجھا۔ زینی نے پھلنا بند کر دیا تھا اور اب ڈھیلے انداز میں تیر رہی تھی۔ باہر نکلتے ہی میں نے دیوانہ وار سانس لیے اور پھر زینی کو ہلایا۔ مگر اس کا سانس رکا ہوا تھا۔

”اے سانس لو۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ مگر وہ ساکت رہی۔ مجبوراً میں نے اسے گھما کر سامنے کیا اور پلے اس کے منہ سے منہ ملا کر اس کے پھپھڑوں میں ہوا بھری اور پھر اس کے سینے پر کے مارے۔ نسوانی جسم کے رک جھے پر یہ ضرب خاصی سخت تھی مگر مجبوری تھی۔ ایک بار کے مارنے پر وہ بے حس رہی۔ مگر دوسری باریہ عمل کرنے پر اس نے کھانس کر سانس لی اور پھر مگر بے سانس لینے لگی۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا اور اس سر پانی سے باہر رکھا کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھی کہ از خود تیر سکتی۔ اس دوران میں ہم دریا میں بہتے جا رہے تھے مجھے ارد گرد کی خبر نہیں تھی۔ زینی کے سانس لینے کے بعد میں نے آس پاس دیکھا تو پل پیچھے رہ گیا تھا۔ کچھ دیر زینی نے آنکھیں کھول دیں اور آس پاس دیکھا۔

”ہم کہاں ہیں؟“

میں نے اسے آگاہ کیا ”پل سے آگے نکل آئے ہیں دھارے کے ساتھ جارہے ہیں۔“

”ہم دوبارہ قصبے کی طرف جارہے ہیں۔“ وہ مضطرب ہو گئی۔ ”ہمیں کنارے پر جانا ہے۔“

وہ رہ رہ کر کھانسنے لگی تھی اور میرے کھانسنے سے یقیناً اسے تکلیف پہنچی تھی۔ قصبے کے پاس دریا کا پاٹ چوڑا اور دھارا سُست ہو گیا تھا۔ میں نے کنارے کی طرف دیکھا تو دور ایک گاڑی ہائی وے پر نظر آئی مجھے شبہ ہوا کہ یہ وہی گاڑی تھی جو میں نے پل پر دیکھی تھی۔ پھر ہائی وے دریا سے دور ہونے لگی اور گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ زینی نے کہا۔ ”چلو ہمیں اس کنارے چلنا ہے۔“

”اس طرف دشمن ہے۔“

”اسی لیے تو اس طرف جانا چاہیے وہ سمجھے گا کہ ہم قصبے کی طرف جائیں گے۔“

اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں صرف منطقی اعتراض کر سکتا تھا اگر زینی کوئی بات کہہ دیتی تو اسے لازمی تسلیم کرنا چاہیے وہ عقل و منطق کے بالکل ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کے ساتھ مخالف کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ دریا کا پاٹ چوڑا ہوا تھا مگر اس کی تندی ختم ہو گئی تھی اور اب ہم آرام سے تیر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم کنارے پہنچے۔ میں اوپر چڑھا اور پھر زینی کو بھی کھینچا۔ میں بھی ہانپ رہا تھا مگر اس کی حالت بری تھی۔ وہ دیوانہ وار سانس لے رہی تھی اور بالکل ڈھیر ہو گئی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا اور پھر اس سے کہا۔ ”ان جھاڑیوں تک چلو یہاں دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہے۔“

”میں نہیں جاسکتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم مجھے لے چلو۔“

میں اٹھا اور اسے سہارا دے کر ان جھاڑیوں تک لے آیا۔ اس نے اپنا بیگ اتارا اور اس کی زپ کھولی تو اندر سب خشک تھا گویا یہ دائرہ پروف بیگ تھا۔ اس نے اندر سے ایک میڈیکل پیک نکالا اور اس میں موجود چھوٹا سا انجکشن نکال کر اپنے دائیں بازو میں انجکٹ کر دیا۔ اس کی رنگت نیلی ہو رہی تھی اور وہ کھانسنے لگا تھا۔ میں نے اس کی سانس بھی ہموار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میڈیکل پیک میں اور بھی کئی انجکشن اور دو ایٹا تھیں۔ مگر اس نے صرف وہی انجکشن لے کر پیک بند کیا اور اسے واپس بیگ میں رکھ لیا۔ حالت ٹھیک ہوتے ہی اس نے اٹھ کر اپنی جیکٹ اتاری۔ پھر شرٹ کے بٹن کھولنے لگی تو میں نے منہ پھیر لیا۔ وہ رکی اور اس نے حکمانہ انداز میں کہا۔ ”اے میری طرف دیکھو۔“

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھا تو وہ دوبارہ بٹن کھولنے لگی تھی۔ اس نے شرٹ اتار دی۔ اس کے نیچے زیر جامہ تھا۔ پھر اس نے اپنی بھاری جینز اور کسی ہوئی پتلون کسی قدر دقت سے اتاری۔ بھگ کر وہ اور چمٹ رہی تھی۔ نیچے بھی زیر جامہ تھا اور اب وہ نہ ہونے کے برابر لباس میں تھی۔ مگر میں تو اسے اس سے بھی زیادہ کھلے ڈھلے چلیے میں دیکھ چکا تھا۔ دوسرے اسے یوں دیکھ کر بھی مجھے کوئی احساس نہیں ہوا جب کہ میں پہلے سنسا گیا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے نچوڑے اور پھر ان کو جھٹک کر مکنا حد تک پانی نکال دیا۔ وہ بلاشبہ نہایت حسین عورت تھی۔ بعض عورتوں کے نقوش حسین ہوتے ہیں اور بعض جسمانی لحاظ سے جاذب نظر ہوتی ہیں۔ مگر زینی میں یہ دونوں خصوصیات تھیں۔ اس کے نقوش جتنے دل فریب تھے جسمانی زاویے اس سے زیادہ حسین تھے۔

اس نے دوبارہ کپڑے پہن لیے اور مجھ سے کہا۔ ”تم بھی اپنے کپڑے خشک کرلو۔“
 میں ایک جھاڑی کی آڑ میں آیا اور لباس اتار کر نچوڑا۔ جوتوں میں پانی بھر گیا تھا انہیں جھٹک کر صاف کیا اور پھر پہن لیے۔ میں جھاڑی سے باہر آیا تو وہ جیکٹ پہن کر بیک پشت پر باندھ چکی تھی مگر اس نے اسلحہ نکال لیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور پستول اس نے جیکٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اگرچہ میں اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا مگر اس نے اب تک اسلحے کے معاملے میں مجھ پر اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس اضافی اسلحہ تھا۔ دریا کے ساتھ ڈھلان تھی دراصل یہ دریا کا ہی حصہ تھا۔ کئی سالوں بعد جب سیلاب آتا ہوا وہ دریا کا پاٹ اوپر ہائی وے کے پاس پہنچ جاتا ہوگا۔ اسی وجہ سے یہاں صرف چھوٹی جھاڑیاں اور درخت تھے۔ ہم اوپر جانے لگے۔ مگر جھاڑیاں زیادہ نہیں تھیں اس سے اوپر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دریا نزدیک ہونے کی وجہ سے انہیں آبپاشی کے لیے پانی آسانی سے مل جاتا تھا۔ اس لیے سیلاب کے خطرے کے باوجود یہاں کاشت کاری کی جا رہی تھی۔ ہم اوپر آئے تو ہائی وے پر ویرانی تھی۔ روشنی زیادہ ہو چکی تھی اور سورج کسی لمحے نکل سکتا تھا۔ ہائی وے کے پار بھی دور تک میزمری نہا کھیت نظر آرہے تھے۔ زینی نے ان سے اوپر اشارہ کیا۔

”ہیں اس طرف جانا ہے۔“

”درمیان میں لوگ مل سکتے ہیں۔“

”لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے ان دشمنوں سے بچنا چھڑانا ہے۔“

”لوگ ان کو بتا سکتے ہیں کہ ہم کہاں گئے۔ ہمیں ایسی جگہوں سے گزرنا چاہیے جہاں لوگ نہ ہوں۔“

زینی نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ سامنے کی بات ہے لیکن اس وقت میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔“

”ایسی عقل کا کیا فائدہ جو وقت پر کام نہ آئے۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“

”چلو میرے ساتھ۔“ وہ بولی اور ہم ہائی وے کے متوازی چلنے لگے۔ ممکن حد تک آڑ میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ زینی کر رہی تھی میں تو اس کے حکم کا غلام بنا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد ہم ہائی وے کے ایک ایسے حصے میں تھے جس کے پار دوسری طرف ویران پہاڑ اور کھائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم نے ہائی وے کر اس کی اور دوسری طرف پہنچ گئے۔ ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا زینی نے بیک سے ایک نقشہ نکالا اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ میں بھی دیکھ رہا تھا اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”ہمیں یہاں پہنچنا ہے۔“

”اسد آباد۔“ میں نے غور کیا۔ ”ہم اس وقت کہاں ہیں؟“

”یہاں۔“ اس نے ایک اور جگہ انگلی رکھی۔ یہاں اسمار لکھا تھا۔ گویا اس قصبے کا نام اسمار تھا۔ یہ جگہ

پاکستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اسمار سے اسد آباد تک وہی ہائی وے جا رہی تھی جو اصل میں پاکستان سے آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”لیکن اس علاقے سے ایک ہی ہائی رے جاتی ہے اور تہارے دشمن تمہیں کہیں بھی روک سکتے ہیں۔“
 ”ہم پیدل اور ہائی وے سے ہٹ کر سفر کریں گے۔“ اس نے جواب دیا اور نقشہ تہہ کر کے واپس جیکٹ
 میں رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”چلو ہمیں گھوم کر جانے میں بہت وقت لگے گا۔“

”ہم شام تک پہنچ سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس طرف دریا اور سڑک کے ساتھ آبادی ہے۔“
 ”ہاں اسی وجہ سے مشکل ہوگی۔ مگر ہم دوروں کی نظروں سے بچ کر سفر کر سکیں گے۔“

ہم چل پڑے۔ میری کیفیت ایسی تھی کہ مجھے تجسس تک نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور زینی نے اپنے
 ہی ساتھیوں کو کیوں مروادیا تھا پھر یہ کون تھے جو اس کے حکم کے غلام بنے ہوئے تھے اور اب اس کے کچھ دشمن بھی
 نکل آئے تھے جنہوں نے ہمیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ علاقہ نہایت مشکل اور دشوار گزار تھا اس
 لیے آبادی کے پاس ہونے کے باوجود اسے استعمال میں نہیں لایا جاسکا تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف جا رہے
 تھے راستے کی دشواری بڑھ رہی تھی مگر یہی دشواری ہمیں پیچھے آنے والوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ مگر اس مشقت
 سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ پانی میں رہنے سے جسم کی حرارت جو زائل ہو گئی تھی دوبارہ لوٹنے لگی اور ہمارے کپڑے
 خشک ہونے لگے۔ سورج بلند ہونے کے بعد یہ ٹل تیزی سے ہوا تھا اور ایک گھنٹے سے بھی پہلے ہمارے کپڑے
 خشک ہو گئے تھے۔ بلکہ اب کسی قدر گرمی لگ رہی تھی۔

ہم سیزمی دار کھیتوں کے اوپر موجود پہاڑی سلسلے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ جگہ بلندی پر تھی اور یہاں سے
 برف پوش پہاڑ زیادہ دور نہیں لگ رہے تھے۔ دھوپ خاصی تیز تھی مگر جہاں سائے سے گزرتے تھے خشکی ایک لمحے
 کو کاٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم ویرانے میں سفر کر رہے تھے۔ تب پہلی بار میں نے اپنے اندر
 تبدیلی محسوس کی اور مجھے لگا کہ میری کیفیت بدل رہی ہے۔ میرا ذہن جو سن سا تھا اب بہتر ہو رہا تھا۔ مجھے خیال آیا
 کہ میں زینی کے ساتھ اتنے سکون سے سفر کیوں کر رہا تھا؟ جب کہ وہ مجھے قیدی بنا کر لائی تھی اور مجھے کسی کے
 ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ تھا۔ پھر مزید ذیلی سوالات ذہن میں پکرانے لگے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے
 ساتھ کیا کیا تھا اور یہاں کس چکر میں تھی؟ مگر مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا یعنی یہ موقع نہیں ملا کہ میں زینی
 سے چھٹکارے کا سوچتا۔ کیونکہ اچانک زینی رک گئی اور اس نے کہا۔

”وقت ہو گیا ہے۔“

”کس چیز کا؟“

”بیٹھو۔“ اس نے حکمانہ انداز میں کہا اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے
 بیک سے میڈیکل پیک نکالا اور اس میں سے ایک چھوٹا انجکشن نکال کر مجھ سے بازو سامنے کرنے کو کہا اور میں
 نے بازو آگے کیا تب میں نے اس پرنس کی جگہ انجکشن کا نشان دیکھا۔ مجھے پہلے بھی انجکشن لگا تھا اور زینی نے اسی
 جگہ یہ انجکشن بھی لگا دیا۔ یہ زرد کا تھا۔ انجکشن لگنے کے چند منٹ تک میرا سر چکراتا رہا۔ زینی نے اس دوران میں
 مجھے نہیں چھیڑا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے کہا۔ ”اٹھو۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اگلا حکم دیا۔ ”اس چٹان پر چڑھو اور نیچے کود جاؤ۔“

میں چڑھ گیا۔ اس نے اگلا حکم دیا۔ ”اس چٹان پر چڑھو اور نیچے کود جاؤ۔“

طرف بڑھا اور اس پر چڑھ کر کنارے جا رہا تھا کہ عقب سے زینی نے کہا۔ ”رک جاؤ۔“
میں رک گیا تو اس نے حکم دیا۔ ”واپس آ جاؤ۔“

میں واپس آ گیا۔ اس دوانے مجھے اس کا غلام بنا دیا تھا۔ یہی حربہ میں بھارت میں دشمنوں پر استعمال کر چکا تھا اور اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا تھا۔ یعنی زینی نے میرا جوتا میرے ہی سر مارا تھا۔ اگرچہ اب ایسی اودیات کا استعمال کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن میرے ساتھ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ قہوے کی تیندک دوا دینے کے بعد مجھے انجکشن دیا گیا تھا جی جانے کے بعد اور موقع ملنے پر بھی میں نے فرائی کو شش نہیں کی بلکہ زینی کا ساتھ دیتا رہا اور اس کی جان بھی بچائی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسے موت کے منہ سے کھینچ لیا تھا۔ ورنہ اس کا سانس تو رک گیا تھا۔ گویا اپنے پاؤں پر میں نے خود کھلاڑی ماری تھی۔ اگر وہ مر جاتی تو اس وقت میں آزاد ہو چکا ہوتا۔ میرے اس طرح رو بٹ بننے پر وہ خوش تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تم نے دیکھا کہ میرے اشاروں پر کیسے ناچ رہے ہو؟“

میرے اندر کوئی لہر نہیں اٹھی میں سن کھڑا رہا۔ اس لیے میں نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی، پھر میرے پاس آئی اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور ذرا چمک کر ہنٹ میرے ہونٹوں کے سامنے لے آئی۔ وہ اپنی من مانی کر رہی تھی اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا مگر میں کچھ محسوس بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بھی میرا سپاٹ پن محسوس کر لیا اور کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ الگ ہو گئی۔ ”تم بالکل ٹھس ہو گئے ہو میرا ساتھ دو۔“

میں نے ساتھ دیا مگر اسے مزہ نہیں آیا۔ اسی نے ٹھس کیا تھا ورنہ اتنے پاس آنے پر میں با آسانی اس کی گردن مروڑ دیتا۔ اس نے بیک سے ایک گول دھاتی ڈبا نکالا اور اسے کھول کر اس میں سے ایک درمیانے سائز کا بسکٹ نکالا اور اسے منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ پھر اسے حلق سے اتارنے کے لیے اس نے پانی کا سہارا لیا۔ اس نے ایسا ہی ایک بسکٹ مجھے بھی دیا۔ میں نے اس بد مزہ سے بسکٹ کو بڑی مشکل سے پانی کی مدد سے نیچے کیا۔ مگر اسے کھاتے ہی مجھے لگا جیسے میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ہو۔ زینی بولی۔ ”یہ ہائی پروٹین بسکٹ ہے سبھ لو ایک بسکٹ میں ایک وقت کے کھانے کی مکمل غذائیت ہوتی ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے لگ رہا ہے میں نے اچھی طرح کھا لیا ہو۔“

”بس اب چلو۔“ وہ کھڑی ہو گئی مگر اس بار اس نے بیک مجھے تھما دیا اور میں نے اسے پشت پر باندھ لیا۔

یہاں ڈھلان اترتی تھی اور زینی نے وعدہ و کٹریاں تلاش کیں جن سے ہم اسٹک کا کام لے سکتے تھے۔ سہارے کے بغیر اتنا مشکل کام تھا۔ اسٹک سے یہ آسان ہو گیا۔ سورج سر پر آ گیا تھا اور اس کی تپش اب بڑھ گئی تھی۔ خاص طور سے سر جیسے براہ راست حرارت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنا رومال سر پر باندھ لیا۔ زینی کے پاس جھلی اونی ٹوپی تھی اس نے وہی پہن لی۔ اگرچہ یہ گرم تھی مگر فی الحال دھوپ سے بچا رہی تھی۔ بلندی پر پانی نہیں فاس لیے ہمیں اسی بوتل پر گزارا کرنا تھا۔ دوپہر تک جب کہیں پانی نہیں ملا تو زینی بوتل خود استعمال کرنے لگی۔ اس نے مجھے پانی دینا بند کر دیا۔ ایک گھنٹے میں میرا حلق خشک ہو گیا اور اس میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے۔ ہاں گرمی سے زیادہ خشکی تھی جس نے پیاس کو ذرا سی دیر میں شدید کر دیا تھا۔ بسکٹ کھا کر برداشت کرنا

مشکل ہو گیا تو میں نے اس سے پانی مانگا۔

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

”ابھی تمہیں پانی نہیں ملے گا۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”تب میں پانی کہاں سے لوں؟“

”دیکھو شاید راستے میں کوئی ندی یا تالا آئے گا تو پی لیتا۔“

ہم نے سفر جاری رکھا تھا مگر ہر گزرتے لمحے پیاس کی شدت بڑھ رہی تھی اور اگر جسم میں پانی ایک حد سے کم ہو جاتا تو ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت ہو جاتی۔ مجھے چکر آنے لگتے اور نظر دھندلانا شروع کر دیتی۔ مگر فی الحال صرف تھکنی تھی۔ میں چلتے ہوئے ایسی جگہوں پر جھانک رہا تھا جہاں گڑھوں میں گزشتہ بارش کے پانی کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا مگر قسمت کہ بارش کا اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ اگر پانی تھا بھی تو اب خشک ہو چکا تھا۔ ہمارا رخ نیچے کی طرف تھا اور اس کا امکان بڑھ رہا تھا کہ راستے میں کوئی ندی یا تالا مل جائے۔ سہ پہر تک ہم ایک ڈھلان عبور کر کے نیچے پہنچے تو اوپر چڑھائی خطر تھی۔ بائیں طرف شیب میں گہرائی تھی میں نے زینی سے کہا۔ ”اب مجھ سے پیاس برداشت نہیں ہو رہی ہے وہاں نیچے پانی ہو سکتا ہے۔ مجھے پانی دو یا وہاں تک چلو ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”مجھے ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت شروع ہو جائے گی اس وقت بھی میرا سر ہلکا سا چکر رہا ہے۔“

اس نے سوچا اور سر ہلکا کر پہلے بوتل میری طرف بڑھائی۔ ”اس سے دو گھونٹ لے لو۔“

میں نے دو گھونٹ لے کر بوتل اسے واپس کی اور اب میری حالت بہتر ہوئی تھی۔ زینی میرے ساتھ اس شیب کی طرف بڑھی۔ یہاں سبزہ گہرے رنگ کا تھا جو اس بات کی نشانی تھی کہ یہاں پودوں کو زیادہ پانی ملتا تھا۔ پہاڑی علاقے پانی کے لحاظ سے صحرا سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے ہیں یعنی ان کی زمین میں پانی زیادہ دیر نہیں نکلتا ہے۔ اس لیے پودوں کو اپنے پاس پانی محفوظ کرنا پڑتا ہے۔ البتہ پہاڑوں میں بارش کہیں زیادہ ہوتی ہے اور پھر برف بھی پگھلتی ہے۔ اس لیے یہاں ہریالی پائی جاتی ہے۔ ہم ذرا نیچے آئے تھے کہ پانی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ چشمہ تھا جو زمین سے ابل رہا تھا مگر ایک ہی جگہ محدود تھا۔ میں تیزی سے پانی کی طرف بڑھا۔ پانی شفاف اور نیلگوں رنگ کا تھا اس سے نباتات کی مخصوص مہک آ رہی تھی میں نے تھیلی میں لے کر پہلے اسے پکھا اور صرف پانی کا ڈالنے محسوس کر کے ایک بار منہ میں لیا۔ اس بار بھی پانی میں کوئی خرابی محسوس نہیں کی اس لیے چند گھونٹ پی کر دیکھا۔ زینی میرے عقب میں موجود احتیاط پسندی کا مظاہرہ دیکھ رہی تھی اور جھنجھلا رہی تھی۔

”اب جلدی کرو۔“

”چشموں کا پانی ایسے ہی نہیں پینا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”بعض اوقات اس میں زہریلی معدنیات یا پودوں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ویسے یہ پانی ٹھیک ہے۔“

میں نے دل بھر کر پانی پیا اور زینی نے اپنی بوتل بھی بھری۔ یہ ڈیزہ لیٹر کی بوتل تھی۔ بلکہ اسے پانی اتنا اچھا لگا کہ اس نے اپنا پہلے والا پانی پھینک کر چشمے سے پانی بھر لیا۔ اس دوران میں میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ دھوئے اور اپنا تپ جانے والا سر کچھ دیر کے لیے پانی میں رکھ کر ٹھنڈا کیا۔ اس ٹھنڈک نے مجھے بالکل تروتازہ کر

دیا تھا۔ سراب ہو کر ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ زینی نے نقشہ نکال کر دیکھا اور روٹ ڈرا بدل دیا۔ ہم واپس ڈھلان کی طرف جانے کی بجائے اسی جھٹے سے اوپر چڑھنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس طرف سے کیوں جا رہے ہیں؟“

”یہ شارٹ کٹ ہے۔“ وہ بولی۔

مگر شارٹ کٹ خاصا طویل ثابت ہوا کیونکہ ترچھا ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں راستہ اتنا زیادہ گھوم رہا تھا کہ اس کی بجائے اگر ہم واپس ڈھلان پر جا کر چڑھتے تو اب تک دوسری طرف پہنچ چکے ہوتے۔ زینی تھک گئی تھی اور میرا حال بھی اچھا نہیں تھا لگا تار تین دن سے پہاڑی راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ جب ہم اوپر پہنچے تو دوسری طرف بھی اتنی ہی مشکل اترائی تھی اور شام سر پر تھی۔ اس اترائی کے بعد ایک وسیع میدان نما پلیٹو دکھائی دے وہی تھی۔ مگر یہ بھی پہاڑوں کے اوپر تھی۔ یہاں دور ہائی وے بھی نظر آرہی تھی۔ میں نے زینی سے کہا۔ ”اگر تم نے آج ہی اسدا آباد پہنچنا ہے تو ہائی وے تک جانا ہوگا ہم کسی گاڑی میں ہی وہاں تک جاسکتے ہیں۔“ غالباً وہ بھی یہی سوچ رہی تھی اس لیے فوراً مان گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں ہائی وے کی طرف جانا چاہیے۔“

اس دشوار ڈھلان سے کسی نہ کسی طرح نیچے آئے تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ ہم نے شاید دس کلومیٹر کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا اور سارا دن گزر گیا تھا۔ میدان سے ہوتے ہوئے ہم ہائی وے کے پاس آئے۔ اس پر ٹریفک گزر رہا تھا مگر اس طرح کہ چند منٹ بعد کوئی گاڑی آتی یا جاتی نظر آتی تھی۔ ہم ہائی وے کے نزدیک آئے تو خود کو چھپانے لگے۔ اس کا امکان تھا کہ پچھا کرنے والے یہاں بھی ہوں۔ ایک موزوں جگہ ہم نے قیام کیا۔ یہاں سے ہم ہائی وے پر دونوں طرف نظر رکھ سکتے تھے اور کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ویسے بھی اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ہوا میں خنکی محسوس کی جاسکتی تھی۔ مگر مجھے بھوک لگ رہی تھی عام حالات میں میں کبھی اپنے دشمن سے اس طرح کھانے کا سوال نہیں کر سکتا تھا مگر میں جس کیفیت میں تھا میں نے آرام سے زینی سے کہہ دیا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”کچھ دیر صبر کر لو اگر گاڑی مل گئی تو ہم کھانا بھی کھا سکیں گے۔ یہ ازجی بکٹ ہنگامی حالات کے لیے ہیں۔“

”ہم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہیں؟“

”بس کا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم چھوٹی گاڑی والوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے وہ دشمن بھی ہو سکتے ہیں اور چور ڈاکو بھی۔“

”یہ دشمن کون ہیں؟“

”میں نہیں جانتی مگر اندازہ ہے۔ یہاں کا ایک طاقتور سردار میرے پیچھے پڑ گیا ہے یہ اسی کے آدمی ہیں جو مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”یعنی یہ میرے چکر میں نہیں ہیں؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”یہاں نہیں کون جانتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے کوئی نکل آئے۔“ میں نے کہا۔ ”یقین سے مت کہو۔“

اس کا منہ بن گیا اس کے خیال میں، میں نے اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے پوچھا۔
”اس طاقتور سردار کو تم سے کیا مطلب ہے؟“

”یہ اس سردار کا بھائی ہے جسے میں نے قتل کیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”وہ اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔“

”تم نے شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو کیوں مارا؟“

”وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے بس میں ہوں۔“ زینی کا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔ ”اس لیے وہ مجھ سے جیسا
چاہے سلوک کر سکتے ہیں۔“

”اگر تم ان سے خوش نہیں تھیں تو ان کے ساتھ کیوں تھیں؟“

”میں اصل میں تمہارے لیے پاکستان گئی تھی۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”وہ سمجھے کہ میں مجبوری میں ان
کے ساتھ شامل ہوئی ہوں۔ یہ کام بھی بہ ظاہر میں نے ہی ان کو دلایا تھا۔ میں تم کو لے آئی اور ساتھ ہی ان کو بھی
کیفر کر دار تک پہنچا دیا۔“

میں نے اس کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی۔ ”میرے لیے کیوں؟“

”کسی کو تمہاری تلاش ہے۔“

”میری تلاش کس کو ہے؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ ”میں تم کو اس کے پاس لے جانے کی کوشش کر رہی
ہوں اگر کامیاب رہی تو تم دیکھ ہی لو گے۔“

”تم نے مجھے انجکشن کس چیز کا لگایا ہے؟“

”شریف بنائے رکھنے کا۔“ وہ ہنسی۔ ”اگر میں تمہیں یہ انجکشن نہ لگاتی تو اس وقت تم میرے قابو میں کہاں
ہوتے؟“

میں نے سوچ کر کہا۔ ”ہاں میں بھاگ جاتا۔ آج تک کوئی دشمن مجھے زیادہ دیر قید نہیں رکھ سکا۔“

”تم بہت خطرناک آدمی ہو، مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ آ گئے۔“

”یہ شیر خان اور اس کے ساتھی.....“

”انہیں بھول جاؤ۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”وہ گھنیا درجے کے جرائم پیشہ تھے اور ان کا انجام

یہی ہوتا تھا۔“

”میں نے شیر خان سے کہا تھا۔“

”تم نے ٹھیک کہا تھا میرے پاس وقت ہوتا تو میں انہیں تڑپا تڑپا کر مارتی۔“

میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”دیکھنے میں اتنی ظالم نہیں لگتی مگر تم نے کیسے آرام سے ان تینوں کو مار

دیا۔“

”میں نے قسم کھائی تھی مجھے جب موقع ملا میں انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گی۔“

”یہ چاروں جو ہمارے ساتھ آئے کیا تمہارے پرانے ساتھی ہیں؟“

”نہیں انہیں اس شخص نے ہار کر کے میری مدد کے لیے بھیجا جس کے لیے میں کام رہی ہوں۔ ورنہ میں ان کو جانتی بھی نہیں ہوں۔“

”شاید وہ چاروں مارے گئے ہیں۔“

اس نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ ”حملہ آور زیادہ تھے۔ مگر انہیں اسی لیے ہار کیا گیا تھا۔ ویسے بھی اس ملک میں مرنے مارنے کے سوا اور ہے ہی کیا؟“

”جب تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

”صرف اسی کام کے لیے اس کے بعد میں واپس جا رہی تھی۔ وہاں میرا خاندان ہے۔“

”تم نے جو وقت گزرا ہے کیا اس کے بعد تامل زندگی گزار سکو گی؟“

”ہاں نہیں۔“ اس نے مجھے کھورا۔ ”تم کچھ زیادہ ہی بات نہیں کر رہے ہو اس انجکشن کے بعد آدمی چپ رہتا ہے۔ مگر تم ہو کہ بولے جا رہے ہو۔“

”میں زیادہ بولتا ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔ زینی نے سرٹک کی طرف دیکھا اور بولی۔

”میرا خیال ہے بس آگئی ہے۔“

بس اسی سمت سے آ رہی تھی جس طرف سے ہم آئے تھے۔ زینی نے رائفل بیک میں کر لی اور اب بیک اپنے قبضے میں لے لیا البتہ اس نے پستول جیکٹ تلے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”آؤ۔“

ہم سرٹک پر آئے اور زینی نے خود کو نمایاں کرتے ہوئے بس روکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے پہلے ہی بریک لگا دی اور ہمیں بس تک جانا پڑا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو بس کچھ کچھ بھری ہوئی تھی اور اس میں خواتین اور حضرات کے ساتھ ساتھ چند پرند بھی تھے۔ بس میں سٹیش چند ایک تھیں جو دی آئی پی حضرات کے لیے مخصوص تھیں باقی سٹیش نکال کر جگہ کشادہ کی گئی تھی جس میں زیادہ سے زیادہ افراد کوشنسا ہوا تھا۔ اندر کا حال دیکھ کر زینی نے آگے جانا مناسب نہیں سمجھا اور ڈرائیور نے فوراً اسے اپنے ساتھ والی نشست پیش کی اور اس پر براجمان کنڈیکٹر کو وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ زینی بیٹھ گئی اور میں دروازے پر ہی کھڑا ہو گیا۔ آگے جانے کا کوئی چانس ہی نہیں تھا۔ بس آگے بڑھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر پچھا کرنے والوں میں سے کوئی بس میں ہوا تو اس کا رد عمل کیا ہو گا؟ اس سے پہلے بھی ہم پر براور راست فائرنگ کی گئی تھی اور اب بھی امکان یہی تھا کہ ہمیں مارنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر شکر ہے بس میں کوئی دشمن نہیں تھا اور ہم آرام سے اسد آباد پہنچ گئے۔

جس جگہ ہم بس پر سوار ہوئے وہاں سے اسد آباد مشکل سے دس بارہ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا اور ڈرائیور تیز رفتاری کا مریض تھا اس نے یہ فاصلہ مشکل سے چندرہ منٹ میں طے کر لیا اور جب اسٹاپ پر ہم اترنے لگے تو ڈرائیور مایوس ہوا تھا کہ اس نے اتنی جلدی کیوں دکھائی مزید کچھ دیر زینی کا ساتھ رہتا۔ زینی نے راستے میں ٹکٹ لے لیے تھے۔



اسد آباد بڑا قصبہ یا چھوٹا شہر ہے اور رات کے وقت بھی یہاں خاصی چہل پہل تھی۔ زینی نے نیچے

اترے ہی ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ٹیکسی والا اسے اڑا کر لایا تھا۔ بہ مشکل ہم اس کی زد سے بچے اگر ٹیکسی کے بریک بہت اچھے نہ ہوتے تو وہ ہم پر چڑھ جاتی۔ اس کے بریک تو اچھے ہونے تھے کیونکہ یہ نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرواچی اور یہاں ٹیکسی کے طور پر کام کر رہی تھی۔ افغانستان میں گاڑیاں اسمگل ہو کر آتی ہیں۔ کوئی ڈیوٹی ٹیکس اور رجسٹریشن نہیں ہے اس لیے نہایت سستی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اعلیٰ درجے کی لکڑی گاڑیوں سے ٹیکسی حتیٰ کہ بار برداری کا کام بھی لیا جا رہا تھا۔ اگر انہیں بنانے والی کمپنیاں اپنی گاڑیوں کا استعمال دیکھتیں تو یقیناً صدے میں آجائیں۔

کاریں کم نظر آ رہی تھیں جب کہ بڑی لکڑی فورڈ ہیل ڈرائیو کی بھر مارتھی۔ بازاروں کی رونق بتا رہی تھی کہ فی الحال یہاں لوگوں کے پاس خاصا پیسا آیا تھا۔ زینی نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیو کو کسی جگہ کا بتایا۔ اس نے سر ہلایا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ عام سی گلیوں اور سڑکوں پر وہ بہت حیرت انگیز کر رہا تھا اور یہاں لوگ اس کے عادی تھے کیونکہ کسی نے اسے گالی نہیں دی اور نہ لعنت دکھائی جیسا کہ ہمارے ہاں کا رواج ہے۔ شہر دو دریاؤں کے سنگم پر آباد ہے اور اس کا بڑا حصہ جزیرہ نما جگہ پر ہے جس کے تقریباً چاروں طرف پانی بہتا ہے۔ ہم اسی جزیرہ نما حصے میں اترے تھے اور اسی میں کہیں جا رہے تھے۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد ٹیکسی ایک بڑے سے مکان کے سامنے رکی۔ یہ جدید طرز کا کارواں ماربل سے ڈھکا ہوا مکان تھا۔ یقیناً کسی دولت مند کا تھا۔ فولادی گیٹ پر نہ صرف دو عدد مسلح گارڈز تھے بلکہ مکان کی چھت پر باقاعدہ مورچہ بنا کر اس میں ایل ایم جی نصب کی گئی تھی۔ ہم نیچے اترے تو ایک گارڈ آگے آیا۔

”ادھر کیوں آیا ہے؟“

”رنی شاہ سے کہو بیٹی آئی ہے۔“ زینی نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ گارڈ کچھ دیر اسے نظروں سے نڈتا رہا پھر مڑ کر گیٹ تک گیا اس نے آگے پیغام پہنچایا اور اس نے آگے کسی سے کہا کیونکہ پیغام خاصی دیر میں پہنچا اور نتیجے میں رنی شاہ خود آگیا۔ اس نے والہانہ انداز میں زینی سے ہاتھ ملایا۔

”تم اوھر کب آیا مجھے بتایا ہوتا میں گاڑی بھیجتا۔“

”میرے پاس گاڑی اور آدمی تھے۔“ زینی نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن سب راستے میں رہ گئے۔“

رنی شاہ چونکا۔ ”کیا ہوا؟“

”میرا خیال ہے گہرام کے آدمی تھے۔ انہوں نے اسار میں ہم پر حملہ کیا۔“

رنی شاہ متشکر ہو گیا۔ ”گہرام خان..... ان دنوں وہ بہت اونچا اڑ رہا ہے۔“

”جو جتنا اونچا اڑتا ہے اتنی ہی بلندی سے نیچے گرتا ہے۔“ زینی نے جواب دیا۔ رنی شاہ پہلی بار میری

طرف متوجہ ہوا اور اس نے حاسدانہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“

”ایک قیدی ہے۔“ زینی بولی۔

”فیا۔“ رنی شاہ نے کسی کو آواز دی۔ ”اسے نیچے لے جا کر بند کر دو۔“

”یہ میرے ساتھ رہے گا۔“ زینی بولی۔ ”میں اسے ایک لمحے کے لیے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کر

کتی۔“

”کیوں؟“ رنی شاہ کے انداز میں شک آگیا۔ وہ خش خش داڑھی اور بھاری جسامت والا پستہ قد شخص تھا اس میں سوائے دولت مندی کے اور کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کوئی عورت اس کی طرف متوجہ ہوتی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ زہنی کا نیاز مند تھا اور شاید اس کی دلنواز قربت سے بھی لطف اندوز ہو چکا تھا۔ اس لیے مجھ سے بلاوجہ خار کھا رہا تھا۔ زہنی کی بات پر اس نے نہایت کینہ تو نظر سے مجھے دیکھا۔

”یہ کیسا قیدی ہے جسے تم ساتھ رکھنا چاہ رہی ہو۔“

”کیونکہ یہ میرا قیدی ہے۔“ زہنی نے ایک ادا سے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”اگر میں اسے آزاد چھوڑ دوں تب بھی یہ کہیں نہیں جائے گا۔“

”مجھ سے شاعری میں بات مت کرو۔“ رنی شاہ نے لہجہ بدل کر کہا۔ ”تم جانتی ہو میں صرف ایک زبان جانتا ہوں۔“

زہنی نے گہری سانس لی اور اپنے بیک سے انجکشن نکال کر اسے دکھایا۔ ”امید ہے اب تم سمجھ گئے ہو گے، ورنہ یہ اتنا خطرناک آدمی ہے کہ تمہارے یہ آدمی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔“

”ایسا کون سا سورما پیدا ہو گیا ہے۔“ اس نے حقارت سے کہا۔ واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو افغانی پشتو میں ہو رہی تھی۔ یہ کسی حد تک پاکستانی پشتو سے مختلف ہے لیکن اسی طرح جیسے جنوبی پنجاب کی بولی پوٹھوہاری پنجابی سے الگ ہے۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ زہنی بہت روانی سے بول رہی تھی۔ زہنی نے آگے جھک کر کہا۔

”شہباز ملک کا نام سنا ہے۔“

رنی شاہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”وہ انڈیا والا۔“

”پاکستانی۔“ زہنی نے تصحیح کی۔ ”ہاں وہی جس نے انڈیا میں تباہی پھیلانی تھی۔“

رنی شاہ کی آنکھوں میں بدستور شک تھا بس شک کی نوعیت بدل گئی تھی۔ ”دیکھنے میں تو یہ عام سا آدمی لگ رہا ہے۔“

”انسان کا کام ہی دھوکا دینا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ہم اندر آئے۔ مکان باہر سے جتنا شاندار تھا اندر سے اس سے کہیں زیادہ شاندار تھا۔ ہر چیز غیر ملکی اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ یہاں بجلی تھی اس لیے پورا گھر جگمگ کر رہا تھا۔ زہنی نے اندر آتے ہی بے تکلفی سے کہا۔ ”اپنے باورچی سے کہو جلد از جلد کھانا بنا دے اور کچھ پیئے کو دو۔“

رنی شاہ نے دونوں چیزوں کا کہا۔ یہ جاننے کے بعد کہ میں شہباز ملک ہوں اس کا رویہ کسی قدر بدل گیا۔ میں اگر اپنی درست کیفیت میں ہوتا تو لازمی حیران ہوتا کہ میری شہرت سرحد پار تک موجود تھی۔ ایک ملازم م انٹرنیٹ کی بوتل اور بلوریں جام ایک شیشے کی ٹرے میں رکھ کر لے آیا اور اس نے سلیقے سے جام بنا کر سب کے سامنے رکھے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں پیتا ہوں۔“

رنی شاہ کی رگ خباثت پھڑکی اور اس نے زہنی سے کہا۔ ”تم تو کہہ رہی تھیں یہ تمہارے قابو میں ہے۔“

”ہاں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اپنا ماضی بھول گیا۔“

”لیکن ہے تو تمہارے حکم کا غلام اسے کہو کہ شراب پیئے۔“

”کیا ضرورت ہے جب کہ یہ نہیں پیتا۔“ زینی نے بے پروائی سے کہا اور ایک ہی سانس میں اپنا جا خالی کر دیا۔ وہ بلا نوش لگ رہی تھی۔ ورنہ یہ خاصی تیز شراب تھی۔

”تمہیں پتا تو چلے کہ یہ سچ کچھ تمہارے قابو میں ہے یا نہیں۔“

اس کی بات پر زینی نے پہلے اسے گھور اور پھر مجھے دیکھنے لگی۔ رنی شاہ نے کسی شیطان کی طرح اس۔۔۔ دل میں وہم ڈال دیا تھا۔ میں سن کیفیت کے باوجود اندر سے عجیب سا محسوس کرنے لگا۔ مجھے خوف آ رہا تھا کہ اگر زینی نے مجھے شراب پینے کا حکم دیا تو میں کیسے مزاحمت کروں گا جب کہ میں اس کا حکم ماننا آیا تھا اور میں نے ایک بار بھی مزاحمت محسوس نہیں کی تھی۔ مگر پہلی بار میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے اس کا حکم نہیں ماننا چاہیے۔ زینی کچھ دیر بعد بولی۔ ”شہباز بیو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم جانتی ہو میں نہیں پیتا۔“

رنی شاہ نے قہقہہ مارا۔ ”یہ تمہارا حکم ماننے سے انکار کر رہا ہے۔“

زینی اب تشویش زدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم میرا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو؟“

”تم جو کہتی ہو میں کرتا ہوں۔“ میں نے دفاعی انداز میں جواب دیا۔ ”لیکن شراب نہیں پی سکتا۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”شہباز ملک یہ جام پیو۔ یہ میرا حکم ہے۔“

میری مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ بلکہ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے اتنی مزاحمت بھی کیسے کی۔ میں تو کسی آہستہ کی طرح اس کے اشاروں پر عمل کر رہا تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے جام اٹھا لیا۔ مگر میں اسے منہ کی طرف نہیں لا پا رہا تھا۔ میرے اندر سے کوئی منع کر رہا تھا کہ میں اس حرام شے کو منہ نہ لگاؤں۔ اسے طلق سے نہ اتاروں۔ رد شاہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میری ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے زینی نے پھر زور دے کر کہا۔

”شہباز اسے پی لو۔“

میں بے ساختہ جام منہ کے پاس لے کر آیا اور اس سے اٹھتی کراہیت آمیز نو سے میرا دل متلایا اور میں نے بے ساختہ ہی جھکتے ہوئے ابکائی لی اور الٹی کی پھوار میرے منہ سے نکل کر رنی شاہ تک گئی تھی۔ اس کا شلوار اور قمیص کا دامن داغ داز ہوا اور وہ الجھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ سے گالی اور زینی کے منہ سے قہقہہ نکلا تھا۔ ابکائی کے لیے جھکا تو جام قالین پر گر گیا تھا۔ رنی شاہ نے پاؤں بیخ کراپنے خادم کو پکارا اور خود وہاں سے چا گیا۔ خادم آیا اور اس نے صورت حال کا اندازہ کر کے میری ہاتھ روم تک رہنمائی کی اور میں نے کلی کر کے منہ دھویا۔ میرے لباس پر جہاں جہاں دھبے آئے تھے۔ ان کو صاف کیا۔ واپس آیا تو خادم نشست گاہ کو صاف کر چکا تھا۔ زینی سکون سے سے نوشی میں مصروف تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم بہت چالاک ہو، تم نے جان بوجھ کر قے کی ہے۔“

”کوئی اس طرح جان بوجھ کر قے کر سکتا ہے؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”کر بھی سکتا ہے۔“

میرا تو خیال تھا کہ اللہ نے مجھے اس حرام شے سے بچا لیا تھا۔ مگر ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ میری سز

کرنے والی کیفیت ختم ہو رہی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا اور مجھے زینی اور رنی شاہ پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے میرے ساتھ ایسی حرکت کرنے کی کوشش کی۔ شاید تم کرنے سے دوا کا اثر قبل از وقت زائل ہو رہا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ ایسے انجکشن کا اثر بارہ گھنٹے رہتا تھا اور اس کے بعد دوسرا انجکشن دینا پڑتا تھا۔ زینی نے مجھے دس بجے کے قریب انجکشن دیا تھا۔ لازمی بات ہے رات کا انجکشن بارہ گھنٹے پہلے دیا گیا ہوگا۔ میں نوبے سے بھی پہلے سو گیا تھا بلکہ دوا کے اثر سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس وقت نوبہ رہے تھے اور زینی ایک گھنٹے بعد مجھے انجکشن دیتی۔ صبح میں دس بجے بھی سن والی کیفیت میں تھا اور زینی کے احکامات کی پوری طرح تعمیل کر رہا تھا۔ مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کسی صورت انجکشن نہیں لینا چاہیے۔ ورنہ میں اس عورت کا غلام بنا رہوں گا۔ واپس آ کر میں سعادت مندی سے کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک زینی نے نہیں کہا۔

”کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔“

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”مجھے پانی چاہیے۔“

زینی کے اشارے پر خادم پانی لے آیا۔ چند منٹ بعد رنی شاہ آیا اور اس نے کینہ تو زینٹوں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا تم اسے پھر شراب پینے کا حکم نہیں دو گی۔“

”میں حکم دوں گی اور یہ مانے گا۔“ زینی نے بے پروائی سے کہا۔ ”لیکن کیا فائدہ تمہارا لباس اور خوب صورت ڈرائنگ روم پھر سے کندہ نہ ہو جائے۔“

”اس کی فکر مت.....“

”پلیز۔“ زینی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں یہاں صرف کھانے پینے نہیں آئی ہوں۔“

رنی شاہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مجھے بہر صورت کابل پہنچنا ہے۔“

رنی شاہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”موجودہ حالات میں یہ آسان کام نہیں ہے تم جانتی ہو یہاں سے جلال آباد تک گہرام خان کے آدمیوں کی چیک پوسٹیں ہیں۔ ان سے گزرے بغیر کوئی کابل نہیں جاسکتا ہے۔“

”یہ کام تم ممکن بناؤ گے۔“ زینی بولی۔ ”یہ بتاؤ یہاں آس پاس کوئی ایئر فیلڈ ہے جہاں چھوٹا طیارہ اتر سکے۔“

رنی شاہ نے اپنی شخصیت داڑھی سہلاتے اور سوچتے ہوئے کہا۔ ”روسیوں کے زمانے کی ایک ایئر فیلڈ ہے مگر وہ استعمال نہیں ہوتی ہے۔“

”قابل استعمال ہے؟“

”ہاں قابل استعمال ہے۔“

”تب کام چل سکتا ہے۔ مجھے اور اسے لینے کابل سے طیارہ آجائے گا۔“

رنی شاہ کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ ”لگتا ہے آج کل تم بھی بہت اونچا اڑ رہی ہو۔“

”میں اپنی بلندی پر ہوں۔“ اس نے کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔ ”سب اس کے لیے ہو رہا ہے۔ یہ

اصل آدمی ہے۔“

”طیارہ کیسے منکواؤ گی؟“

”کال کر کے۔“ زینی نے کہا۔ ”مجھے لوکیشن بتاؤ۔“

”یہاں سے دور ہے نقشے پر بتا سکتا ہوں۔“ رنی شاہ نے کہا تو زینی نے نقشہ نکال کر اس کے سامنے رکھ

دیا۔

”اس میں بتاؤ۔“

رنی شاہ نے اسد آباد کے جنوب مشرق میں ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”یہاں ہے مگر یہ بہت چھوٹا ہے۔

روسیوں نے اسے چھوٹے طیاروں اور ہیلی کاپٹر کی ری فیلنگ کے لیے بنایا تھا۔“

”رات کے وقت لینڈنگ ہو سکتی ہے؟“

”میں معلوم کرتا ہوں۔“ رنی شاہ نے کہا۔ ”اس زمانے میں یہاں کا ایک سابق ایوی ایشن مین میرا

جاننے والا ہے۔“

”تم معلوم کرو۔“ زینی بولی اور پھر اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”یقین کر دو تم خسارے میں نہیں رہو گے۔“

رنی شاہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”کیسے تم تو جلی جاؤ گی۔“

”فورا تو نہیں جا رہی ابھی چند گھنٹے یہاں رکوں گی۔“ زینی نے بھی اسی لہجہ میں جواب دیا۔ ”کیا چند

گھنٹے کافی نہیں ہیں؟“

”تمہارے ساتھ کے لیے تو چند دن اور ہفتے بھی کم لگتے ہیں۔“

”میں واپس بھی آؤں گی۔“ زینی نے اسے تسلی دی تو وہ اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی زینی نے زیر

لب ایک ایسی گالی دی کہ میرے کان گرم ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا موبائل نکال کر آن

کیا اور کسی کو کال کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ”مجھے رات دو بجے اس لوکیشن پر چھوٹا طیارہ چاہیے۔۔۔۔۔

ہاں لوکیشن نوٹ کرو۔“

اس نے مخصوص اصطلاحات کے ساتھ لوکیشن نوٹ کرائی۔ یہ ہوا بازی کی زبان تھی۔ اس نے موبائل

آف کر کے واپس بیگ میں رکھ لیا۔ اس وقت خادم وہاں نہیں تھا۔ یہ کام کر کے زینی نے بیگ سے میڈیکل پیک

نکالا اور اس میں سے انجکشن برآمد کیا تو میں سمجھ گیا کہ اگلے انجکشن کا وقت آ گیا ہے حالانکہ ابھی دس بجتے ہیں آدھا

گھنٹا تھا مگر ہوشیار زینی نے قبل از وقت مجھے انجکشن لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور سرخ پر

انگلی مارتے ہوئے بولی۔ ”بازو سامنے کرو۔“

میں نے بازو سامنے کیا اور جیسے ہی اس نے انجکشن کے لیے ہاتھ آگے کیا میں نے اس کا انجکشن والا ہاتھ

پکڑ کر اسے گھمایا اور وہ بل کھا کر بہت آسانی سے میرے بازوؤں کے گھٹنے میں آ گئی۔ اس کا ہاتھ میں نے پکڑا

ہوا تھا اور انجکشن کی سوئی اب اس کی گردن کو چھو رہی تھی۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جما ہوا تھا اور اس کے چمچنے

جسم کو میں نے ایک پاؤں سے قابو کیا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ”ہماری زبان میں ایک

محاورہ ہے آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار محاورے ہیں مگر فی الحال یہ ہی کافی ہے۔“

میں نے کہتے ہوئے انجکشن کی سوئی اس کی گردن میں داخل کر دی۔ وہ تڑپتی تھی لیکن مجھے پسٹن دبانے

سے نہیں روک سکی تھی۔ دوا اس کی گردن میں اتر گئی۔ گردن میں گوشت کے گلنے والا انجکشن بھی تقریباً نزو کے انجکشن کی طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔ انجکشن گلنے کے بعد بھی وہ مزاحمت کرتی رہی اور اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح آس پاس موجود افراد کو متوجہ کر لے مگر اس کی بد قسمتی اور میری خوش قسمتی کہ اس دوران میں کوئی نہیں آیا تھا۔ جب اس نے مزاحمت ترک کی تو میں نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس کے باوجود میں پوری طرح ہوشیار تھا اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر اسے دوبارہ دبوچ سکتا تھا۔ مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھوں میں سپاٹ پن آ گیا تھا اور وہ یوں پلکیں جھپک رہی تھی جیسے اُلُو کو تیز روشنی میں بٹھا دیا جائے۔ میں نے میڈیکل پیک واپس زینی کے بیگ میں رکھا۔ اس میں سے پستول نکال کر اپنی قمیص کے نیچے پتلون میں اڑسا اور واپس اپنی جگہ آ گیا۔ اب یہ ظاہر سب پہلے جیسا تھا مگر رنی شاہ اینڈ کمپنی کو قطعی خبر نہیں تھی کہ بازی پلٹ گئی تھی اب جو سیاد تھا وہ قیدی بن گیا تھا اور جو یہ ظاہر قیدی ہے وہ سیاد بن چکا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد میں نے زینی سے کہا۔

”تم بالکل نابل رہو گی اور ابھی جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں کسی سے نہیں کہو گی۔“

”میں کسی سے نہیں کہوں گی۔“ زینی نے کہا اور اسی لمحے رنی شاہ وہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی سرور

لہجے میں کہا۔

”کام ہو گیا ہے۔ میرے آدمی زمین گل کا کہنا ہے کہ رن وے اس قابل ہے کہ اس پر طیارہ اتر سکے اور وہاں روسیوں نے زیر زمین سیٹ آپ لگایا تھا وہ بھی موجود ہے۔ اگر وہاں موجود بجلی کا نظام کام کر رہا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے رن وے لائٹس آن کرنے کے لیے جنریٹر لے جانا پڑے گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ جنریٹر کا بندوبست کرے۔ کیونکہ بیس چھپس سال سے بند پڑا سسٹم کہاں کام کرے گا؟ ویسے تمہیں کب جانا ہے؟“ سوال کرتے ہوئے رنی شاہ کی آنکھیں گدھنا ہو گئی تھیں جیسے اسے گوشت نظر آ گیا ہو۔

”رات دو بجے۔“ زینی نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ نابل تھا۔

”کافی وقت ہے۔“ رنی شاہ کی بانجھیں کھل گئیں۔ ”یہاں سے مشکل سے آدھے گھنٹے کا فاصلہ ہے۔“

”دو بجے طیارہ وہاں پہنچ جائے گا۔“

”کوئی بات نہیں وہ کچھ دیر انتظار کر لے گا۔ دیے زمین گل وہاں پہنچ جائے گا۔ انتظام تو اسے ہی کرنا

ہے۔ آؤ کھانا لگ گیا ہے۔“

شاندار ڈائننگ روم میں بڑی سی میز پر کھانا لگایا جا چکا تھا اور نہایت پر تکلف تھا۔ اس میں افغانی پلاؤ تھا۔ بکرے کی تھی تھی جو ظاہر ہے کہ ہماری آمد سے پہلے بن رہی تھی اور کباب تھے۔ یہ خاص ڈشیں تھیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ چل چل کر معدے کی چکی بھی تیز ہو گئی تھی اور مجھے کئی دن سے ڈھنگ کا کھانا نصیب نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے تکلف کو بالائے طاق رکھ کر کھایا۔ البتہ سیر ہوتے ہی ہاتھ روک لیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ معدے کی گرانی مجھے سست کر دے اور کسی موقع پر بازی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ کھانے کے بعد بیٹھا آیا جو نہایت میٹھا تھا اس لیے میں نے صرف پکھا البتہ خاص ہاضم قبوے کی کئی پیالیاں خالی کر گیا تھا۔ رنی شاہ نے کسی رغبت سے نہیں کھایا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر بھی بت انگور سے دور ہونے کو تیار نہیں تھا اور یقیناً زینی کے لیے بے تاب تھا کہ وہ کب اپنا وعدہ وفا کرتی ہے۔

اگرچہ زینی کوئی پاکہاز عورت نہیں تھی اور نہ ہی اسے اپنی عزت کی پروا تھی وہ اسے سکہ رائج الوقت بھنے والی عورتوں میں سے تھی اس لیے اگر وہ رنی شاہ کے بیڈروم سے ہوا آتی تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر میرے ضمیر کو گوارہ نہیں تھا کہ ایک عورت جو اصل میں اب میرے قبضے میں تھی میں اسے اپنی آزادی کے لیے یوں استعمال کروں۔ رنی شاہ بے خبر تھا کہ اصل بازی میرے ہاتھ میں ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ زینی سے چلنے کو کہتا تو وہ تیار ہو جاتی کیونکہ میں نے ہی اسے حالات کو نارمل ظاہر کرنے کا حکم دیا تھا۔ اگر میں رکاوٹ بننا تو راز فاش ہو جاتا کہ اب میں زینی کا معمول نہیں ہوں اور پھر مجھے رنی شاہ سمیت اس کے بہت سارے مسلح مرگروں سے نمٹنا پڑتا جو بالکل بھی آسان کام نہیں تھا۔ جب میں نے زینی کو قابو کیا تو مجھے خود کو اس کام پر آمادہ کرنا پڑا تھا کیونکہ دوا کا کچھ اثر باقی تھا۔ البتہ کھانے کے بعد میں خود کو بالکل نارمل محسوس کرنے لگا تھا۔ خاص طور سے سیاہ تلخ قہوے نے دوا کا رہا سہا اثر بھی ختم کر دیا تھا۔ اب میں چاک و چوبند تھا۔ گیارہ بجے تک طعام ختم ہو چکا تھا اور رنی شاہ نئے میں خاصا دھت ہو گیا تھا۔ اس نے زینی سے کہا۔

”اب مجھے اور مت تڑپاؤ۔“

وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہوا تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم یہیں رکو گے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”زینی نے کہا ہے میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں۔“

”ہاں میں نے اس سے یہی کہا ہے۔“ وہ فرمانبرداری سے بولی مگر رنی شاہ نہیں سمجھ سکا تھا اس نے پاؤں بچ کر کہا۔

”تو کیا اسے میرے بیڈروم میں بھی لے جاؤ گی۔“

”نہیں جناب میں باہر رکوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے نا زینی؟“

بہ ظاہر یہ سوال تھا مگر درحقیقت حکم تھا اور زینی اس سے سرتابی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ ”ہاں یہ باہر رک جائے گا۔“

رنی شاہ کا بس چلتا تو وہ مجھے اپنے محل نما گھر سے باہر پھنکوا دیتا۔ مگر وہ زینی کی وجہ سے مجبور تھا اور اس نے سوچا کہ کہیں وہ پورے کے چکر میں آدمی سے بھی نہ جائے۔ اس لیے بادل نا خواستہ مان گیا۔ ”ٹھیک ہے یہ باہر رہے گا۔“

وہ ہمیں لے کر اپنے خاص حصے میں آیا۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ وہاں صرف عورتیں اور لڑکیاں تھیں اور وہ سب نہایت کھلے ڈالے حلیے میں تھیں۔ ظاہر ہے یہ اس کا حرم تھا مگر وہ اس رنی شاہ کا حرم نہیں تھیں ورنہ وہ انہیں اس حلیے میں کسی اجنبی کے سامنے آنے کی اجازت کیسے دیتا۔ یہ آج کے جدید دور میں انسانی غلامی کی بدترین صورت تھی۔ وہ مجبور عورتیں تھیں جو اس طاقتور اور دولت مند شخص کے قبضے میں تھیں۔ ان کی صورتوں پر خوف اور بے بسی بتا رہی تھی کہ وہ اپنی خوشی سے یہاں نہیں تھیں۔ زینی کا بیگ اسی کے پاس تھا اور میں نے یوں نہیں لیا کہ کہیں رنی شاہ کو شک نہ ہو۔ اس گھر کے عام حصے میں صرف مرد ملازم تھے۔ مگر یہاں کوئی مرد ملازم نہیں آ سکتا تھا۔ میں بھی زینی کی وجہ سے آ گیا تھا۔ جیسے ہی رنی شاہ زینی کو لے کر اندر گیا میں حرکت میں آ گیا۔ میں پستول نکال کر اس طرف آیا جہاں رنی شاہ کے حرم کی عورتیں موجود تھیں ان کی تعداد نصف درجن تھی۔ ان میں سے دو تو

نہ ہونے کے برابر لباس میں تھیں اور باقی بھی ناکافی کپڑوں کے ساتھ تھیں۔ یہاں موسم کا اثر نہیں تھا مگر ان عورتوں کو اس طے میں رکھنا سوائے نفسانیت کے اور کچھ نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے کہا۔

”شاہ جی نے حکم دیا ہے کہ تم سب ایک کمرے میں چلی جاؤ یہاں خطرہ ہے۔ کمرہ اندر سے بند کر لیتا۔ جب تک شاہ جی خود آواز نہ دیں باہر مت آنا۔“

وہ بے چاری حکم کی غلام تھیں۔ خطرے کا سن کر سب ہی افراتفری میں ایک کمرے میں جا گھسیں اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ میں نے اطمینان کیا کہ اب وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ پھر میں نے اس حصے میں آنے والا واحد دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں واپس رنی شاہ کے بیڈروم تک آیا تو اندر مجھے عجیب سی آواز آئی ایسا لگا جیسے کوئی خرخرہا ہو۔ یہ خراٹے لینے کی آواز بھی نہیں تھی۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے لاک نکلا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔ مجھے امید تھی کہ رنی شاہ جھنجھلائے مگر دروازہ کھول دے گا اور اس کے بعد وہ میرے قابو میں ہوگا۔ جب دروازہ نہیں کھلا اور کوئی آواز بھی نہ آئی تو میں نے پھر دستک دی۔ اب خرخرہٹ کی آواز بھی رک گئی تھی۔ ایک منٹ بعد میں تیسری دستک دینے جا رہا تھا کہ دروازہ جھکے سے کھلا اور زینتی میرے سامنے اس ہیبت کدائی میں کھڑی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھری تھی اور اس کی شرٹ سامنے سے نہ صرف کھلی بلکہ خون میں بھیگی ہوئی تھی۔

”واؤ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”یہ کیا؟“

اس نے کچھ بولے بغیر چھری سے اندر اشارہ کیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ چھری معمولی سی تھی اور پھل کانٹے کے لیے استعمال کی جاتی تھی مگر زینتی نے اس کا استعمال رنی شاہ کی گردن پر کیا تھا۔ وہ بستر پر صرف شلوار میں یوں پڑا تھا کہ اس کے پاؤں نیچے تھے اور دونوں ہاتھ گردن پر جھے ہوئے تھے مگر وہ اس خون کو روکنے میں ناکام رہا تھا جو چھری کے وار کے بعد کٹ جانے والی شرگ سے بہہ رہا تھا۔ زیادہ خون بہنے کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میں نے قریب سے اس کا معائنہ کیا اور پھر زینتی سے پوچھا۔ ”تم نے اسے کیوں قتل کیا؟“

”میں اس کام کے لیے بھی آئی تھی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”یہ ان درندوں میں سے ہے جنہوں نے میری آبرو لوٹی تھی۔“

میں نے سوال کرنے سے گریز کیا کہ اس کے پاس اس نام کی کوئی چیز بھی تھی؟ یہ ذاتیات میں آجاتا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس کی بجائے میں نے کہا۔ ”اپنی شرٹ بند کرو اور جا کر یہ خون صاف کرو۔ ابھی میں یہاں سے نکلتا بھی ہے۔“

وہ فرمانبرداری سے بیڈروم کے ساتھ موجود ہاتھ روم میں چلی گئی۔ بستر خون سے تر ہو رہا تھا۔ رنی شاہ کے پلے پلائے جسم میں خاصا خون تھا۔ میں نے اسے ہاتھ لگائے بغیر بستر کے دونوں طرف موجود سائیڈ ازوں کی تلاشی لی۔ مجھے کسی ہتھیار کی تلاش تھی۔ اگرچہ زینتی والے بیک میں ایک رائفل بھی تھی مگر ہمیں زیادہ ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ ہمیں یہاں سے نکلتا تھا۔ رنی شاہ کے مرنے کے بعد صورت حال خراب ہو گئی تھی۔ اس کے آدمیوں کو پتا چل جاتا تھا کہ وہ مارا گیا ہے اور زینتی نے مارا ہے تو یہاں سے صحیح سلامت نکلتا محال ہو

جاتا۔ اسلحہ مجھے ایک الماری میں ملا۔ اس کے ایک خانے میں جدید ترین ایم سولہ رائفلیں اور ان کا بے شمار ایمنیشن بھرا ہوا تھا۔ چند عدد ہینڈ گرنیڈ اور کچھ اسموک گرنیڈ بھی تھے۔ میں نے دو عدد رائفلیں دستے الگ کر کے بیگ میں رکھ لیں۔ ان کے اضافی میگزین، ہینڈ گرنیڈز اور اسموک گرنیڈز بھی بیگ میں ڈال لیے تھے۔ زینی ابھی تک ہاتھ روم سے نہیں نکلی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اس نے اندر سے کہا۔
 ”آ جاؤ۔“

میرا خیال تھا کہ وہ شاک میں ہوگی اور شاید اب تک خود کو صاف بھی نہ کیا ہو مگر وہ تو مزے سے جھاگ سے بھرے ٹب میں بیٹھی ہوئی خوشبودار گرم پانی کے مزے اٹھا رہی تھی۔ اس نے فطری نظروں سے مجھے دیکھا۔
 ”آؤ تم بھی آ جاؤ بہت مزہ آ رہا ہے۔“
 میں پہلے ہی داخل پڑھ چکا تھا۔ اس لیے اسے صرف اتنا کہا۔ ”ابھی رنی شاہ کے آدمیوں کو علم ہو جائے گا کہ وہ جنم رسید ہو چکا ہے تب زیادہ مزہ آئے گا۔ بہتر ہوگا تم غسل صحت سے جلد فارغ ہو جاؤ ہمیں ابھی یہاں سے لکنا اور ایئر فیلڈ تک بھی جانا ہے۔“

کیونکہ میرا حکم تھا اس لیے وہ سنجیدہ ہو گئی اس نے سر ہلایا۔ ”میں بس ابھی آئی۔“
 وقت بارہ بجے سے اوپر ہو چکا تھا۔ زینی نے دو بجے کا وقت دیا تھا۔ مگر میرا ایئر فیلڈ تک جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ طیارے میں بھلا میں کہاں جاتا؟ دوسرے غیر ملکی فوج اور ایئر فورسز کے ہوتے ہوئے طیارے میں پرواز نہایت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف میزائل سسٹم تھے جو طیارے کو آسانی سے گرا سکتے تھے۔ اس لیے میرا ارادہ اسی راستے سے واپس کا تھا جہاں سے زینی مجھے لے کر آئی تھی لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر طیارے کا آپشن بھی برقرار رکھنا تھا۔ میں زینی کے ان دشمنوں کو نہیں بھولا تھا جو اسارے سے ہمارے پیچھے لگے تھے اور رنی شاہ کا کہنا تھا کہ گہرام نامی اس دشمن سردار کی کاہل تک چپک پوشیں تھیں۔ میں نے واپس آ کر رنی شاہ کا موبائل تلاش کیا جو اس کی قمیص کی جیب میں مل گیا۔ میں نے اس کی ڈائل ہسٹری میں جا کر دیکھا تو دس بجے سے ذرا پہلے ایک ہی کال کی تھی۔ میں نے وہ نمبر زینی کے موبائل میں نوٹ کر لیا۔ بستر کی ایک سائیڈ دراز میں دو عدد جدید موبائل اور بھی تھے لیکن میں نے ان کو چھیننا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بعض اوقات بلاوجہ کی پٹنکے بازی انسان کے گلے پڑ جاتی ہے۔

اس کام کے لیے زینی کا موبائل کافی تھا۔ البتہ اس سے بیلنس کا پوچھ سکتا تھا کہ وہ اتنا ضرور ہو کہ بہ وقت ضرورت کال کرنے سے مسئلہ نہ ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر بیلنس کافی ہو تو میں پاکستان کال کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دے دوں گا۔ اسلحہ کے ساتھ والے خانے میں ایک لاکر نصب تھا اور اس کا تالہ نمبروں سے کھلتا تھا۔ یقیناً اس میں مال و دولت تھی۔ مگر رقم رنی شاہ کے پرس اور سائیڈ دراز سے خاصی مل گئی تھی۔ یہ ڈالرز تھے اور تقریباً دو لاکھ کی رقم بنتی تھی۔ وہ میں نے جیب میں رکھ لی۔ اب میں زینی کا انتظار کر رہا تھا چندرہ منٹ بعد وہ یوں باہر آئی کہ اس نے اوپر صرف تولیہ باندھ رکھا تھا۔ جو بہ مشکل اس کی رانوں تک آ رہا تھا۔ میں نے لباس کا پوچھا تو اس نے کہا۔

”وہ خراب ہو گیا ہے میں نہیں پہن سکتی۔“

”تب کیا پہنوں گی؟“

”یہاں کپڑے ہوتے ہیں۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تم نے دیکھا نہیں کتنی عورتیں ہیں یہاں۔“

”تب جلدی کرو ہمیں یہاں سے نکلتا ہے۔“ میں نے بے تابی سے کہا۔ وہ باہر چلی گئی۔ دس منٹ بعد واپس آئی تو اس کا منہ بنا ہوا تھا اس نے مقامی طرز کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا اتنے کپڑے میں تو اس کے تین چار سوٹ آرام سے بن سکتے تھے۔ اس نے بھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہی کپڑے ہیں یہاں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس لباس کے ساتھ بھاگ دوڑ مسئلہ ہو جائے گی۔ ایسا کرو تم اپنی جمنز اور اوپر جیکٹ پہن لو شرٹ چھوڑ دو۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ اس نے خوش ہو کر کہا اور ہاتھ روم چلی گئی۔ واپس آ کر اس نے اپنے سیلے بالوں کی ہی کٹنگھی کر کے ان کو پونی ٹیل کی صورت دے دی۔ بال خشک کرنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ موسم بیڑ والا نہیں تھا۔ ورنہ اس سے کام چلایا جاتا۔ دوا کے زیر اثر ہونے کے باوجود اس کی فطرت نہیں بدلی تھی اس نے جان بوجھ کر جیکٹ کی زپ خاصی نیچے کی ہوئی تھی اور اس کا گلابی بدن جھلک رہا تھا۔ میں نے زپ اوپر کرنے کو کہا۔ وہ بولی۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”اس سے پتا چل رہا ہے کہ تم نے انڈر شرٹ نہیں پہنی ہے۔“ میں نے سمجھایا تو اس نے بادل نا خواستہ زپ اوپر کر لی۔ میں نے بیلنس کے بارے میں پوچھا۔

”پتا نہیں مجھے یہ سیل دیا گیا تھا یہ نہیں بتایا تھا کہ اس میں بیلنس کتنا ہے۔“

میں نے سوچا کہ ایک بار یہاں سے نکل جائیں پھر میں موبائل استعمال کر سکوں گا۔ ایک بجے ہم باہر نکلے۔ میں نے زینی والی رائلز اپنے شانے پر ٹانگ لی تھی۔ رنی شاہ کے بیڈ روم کا دروازہ اندر سے مٹن دبا کر لاک کر دیا اب یہ صرف چابی سے کھل سکتا تھا۔ یہی سلوک ہم نے باہر والے دروازے کے ساتھ کیا اور باہر آئے تو ایک خادم موجود تھا۔ زینی نے اس سے کہا۔

”ہمیں گاڑی چاہیے۔“

”گاڑی۔“ اس نے کسی قدر تذہذب کے ساتھ کہا۔ ”پردہ تو شاہ جی کے کہنے پر مل سکتی ہے۔“

”میں اس کے بیڈ روم سے آ رہی ہوں۔“ زینی نے واہیات انداز میں کہا۔ ”اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اس کی گاڑیوں میں سے جو چاہے لے جاؤں۔ کیا میں اسے اٹھاؤں کہ وہ تمہیں بھی کہہ دے؟“

خادم ڈر گیا کہ کھل کر عیاشی کے بعد اس دقت رنی شاہ مکمل آرام کے موڈ میں ہو گا اور اس میں خلل اندازی کے نہ جانے کیا نتائج نکلیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”شاہ جی نے آپ سے کہہ دیا تو ٹھیک ہے۔“

ہم باہر آئے جہاں پورچ میں کئی طرح کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور یہ سب اعلیٰ درجے کی لکڑی گاڑیاں تھیں۔ میں نے ایک چھوٹی فورڈ ڈیل ڈرائیو کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا طاقتور انجن اسے تاہموار راستوں پر بھی بہت تیزی سے دوڑا سکتا تھا۔ ہمارے کام کے لیے یہ موزوں تھی۔ میں نے سوچا کہ اس میں جتنی دور جا سکے۔

جاؤں گا اور اس کے بعد باقی فاصلہ پیدل بھی طے کیا جاسکتا تھا۔ چابی انکیشن میں لگی ہوئی تھی اور نینک فل تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور زینٹی میرے برابر میں آگئی۔ اس نے اسلے والا بیگ عقبی نشست پر ڈال دیا تھا۔ میں نے رائفل بیروں کے پاس رکھ لی۔ خادم کے اشارے پر گاڑوڑنے گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی باہر نکالی تھی کہ اچانک ایک طرف سے دو تیز رفتار گاڑیاں نمودار ہوئیں اور تیزی سے اسی طرف آنے لگیں۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں نے گاڑی کا رخ ان کے مخالف سمت میں موڑ دیا۔ زینٹی نے بھی خطرہ بھانپ لیا تھا اس نے مرکز دیکھا اور تشویش سے بولی۔

”یہ کون ہیں؟“

”ہائیں۔“ میں نے کہا تھا کہ عقب سے فائرنگ کا شور بلند ہوا۔ اگلی والی گاڑی سے گیٹ پر فائرنگ کی گئی تھی اور یہ کوئی بڑی اور بھاری گن تھی جس کی فائرنگ پاور اور شور بے پناہ تھا۔ یہ گاڑی فائرنگ کے دوران میں رک گئی مگر دوسری اس کے پیچھے سے نکل کر ہمارے پیچھے آنے لگی۔

”بیٹ بیٹ باندھ لو۔“ میں نے کہا اور اپنی سیٹ بیٹ باندھ لی تھی۔ زینٹی نے بھی باندھ لی اور میں نے اسے رائفل اٹھا کر تھمادی۔ ”اے سنبھال کر رکھنا۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے ایکسی لیئر دبا دیا اور تنگ گلیوں میں گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ مگر پیچھے آنے والی گاڑی بہت زیادہ رفتار سے آرہی تھی۔ پانچ منٹ سے پہلے ہم ہائی وے تک پہنچ گئے تھے۔ مگر اس پر آتے ہی بائیں طرف سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور ہماری طرف آنے لگی تو میں نے اسٹیئرنگ دائیں طرف کاٹا۔ مجھے دائیں طرف ہی جانا تھا مگر دشمن پیچھے آ رہا تھا پہلے اس سے چھٹکارا لازمی تھا۔ زینٹی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ میرے قابو میں ہے لیکن پھر بھی میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ ہم ایئر فیلڈ کی طرف نہیں جا رہے تھے۔ ایئر فیلڈ تک جانے کے لیے اوپر سے ہائی وے سے ایک ہل دریاے کنہار پر نکلنا تھا اور اس سے گھوم کر ہم ایئر فیلڈ کی طرف جاتے اس لیے اگر زینٹی سمجھ رہی تھی کہ ہم اسی طرف جا رہے تھے تو وہ سمجھنے کے لیے آزاد گئی۔ مگر یہ دوا سب سے پہلے انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم کرتی ہے۔

دونوں گاڑیاں ہائی وے پر آگے پیچھے آچکی تھیں اور اب تک میں فاصلہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا کیونکہ تنگ گلیوں میں بڑی گاڑی ایک حد سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتی تھی۔ البتہ ہائی وے پر آتے ہی اس کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کی رفتار آزمانے کا موقع ملا تھا اور وہ اب نزدیک آرہی تھی۔ پہلی گاڑی جس نے رنی شاہ کے مکان پر دھاوا بولا تھا اس پر بھاری مشین گن نصب تھی مگر اس گاڑی پر ایسی کوئی گن نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے باوجود اس میں موجود افراد کا مسلح ہونا یقینی تھا۔ میں نے زینٹی سے کہا۔ ”تیار ہو جاؤ۔ سن روف سے نکل کر جواب دینے کے لیے۔“

”کس بات کا؟“ اس نے پوچھا۔

اسی لمحے عقب سے پہلا برسٹ چلا مگر گولیاں گاڑی کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔ گاڑی کی دونوں کھڑکیوں سے دو افراد نمودار ہوئے تھے اور خود کار رائفلوں سے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، میں نے کہا۔ ”اس بات کا، جلدی کرو ورنہ نزدیک آرہے ہیں۔“

زینی نے اٹھ کر سن روف ہٹایا اور سیٹ پر کھڑے ہو کر چھت پر رائل ٹکاتے ہوئے جوابی برسٹ مارا اور عقبی گاڑی کی رفتار فوری کم ہو گئی اور وہ اب دور ہونے لگی تھی میں نے رفتار میں مزید اضافہ کیا اور اب اسپیدومیٹر کی سوئی ایک سو بیس کلومیٹر پر تھی۔ ہائی وے بہت انچھی تھی اور فی الحال سیدھی جا رہی تھی اس لیے رفتار بڑھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر رات کے اس پہر ٹریفک بھی نہیں تھا۔ مگر پل کے پاس آتے ہی مجھے مخالف سمت میں ایک وین سڑک پر آڑی کھڑی نظر آئی۔ اس نے راستہ بند کیا ہوا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ ایک گالی نکلی اور میں نے رفتار کم کرتے ہوئے گاڑی پل کی طرف موڑ دی۔ پل کی حد تک سڑک ٹھیک نہ تھی لیکن جب ہم دوسری طرف اترے تو سڑک نارل ہو گئی تھی۔ دائیں طرف یہ آبادی میں کم ہو رہی تھی اور اس طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بائیں طرف موڑ دی۔ آگے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے؟ زینی کی فائرنگ سے نہ صرف گاڑی پیچھے ہوئی تھی بلکہ اس میں سے جھانکنے والے افراد بھی اندر چلے گئے تھے۔ میں نے زینی سے کہا۔ ”نقشہ نکال کر دیکھو ہمیں کس طرف جانا چاہیے۔“

وہ اندر آئی اور پیچھے سے بیک اٹھا کر نقشہ برآمد کیا۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”اسی سڑک پر چلو۔ ہمیں گھوم کر آنا ہوگا سڑک دریا کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور اسی پر اینٹر فیلڈ ہے۔“

اگرچہ میرا اینٹر فیلڈ کی طرف جانے کا ارادہ نہیں تھا مگر قدرت اسی طرف لے جا رہی تھی اور طیارے میں فرار ہونا پڑتا تب بھی یہ عقب سے آنے والے دشمنوں سے بہتر تھا۔ نصف کلومیٹر بعد سڑک گھوم کر آبادی کے اوپر سے ہوتی ہوئی دوبارہ دریا کے پاس آنے لگی۔ پیچھے آنے والی گاڑی اس لحاظ سے مشکل میں تھی کہ ناہموار سڑک پر اسے قابو کرنا مشکل تھا۔ اس کا وزن زیادہ تھا اور وہ بے قابو ہو کر الٹ سکتی تھی۔ ہماری گاڑی ہلکی تھی اور اس وجہ سے رفتار کے باوجود اس پر کنٹرول آسان تھا۔ پیچھے آنے والی گاڑی تقریباً تین سو میٹر ز دور تھی۔ پہلے برسٹ کے بعد اس کی طرف سے چند ایک برسٹ اور مارے گئے تھے مگر اتنی دوری سے نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھ رہا تھا۔ میں نے بیک میں ہاتھ ڈالا اور اس سے ایک گریینیڈ نکال کر اس کی پن کھینچی اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اسے پیچھے اچھال دیا۔ زینی چونکی۔

”یہ کیا تھا؟“

”دیکھو۔“ میں نے عقبی آئینے میں دیکھا اور ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد گریینیڈ دھماکے سے پھٹا اور سڑک کے وسط میں بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا تھا۔ دشمن کی گاڑی اس سے چند گز کی دوری پر تھی۔ دھماکے سے اسے براہ راست تو اتنا نقصان نہیں ہوا تھا مگر اس کی شاک دیو نے گاڑی کو ہلایا اور ڈرائیور کے حواس اڑا گئے۔ گاڑی لہراتے ہوئے سڑک سے اتری اور پھر بے قابو ہو کر اس نے فلا بازی کھائی اور مزید چند فلا بازیوں کے بعد وہ دریا میں جا گری۔ زینی خوشی سے چلائی۔

”شاندار، گریینیڈ کہاں سے آیا؟“

”رنی شاہ کے کمرے سے ملا تھا۔“ میں نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ دوسری گاڑی پاس آ رہی تھی اور اس کے پیچھے ذرا فاصلے پر ایک گاڑی اور تھی جو یقیناً وہی وین تھی جس نے پل کے بعد راستہ روکا ہوا تھا۔ اب سڑک دریا کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے ایک طرف کھیت تھے اور اب علاقہ کسی میدان کی طرح ہموار

تھا۔ ورنہ یہ سارا علاقہ پہاڑی تھا اور ہموار زمین بہت کم تھی۔ شاید اسی وجہ سے یہاں ایئر فیلڈ بنائی گئی تھی۔ میں نے زینی سے کہا۔ ”اپنے موبائل میں ڈائل پہلا نمبر ملاؤ اور اس پر موجود زمین گل نامی شخص سے بات کرو اس سے کہو کہ ہم ایئر فیلڈ کے پاس ہیں کیا طیارہ آگیا ہے؟“

اس وقت پونے ایک بج رہا تھا۔ زینی نے کال کی اور زمین گل سے بات کرنے لگی۔ اس سے بات کر کے مجھے مطلع کیا۔ ”زمین گل نے لائنس کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ جزیئر لے آیا ہے، مگر طیارہ ابھی نہیں آیا وہ دو بج تک آئے گا۔“

”طیارہ نہیں آیا مگر دشمن پیچھے ہیں۔“ میں نے پھر عقب میں دیکھا۔ ”سوال یہ ہے کہ ہمیں اتنی آسانی سے پرواز کی اجازت دے دیں گے؟“

”اس کا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ طیارے کے ساتھ میرے آدمی بھی آئیں گے اور وہ ان سے منٹ لیں گے۔“

میں چونک گیا۔ ”تمہارے آدمی؟ تم نے پہلے نہیں بتایا۔“
 ”تم نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ سادگی سے بولی
 خیر یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا زینی میرے قابو میں تھی اور میں اس سے کام لے سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم اپنے آدمیوں کو یہی تاثر دو گی کہ میں تمہارے قابو میں ہوں۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ بل کھاتے دریائے کبار کے ایک پہلو کے ساتھ ایئر فیلڈ شروع ہو جاتی تھی۔ اس کے آغاز میں ایک بڑی سی عمارت تھی اور اس کے بعد رن وے تھا۔ عمارت تاریک نظر آرہی تھی۔ جب ہم اس کے پاس پہنچے تو اس پر اسکول کا بورڈ نظر آیا تھا۔ گویا یہاں اب اسکول تھا جب کہ عمارت کی اصل ساخت بتا رہی تھی کہ یہ فوجی مقاصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ ہم اس کے ساتھ سے ہوتے ہوئے رن وے کی طرف آئے اور اس کے آخری حصے میں موجود دوسری عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ وہاں روشنی نظر آرہی تھی۔ رن وے تقریباً پانچ سو گز لمبا تھا۔ جو عام پروں والے چھوٹے طیارے کی پرواز اور اترنے کے لیے کافی تھا۔ ایک پک اپ نما گاڑی کے ساتھ دو افراد کھڑے تھے۔ اس کے پچھلے حصے میں موجود جزیئر چل رہا تھا اور اس کے ہوز پائپ سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ میں نے گاڑی ان کے ساتھ لے جا کر روکی اور نیچے اترتے ہوئے کہا۔

”تم میں سے زمین گل کون ہے؟“
 دونوں میں سے ادھیڑ عمر شخص آگے آیا۔ ”میں زمین گل ہوں اور یہ میرا بیٹا امین گل ہے۔“
 ”دشمن ہمارے پیچھے آ رہے ہیں انہوں نے رنی شاہ کے گھر پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت ہم وہاں سے نکل رہے تھے۔ ہم نے ایک گاڑی تباہ کر دی مگر دو پیچھے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم مسلح ہو۔“

زمین گل نگر مند ہو گیا۔ ”شاہ جی نے ایسا بات تو بتائی نہیں ورنہ اسلحہ لے کر آتے ابھی تو صرف پستول ہے۔“

گویا پستول کوئی چھری چاقو جیسا اسلحہ تھا۔ پتا نہیں وہ کن ہتھیاروں کی صورت میں خود کو مسلح سمجھتے تھے۔

میں نے بیک سے ایم سولہ راکٹیں نکال کر ان کے حوالے کیے اور پوچھا۔ ”انہیں استعمال کر سکتے ہو؟“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”ادھر بچہ ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہے۔“

”تب تیار ہو جاؤ وہ آنے والے ہیں اور ہاں رن وے لائن آن کر دو۔“

وہ اپنی گاڑی میں ایک چھوٹا جزیئر لائے تھے اور اس کی وائرنگ اندر بجلی کی تنصیبات تک پہنچا دی تھیں۔ فی الحال جزیئر سے صرف عمارت کی روشنیاں جلائی گئی تھیں۔ رن وے کی روشنیاں بند تھیں۔ زمین گل اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ادھر تعاقب میں آنے والی دوسری گاڑی نمودار ہوئی اور ادھر رن وے لائن آن ہو گئیں۔ میں نے اور امین گل نے بیک وقت فائر کیے۔ میں نے برسٹ لوڈ رکھا تھا مگر میں نے سنگل موڈ پر فائر کیا اور بہترین نشانہ لگایا تھا کیونکہ گاڑی کی وینڈ اسکرین ٹھہر گئی تھی۔ گاڑی تیزی سے ریورس ہوئی اور اسکول کی عمارت کے عقب میں چلی گئی۔ دین بھی وہاں آگئی تھی اور اس سے نکل کر مسلح افراد پھیل رہے تھے۔ مگر وہ اتنے دور تھے کہ ان کا نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح ہم بھی اتنے دور تھے کہ وہ آسانی سے ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

سوا ایک بج رہا تھا اور زمینی نے طیارہ دو بجے تک منگوا یا تھا مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ ٹھیک دو بجے آتا وہ اس سے پہلے بھی آ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ طیارہ آ بھی جائے تو وہ اسے لینڈ کرنے کی اجازت کہاں دیں گے؟ فضا اور رن وے پر اسے نشانہ بنانا بہت آسان ثابت ہوگا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہلکی سی گنگناہٹ کی آواز آئی اور پھر آواز طیارے کی صورت اختیار کر گئی۔ تاریکی میں اس کی نیچے کی جلتی بجتی سرخ روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ساخت واضح نہیں تھی لیکن آواز سے یہ چھوٹا طیارہ لگ رہا تھا۔ زمینی نے موبائل نکال کر کسی کو کال کی اور اسے بتانے لگی کہ نیچے مسلح افراد ہیں اور کس پوزیشن پر ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسے کال کر رہی تھی کیونکہ اس موبائل کی مدد سے طیارے سے رابطہ تو ممکن نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے کال ختم کی میں نے پوچھا۔

”کسے کال کر رہی تھیں؟“

”نابل میں اپنے آدمی کو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ طیارے کے پائلٹ کو صورت حال سے آگاہ کرے گا۔“

چند لمبے بعد طیارہ جو رن وے کی سیدھ میں آچکا تھا اچانک بلند ہوا اور گھومتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف جانے لگا۔ ایک پھر لگا کر وہ اوپر سے گزرا تو نیچے سے اس پر شیش گن سے فائرنگ کی گئی مگر طیارے کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ رن وے کی روشنیوں کے پاس آیا تو میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔ یہ ایک پروپلر انجن والا چھوٹا طیارہ تھا جس میں چار پانچ افراد کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ کابل میں موجود شخص نے یقیناً پائلٹ سے رابطہ کر کے اسے نیچے موجود خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے نیچے موجود افراد کے خلاف کیسے کارروائی ہوگی؟ مگر جلد مجھے اس کا جواب مل گیا۔ دوسری بار طیارہ گھوم کر اسکول کی عمارت کی سیدھ میں آیا اور دریا کے دوسری طرف سے پرواز کرتا ہوا نزدیکی آنے لگا۔ اچانک اس کے پروں کے نیچے سے شعلے نکلے اور چند لمبے بعد اسکول کے دوسری طرف دھماکوں کے ساتھ شعلے بلند ہوئے تھے۔

طیارے میں راکٹ پوڈ فٹ تھی۔ جواب میں نیچے موجود افراد نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی مگر اپنا کام کر کے طیارہ فوراً اوپر اٹھ گیا تھا اور واپس دوسرے حملے کے لیے جا رہا تھا۔ اب مجھے پتا چلا کہ زمینی اتنی مطمئن

کہ تھی کہ طیارے میں موجود افراد نیچے موجود دشمن کا بندوبست کر لیں گے۔ اسے معلوم تھا کہ طیارہ مسلح ہوگا۔ شعلوں کا مستقل انعکاس بتا رہا تھا کہ کوئی گاڑی نشانہ بنی تھی اور اب جل رہی تھی۔ نصف کلومیٹر دوری کے باوجود ان لوگوں کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں اور ان میں سے کچھ افراد تفری میں اسکول کے دوسری طرف نمودار ہوئے۔ میں نے اور امین گل نے بیک وقت انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ زمین گل کو دشمن سے زیادہ رنی شاہ کی فکر تھی اور وہ بار بار اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا میں نے ٹھک آ کر کہا۔ ”ہمیں کیا پتا، جب ہم نکلے تب دشمن آیا تھا۔ اب اللہ جانے وہاں کیا ہوا ہے؟“

زینی نے آہستہ سے انگریزی میں کہا۔ ”تم نے انہیں اسلحہ دے کر اچھا نہیں کیا۔“

”یہ رنی شاہ کے آدمی ہیں لیکن اس وقت ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس لیے تم فکرت کرو۔“

ہماری طرف سے فائرنگ ہوئی تو ادھر پناہ کے لیے آنے والے مشکل میں پڑ گئے۔ وہ واپس بھاگے تھے مگر ان کے لیے کہیں امان نہیں تھی۔ اسی اثنا میں طیارے سے دوبارہ ہیلنگ ہوئی اور شاید دوسری گاڑی بھی نشانہ بن گئی۔ کیونکہ اس بار دھماکے اور شعلے کہیں زیادہ بلند تھے۔ ہیلنگ کے بعد طیارہ بلند نہیں ہوا بلکہ اس نے مزید نیچے آتے ہوئے مشین گن سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ گاڑیاں تباہ ہونے کے بعد کام آسان ہو گیا تھا مسلح افراد کے پاس اب بچنے کے لیے کوئی آڑ نہیں تھی۔ میں نے زمین گل سے کہا۔ ”ہمیں ان کا ساتھ دینا ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“ زمین گل نے پوچھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے کہا اور گاڑی کا گیر نیوٹرل کر کے اسے آگے دھکیلنے لگا۔ ”تم دونوں میرے

دائیں بائیں سے ان لوگوں کو نشانہ بناؤ گے۔“

وہ میری حکمت عملی سمجھ گئے۔ میں درمیان میں رہ کر گاڑی کو دھکا لگا رہا تھا اور وہ میرے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ خود کار رائلوں کے لیے پانچ سو میٹر زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی مار اس سے زیادہ ہوتی ہے مگر پھر گولی خطرناک نہیں رہتی ہے۔ ساڑھے تین سو چار سو میٹر کا فاصلہ مناسب تھا۔ طیارے کی مشین گن سے بچنے کے لیے دشمن کے نصف درجن آدمی اس طرف آچکے تھے۔ جب ہم ان کے قریب آنے لگے تو ان کو یہاں بھی لالے پڑ گئے۔ چار سو میٹر کی دوری سے ان دونوں باپ بیٹے نے دو افراد کو نشانہ بنایا تو باقی افراد کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ اندھا دھند گولیاں برساتے ہوئے رن وے کے ساتھ کھلے میدان کی طرف بھاگ نکلے تھے مگر بد قسمتی سے وہ غلط وقت پر آڑ سے نکلے تھے۔ طیارہ پھر چکر کاٹ کر اس طرف آ گیا تھا اور اس نے ہنگوڑوں پر مشین گن آزمائی ان میں سے دو اور گرے تھے اور باقی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ اب میدان صاف تھا۔

میں گاڑی میں آ گیا۔ میرے ساتھ زمین گل تھا اور امین گل پیچھے آ گیا۔ ہم نے اسکول کی عمارت کے گرد چکر لگایا۔ دونوں گاڑیاں راکٹوں کا نشانہ بن چکی تھیں۔ پائلٹ ماہر نشانے باز بھی تھا اس نے دونوں بار در سے جگہ پر راکٹ مارے تھے۔ ہم واپس آئے اور زینی کو آل کثیر کا سگنل دیا۔ اس نے پھر اسی شخص کو کال کی اور اس نے پائلٹ کو پیغام بھیجا کہ اب طیارہ لینڈ کر سکتا ہے۔ پائلٹ نے طیارے کو رن وے کی سیدھ میں لا کر نیچے کیا اور بہت آرام سے اتار لیا۔ چند منٹ بعد طیارہ ہمارے پاس آ کر رکھا اور اس میں سے پائلٹ کے ساتھ ایک شخص اتر ا تھا۔ یہ چار نشستوں والا طیارہ تھا۔ اترنے والے دونوں افراد سفید فام تھے۔ انہوں نے زینی اور مجھ سے ہاتھ

ملایا۔ زینی سے ان کا انداز بے تکلفانہ تھا جیسے وہ اسے جانتے ہوں۔ البتہ مجھ سے رکھائی سے ملے تھے۔ میں نے امین گل سے کہا۔ ”جب ہم پرواز کر جائیں تو تم چلے جانا اور اس کا ذکر کسی سے مت کرنا رانی شاہ خود تم سے رابطہ کرے گا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

میں اور زینی طیارے میں آئے پائلٹ نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ ہمارے بیٹھے ہی اس نے سیٹ سنبھالی اور طیارے کا رخ موڑنے لگا۔ میں پائلٹ کے برابر والی نشست پر تھا کیونکہ زینی اور دوسرا آدمی مجھ سے پہلے پچھلی نشست پر آگئے تھے۔ پائلٹ نے ہم سے کہا۔ ”جب تک فلائٹ لیول نہیں ہو جاتی تم لوگوں کو پریشر برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر مٹی ہو تو سیٹ کے سائیڈ میں شاہر موجود ہے۔“

زینی نے جواب دیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

پائلٹ نے سر ہلایا اور تھروٹل آگے کیا تو طیارہ تیزی سے آگے بڑھا اور رن وے پورا ہونے سے پہلے طیارہ فضا میں بلند ہو گیا۔ طیارے کے آلتی میٹر کے مطابق یہاں کی بلندی سولہ سو ساٹھ میٹر تھی اور اس میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ تین ہزار میٹر پر پہنچ کر پائلٹ نے طیارہ سیدھا کر لیا۔ انجن کا شور اور کانوں پر آنے والا پریشر کم ہو گیا تھا مگر پہاں کسی مسافر بردار طیارے جیسا آرام دہ ماحول نہیں تھا کیونکہ طیارے میں کبین پریشر نہیں تھا۔ تین ہزار میٹر کا مطلب تھا کوئی دس ہزار فٹ کی بلندی اور یہاں فضائی دباؤ سطح سمندر سے نصف رہ جاتا ہے۔ انجن کا شور تھا اس لیے مجھے انداز نہیں ہوا کہ زینی اپنے ساتھ بیٹھے سفید فام سے کیا بات کر رہی تھی مگر وہ دونوں آپس میں جو گفتگو تھے۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کے سر خاصے نزدیک آگئے تھے۔ مشرق میں اسے برا سمجھا جاتا ہے مگر مغرب میں یہ عام سی بات ہے۔ انجینی مرد عورت بھی دوران گفتگو ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ جاتے ہیں۔



سفید فاموں کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا کیونکہ اب تک اس معاملے میں کوئی سفید فام نظر نہیں آیا تھا۔ پائلٹ اور دوسرا شخص دونوں غیر فوجی تھے۔ افغانستان میں غیر ملکی افواج کے ساتھ بے شمار عام افراد بھی آئے تھے۔ ان میں اکثریت کٹر یکسرز کی تھی جنہوں نے افغانستان میں مختلف کاموں کے ٹھیکے لیے ہوئے تھے۔ اس لیے بے ظاہران کی موجودگی کوئی خاص تعجب انگیز نہیں تھی۔ طیارہ اڑانے جیسے فی کام زیادہ تر غیر ملکی کر رہے تھے۔ ان کی خدمات کرائے پر حاصل کی جاسکتی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے کھکا ہوا تھا۔ انہوں نے جتنی مہارت سے راکٹ جیسا پیچیدہ ہتھیار استعمال کیا تھا اور منوں میں زمین پر موجود دو گاڑیاں تباہ کر دی تھیں اس سے لگ رہا تھا کہ وہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھے۔ زینی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ دوا کے زیر اثر تھی مگر دوسرا تو ایسا نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ زینی کی باتوں سے بھانپ نہ لے کہ جو بے ظاہر قیدی ہے وہی اصل ماسٹر ہے۔

اسد آباد سے کابل کا فاصلہ سو کلو میٹر بھی نہیں ہے اور طیارے نے مشکل سے نصف گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کر لیا۔ کابل شہر کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ خاصا بڑا شہر ہے اور سنا ہے کہ اس کی آبادی پچاس لاکھ سے

زیادہ ہے۔ یعنی یہ دارالحکومت ہی نہیں افغانستان کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ دریائے کابل کی وادی میں اس کے دونوں اطراف بسا یہ شہر گزشتہ چار عشروں سے جنگ دیکھ رہا ہے۔ بہ ظاہر روس 1979 میں یہاں وارد ہوا تھا۔ مگر کابل کی جنگ اس سے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ ان چار عشروں میں یہاں امن اور سکون کا دور بہت کم گزرا اور اس شہر کے باسیوں نے زیادہ تر توت گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور گولوں کے دھا کے سنتے ہی گزرا ہے۔ طیارے نے پکڑ لگایا اور پائلٹ کنٹرول ٹاور سے ہدایات لے رہا تھا ان ہدایات کی روشنی میں اس نے پکڑ لگایا اور ایک رن وے پر اتر گیا۔ اترنے کے بعد طیارہ رکنا نہیں بلکہ ٹیکسی کرتا ہوا ایک ٹینگر میں داخل ہو گیا۔ یہ ٹینگر چھوٹے طیاروں کے لیے مخصوص تھا۔

میں نے طیارے کے ذریعے یہاں آ کر رسک لیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ انٹرفیلڈ سے فرار ہونے کے بعد بھی وہ لوگ ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ان کا علاقہ تھا اور وہاں سے ہمارا صحیح سلامت نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ کابل میں بھی خطرہ تھا مگر میں پاکستانی سفارت خانے میں پناہ لے سکتا تھا اور سفارت خانے کی مدد سے وہاں جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی نکلنے کے اور راستے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ یہاں بھی پاکستانی مشکوک سمجھے جاتے ہیں اور انہیں فوری طور پر عسکری تنظیموں یا خفیہ اداروں کا آدمی تصور کر لیا جاتا ہے جیسا کہ انڈیا میں ہوتا ہے اور ان کے ساتھ تقریباً وہی سلوک بھی ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں ایسے واقعات بھی سننے میں آئے جب صرف پاکستانی ہونے کے جرم میں یہاں عام افراد کو قتل کر دیا گیا۔ حالانکہ وہ تاجر تھے یا کمپنیوں کی طرف سے بطور لیبر آئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہاں برسرِ اقتدار طبقہ پاکستانیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا ہے۔ سرکاری اہلکار عام طور سے پاکستانیوں کے ساتھ دوستانہ رویہ نہیں رکھتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں انڈیز کو یہاں نہ صرف پسند کیا جاتا ہے بلکہ انہیں افغانستان کی تعمیر نو میں کروڑوں ڈالرز کے ٹھیکے بھی ملے ہیں۔

افغانستان میں پاکستانیوں کی تعداد شاید دس پندرہ ہزار سے زیادہ نہ ہو لیکن پاکستان میں کم سے کم پچاس لاکھ افغانی موجود ہیں اور ان میں سے بیشتر نہ صرف پاکستانی شناختی کارڈ بلکہ پاسپورٹ بھی رکھتے ہیں اور اس پر ساری دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ پنڈی جیسے درمیانے شہر میں بہت سے محلے اور بازار ایسے ہیں جہاں صرف افغانی پائے جاتے ہیں اور کھلے عام رہتے ہیں۔ انہیں کوئی صرف اس بنیاد پر کچھ نہیں کہتا کہ وہ افغانی ہیں۔ حالانکہ وہ پاکستان میں پائی جانے والی بیشتر خرابیوں کے ذمے دار ہیں۔ اسلحہ یہ لوگ لائے، منشیات کا پورا کاروبار ان کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے جرائم میں بھی یہ ملوث ہوتے ہیں۔ پنڈی اور اس کے گرد و نواح میں منظم ڈیکیتیوں میں افغان گروہ ملوث ہیں جو حاصل ہونے والی رقم کو پھر دہشت گردانہ مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر ہونے والی دہشت گردی کے تانے بانے بھی ان ہی لوگوں سے ملتے ہیں۔

ہمارے ہاں دہشت گردی میں ملوث اکثر افراد کا تعلق بھی پڑوسی ملک سے نکلتا ہے۔ اس کے باوجود افغانیوں کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جب کہ افغانستان میں پاکستانیوں کا تاثر شاید انڈیا سے کچھ ہی اچھا ہو۔ آئے دن سرحد کے دوسری طرف سے زبان کے اور عملی گولے برسائے جاتے ہیں۔ ہماری چیک پوسٹوں پر حملہ ہوتا ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں دہشت گردی میں مطلوب افراد افغانستان میں کھلے عام گھومتے ہیں اور اس کے باوجود لعن طعن ہم پر کی جاتی ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی میں استعمال ہونے والا اسلحہ اور بارود

افغانستان سے لایا جاتا ہے۔ پڑوسی ملک ہونے کے باوجود ہمارے یہاں اتنے کونسلٹ نہیں ہیں جتنے کہ انڈیا نے کھول رکھے ہیں اور یہ کونسلٹ ہماری سلامتی کے خلاف دن رات کام کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اکثر افغانی پاکستان کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ پاکستان کے بہت زیادہ حامی بھی نہیں ہیں۔ عام طور سے ان کا رویہ بھی سرد مہری لیے ہوتا ہے۔

آج میں اسی افغانستان کے دارالحکومت میں تھا جو آج بھی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اگرچہ دنیا کی اکلوتی (نی الحال) سپر پاور یہاں مزید تین درجن سے زیادہ ممالک کے ساتھ براجمان تھی۔ مگر حالات اس کے قابو میں نہیں آرہے تھے اور آنے والے دنوں میں مزید ابتری کی پیشگوئی تھی۔ صرف افغانستان ہی نہیں بلکہ اس خطے کے دوسرے ممالک کے لیے بھی حالات کچھ اچھے نہیں ہیں جن میں سرفہرست وطن عزیز ہے۔ مگر یہ وقت سیاست پر غور کرنے کی بجائے ذاتی فکر کرنے کا تھا کہ میں کس طرح جلد از جلد واپس اپنے ملک جاسکتا تھا۔ طیارہ بیگر میں رک گیا تھا اور اس کا انجن بند ہو گیا تھا مگر پر اب تک گھوم رہا تھا۔ میں نے مڑ کر زینی کی طرف دیکھنا چاہا تھا کہ میری گردن میں کوئی چیز جچی اور خواب آور سیال میری گردن میں اتر گیا کیونکہ فوراً ہی میرا دماغ پکڑنے لگا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو انجکشن لگانے والی زینی تھی جو مسکرا رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”تم..... کیسے.....؟“

”ایسے۔“ اس نے انجکشن کا ایک سیٹ میرے سامنے کیا۔ ”یہ اینٹی ڈوٹ ہے اس کا توڑ..... کیا سمجھے؟“ بے ہوش ہونے سے پہلے میں سمجھ گیا تھا کہ زینی نے دوا کے اثر سے کیسے چھٹکارا پایا تھا۔ اس نے خاموشی سے کسی وقت اینٹی ڈوٹ لے لیا تھا جس نے دوا کا اثر ختم کر دیا اور اس کا اعتماد بحال ہو گیا اس کے بعد بھی وہ ل بنی رہی جیسے میرے قابو میں ہو اور جب حالات پوری طرح اس کے قابو میں آ گئے تو اس نے اصلیت پر نے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ طیارہ رکتے ہی اس نے میری گردن میں بے ہوشی کا انجکشن اتار دیا تھا اور آخری رچ جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں خوش فہمی میں مارا گیا۔



مجھے ہوش آیا تو میں ایک سادہ کمرے میں سادہ لیکن آرام دہ بستر پر تھا اور میرے سر کے عین اوپر ایک چلی نئی والا انرجی سیور روشن تھا۔ جاگنے کے بعد بھی کچھ دیر تک میرا ذہن غنودگی کا شکار رہا اور پھر میں چونک کر اٹھ نما۔ کمرے میں آمدورفت کے لیے ایک ہی دروازہ تھا اور ایک طرف روشن دان نما جالی لگی تھی۔ یہ شاید اے سی ڈکٹ تھا۔ میرے جسم پر اب ہلکی سرمئی رنگ ٹی شرٹ اور اسی رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ پاؤں خالی تھے البتہ بیڈ کے نچے میرے جوتے رکھے تھے اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گردن میں جہاں انجکشن لگا تھا وہ جگہ دکھ رہی تھی مگر اس علاوہ میں بالکل فٹ فٹ تھا۔ زینی نے مجھے پھر انجکشن نہیں دیا تھا جو اعتماد ختم کر دیتا ہے کیونکہ میں خود کو نازل دس کر رہا تھا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں تھی اور ایک حد سے زیادہ ان انجکشنوں کا استعمال خطرناک بھی ہو ہے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

میں نہ جانے کہاں تھا کیونکہ آس پاس مکمل سناٹا تھا اور کسی قسم کی معمولی سی آواز بھی نہیں تھی۔ ایک بار پھر سے اندر بھارتیوں کا خوف سرسرا نے لگا کہ کہیں میں ان کے ہاتھ تو نہیں آ گیا تھا۔ اگرچہ زینی نے مجھ سے کہا

تھا کہ مجھے کسی آدمی نے مانگا ہے اس کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بول سکتی تھی اور میں بے بس تھا کہ کسی طرح اس کی بات کی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔ ایک خیال ڈیوڈ شا کا بھی آ رہا تھا مگر کچھ عرصے پہلے ہی وہ پاکستان میں مجھ سے دست بردار ہو کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے اتنی غلط میں اور اتنے گھماؤ پھراؤ کے ساتھ مجھے قہقہے میں کرنے کی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اگر کوئی تک تھی تو اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کم سے کم چھ سات گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا اور اس دوران میں مجھے کابل سے کہیں دور بھی لے جایا جاسکتا تھا۔

مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں کابل یا اس کے آس پاس ہی کہیں تھا۔ موسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے دروازہ چیک کیا یہ پلائی کا بنا ہوا مضبوط دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا اور اس کے اندر نہ تو ہینڈل تھا اور نہ ہی کنڈی تھی۔ میں نے دستک دی اور پھر زور سے بجایا مگر دونوں صورتوں میں کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ اب میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جب دروازہ کھلے اور صورتِ حال سامنے آئے۔ میں واپس بیڈ پر آکر بیٹھ گیا۔ کم بجتوں نے پانی کی ایک بوتل تک نہیں رکھی تھی اور اب مجھے پیاس لگنے لگی تھی۔ میں نے بیڈ کا جائزہ لیا کہ یہ لوہے کا بنا ہوا چھ بائی تین فٹ کا بیڈ تھا جس کے پائے فرش میں پیوست تھے اور اس کے وسط میں ہر چھ انچ کے بعد فولادی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر اسپرنگ میٹریس تھا اور یہ انتظام یقیناً ایک قیدی کے لیے کیا گیا تھا۔ گویا میں کسی ایسی جگہ تھا جہاں قیدی رکھے جاتے ہیں۔

یہ جان کر میری تشویش میں اضافہ ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹا ہو گیا تھا مجھے بیدار ہوئے اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کسی کو متوجہ کروں کہ دروازہ کھلا اور زینی قیامت بنی ہوئی اندر آئی۔ اس نے جسم سے چمکی ہوئی مٹی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جسے جدید قسم کا بلاؤز بھی کہا جاسکتا تھا۔ بازو ندر تھے اور گلہ فراخ دلی کی حدود کو چھو رہا تھا۔ ایک مختصر سی پٹی کے بعد پیٹ شروع ہو گیا تھا جو ناف سے نیچے تک کسی بھی لباس کی گرفت سے آزاد تھا۔ اس نے جوڑی اسکرٹ پہن رکھا تھا اس میں اس کی ٹانگیں نمایاں تھیں۔ اس کا قد مناسب تھا یعنی پانچ پانچ مگر اس نے تین انچ کی ہیل کے ساتھ اس میں مزید اضافہ کر لیا تھا۔ میری توجہ پاکر اس نے خود کو مزید ملاحظے کے لیے پیش کیا۔ میں نے گہری سانس لی اور کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم میرے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیل رہی ہو؟“

”بس اس کھیل کا آخری حصہ شروع ہو گیا ہے۔“ اس نے نارمل انداز میں کھڑے ہوئے کہا۔ ”تم تیار

ہو؟“

”کس کام کے لیے؟“

”ناشتے کے لیے۔“

”کیوں نہیں۔“ میں کھڑا ہوا تو وہ ذرا محتاط ہو گئی اور دروازے کے پاس ہو گئی۔ میں مسکرایا۔

”ڈر رہی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”حالانکہ میں عورتوں کا بہت احترام کرتا ہوں۔“

”مجھ جیسی عورتوں کا نہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں اس وقت انجکشن میسر نہ ہوتا تو تم میری گردن توڑنے میں دیر نہیں لگاتے۔“

وہ مجھے باہر لائی۔ یہ چھوٹی سی عمارت تھی اور یہاں کم سے کم چھ مسلح افراد تھے۔ مجھے واش روم جانے کا موقع ملا اور پھر ریڈی میڈ ناشتا نصیب ہوا۔ زینی نے صرف سیاہ چائے لی تھی۔ اس نے بہت نفاس سے میک اپ کیا ہوا تھا اور اس کی تیاری بتا رہی تھی کہ ہمیں کہیں جانا ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا ہینڈ بیگ تھا مگر اس کی جسامت سے قطع نظر مجھے یقین تھا کہ اس میں کوئی ہتھیار لازمی ہوگا۔ کمرے سے باہر آتے ہی دو افراد مجھ پر مسلط کر دیئے گئے تھے اور اس وقت میرے پاس تھے۔ یہ چہرے مہرے سے افغانی ہی لگ رہے تھے۔ زینی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں قبل از وقت انجکشن کے اثر سے کیسے نکلا اسی طرح میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ قوت ارادی ختم ہونے کے بعد بھی اس نے انٹنی ڈوٹ کیسے لیا۔ ہم عام افراد نہیں تھے۔ میں ناشتے کے دوران میں محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کسی چیز میں کوئی الگ سے ذائقہ آ رہا ہے مگر میں ناکام رہا اور ناشتے کے بعد بھی ٹھیک رہا۔ زینی سکون سے انتظار کر رہی تھی جیسے ہی میں نے ہاتھ روکا اس نے کہا۔

”چلو۔“

”کیا تم بذات خود مجھے ہینڈ اور کروگی۔“

اس نے میری طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”کاش کہ میں تمہیں اپنے پاس رکھ سکتی۔“

”میں کسی کے پاس رہنے والا شخص نہیں ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جلد یہ بات تم اور وہ شخص جان جائے گا جس نے مجھے بلوایا ہے۔“

”میری ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔“ زینی نے شانے اچکائے۔ ”میں چاہتی ہوں اب تم نائل رہو لیکن اگر تم نے مزاحمت کی تو مجبوراً تمہیں بے بس کرنا پڑے گا۔“

”میں تعاون کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو۔“

”کس بات کا اور کیا تم میرے جواب پر یقین کرو گے؟“

”ہاں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کیا تم مجھے بھارتی حکومت یا اس کی کسی ایجنسی کے حوالے کرنے جا رہی ہو؟“

”نہیں اس شخص کا بھارتی حکومت یا اس کی کسی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”وہ بھارتی ہے؟“

”نہیں وہ بھارتی بھی نہیں ہے۔“

میں اس کے لہجے اور الفاظ پر غور کر رہا تھا اور مجھے لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے

تمہاری بات پر یقین ہے۔“

”تب چلو۔“

ہم عمارت سے باہر آئے یہ ایک وسیع احاطے میں بنی ہوئی چھوٹی سی جھونپڑی تھی اور خاص بات یہ تھی کہ وہاں سارے غیر ملکی نظر آ رہے تھے۔ یہ شاید کابل میں غیر ملکیوں کے لیے مخصوص کمپاؤنڈ تھا جہاں وہ محفوظ زندگی

گزار رہے تھے۔ یہ عام سولین لوگ تھے جو زیادہ تر مغربی اور مشرق بعید کے ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک بڑی لکڑی وین کے پچھلے حصے میں مجھے اس طرح بٹھایا گیا کہ میری دائیں بائیں دو افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص بھی مسلح تھا۔ زینی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے ایک شال نما چادر لے لی تھی۔ کابل کی گرد آلود سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم آدھے گھنٹے بعد کابل ایئر پورٹ پہنچے جہاں گاڑی براہ راست ایک پرائیویٹ جیٹ ہینگر تک پہنچی۔ یہاں ایک چھوٹا جیٹ طیارہ منتظر تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔

”یہ میرے لیے ہے؟“

”بالکل خاص طور سے تمہارے لیے۔“

”ہمیں کہاں جانا ہے۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے کہا اور گاڑی سے اتر گئی۔ میں بھی نیچے آیا میرے نگران پہلے ہی اتر گئے تھے۔ ان کے ساتھ میں طیارے کی سیڑھیوں تک آیا اور دروازے پر موجود شخص کو دیکھ کر چونکا۔ وہ ڈیوڈ شا کا خاص آدمی کرنل جیمز بیکسٹر تھا۔ وہ سوٹ میں تھا اور اس نے سر پر فلیٹ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ تو بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ مجھے ڈیوڈ شانے بلوایا تھا اور وہی میرے لیے اس طرح کے انتظامات کر سکتا تھا۔ میں طیارے میں داخل ہوا۔ میرا خیال تھا کہ زینی وہیں رہ جائے گی مگر وہ بھی طیارے میں آ گئی۔ ہم کل تین مسافر تھے اور ایک ایئر ہوش سمیت عملے کے کل تین افراد تھے۔ دروازہ بند ہوتے اور ہمارے نشستوں پر بیٹھتے ہی طیارے کے انجن اشارت ہوئے اور اس نے ہینگر سے نکل کر رن وے پر ٹیکسی شروع کر دی۔ میں اور کرنل آسنے سانسے بیٹھے تھے اور زینی ذرا آگے صوفہ نما نشست پر تھی۔ طیارے میں آتے ہی وہ مجھ سے بے نیاز ہو گئی تھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ یہ پوز بھی خاصا سنسنی خیز تھا مگر فی الحال میری توجہ کرنل پر تھی جو طیارے کی پرواز سے پہلے سگار نوشی میں مصروف تھا۔ جیسے ہی طیارے نے پرواز شروع کی اور بلندی پر آیا سیٹ بیلٹ سائن بجا اور اس نے سگار جلا لیا۔

”تو ڈیوڈ شا کو پھر میری یاد آ گئی؟“

کرنل نے سر ہلایا۔ ”وہ تمہیں کبھی بھولا نہیں۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بائی دی وے ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”انڈیا۔“ کرنل نے کہا۔

”ڈیوڈ شا وہیں ہے؟“

”ظاہر ہے۔“

معاملات اس طرف جا رہے تھے جہاں میں لے جانا نہیں چاہتا تھا یعنی اس پراسرار وادی تک۔ مگر میں بے بس تھا۔ میں طیارے میں تھا اور اس کا رخ انڈیا کی طرف تھا۔ میں نے سیٹ بیلٹ کھولنا چاہی تب بتا چلا کہ وہ نہیں کھل رہی تھی۔ کرنل مسکرایا اور بولا۔ ”صرف دو گھنٹے کا سفر ہے پھر تم آزاد ہو گے۔“

زینی نے ایک توجہ جنک انکوائری لی اور بولی۔ ”اب تم اور ہم آرام سے سفر کر سکیں گے۔“

اگلے دو گھنٹے تک میں اسی طرح بندھا بیٹھا رہا۔ طیارہ اتنی بلندی پر تھا کہ نیچے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر جب

برف پوش پہاڑ نظر آنا شروع ہوئے تو میں چونکا تھا۔ ہم ہمالیہ کے آس پاس تھے۔ پریش کیمن اور پرسکون ہموار پرواز کی وجہ سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ طیارہ کس رفتار سے اڑ رہا ہے لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ کم سے کم آواز کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا اور اتنی رفتار سے وہ دو گھنٹے میں بھارت کے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا تھا۔ پھر طیارے کی بلندی کم ہونے لگی اور ذرا دیر بعد وہ ایک عام سی ایئر فیلڈ پر اتر رہا تھا۔ یہ کوئی پبلک ایئر پورٹ نہیں تھا بلکہ شاید نجی یا کلب ایئر پورٹ تھا۔ طیارہ اتر اور رک گیا۔ ایک کار طیارے کی طرف آئی اس دوران میں ایئر ہوسٹس نے دروازہ کھول دیا اور میری سیٹ بیلٹ بھی خود بخود کھل گئی۔ میں، زینی اور کرل نیچے اترے۔ کار کے ساتھ دو افراد تھے اور یہ مقامی تھے۔ انہوں نے دروازے کھولے اور ہم تینوں عقبی نشست پر آگئے۔ زینی مجھ سے لگ کر بیٹھی تھی اور اس نے میرے کان میں کہا۔ ”ہم بس پہنچنے والے ہیں۔“

”اطلاع کا شکریہ۔“

یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا کار ایئر کلب سے نکل کر بل کھاتی سڑکوں پر سفر کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ایک پہاڑی مینشن میں تھے اور کار رکتے ہی میں نے لان میں دھوپ اور ڈرنک سے لطف اندوز ہوتے ڈیوڈ شا کو دیکھ لیا۔ ہم کار سے اتر کر براہ راست اس کی طرف آئے تھے۔ زینی سب سے آگے تھی اور مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی جب وہ لپک کر ڈیوڈ شا کے گلے لگ گئی۔ مگر اس کے کبے الفاظ پر میں اچھل پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ”پاپا میں شہباز کو لے آئی ہوں۔“



میں دم بخود تھا کیونکہ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ڈیوڈ شا اور زینی میں کوئی رشتہ ہوگا اسے ڈیوڈ شا کے گلے لگتے دیکھ کر میں غلط فہمی کا شکار ہوا تھا کہ شاید زینی اور ڈیوڈ شا میں کوئی اور رشتہ ہے مگر زینی کے الفاظ نے میری غلط فہمی دور کر دی تھی۔ مگر زینی کی گرم جوشی اور پاپا کے لفظ پر بھی ڈیوڈ شا کے سپاٹ چہرے پر جذبات یا گرم جوشی کی ہلکی سی رتق بھی نہیں آئی تھی۔ اس نے صرف سر ہلایا اور بولا۔ ”ویل ڈن۔“

غالباً زینی کو اس سے اتنے سرد رویے کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ خفیف ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں اپنی جگہ بے پروائی سے ساکت اور خاموش کھڑا رہا اور آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ اگرچہ ڈیوڈ شا کو دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی تھی مگر میں نے اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھا۔ پیلس پرانے طرز تعمیر کا مگر بہت عالی شان تھا۔ اس میں بیک وقت تہتی اور مغلی طرز تعمیر جھلک رہا تھا۔ سرخ اینٹوں یا پتھروں سے اس کی دو منزلہ مرکزی عمارت میں یقیناً بہت سے کمرے ہوں گے اور وہ احاطے کی سب سے بلند سطح پر ایستادہ تھا۔ اس کے عقب میں بلند ہوتے پہاڑ اور ان پر بے حد گھنے جنگلات تھے۔ زمین کی ساخت کے لحاظ سے اوپر نیچے ہوتی چار دیواری تھی جس پر لوہے کی حفاظتی جالی کے ساتھ ساتھ ہر بیس فٹ کے بعد پول لائٹس نصب تھیں۔ یہ خاص متعدد سطحوں والا پہاڑی پیلس تھا۔ اس میں مرکزی پیلس کے علاوہ بھی کوئی نصف درجن عمارات تھیں۔ لان کے آس پاس صرف دو مقامی افراد تھے جو خدام کی وردی میں تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ یہاں کا حفاظتی نظام سخت ہوگا۔ ڈیوڈ شا کسی معمولی سیوری والی جگہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈیوڈ شا نے کہا۔

”بیٹھو شہباز، تمہیں ٹھیک دیکھ کر خوشی ہوئی۔“

”میں پہلے بھی ٹھیک تھا۔“ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے بیٹھنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ ”مبارک ہو تم پھر کامیاب رہے۔ ویسے مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا جب آگھ کی پتلی سے میری شناخت کی گئی تھی۔ یہ کام ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔“

”تم جانتے ہو مجھے زبردستی پسند نہیں ہے لیکن حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ مجھے تم کو بلوانا پڑا۔“

”اتنے لمبے پلان کے ساتھ؟“ میں نے کسی قدر چبھتے لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے خاصا پہلے زینی کو بھیج دیا

تھا۔“

”ہاں لیکن تمہیں لانے کا مشن چند دن پہلے دیا تھا۔“

”او کے میں مان لیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”حالانکہ سابق ملاقات کو زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔“
 ”میں نے کہا نا حالات کچھ بدلے ہیں۔“ ڈیوڈ شانے اپنا گلاس اٹھالیا اور میز پر وہی ایک گلاس تھا اس کے علاوہ صرف ایک چوکور بوتل تھی جس میں سبزی مائل شراب تھی۔ یہ اس کی محفل تھی اور میں ایک قیدی تھا۔ زینی اور کرنل ذرافا صلے پر کھڑے تھے۔ ڈیوڈ شانے ان کی طرف دیکھا۔ ”تم دونوں تھک گئے ہو میرا خیال ہے آرام کرو۔“

وہ خاموشی سے وہاں سے چلے گئے۔ میں نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ ”اگرچہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ تم لاؤ لڈ نہیں ہو۔“

اس نے چسکی لے کر سر ہلایا۔ ”زونیا کے بارے میں مجھے دیر سے علم ہوا۔“

میں چونکا۔ ”اس کی ماں تمہاری بیوی نہیں تھی؟“

”نہیں جار گیا میں قیام کے دوران میں میرے اس عورت سے تعلقات رہے تھے اور یہ بس چند دن کی بات تھی۔ پھر میں وہاں سے نکل گیا۔ یہ سودیت یونین کے آخری دنوں کی بات ہے۔“

”یقیناً تم اس کی آخری رسومات کو یقینی بنانے کے لیے وہاں موجود ہو گے؟“

اس نے میرا سوال نماتمبرہ نظر انداز کیا اور بولا۔ ”اس کے بعد میں پلٹ کر وہاں نہیں گیا۔ اب وہ عورت بھی زندہ نہیں ہے۔“

”تب تمہیں زینی کا علم کیسے ہوا؟“

”اس نے خود مجھے تلاش کیا۔“ ڈیوڈ شانے بے نیازی سے کہا۔

”اس نے مجھے اپنے بارے میں جو بتایا ہے اگر وہ سچ ہے تو اس نے خاصی مشکل زندگی گزاری ہے۔ اسے لوگوں کے ہاتھوں خاصے ناگفتہ بہ حالات سے گزرنا پڑا ہے اور ایسا کرنے والوں میں سے اب کوئی اس دنیا میں نہیں ہے۔“ ڈیوڈ شانے سرسری سے انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اب اس موضوع سے جان چھڑانا چاہ رہا ہو مگر میں جان بوجھ کر زینی پر بات کر رہا تھا۔

”جب اسے پتا چلا کہ اس کا باپ دنیا کی کتنی بڑی شخصیت ہے، بے شک وہ اس کا ناجائز باپ ہے اور تب وہ بہت متاثر ہوئی ہوگی۔“

”میں نے کبھی اس کے تاثرات جاننے کی کوشش نہیں کی۔“ ڈیوڈ شا کے لہجے میں کسی قدر جھنجھلاہٹ گئی۔ میں نے مصنوعی بے یقینی سے کہا۔

”ٹھیک ہے تم انگریز رشتوں کے معاملے میں جذباتی نہیں ہوتے ہو لیکن ایسی بھی کیا بے نیازی اپنی لوتی بیٹی سے.....“

ڈیوڈ شا کا چہرہ سرخ ہوا تھا اور اس نے دوسرا گلاس بھی ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ ”وہ صرف خونی ظ سے میری بیٹی ہے لیکن میں نے اسے نہ تو قانونی لحاظ سے اپنایا ہے اور نہ ہی وہ میری وارث ہے۔“

”یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔“

”کیسی زیادتی؟“

”اسے دنیا میں لانے کے ذمے دار تم ہو اس لیے تم کس طرح اس کی قانونی حیثیت اور وراثت سے انکار کر سکتے ہو؟“

اس بار اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ”میں نے تمہیں اپنے خاندانی معاملات پر بات کرنے کے لیے نہیں بلایا ہے اس لیے.....“

”میں دعوت نامے پر نہیں آیا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”تم مجھے جبراً بلوا سکتے ہو لیکن کیا مجھ سے جبراً اپنے اچھنڈے پر بات کر سکتے ہو۔“

”اگر تم اس وقت بات نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے۔“ وہ زبردستی نارل ہوتے ہوئے بولا۔ ”مگر مجھے یوں زچ کرنے کی کوشش مت کرو۔“

میں ہنسا۔ ”ڈیوڈ شامیں جانتا ہوں تم اس مزاج کے آدمی نہیں ہو مگر میں عادت سے مجبور ہوں۔ خیر تم اپنی بات کر سکتے ہو میں سن رہا ہوں۔“

”ہم اس وقت بھارتی ریاست اردو ناچل پردیش کے ایک علاقے میں ہیں۔ یہ علاقہ انڈیا بننے سے پہلے ایک ریاست کا حصہ تھا اور یہ پبلک اس ریاست کے راجا کا تھا۔ ہمالیائی وادی یہاں سے صرف ڈھائی سو کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔“ ڈیوڈ شام نے کہا۔ ”تم اندازہ کر سکتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلوایا ہے؟“

جولائی کے آغاز میں یہاں موسم نہایت شاندار تھا۔ شاید ایک دو دن پہلے کھل کر بارش ہوئی تھی اور اس کی خنکی اور تازگی زمین اور پودوں میں ساگمگی تھی۔ یہاں بلندی کم سے کم سات ہزار فٹ ضرور تھی اس لیے دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ ڈیوڈ شام صرف برمودا شارٹ اور شرٹ میں تھا۔ میں نے تو اسلام آباد میں مئی جون میں گوروں کو سن باتھ لیتے دیکھا تھا جب مقامی دھوپ سے بچتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں تو موسم خوشگوار تھا۔ ”ہاں مجھے معلوم ہے تمہارے ذہن میں وہی خناس سما یا ہوا ہے جو راجا عمر دراز کے ذہن میں ہے۔“

”راجا عمر دراز۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔“

”اگر تم جانتے ہو تب بھی یہ میرا اور راجا عمر دراز کا معاملہ ہے۔“ اس بار میں سپاٹ ہو گیا۔ ”بائی دی وے کیا تم نے مہم کی تیاری مکمل کر لی ہے؟“

”تقریباً۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”تمہارے علاوہ کچھ افراد کا اور انتظار ہے وہ آجائیں تو پھر ہم روانہ ہو سکیں گے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے میں اس مہم کے لیے راضی ہوں؟“

”تم ہو جاؤ گے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جب تم حالات سے پوری طرح باخبر ہو گے۔“

”جب میں راجا کے محل سے روانہ ہوا تو تمہارے آدمیوں کو اس کا علم کیسے ہوا؟“

”میں نے کہا نا کچھ صبر کرو اور فی الحال آرام کرو۔ جلد سب تمہارے سامنے آ جائے گا۔“ اس نے کہا۔

”یہاں ایک شخصیت تمہاری منتظر ہے۔“

”کون؟“

”جلد تم اس سے ملو گے۔ تم نے اسے چھوڑ دیا تھا مگر میں نے بلوایا ہے۔“

ڈیوڈ شانے مجھے تحس میں ڈال دیا تھا کہ ایسی کون سی شخصیت تھی جسے میں نے چھوڑ دیا تھا اور ڈیوڈ شانے اسے بلوایا تھا۔ ”میرے ساتھیوں میں سے.....؟“

”پاکستان سے کوئی نہیں آیا ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”اس معاملے میں تم بے فکر ہو۔“
 ”تم نے کہا کہ تم مجھے زبردستی نہیں لے جانا چاہتے تھے مگر حالات اچانک بدل گئے ہیں یعنی اب تم مجھے زبردستی لے جا رہے ہو؟“

”تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔ مگر تم چاہو تو اس کام کے بدلے مجھ سے کچھ بھی طلب کر سکتے ہو جو میرے بس میں ہو۔ اپنے دشمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے سے لے کر سات فلگرز والی رقم میں معاوضہ لے سکتے ہو۔ ڈالر، پاؤنڈ یا یورو میں۔“

”تم جانتے ہو میں دشمنوں سے خود نمٹتا آیا ہوں اور جہاں تک دولت کی بات ہے تو میں نے اس کی پروا بھی نہیں کی۔“

”تب تم سمجھ لینا تم اس ہستی کے لیے یہ کام کرو گے جسے میں نے یہاں بلوایا ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے ہاتھ بلند کیا تو دور کھڑے خادموں میں سے ایک ہماری طرف آیا۔ ”اس کے ساتھ چلے جاؤ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم کہاں ہو اور تمہارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ اس جگہ سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔“

”اتنی سمجھ رکھتا ہوں۔“ میں نے بد مزگی سے کہا اور خادم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میری زندگی ایک دائرے میں گھوم رہی تھی۔ حالات مجھے بار بار ان ہی منزلوں پر لے آتے تھے جہاں سے میں پہلے بھی کئی بار گزر چکا تھا اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے بھی انڈین سرزمین پر تھا۔ آخری بار جب میں نے سرحد عبور کی تھی تو سوچ لیا تھا کہ اب اس زمین پر قدم نہیں رکھوں گا مگر میں ایک بار پھر بے بس ثابت ہوا تھا۔ جب میں نے راجا عمر دراز سے ملاقات کا ارادہ کیا تو اس کے بعد واقعات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے اور میں تبدیلیوں سے گزرتا ہوا بالآخر ڈیوڈ شا کے قبضے میں آ گیا تھا۔ میرے لیے یہی انکشاف کم نہیں تھا کہ زوینا عرف زینی ڈیوڈ شا کی دختر بد اختر تھی اور مزید یہاں کوئی میری جانی پہچانی ہستی موجود تھی۔ ڈیوڈ شانے جس طرح سے بلوانے کا لفظ استعمال کیا تھا اس سے لگ رہا تھا میری طرح اسے بھی جبر لایا گیا تھا۔

احاطے میں مرکزی پیلس کے ساتھ کئی اور عمارتیں بھی تھیں۔ یہ خادم مجھے ایسی ہی ایک عمارت میں لے آیا۔ یہ شاید مہمانوں کے لیے مخصوص تھی۔ خادم مجھے ایک کمرے تک لایا اور ادب سے بولا۔ ”آپ یہاں قیام کریں گے۔“

کمرہ انتہائی حد تک عالی شان فرنیچر اور سامان سے آراستہ تھا۔ جہازی سائز آرام دہ بیڈ کے ساتھ وہاں چھوٹا صوفہ سیٹ اور چھوٹی ڈائننگ ٹیبل بھی تھی۔ ساتھ ہی انچ ہاتھ تھا۔ ناشتا کب کا ہضم ہو گیا تھا مگر میں نے لچ سے پہلے شاور لینے کا فیصلہ کیا۔ میرے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے ایک پہلے دن سے پہنا ہوا تھا۔ میں نے خادم سے لباس کا کہا تو اس نے وارڈ روم کھول کر دکھائی تو اس میں میرے ٹاپ کے کئی سوٹ اور دوسرے لباس تھے۔ میں نے ایک ٹراؤزر اور شرٹ لی اور واش روم میں آیا۔ میں شاور کے ارادے سے اندر آیا تھا مگر جہازی سائز بیڈ دیکھ کر میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے اس میں پانی بھرا۔ یوڈی کلون اور لیکوید واش ڈال کر جھاگ بنایا

اور ب میں گھس گیا۔ یہ پُر عیش ہاتھ تھا۔ شاید میں کچھ دیر سکون سے سوچتا چاہتا تھا۔ اس لیے ب کا انتخاب کیا۔ اوپر سے پُر سکون ہونے کے باوجود میں اندر سے نہیں تھا۔ نیم گرم خوشبودار پانی نے مجھے پُر سکون کرتا شروع کیا اور میں نے غور کیا تو مجھے اب تک پیش آنے والے حالات میں کئی قابل وضاحت قسم نظر آئے تھے۔

اول راجا عمر دراز کے محل میں میرے ساتھ جو ہوا اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آئی۔ سیکرٹری بیک نے میرے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا اور اس کے بعد اس نے معذرت بھی کی۔ پھر زینی اینڈ کمپنی جو پہلے شیر خان اینڈ کمپنی تھی عین موقع پر نمودار ہوئی اور مجھے اٹھا کر یہاں انڈیا تک لے آئی۔ آخر ان لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ میں راجا عمر دراز کے محل سے روانہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی ایک توجیہ ہو سکتی تھی کہ جیسے فتح خان کو علم ہوا تھا کہ میں کہاں تھا اسی طرح شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو بھی علم ہو سکتا تھا مگر نہ جانے کیوں یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی۔ میں سوچ میں گم تھا کہ واش روم کا دروازہ کھلا اور میں سمجھا کہ خادم ہوگا مگر وہ زینی تھی۔ اگرچہ میں پوری طرح جھاگ اور پانی میں چھپا ہوا تھا مگر اسے دیکھ کر کچھ بوکھلایا اور پھر اسے ہنسنے دیکھ کر خفگی سے کہا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟ ٹھیک ہے میں تمہارے باپ کا قیدی ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میرے واش روم میں گھس آؤ۔“

”میں تو سوچ رہی ہوں کہ ب میں آ جاؤں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ وہ اسی لباس میں تھی۔ جس میں یہاں آئی تھی۔ ”کیا خیال ہے مل کر نہاتے ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ وہ ایسی ہی عورت تھی کہ اپنے الفاظ کو عملی جامع بھی پہننا سکتی تھی۔ ”یہاں سے جاؤ۔“

”کیا تم جج ایسا چاہتے ہو۔“ اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ ”کیونکہ میں ایسی تفریح کا قائل نہیں ہوں۔ پلیز کوناؤ۔“

بادل نا خواستہ وہ باہر نکلی تھی اور میں نے اٹھ کر سب سے پہلے دروازہ اندر سے لاک کیا اس کے بعد شاہور لے کر غسل مکمل کیا اور جسم خشک کر کے، کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی اپنے اسارٹ فون پر کچھ دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے موبائل واپس رکھ دیا۔ اس وقت وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اب تم جان گئے ہو کہ میں کس کے لیے کام کر رہی ہوں؟“

”مجھے شبہ تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈیوڈ شاتہمارا باپ ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ نظر آئی۔ ”نام نہاد..... جس وقت میری ماں ہڈیوں کی ٹی بی کی وجہ سے مر رہی تھی تو میں صرف بارہ سال کی تھی۔ اس نے میرے سامنے دم توڑا اور اس کے بعد میں تین سال در بدر رہی۔ تیرہ سال کی عمر میں، بیس عورت بن چکی تھی۔“

”تم اس کا ذمہ دار ڈیوڈ شاتہمارا سمجھتی ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے یوں انکار کیا کہ اس میں اقرار چھپا ہوا تھا۔

میں نے طنزاً کہا۔ ”بائی دی وے مغرب میں اتنی فیصد لڑکیاں اسی عمر میں عورت بن جاتی ہیں اور یہ وہاں

کارواج ہے۔ ویسے ڈیوڈ شا کا کہنا ہے کہ یہ تعلق صرف چند دن کا تھا اور اس کے بعد وہ جار جیا نہیں گیا اور نہ ہی اسے تمہاری ماں کے بارے میں علم تھا۔“

”سوال یہ ہے کہ پاپا کو تمہیں وضاحت دینے کی کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورت تو نہیں ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن وہ مجھے کئی بار ایسی وضاحتیں دے چکا ہے جس سے لگتا

ہے کہ وہ میرے سامنے اپنا تاثر بہتر کرنا چاہتا ہے۔“

”آخر وہ تمہارے لیے اتنا بے تاب کیوں ہے؟“

”کیا تم نہیں جانتی ہو؟“ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پاپا نے صرف یہ بتایا ہے کہ تم ان کے لیے ناگزیر ہو۔“

”یہ ایک احمقانہ خیال ہے جس کی توقع میں ڈیوڈ شا جیسے شخص سے نہیں کر سکتا۔“

”کیسا احمقانہ خیال؟“ وہ صوفے پر ذرا سرک کر میرے سامنے جھکی اور اس کی بلاؤز نمائش کا گلا کچھ

زیادہ ہی وسعت اختیار کر گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا باپ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس نے وادی کا سن کر سر ہلایا۔

”پاپا نے اس کے بارے میں بتایا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہاں داخلہ تمہاری وجہ سے ہوگا۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔“

”لیکن اب مجھے یقین ہے کہ پاپا ایسا ہی سمجھتے ہیں۔“

میں فی الحال وادی پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے موضوع بدل دیا۔ ”تم ڈیوڈ شا سے محبت کرتی ہو؟“

”ہاں کیونکہ وہ میرا باپ ہے۔“

”لیکن میرا نہیں خیال کہ اس نے تمہیں بیٹی کے طور پر قبول کیا ہے۔“

”ابھی نہیں کیا ہے لیکن جلد کر لے گا۔“ زینی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے

آخر میں ہوں اس کا خون، وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔“

مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ڈیوڈ شا اسے بیٹی کی حیثیت سے قبول کرتا ہے یا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا

کہ وہ کون ہے جس کے بارے میں ڈیوڈ شا نے کہا تھا اور وہ یہیں موجود ہے۔ اسی لمحے باہر سے کسی نے زور سے

کہا۔ ”ہٹ جا آگے سے.....“

”ابھی تم اندر نہیں جا سکتی ہو۔“ خادم کی آواز آئی۔

”ہمیں شہباز سے ملنا ہے وہ یہاں ہے ہم نے خود اسے آتے دیکھا ہے۔“

زینی نے سوایہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا کیونکہ آواز اوشا کی تھی۔ خادم

اسے روک رہا تھا اور وہ غصے میں آ جاتی تو اسے کاٹ سکتی تھی اور اس کا گانا ہوا مشکل سے چلتا۔ اس لیے میں تیزی

سے دروازے تک آیا اور بروقت آیا کیونکہ اوشا اس کے پاس آگئی تھی۔ خادم نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ آگے

کیا تھا اور اوشا کے سفید جکیلے دانت جھلکنے لگے تھے۔ میں نے کہا۔ ”اسے آنے دو..... راستے سے ہٹ جاؤ۔“

خادم نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ادب سے بولا۔ ”میں اندر ہیں کوئی اور اندر نہیں جا سکتا۔“

”یہ میم کانہیں میرا کمر ہے۔“ میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”اسے اندر آنے دو، یہ میری ساتھی ہے۔“ اوشا مجھے دیکھ کر کھل اٹھی تھی جیسے ہی خادم نے ہاتھ ہٹایا وہ اڑ کر میری طرف آئی اور یوں لپٹی کہ ایک لمحے کو میں بھی بوکھلا گیا تھا۔ وہ شروع سے بے باک اور کسی کی پروا نہ کرنے والی تھی۔ میں نے تو اسے اس حال میں بھی دیکھا تھا جب اس کے کمان کی طرح کسے بدن پر ہمہ وقت صرف ایک منی ساڑھی ہوتی تھی جس کے نیچے بلاؤز بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت اس نے ڈھنگ سے مکمل ساڑھی مع بلاؤز پہنی ہوئی تھی مگر اس کی فطرت تو تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی شاخ سی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور چہرہ میرے چہرے کے سامنے لا کر بولی۔ ”ٹوکیا ہے رے؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے کسمسا کر کہا۔ ”ذرا دور رہ کر بات نہیں کر سکتیں۔“

وہ شوخی سے ہنسی۔ ”اب دور نہیں جاؤں گی رے تجھ سے ایسے ہی لپٹی رہوں گی۔“

”خدا کے لیے میرا تماشا بناؤ گی اور میں دور نہیں بھیج سکتا میں تو خود یہاں قیدی ہوں۔“

”ٹو قیدی نہیں ہو سکتا۔“ وہ الگ ہوئے بغیر بولی مگر اس نے دباؤ ختم کر دیا تھا۔ خادم غور سے سن رہا تھا

اور کن آنکھوں سے دیکھ رہا تھا میں نے مناسب سمجھا کہ اسے اندر ہی لے جاؤں۔ مگر اندر زینتی موجود تھی۔ اوشا اسے دیکھ کر چوکی اور کسی قدر بد لے لہجے میں بولی۔ ”یہ کون ہے؟“

زینتی نے میری طرف دیکھا۔ ”اسے بتاؤ میں کون ہوں۔“

”فی الحال میں اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”پلیز کیا تم

ہمیں اکیلے چھوڑ دو گی؟“

زینتی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے غصہ آیا تھا مگر فوراً ہی وہ مسکرانے لگی۔ ”کیوں نہیں۔“

وہ دروازے کی طرف بڑھی اور جان بوجھ کر خود کو مجھ سے مس کرتی گئی تھی۔ اوشا دیکھ رہی تھی اور اس کے

چہرے پر طیش دکھائی دیا تھا اس نے زینتی کے جانے کے بعد اسے ایک کلاسیکل گالی دی۔ ”یہ حرام جادی کون ہے؟“

”ڈیوڈ شاکی بیٹی۔“ میں نے کہا۔ ”وہی جس نے تمہیں رانا دیاس کے محل سے اٹھوایا ہے۔“

”مجھے کسی نے نہیں اٹھوایا۔“ اس نے تردید کی۔ ”ایک آدمی نے تجھ سے ملوانے کا بولا ہم اس کے ساتھ

چلے آئے۔“

”ایسے ہی چلی آئی تجھے ڈر نہیں لگا۔“ میں نے اسے صوفے پر بٹھایا کیونکہ وہ سچے سچ الگ ہونے کو تیار نہیں

تھی مجھ سے چپکلی جا رہی تھی۔ جب تک وہ اپنے باپ کے ساتھ غریبانہ زندگی گزارتی رہی اس کا بدن نہایت

چھریرا رہا تھا مگر پہلے کنور محل اور پھر رانا دیاس کے محل میں اچھی زندگی نے اسے بدل دیا تھا، اس کا بدن بھر گیا تھا۔

جلد میں ملاحظہ کر آ گئی تھی۔ اس نے سلک جیسے کپڑے کی سادہ سفید ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اسی رنگ کا بلاؤز

تھا۔ میری بات پر وہ ہنسی۔

”تو نہیں جانتا کیا؟ مجھے کس سے کھتر ہو سکتا ہے؟“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ اس کا انسانیت کوئی سے خطرہ نہیں تھا۔ اس ارادے سے اس کے پاس آنے

والے کو موت ہی نصیب ہوتی۔ ”ٹوٹھیک کہہ رہی ہے پر خطرہ جان کو بھی تو ہوتا ہے۔“
 ”اس کی پروا کسے ہے رے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”جنگی میں بس ایک ہی آدمی کی پروا کی ہے
 اور وہ ٹو ہے۔“

”ٹو نے بے وقوفی کی ہے اس طرح رانا کے محل سے نکل کر۔ وہاں ٹو محفوظ تھی۔“
 میری بات سن کر وہ جذباتی ہو گئی۔ ”اگر تیرا نام لے کر ہمیں ہم دوت بھی لے جاتا تو ہم چلے جاتے۔“
 اب میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شانے یہ نیا حربہ استعمال کیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میرے کسی دوسرے
 ساتھی کو اٹھوائے گا اور اسے یہ خیال بنا کر اپنا کام نکلوانے کی کوشش کرے گا تو میں مزاحمت کروں گا۔ اس لیے اس
 نے اوشا جیسے کسی قدر نرم کار کو استعمال کیا تھا۔ اوشا میرے لیے دوسرے ساتھیوں کی طرح اہمیت نہیں رکھتی تھی
 مگر میں اس کی پروا ضرور کرتا اور ڈیوڈ شا اسی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کے سامنے صوفے پر
 بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک وہ اٹھ کر میری گود میں بیٹھ گئی اور میرے سینے سے سر نکال لیا۔ وہ بوجھل لہجے میں بولی۔ ”شہباز
 ٹو جانتا ہے تاکہ ٹو ہمارے لیے کیا ہے رے؟“

میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اوشا کالمس کسی زاہد خشک کو بھی بیدار کر سکتا تھا۔ میں تو جوان اور گناہ گار انسان
 تھا۔ میں نے التجا کی۔ ”ٹو اپنی جگہ بیٹھ کر بات نہیں کر سکتی۔“

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”شہباز ہم تیرے لیے بہت تڑپے ہیں
 رے، اب دور نہ کر، بھلے پیار نہ کر مگر خود سے جدا نہ کر۔“

میں نے اس آزمائش کا بوجھ ذرا کم کرنے کے لیے اسے اٹھا کر صوفے کی ہتھی پر بٹھایا۔ ”اوشا سمجھنے کی
 کوشش کر میں بہت مشکل میں ہوں۔ ٹھیک ہے ٹو میرے لیے تڑپا ہے مگر یہاں تیری موجودگی میرے لیے
 مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔“

”ایسا نہ بول۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”اوشا تیرے لیے مشکل بننے سے پہلے مر جانا چاہے گی رے۔ ابھی
 آزما لے۔“

شیشے کی میز پر پھلوں کی ٹوکری اور اس کے ساتھ ہی پھل کاٹنے والی چھری رکھی تھی۔ اوشا نے وہ اٹھا کر
 اپنے سینے میں اتارنے کی کوشش کی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی کوئی کوشش کرے گی۔ اس لیے
 جب تک میں اس کا ہاتھ پکڑتا چھری اس کے سینے کو چھو چکی تھی۔ اس نے پورا زور لگایا تھا۔ مجھے بھی روکنے کے
 لیے پورا زور لگانا پڑا تھا۔ جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ خود کو چھری کی طرف لائی اور مجھے دوسرے ہاتھ
 سے اسے روکنا پڑا۔ وہ تقریباً میرے ہاتھ سے لٹک گئی تھی اور اس کی انتہائی کوشش تھی کہ چھری اس کے سینے میں
 اتر جائے۔ یہ مشکل چھری اس سے دور کر کے میں نے چھین کر پھینک دی اور اسے دبوچ لیا۔ ”یہ کیا حرکت تھی؟“
 اب وہ ہمد سکون تھی۔ اس نے کہا۔ ”ٹو کیا سمجھتا ہے رے، اوشا بس جنابی پریم کرتی ہے۔ ایک لمحے کو چھوڑ
 تجھے مر کر دکھاتی ہوں رے۔“

”جی بات ہے اس کی حرکت نے مجھے دہلا دیا تھا۔ چھری بے شک پھل کاٹنے والی تھی مگر اوشا نے جتنی
 ت سے اسے سینے پر مارا تھا اگر وہ لگ جاتی تو دستے تک اندر گھس جاتی۔ اس نے دل پروا کیا تھا۔ وہ لمحوں

بس مر جاتی۔ لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں اور بلاشبہ میرے لیے جان قربان کر سکتے ہیں۔ بیٹو نے کر کے بھی دکھایا۔ وسیم، سفیر، عبداللہ اور ایاز سب جاں نثار تھے۔ سویرا دیوانی تھی مگر اوشا نے جو کیا تھا وہ شاید کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے اسے چھوڑا تو وہ پھر چھری نہ اٹھالے۔ مگر ابھی وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی اور کسی منہی سی ہنسی کی طرح میرے بازوؤں میں دبکی ہوئی تھی۔ ”ٹو پاگل ہے۔“

”ہاں تیری پاگل ہوں۔“ اس نے اقرار کیا۔

میری نظر اس پر گئی تو اس کا سفید بلاؤ سرخ ہو رہا تھا۔ ”یہ کیا خون نکل رہا ہے؟“

اس نے دیکھا اور بے پروائی سے بولی۔ ”لگ گئی ہوگی چھری۔“

جب اس نے چھری سینے میں اتارنے کی کوشش کی تو میں نے اسے روک لیا تھا اور اس وقت میرا خیال تھا کہ اسے کٹ نہیں لگا تھا۔ مگر اب پھلکتا خون بتا رہا تھا کہ اسے چھری لگی تھی۔ ”مجھے دکھاؤ۔“

”دیکھ لے سب تیرا ہی تو ہے۔“ اس نے ساڑھی کا پلو گرا دیا۔

”لا حول ولا۔“ میں نے کہا اور بلاشت بھر کے بلاؤ کا ایک حصہ سر کا زخم کا جائزہ لیا۔ معمولی سا زخم تھا مشکل سے نصف انچ کا کٹ تھا۔ چھری کی نوک لہرا کر گئی تھی ورنہ اتنا بھی نہ ہوتا۔ ”ایک منٹ۔“ میں نے کہا اور واٹس روم میں آیا جہاں ایک عدد میڈیکل بکس موجود تھا۔ میں نے اوشا کا زخم صاف کیا۔ اس نے بلاؤ کے اوپری بٹن کھول لیے تھے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ زخم تقریباً کھلی جگہ تھا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی۔ زخم صاف کر کے میں نے اسے تیار گول پٹی لگا دی۔ وہ ساکت اور تن کر بیٹھی رہی۔ ”اب بلاؤ بدل لو۔“

”بدل لوں گی۔“ وہ بولی۔ ”پرا بھی نہیں۔ میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی رے۔“

”میں کہیں نہیں جا رہا۔“

”ہم نہیں جانتے۔“ اس نے انکار کیا اور پھر مجھ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

”اوشا ٹو مجھے جانتی ہے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میں ایسی حرکت ناپسند کرتا ہوں۔ میرے مذہب میں خودکشی حرام ہے۔ مجھ سے وعدہ کر اب ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی؟“

”ٹو چاہتا ہے کہ ہم زندہ رہیں؟“ اس نے سراٹھا کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”تب خود سے ددرمت کرنا ورنہ ہم مر جائیں گے۔“

”منظور ہے خود سے الگ نہیں کروں گا۔“ میں نے وعدہ کیا۔ ”ہاں تقدیر کے آگے بے بس ہوں۔“

”اس کا الزام تجھے نہیں دوں گی رے۔“ اس نے کہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا مگر وہ موقع سے فائدہ اٹھا

کر چکی رہی اور شرارت سے بولی۔ ”ایسے بجا آ رہا ہے۔“

”آرام سے یہاں بیٹھو۔“ میں نے اسے دوسرے صوفے پر بٹھا دیا۔ ”رانا دیاس کے ہاں کوئی مسئلہ تو

نہیں ہوا؟“

”ہوا تھا اس کا ایک پوتا میرے لیے پاگل ہو گیا تھا۔“ وہ مزے سے بولی۔

”پھر ٹھیک کیسے ہوا؟“

”میں نے اس کے کتے کو کاٹ لیا۔ بہت بھونک رہا تھا۔ وہ مرا تو اس کا مالک ٹھیک ہو گیا۔“

میں مسکرایا۔ ”تجھے تو کسی نے کچھ نہیں کہا؟“

”نہیں رانا جی کو پتا چلا تو انہوں نے پوتے کو بہت ڈانٹا تھا اور پھر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں تھی تو خادمہ

پر بنی سامن سمجھتے تھے۔ تیرے کارن میرا بہت کمال رکھا۔“

”تجھے خیال نہیں آیا کہ اس طرح وہاں سے نکلے گی تو وہ پریشان ہوں گے۔“

”میں چنٹی چھوڑ آئی تھی۔“

”کیسے تجھے تو لکھنا پڑھنا نہیں آتا؟“

وہ ہنسی۔ ”ایک ملاجم سے لکھوائی تھی وہ بھی بہت میرے آگے پیچھے پھرتا تھا۔“

”پھر بھی وہ پریشان ہوں گے کیونکہ میں نے تجھے ان کے پاس بھیجا تھا۔“

”ٹو پلٹ کر ایسا گیا کہ کبھی یاد بھی نہیں کیا۔“ اس نے شکوہ کیا۔ ”میں اتنا رکتی رہی رہے۔“

”ٹو جانتی ہے میری جان کتنے سارے چکروں میں پھنسی رہتی ہے۔ ایک لمحے کو سکون نہیں ہے۔ ابھی

ایک دشمن سے بچھا نہیں چھوٹا ہے کہ دوسرا آ جاتا ہے۔ یہاں بھی سمجھ لے کہ قیدی بن کر آیا ہوں۔“

”یہ گور اکیوں تیرا دشمن ہے؟“

”دشمن نہیں ہے مجھ سے ایک کام ہے اور میں تیار نہیں ہوں اس لیے زبردستی بلوایا ہے۔ اسے معلوم ہے وہ

مجھ سے میری جان کی دھمکی پر کچھ نہیں کروا سکتا اس لیے تجھے بھی بلوایا۔“

”ٹو بھاگ نہیں سکتا یہاں سے مجھے لے کر؟“

”بہت مشکل ہے ہاں موقع ملے تو ایسا کر سکتا ہوں۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں؟“

”جب موقع ہوگا تب بتاؤں گا۔“

”یہ عورت کون ہے رے؟“ بالآخر اس نے وہ سوال کیا جو اسے سب سے پہلے کرنا تھا مگر وہ دوسرے چکر

میں پڑ گئی۔

”بتایا تو ہے ڈیوڈ شاکی بنی ہے۔“

”بھلے کسی کی بنی ہو میں پوچھ رہی ہوں تیری کیا لگتی ہے؟“

”میرے دشمن کی بنی ہے تو میری کیا لگے گی؟“

”تب ایسے کیوں پوچھ رہی تھی میرا؟“

”میں نے شانے اچکائے۔“ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”شہباز میں عورت ہوں اور عورت کا انداز جانتی ہوں۔ وہ تیرے چکر میں ہے۔“

”مگر میں اس کے چکر میں نہیں ہوں۔“

”چھوڑ اسے۔“ وہ بولی۔ ”یہ بتا میں کیسی لگ رہی ہوں۔“

”اچھی لگ رہی ہے۔“

”کتنی اچھی؟“

”بہت اچھی۔“ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ ”ٹو جانتی ہے میں ایسا مرد نہیں ہوں جو عورتوں پر غور کرتا پھر دوں۔“

”اچھا کرتا ہے پر مجھ پر تو کیا کرتا۔“ اس نے کھڑے ہو کر اپنا سراپا دکھایا۔ ”دیکھ مجھے اب یوں ساڑھی پہننا آگئی ہے۔“

”اور کیا آتا ہے؟“

”مجھے رسوئی میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سب ڈرتے تھے کہ میراوش نمل جائے بھوجن میں، اس لیے بھوجن بنانا نہیں آتا۔ میں صفائی کرتی تھی اور رانا جی کے کام کرتی تھی۔“

میں سوچ میں تھا اور اوشا تاڑ گئی کہ میں فکر مند ہوں۔ ”کیا مجھے دیکھ کر اچھا نہیں لگ رہا کیا؟“

”اوشا میں اس وقت دشمن کے پاس ہوں اور ایسے میں مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ میرا کوئی ساتھی بھی دشمن کے ہاتھ لگ جائے۔“

”پر میں تیری ساتھی تو نہیں ہوں۔“ اس نے اپنے بکھر جانے والے سیاہ لمبے بال سمیٹے جو چھری کی نکش میں بکھر گئے تھے۔ پہلے اس کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے مگر اب کمر کے خم سے نیچے آ رہے تھے۔

”ٹو میری ساتھی ہے۔“

”جن ساتھی نہیں ہوں۔“ اس نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ ”مجھے پتا ہے ٹو میرا نہیں ہے میرا بننا بھی چاہے تو نہیں بن سکتا۔ میرے لیے دیوتا سامان ہے۔ میں تیری پجاری ہوں۔ تیری پوجا کر سکتی ہوں پر تجھ سے گھر نہیں نکلتی۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ یہ اچھی بات تھی کہ وہ مجھ سے کچھ مانگ نہیں سکتی تھی ورنہ مجھے انکار کرنا پڑتا۔ لیکن اس کے ساتھ ظلم تو ہوا تھا اس کے باپ نے اسے زہریلی بناتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی واحد اولاد کو فطرت کی خوشی سے محروم کر رہا ہے۔ وہ ازدواجی زندگی نہیں گزار سکتی تھی کیونکہ اس کے پاس آنے والا مرد اس کے زہر کی نذر ہو جاتا۔ زہریلی ہونے کے باوجود وہ عورت کی فطرت سے محروم نہیں تھی۔ اس کے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش موجود تھی اور شاید عام لڑکیوں سے زیادہ تھی۔ وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ اس نے بچپن سے جوانی تک اپنے باپ کو پاس دیکھا تھا۔ پھر میں اس کی زندگی میں آیا تو وہ مجھ سے منسلک ہو گئی۔ جب تک ساتھ رہی وہ مجھ سے جسمانی قربت کی کوشش کرتی رہی اور جب مجھ سے جدا ہوئی تو اس پسند میں محبت کا پاگل پن شامل ہو گیا۔ میں نے اسے رانا دیاس کے پاس بھیجا تو میرے ذہن میں تھا کہ وہی اس کے لیے محفوظ ٹھکانا تھا اور وہ ساری عمر وہاں آرام سے رہ سکتی تھی مگر ڈیوڈ شانے اسے وہاں سے بلوا کر نہ صرف میرے بلکہ اوشا کے لیے مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔

اوشا یقیناً میرے معاملے میں مبر سے کام لے رہی تھی اور تبھی وہ ایک نارمل زندگی کی طرف آئی تھی۔ اسے امید ہو گی کہ شاید کبھی میرا اس سے سامنا ہو مگر وہ میرے لیے پاگل ہو کر رانا دیاس کے محل سے نکلی نہیں تھی۔ ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری یاد دھندلی پڑ جاتی۔ تب شاید وہ اتنی بے چین نہ رہتی۔ مگر ڈیوڈ شا

نے اسے یوں میرے سامنے لا کر اس کے دبے جذبات بھڑکا دیئے تھے اور اب میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اوشا کا ردِ عمل بتا رہا تھا کہ اب وہ اتنی آسانی سے میری جان نہیں چھوڑے گی۔ اس کا لہجہ بدل گیا تھا کبھی وہ صاف ہندی میں بات کرتی تھی اور کبھی اپنے پرانے انداز پر اتر آتی۔ کبھی ہم کر کے بات کرتی اور کبھی میں کہتی تھی۔ خادم نے دروازے پر دستک دی اور میری اجازت پر اندر آیا۔ اس نے لچ کا پوچھا اور میں نے اسے یہیں لانے کو کہا۔ اس کے جانے کے بعد اوشا نے کہا۔

”میرا من کرتا ہے تیرے ایک ایک دشمن کو ڈس کر مار ڈالوں۔ تیری کوئی مجبوری باقی نہ رہے۔“
میں مسکرایا۔ ”حالا کتم تم سے جتنی بار ملا ان دشمنوں کے طفیل ہی ملا۔ ورنہ تم کہیں رہتی تھیں اور میں کہیں تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دیرانے میں ہماری ملاقات ہوگی۔“
”ہاں یہ تو ہے پر تیری مشکل ہمیں بے چین رکھتی ہے۔“

”میری مشکلیں آسان ہوں گی۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔“
”بیٹو کا دکھ ہوا۔“ اوشا نے کہا تو میں حیران ہوا۔

”تم جانتی ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”رانا جی تک تمام کھمیں آتی تھیں اور وہ ہمیں بتاتے تھے۔“
رانا دیاس باخبر آدمی تھا۔ مگر میرے لیے یہ تعجب انگیز تھا کہ وہ اوشا کا اس حد تک خیال رکھتا تھا کہ اسے میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں تازہ ترین خبروں سے باخبر رکھتا تھا۔ بیٹو کے ذکر پر میرے دل سے آہ نکلی تھی۔ میں نے اوشا کو مختصر بتایا کہ بیٹو نے کس طرح مجھ پر جان واری۔ اوشا نے کہا۔ ”ٹو ہے ہی ایسا کہ جان دار نے کوچی کرتا ہے۔“

”میں نے کبھی خود کو اس قابل نہیں سمجھا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نہیں جانتی کہ بیٹو میرے لیے کیا تھا اور اس کا نقصان میرے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے۔“

بیٹو کے ذکر پر میرا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ اوشا نے میرا دکھ محسوس کیا اور اٹھ کر میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے انداز میں محبت تھی، سستا پن نہیں تھا اس لیے مجھے سچ سچ سکون ملا اور میرے اندر کا بوجھل پن کم ہونے لگا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ خادم کھانا لے آیا تھا۔ وہ میز پر لگانے لگا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں اوشا کچھ بے چین نظر آنے لگی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تجھے سے کچھ کہنا ہے۔“
”کہو۔“

”یہاں نہیں رہے۔“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خدشہ ہے یہاں ہماری بات سنی جا رہی ہوگی اور ایسا لازمی تھا۔ ڈیوڈ شا اس قسم کا آدمی تھا جو کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا اور وہ بہر صورت میری نگرانی کر رہا ہوگا۔ کھانے کے بعد میں نے خادم سے کہا۔ ”اگر میں یہاں سے باہر جانا چاہوں تو.....“
”کوئی پابندی نہیں ہے سرکار۔“ اس نے ادب سے کہا۔ ”آپ بیلس میں کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہیں۔“

مجھے حیرت ہوئی۔ ”کہیں بھی جانے کے لیے؟“

”جی سرکار۔“ اس نے سر ہلایا۔

میں اوشا کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کے سفید بلاؤز پر سرخ دھبہ بہت نمایاں تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ لباس بدل لے مگر پہلے میں جانتا چاہتا تھا کہ اوشا مجھ سے کیا کہہ رہی تھی۔ ہم باہر آئے اور ایک کھلی جگہ جہاں سوائے گھاس کے اور کچھ نہیں تھا میں نے اوشا سے کہا۔ ”تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟“

”شہباز تجھے دیکھ کر میں بھول گئی تھی۔ اب یاد آیا۔ دو دن پہلے ایک میم رانا جی سے ملنے آئی تھی۔ وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے پر وہ بار بار تیرا نام لے رہی تھی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایسی کون سی سفید فام عورت ہو سکتی تھی جو رانا دیاس سے ملنے آئی ہو اور اس سے میرے بارے میں بات کی ہو۔ ”حلیہ بتا سکتی ہو دیکھنے میں کسی لگتی تھی؟“

”پیاری تھی۔“ اوشا نے رشک سے کہا۔ ”گوری سی اور کھوب صورت۔“

اوشا کو حلیہ بتانا نہیں آرہا تھا اس کے نزدیک وہ میم تھی اور بہت خوب صورت تھی۔ اس لیے میں نے سوال شروع کیے اور چند سوالوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ مکمل طور پر ایمین شا تھی۔ اس کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ، چہرے کے نقوش اور جسمانی ساخت وہی تھی۔ اوشا نے تجسس سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے رے؟“

”ایمین شا۔“ میں نے کہا۔ ”ڈیوڈ شا کے بھائی کی بیٹی، لیکن اس کی دشمن اور.....“

”تیری دوست۔“ اوشا بولی۔ ”میں اسی وقت سمجھ گئی تھی جب وہ تیرا نام لیتی تو اس کا انداز ہی بدل جاتا تھا۔“

”وہ میری ہمدرد ہے کیونکہ ڈیوڈ شا اس کا بھی دشمن ہے۔“

”میں پاگل نہیں ہوں۔“ وہ میرے قریب ہو کر بولی۔ ”سب سمجھتی ہوں وہ بھی تجھ پر مرتی ہے۔“

”میرے خدا۔“ میں نے منہ اوپر کر کے فریاد کی۔ ”میں دشمنوں کے چکر سے نہیں نکل پاتا اور یہ لڑکیاں بھی مرنے سے باز نہیں آتی ہیں۔“

وہ ہنسی۔ ”ٹو ہے ہی ایسا..... عورت کی فطرت نہیں سمجھتا کہ اس سے بھاگے گا تو وہ تیرے پیچھے بھاگے گی۔“

”ٹھیک ہے آج سے میں عورتوں کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔“ میں نے ہنسا کر کہا۔ ”اس صورت میں تو تم دور بھاگو گی نا؟“

وہ پھر ہنسی۔ ”دوسروں کا پتا نہیں رہے پر میں نہیں بھاگوں گی۔ یہ بتا تجھے وہ میم کیسی لگتی ہے؟“

”جیسی ٹو لگتی ہے، دوست اور ساتھی، میں نے کچھ اور نہیں سوچا اور نہ ہی سوچوں گا۔“

”ٹو ہے ہی ایسا کشمکشور۔“ اس نے غلطی سے کہا۔

”اوشا بلاؤز بدل لو۔“

”میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ اس نے نہ صرف انکار کیا بلکہ میرا بازو پکڑ لیا۔ ”ٹو چلے گا تو جاؤں گی۔“

”چلو بابا۔“ میں نے مجبوراً کہا۔ اوشا ایک اور چھوٹی مگر معمولی نظر آنے والی عمارت میں ٹھہرائی گئی تھی۔ یہاں اسے معمولی سا کمرالا ہوا تھا جہاں اس کا ایک عدد بیک بھی موجود تھا۔ کمرے میں معمولی سا بیڈ اور دوسرا سامان تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا جب ڈیوڈ شا جانتا تھا کہ وہ میری ساتھی ہے تو اسے اسی لحاظ سے اوشا کا خیال رکھنا چاہیے تھا اس نے اسے معمولی نوکروں کی طرح اس جگہ ٹھہرایا تھا۔ اوشا نے بیک سے ایک اور ساڑھی نکالی اور اپنی ساڑھی کھولنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”میں باہر موجود ہوں۔“

”ٹو نہیں جائے گا۔“ اس نے ضد کی۔

”اوشا بچی مت بنو کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“

”تجھ پر ہے پر اپنے مقدر پر نہیں ہے۔ ڈر لگتا ہے تو آنکھوں سے دور ہوا تو پھر کہیں چلا جائے گا۔“

”تقدیر کے آگے میں اور تم دونوں بے بس ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”میں باہر ہوں تم لباس بدل کر آ جاؤ۔“

”ٹو مجھ سے بھاگ رہا ہے۔ مجھے دیکھنا نہیں چاہتا۔“ اس نے شکوہ کیا تو میں مسکرا کر باہر آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر رانا دیاس سے ملاقات کرنے والی بی بی امین تھی تو وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ بد ظاہر اس کا رانا دیاس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور پھر اوشا کا کہنا تھا کہ دوران گفتگو بار بار میرا نام آرہا تھا۔ یہ دو دن پہلے کی بات تھی جب میں یقینی طور پر زہنی کے قبضے میں آچکا تھا۔ کیا امین میری کشدگی اور اس حقیقت سے واقف تھی کہ میں اصل میں ڈیوڈ شا کے قبضے میں چاچا ہوں جب کہ اس وقت میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کس کے قبضے میں ہوں۔ مگر امین کی یہاں موجودگی ذاتی طور پر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا امکان تھا کہ وہ اپنی ڈیوڈی پر یہاں آئی ہو اور اسے میرے بارے میں علم ہوا ہو۔ زہنی اور پھر اوشا کی آمد سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ میں جس طرح ڈیوڈ شا کے قبضے میں آیا تھا اس کا کوئی نہ کوئی سرا جہاں عمر دراز کے محل سے ملتا تھا۔ بیک نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس سے شبہ مزید بڑھ رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ اس چکر میں بیک یا عمر دراز ملوث تھے؟

مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ راجا عمر دراز یا بیک یوں مجھے دشمن کے حوالے کر سکتے ہیں۔ بیک نے جس طرح مجھ سے معافی چاہی تھی اس سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی وجہ سے مجبور ہے تبھی اس نے یہ سب کیا۔ شاید راجا عمر دراز کی ضد ختم کرنے کا واحد طریقہ یہی سمجھ میں آیا کہ مجھے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اگرچہ پہلے بھی میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ راجا عمر دراز کے ساتھ دادی تک جاؤں مگر اب بیک کے طرز عمل نے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے باوجود مجھے ڈیوڈ شا کے حوالے کرنے میں اس کا کردار سمجھ سے بالاتر تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا میرا یا دشمن نہیں ہے۔ اسے مجھ سے اتنی غرض تھی کہ وہ مجھے وادی تک لے جائے تاکہ اسے اندر جانے کا پروانہ مل سکے۔ اس کے بعد میں اس کے لیے بے مقصد ہو جاتا اور وہ شاید مجھے چھوڑ دیتا۔ شاید اسی لیے اس نے مجھے ڈیوڈ شا کے حوالے کیا۔ ایک تو میں راجا عمر دراز سے دور ہو جاؤں اور دوسرے ڈیوڈ شا بھی پیچھا چھوڑ دے۔ مگر یہ سب میرے قیاس تھے شاید ایسا نہ ہو اور شاید ایسا ہو۔ اچانک اوشا کی آواز آئی۔

”شہباز کیا کہہ رہا ہے؟“

میں چونکا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“

وہ ساڑھی بدل کر آگئی تھی۔ اس بار اس نے نیلی زمین والی ساڑھی پہنی تھی جس پر پیلے اور نارنجی رنگ کے پھول بنے تھے۔ البتہ بلاؤز سفید ہی تھا اور پہلے کے مقابلے میں خاصا مختصر تھا۔ اسے دیکھ کر احساس ہوا کہ اس کا بدن بھر آیا ہے ورنہ پہلے وہ چھری سی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ٹو بات کر رہا تھا خود سے؟“

”اچھا۔“ میں نے حیران ہو کر گہری سانس لی۔ ”مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“

”اچھا چھوڑو یہ بتا کہ اب کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس نے رقص کے انداز میں گھوم کر دکھایا۔

”ٹو ہر حال میں اچھی لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بیک کہاں ہے؟“

”وہ اندر ہے۔“

”اسے لے آؤ اب تم میرے ساتھ رہو گی۔“

”سچ۔“ وہ خوش ہو گئی اور لپک کر اپنا بیک لے آئی۔ ”تیرے ساتھ تیرے کمرے میں؟“

”نہیں لیکن اسی عمارت میں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہ جگہ تیرے لیے اچھی نہیں ہے۔“

”ٹو جانتا ہے میں گھاس سے بنے جھوپڑے میں رہی ہوں۔ مٹی پر سوئی تھی یہ الگ بات ہے کہ رانا جی کے محل کے جس کمرے میں رہتی ہوں وہ رانا جی کے کمرے سے کم نہیں ہے اب یہاں رہی تو کیا بگڑ گیا ہے۔ پر شہباز جی بات یہ ہے کہ ٹو نکھ میں بھی رکھے تو خوشی سے رہوں۔“

مگر میرا نکھ میں رہنے یا اسے رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم باہر آئے اس بار بھی نہ تو کسی نے روکا اور نہ ہی کوئی نظر آیا۔ مجھے حیرت ہوئی یہاں بہ ظاہر کوئی سکیورٹی نہیں تھی۔ ملازم اور ملازمائیں تھیں مگر وہ عام سے تھے۔ سامنا ہونے پر ایک طرف ہو کر اس وقت تک ادب سے سر جھکائے کھڑے رہتے تھے جب تک ان کے پاس سے گزرنہ جایا جائے۔ مگر ایسا بھی ممکن نہیں تھا کہ یہاں سرے سے کوئی سکیورٹی ہی نہ ہو۔ یقیناً یہاں اعلیٰ درجے کی الیکٹرونک سکیورٹی ہو گی جس کے ہوتے ہوئے بہ ظاہر عام گارڈز کی ضرورت نہیں تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عام گارڈز بھی ہوں لیکن سامنے نہ ہوں بلکہ جب ان کی ضرورت ہو سیکنڈوں میں کہیں سے نمودار ہو جائیں۔ مگر سامنے کوئی نہیں تھا۔ بنا کسی روک ٹوک کے ہم واپس آ گئے۔ مگر میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھک گئے۔ وہاں زینی موجود تھی۔ وہ بے تکلفی سے صوفے پر موجود تھی اور اس نے معنی خیز نظروں سے ہمیں دیکھا۔

”کہاں تھے اس کے ساتھ اور اس نے اتنی جلدی کیڑے بھی بدل لیے۔“ وہ انگریزی میں بولی اس لیے اوشا نہیں سمجھی تھی۔ البتہ اس نے اپنی زبان میں کہا۔

”شہباز یہ کتیا کیوں آئی ہے؟“

”اپنی حد میں رہو۔“ زینی غرائی۔

”پلیز۔“ میں نے ہاتھ اٹھایا اور زینی سے کہا۔ ”تم کام کی بات کرو۔“

”شہباز.....“ اوشا نے کہنا چاہا۔

”تم وہاں بیٹھو۔“ میں نے سخت لہجے میں اوشا سے کہا اور بیڈ کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اس طرف بڑھ گئی میں نے زینی سے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

زینی نے جان بوجھ کر اوشا کو چڑانے والے انداز میں دیکھا اور میرے ساتھ باہر آگئی۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا۔ ”تمہیں اس میں کیا نظر آیا؟“

”مجھے تو تم میں بھی کچھ نظر نہیں آتا ہے۔“ میں نے سرو لہجے میں کہا۔ ”تم دونوں باپ بیٹی میرے سر کا درد بن گئے ہو۔“

حسبِ توقع وہ غصے میں آگئی۔ ”تم اس کا مقابلہ مجھ سے نہیں کر سکتے۔“

”ہاں وہ با آبرو لڑکی ہے۔“

”با آبرو؟“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اس کا انداز بتاتا ہے.....“

”کیا تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتیں۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”جب کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“

”تم اس کی اتنی سائیڈ کیوں لے رہے ہو؟“

”اگر میں اس کی سائیڈ لے رہا ہوں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“

”مجھے مسئلہ یہ ہے کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔“

”افسوس کہ تم مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“

”کیوں؟“ وہ جذباتی ہو گئی۔ ”کیا کمی ہے مجھ میں؟“

”تم میں عورت کی کمی ہے۔ عورت صرف ایک مخصوص جسمانی ساخت کا نام نہیں ہے اور تم صرف نسوانی ساخت کی حامل ہو۔“ میں نے نرمی سے بہت سخت بات کہی۔ وہ مجھے گھورنے لگی۔

”تم میری تو بہن کر رہے ہو۔“

”میرے نزدیک تو تمہارا وجود ہی عورت کی تو بہن ہے لیکن تم اپنے نکتہ نظر میں آزاد ہو۔“

اس کی آنکھوں میں غیض و غضب کی جھلک دکھائی دی تھی۔ مگر پھر وہ نارمل ہو گئی۔ ”جلد تم صرف میرے ہو گے۔“

اس نے کہا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے انداز سے میں فکرمند ہو گیا۔ چند لمحے کو مجھے لگا کہ میں نے اسے چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ بہر حال میں ان لوگوں کا قیدی تھا مگر مجھے یہ فکر اپنے لیے نہیں بلکہ اوشا کے لیے تھی۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی مگر اوشا کے خلاف کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے کمرے میں آ کر خادم کو طلب کرنے والا بلن دیا۔ یہ لمبی مونچھوں اور خاص راتھستانی اسٹائل کے لباس والا نوجوان آدمی تھا۔ سیاہی مائل رنگت کے ساتھ اس کے نقوش تینکے اور دلکش تھے۔ جسامت کسرتی مگر کسرتی قدر چھریری تھی۔ اس نے اندر آ کر ادب سے سر جھکا یا۔ ”جی سرکار؟“

”مجھے ڈیوڈ شاسے ملاقات کرنی ہے۔“

”میں آپ کا پیغام پہنچا دیتا ہوں سرکار۔“ اس نے کہا اور رخصت ہو گیا۔ اوشا کا منہ پھولا ہوا تھا اور وہ بستر پر کروٹ لے کر نیم دراز تھی مگر منہ دوسری طرف کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے چھیڑنے سے گریز کیا۔ سچی بات ہے مجھے بیزاری سی ہو رہی تھی۔ عورت کبھی میری زندگی کا مقصد نہیں رہی۔ صنفِ نازک سے فطری دلچسپی اور

احترام اپنی جگہ مگر اپنے آس پاس ان کی ضرورت سے زیادہ موجودگی مجھے بور کر دیتی ہے۔ میں عام حالات میں جینے والا فرد نہیں ہوں۔ گزشتہ ایک سال سے زندگی بہت خاص حالات میں گزر رہی ہے اور اکثر مجھے مشکلوں کا سامنا رہتا ہے۔ میں جدوجہد کر رہا ہوں اور ایسے میں اپنی ساری توجہ صرف اپنے مقصد پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں مگر یہ خواتین مجھے بخشنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب اوشا نے دیکھا کہ میں توجہ نہیں دے رہا ہوں تو وہ بالآخر اٹھی اور میرے پاس آگئی۔ اس نے تھکے لہجے میں پوچھا۔ ”اسے باہر کیوں لے گیا تھا؟“

”تو کیا اسے بھی یہیں رکھ لیتا؟“ میں نے بھنا کر کہا۔

”اسے دفع کرتا۔“ اوشا بولی۔ ”اب وہ یہاں آئی تو میں اسے کاٹ لوں گی۔“

”تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”کیوں تجھے اس کی بہت پروا ہے؟“ وہ جذباتی ہو گئی۔ ”وہ تجھے پسند ہے۔“

”لا حول ولا۔“ میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”وہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔“

”تب اس کی اتنی پروا کیوں کر رہا ہے؟“

”مجھے اس کی نہیں تیری پروا ہے۔ اسے کچھ ہوا تو یہ تجھے نہیں چھوڑیں گے۔“

”نہ چھوڑیں۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”مجھے پروا نہیں ہے۔“

”لیکن مجھے تو تیری پروا ہے۔“

میری بات پر اس کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی اور رونق آئی تھی لمحوں میں اس کے تاثرات ہی بدل کر رہ گئے۔ اس نے میرے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں اور چمک کر کہا۔ ”جج تجھے میری اتنی پروا ہے۔“

”کیا تجھے اندازہ نہیں ہے؟“

”نہیں ہے نا..... تو سب کی اتنی ہی پروا کرتا ہے۔“

”دیکھ کچھ لوگوں کی میں اوپر سے پروا کرتا ہوں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی دل سے پروا کرتا ہوں اور

تو ان میں سے ایک ہے۔“

”جج۔“ اس بار اس نے خوش ہو کر ایک غیر پارلیمانی حرکت کی اور بد قسمتی سے اسی وقت خادم اندر آیا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھ لیا۔ اوشا کو رتی بھر پروا نہیں تھی وہ سرعام بھی اس حرکت کا اعادہ کر سکتی تھی۔ مگر میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ وہ بدستور میرے ساتھ لگی ہوئی تھی اور مجھے اسے الگ کرنا پڑا۔ دوسری طرف خادم کے لیے اس قسم کے منظر کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لیے اس نے ہانسی تاثر کے کہا۔

”سرکار صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔“

شکر ہے اوشا نے بے رنگ لب اسٹک لگائی ہوئی تھی ورنہ اس کے کیے کا نشان میرے چہرے پر رک جاتا۔ پھر بھی میں نے باہر نکل کر احتیاطاً چہرہ صاف کر لیا۔ اوشا خوش تھی کہ وہ اب میرے ساتھ رہے گی اور اپنی من مانیوں کرتی رہے گی مگر میں اسے کھلی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اسے کمرے سے رخصت کرنا بھی مناسب نہیں تھا کہ وہ برامان جاتی اس لیے میں نے خادم سے کہا۔ ”مجھے کوئی دوسرا کمرہ دے دو۔“

”کوئی غلطی ہو گئی سرکار؟“ وہ پریشان ہو گیا۔ ”کوئی کمی ہے یہاں؟“

”نہیں یہاں اوشا رہے گی۔“

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”ٹھیک ہے آپ برابر والا کمرہ دیکھ لیں پسند آئے تو اس میں رہیں۔“



ڈیوڈ شا مرکز پبلس میں موجود تھا۔ وہ سوٹ پوش اور کسی قدر فکر مند لگ رہا تھا۔ دوسرے اس کے تاثرات سے اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ فکر مند رہے لیکن میں اسے اچھی طرح جان گیا تھا۔ میں اس کے سپاٹ چہرے سے بھی اس کے تاثرات بھانپ لیتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”اپنی پراہلم؟“

”تمہاری صاحبزادی۔“ میں نے بھی بلا تہدید کہا۔ ”وہ بلا وجہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”اگر وہ تم سے فری ہو رہی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟“ اس نے مغربی روایات کے عین مطابق سوال کیا۔

”تم جانتے ہو میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔“

”اوکے میں اس سے کہہ دوں گا مگر یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ بات کسی ٹینشن تک نہ پہنچے۔ اوشا میری ساتھی ہے اسے کسی قسم کا نقصان نہیں ہونا چاہیے۔“

اس بار ڈیوڈ شانے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ”یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن میں کہوں گا کہ اوشا تمہارا غلط انتخاب ہے۔“

میں نے اسے گھورا۔ ”جیسی تم نے اسے رانا دیاس کے محل سے یہاں بلوایا ہے۔“

اگر وہ کھسیا تھا تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا۔ ”ٹھیک ہے زینی ایک حد سے آگے نہیں بڑھے گی۔“

”ڈیوڈ شا بہتر ہو گا کہ تم اب کھل کر بات کر لو۔ بقول تمہارے حالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے لیکن جہاں

تک میری نظر اور عقل کام کر رہی ہے مجھے کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی۔“

”اب زیادہ وقت نہیں ہے جلد تمہارے سامنے سب آ جائے گا۔“

”اوکے میں اپنی بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ میں تمہارے ساتھ کیوں جاؤں۔ یعنی

شرافت سے کیوں جاؤں؟“

”تمہاری یہ ساتھی اوشا ہمارے ساتھ ہوگی اور تم اس کی وجہ سے مجبور ہو گے۔“ ڈیوڈ شانے کھل کر کہا۔

”گویا تم مجھے مجبور کر کے لے جاؤ گے لیکن کیا میں واقعی مجبور ہو جاؤں گا؟“

”جب حالات کی تبدیلی تمہارے علم میں آئے گی تب تم دل سے اس مہم میں شامل ہو جاؤ گے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔“

”شبہا زاتی جلدی فیصلہ مت کرو۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اگر تم ذرا صبر سے کام لو تو یقیناً کرو تم

پچھتاؤ گے نہیں۔“

ڈیوڈ شاکی بات سے زیادہ اس کے لہجے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا اور میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اد کے میں فی الحال تمہاری بات مان لیتا ہوں مگر مہربانی کر کے تم زہنی کو مجھ سے اور اوشا سے دور رکھو۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“

اچانک مجھے خیال آیا۔ ”کیا زہنی بھی اس مہم پر جائے گی؟“

”بالکل، میں کم سے کم غیر متعلقہ افراد لے جانا چاہتا ہوں۔“

”زہنی متعلقہ ہے؟“

”ہاں وہ بہر حال میری بیٹی ہے۔“ ڈیوڈ شانے مختصر لیکن مکمل جواب دیا۔

”کہیں اس غفلت کی وجہ موسم تو نہیں ہے۔“ میں نے دریافت کیا کیونکہ مجھے خیال آیا کہ پہاڑوں میں جانے کا یہی سب سے بہتر وقت ہے ورنہ شاید ایک مہینے بعد بھی موسم اس قابل نہیں رہے گا۔ یہ جولائی کا پہلا ہفتہ تھا۔ اگست کے آخر تک موسم خراب ہو جاتا ہے اور پھر بلند پہاڑوں میں سفر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ برف باری اور طوفانوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سردی حد سے بڑھ جاتی ہے جس میں انسان کا زندہ رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ڈیوڈ شانے سر ہلایا۔

”ایک وجہ یہ بھی ہے۔“

”یعنی اصل وجہ اس کے سوا ہے؟“

ڈیوڈ شانے میرا سوال نظر انداز کیا اور کھائی پر موجود قیمتی گھڑی دیکھی۔ ”تمہیں کچھ اور کہنا ہے؟“

”نہیں بس یہی بات کرنی تھی۔“

”ٹھیک ہے تم آرام کرو ہمیں شاید ایک یا دو دن میں یہاں سے روانہ ہوتا ہے۔“

ڈیوڈ شاکی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اس کا پروگرام طے شدہ نہیں ہے۔ کسی وجہ سے اس میں ایک دو دن کی تاخیر ہو سکتی تھی۔ یہ بہر حال ایک دشوار اور خفیہ مہم تھی جسے سر کرنا تو ایک طرف رہا شروع کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ کیونکہ معاملہ بین الاقوامی سرحدوں کا تھا اور سرحد بھی چین اور بھارت جیسے پرانے حریفوں کی تھی۔ ان دنوں یہاں دونوں طرف سے سرحد پر فوجی نقل و حرکت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایسے میں سوہیلین مہم جوئی آسان نہیں تھی خاص طور سے اس صورت میں جب کہ اس میں دوسرے ملکوں کے لوگ بھی شامل تھے اور اگر ہم پکڑے جاتے تو جاسوسی سے لے کر دہشت گردی تک بہت سے الزامات لگ سکتے تھے۔ ڈیوڈ شا تو اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر بچ جاتا لیکن میں اور دوسرے لوگ مارے جاتے۔



ڈیوڈ شا اپنی بات مکمل کرتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ خادم مجھے یہاں تک پہنچا کر واپس چلا گیا تھا اور اب میں خود واپس جاتا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پیلس میں گھومنے پھرنے کی کوشش کی مگر اس کمرے کے علاوہ باقی تمام کمرے لاک نکلے تھے۔ صرف اس راہداری سے باہر نکلنے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یعنی مجھے باہر جانا تھا۔ پیلس کے باقی حصوں کو لاک کر کے میری رسائی سے دور کر دیا گیا تھا۔ مجبوراً میں نے باہر کا رخ کیا جہاں خادم میرا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔ ”سرکاریم صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

شاید زینی تک اطلاع پہنچ گئی تھی کہ میں نے اس کے سلسلے میں اس کے باپ سے بات کی ہے اس لیے اب وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ انکار کر دوں مگر پھر مان گیا۔ میرا خیال تھا کہ زینی مرکزی ہیلس میں ہوگی مگر خادم مجھے عقبی سمت میں ایک چھوٹی سی عمارت تک لایا جو بہ ظاہر رہائشی نہیں تھی۔ تقریباً پاس فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی یہ عمارت بنا کھڑکیوں کے تھی اور اس کے اوپر ترچھی چھت تھی۔ یہ رہائش کی بجائے کسی اور کام کے لیے تھی۔ خادم دروازے پر رک گیا اور مجھ سے کہا۔ ”میں اندر نہیں جاسکتا سرکار آپ کو خود جانا ہوگا۔“

میں اندر داخل ہوا اور جب پتا چلا کہ خادم کیوں اندر نہیں آیا تھا۔ عمارت اصل میں انڈور سوئمنگ پول اور چھوٹے سے جم پر مشتمل تھی۔ اس قسم کے عمارت میں یہ سہولتیں بھی ہوتی ہیں۔ خادم اس لیے نہیں آیا تھا کہ زینڈ سوئمنگ میں مصروف تھی وہ جس حلیے میں سوئمنگ کر رہی تھی اسے دیکھ کر انسان مستقل لاجول کا درد ہی کر سکتا تھا۔ اس کے حلیے میں لباس نام کی چیز شامل نہیں تھی۔ میں دروازے پر رکا تو اس نے آواز دی۔ ”آ جاؤ شہباز ملک۔“

اس کے انداز میں پہنچ تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ آؤ اور میرا سامنا کرو۔ میں آگے آیا اور نارمل انداز میں پول اور آس پاس کا جائزہ لیا۔ ”کیا تم نے اپنا تیراکی کا انداز دکھانے کے لیے بلایا ہے تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنی اچھی تیراک ہو۔“

وہ کنارے کی طرف آئی۔ ”نہیں میں نے تمہیں بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔“

”کہو۔“

”تم بھی آ جاؤ پول میں پانی گرم ہے۔“ اس نے دعویٰ لہجے میں۔

”میرانی الحال تیراکی کا موڈ نہیں ہے۔“ میں نے انکار کیا۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا مگر اس طرح کہ اسے احساس نہ ہو۔

”اوکے۔“ وہ اچک کر کنارے بیٹھی تو میں نے نزدیک رکھا تو یہ اسے تھما دیا۔ مگر اس نے تویہ اپنے پیروں پر رکھ لیا۔ ”تم نے پاپا سے کیا بات کی ہے؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ میں نے خود کو اندر سے اس حد تک مضبوط کر لیا تھا کہ اب اس کا میرا جسم مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں تمہیں اس جنگلی لڑکی کی فکر ہے۔“ اس کے لہجے میں حسد آ گیا۔

”تم نے درست کہا کہ مجھے اس کی فکر ہے لیکن وہ جنگلی نہیں ہے۔“

”تم اسے پسند کرتے ہو؟“

”ایک ساتھی کی حیثیت سے..... میرا کچھ وقت اس کے ساتھ گزرا ہے۔“

”لیکن وہ تم پر مرتی ہے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”اگر کوئی تہذیب یافتہ عورت جو ساری دنیا دیکھے ہو کسی جاہل جنگلی لڑکی کی طرح میرے پیچھے پڑ جائے تو اس میں میرا قصور یقیناً نہیں ہوگا۔ نہ میں آگے بڑھا اور نہ ہی میں نے کوئی دلچسپی ظاہر کی۔“

وہ کھسکیا تھی۔ ”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں۔ اب تم صحیح سمجھا دو تا کہ میں اپنے اصل مقصد پر توجہ دے سکوں۔“

”اصل مقصد؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”اس قید سے چھٹکارا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے تو شبہ ہونے لگا ہے کہ ڈیوڈ شانے اسی لیے اوشا کو یہاں بلوایا ہے کہ میں اس کے اور تمہارے چکر میں پورا پڑ جاؤں۔“

وہ مسکرائی۔ ”ہو سکتا ہے کیونکہ پاپا بہت دور کی سوچتے ہیں۔“

”اس لیے تمہاری محدود سوچ دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ دنیا ایک آدمی کا نام نہیں ہے۔“

اس بار وہ سنجیدہ ہو گئی کیونکہ اس نے تولیہ کھول کر اپنے جسم کے خاص حصوں کی ستر پوشی کر لی تھی۔ ”شہباز میں پاپا کے مشن کے بارے میں جان گئی ہوں۔“

”ڈیوڈ شانہ میں بھی لے کر جا رہا ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں اس مہم میں شامل ہوں اگر چہ اسے پاگل پن سمجھتی ہوں۔“

”گو یا تم مجھ سے متفق ہو؟“

”اس حد تک کہ انسان کو اپنی جان اتنے خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ یہ مہم بہت زیادہ رسکی ہے۔“

”صرف تمہارا باپ نہیں اور لوگ بھی اس پاگل پن میں شامل ہیں۔“ میں نے راجا عمر دراز کا نام لے لیے بغیر کہا۔

”میں راجا عمر دراز کے بارے میں بھی جان گئی ہوں۔“

”وہ کینسر کے مرض کے ہاتھوں اپنے محل میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔“

”آخر ان لوگوں نے وہاں ایسا کیا دیکھا ہے جس کے لیے پاگل ہو رہے ہیں؟“

”کچھ تو ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”کیونکہ جو میں نے سنا ہے اسے ہمارے ہاں ظلم ہوش ربا اور مغرب

میں فیری ٹیل کہتے ہیں۔“

”میرا نہیں خیال کہ یہ سب سچ ہے۔“

”باوجود اس کے کہ تمہارے باپ جیسا عقلیت پسند اس میں شامل ہے اور اس پر پوری طرح یقین رکھتا

ہے۔“

”میرے باپ جیسے بہت سے لوگ چڑیلوں اور بھوتوں پر بھی یقین رکھتے ہیں۔“

”ان کا وجود ثابت نہیں ہوا ہے لیکن اس وادی کا ایک حقیقی وجود ہے۔“

”نا قابل یقین۔“ اس نے کہا۔ ”ہمالیہ کے برف زار کے عین وسط میں ایک ایسی وادی موجود ہے جہاں

انسان اور دوسرے جاندار رہتے ہیں اور موسم ان پر اثر نہیں کرتا ہے۔“

”کسی ممکنہ زلزلے سے ہمالیہ کے وسط میں یہ وادی وجود میں آئی اور اس کی گہرائی خاصی زیادہ ہے تم اسے

کنویں جیسا سمجھ لو۔ اس کی زمین کی بلندی بقول راجا عمر دراز کے سات آٹھ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہے اور وہاں سال میں صرف چار پانچ مہینے برف ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں معمولی بلند پہاڑی علاقوں میں پڑتی

ہے۔ گرمیوں میں خاصی گرمی بھی پڑتی ہے۔“

”وہاں تک رسائی بہت بلند پہاڑوں سے گزر کر ہوتی ہے؟“

”یہ درست ہے ممکنہ طور پر بائیس ہزار فٹ کی بلندی سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔“

”دنیا کا کوئی پہلی کا پٹراس بلندی تک نہیں جاسکتا ہے۔“ زینی نے ٹھنڈی سانس لی تو شاید انجانے میں تویہ نیچے سرک گیا۔ اس نے اسے واپس اوپر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ”یعنی سارا راستہ پیدل طے کرنا پڑے گا؟“

”میرا خیال ہے ڈیوڈ شا اس کا کچھ بندوبست کرے گا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”وقت کم ہے اور ہمیں جا کر واپس بھی آنا ہے۔ اگر دیر ہوگئی تو راستہ بند ہو جائے گا۔“

”پاپا کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں روانگی ہو سکتی ہے۔“

”اتفاق سے مجھ سے بھی یہی کہا ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”کیا تم اپنی مرضی سے جا رہے ہو؟“

”نہیں اور یہ بات میں نے ڈیوڈ شا سے بھی کہہ دی ہے۔“

اس نے مجھے گھورا۔ ”میں نے پاپا سے کہا تھا کہ تمہیں انجکشن دے کر لے جائیں مگر وہ نہیں مانے۔“

”وہ عقل مند آدمی ہے جانتا ہے کہ کوئی چیز بھی مجھ جیسے آدمی کو زیادہ دیر اپنے اثر میں نہیں رکھ سکتی ہے۔“

”شاید اسی لیے پاپا نے اس لڑکی کو یہاں بلایا ہے۔“ زینی کے لہجے میں ناپسندیدگی آگئی تھی اوشا کا ذکر کرتے ہوئے۔ دوسری طرف وہ بھی اس سے خار کھائے ہوئے تھی اور مجھ سے کہہ چکی تھی کہ وہ زینی کو کاٹ لے گی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میرا خیال ہے تم جان گئی ہو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں اس لیے تم بے فکر رہو، میں اوشا یا تمہارے چکر میں نہیں آؤں گا۔“

”تب اسے یہاں کیوں رکھا ہے؟“

”ڈیوڈ شا اسے ساتھ لے جانا چاہ رہا ہے؟“

”اسے بھی۔“ زینی چونکی۔ ”کیا تم راضی ہو؟“

”میرے راضی ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس وقت تو ڈیوڈ شا گیم ماسٹر ہے۔“ میں نے

کہا اور مجھے خیال آیا کہ بہ ظاہر تو ڈیوڈ شا اسے مجھے قابو رکھنے کے لیے ساتھ لے جا رہا ہے لیکن اس کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے ورنہ اوشا کی مدد سے مجھے قابو کرنا تھا تو وہ اوشا کو یہیں قید میں چھوڑ کر جاسکتا تھا۔ مگر وہ اسے لے کر جا رہا تھا تو کیا اس کا مقصد کچھ اور بھی تھا؟ اوشا عام انسان نہیں تھی۔ وہ کسی زہریلے سانپ سے بھی زیادہ زہر رکھتی تھی اور اگر وہ کسی کو کاٹ لیتی تو متاثر فرد دس منٹ میں دنیا سے گزر جاتا۔ میں نے زینی کی طرف دیکھا۔ ”تم جانتی ہو اوشا زہریلی ہے؟“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”کیا مطلب کہ زہریلی ہے؟“

”اس کے جسم میں زہر ہے اور وہ کسی کو کاٹ لے تو وہ مر سکتا ہے۔“

”اب تم کہانی سنارہے ہو۔“ وہ ہنسی تو تولیہ مزید سرک گیا اور مجھے نظریں چرانا پڑیں۔ ”تم مجھے اس سے ڈرا رہے ہو۔“

”یہ حقیقت ہے اور اب مجھے خیال آرہا ہے کہ تمہارے باپ نے اسے ایسے ہی یہاں نہیں بلایا ہے اور اسے بلاوجہ ساتھ لے کر نہیں جا رہا ہے۔“

”پاپا اسے زہریلی ہونے کی وجہ سے ساتھ لے جا رہے ہیں؟“ اس نے شک سے کہا۔ ”اول تو مجھے شک ہے کہ وہ زہریلی ہے۔“

”تم ڈیوڈ شا سے پوچھ سکتی ہو۔“

”مگر کیسے، ایک انسان کیسے زہریلا ہو سکتا ہے۔ زہر نے اسے ہلاک کیوں نہیں کیا؟“ سوال سے زیادہ یہ اس کی خواہش لگ رہی تھی۔ میں نے اسے مختصر بتایا کہ اوشاک کی پرورش کیسے ہوئی تھی اور اس کا باپ نہ صرف حکیم بلکہ سانپوں کا بھی ماہر تھا اسی نے اپنی اکلوتی اولاد کو بچپن سے جڑی بوٹیوں کے ساتھ زہر دے کر بڑے ہونے تک بے انتہا زہریلا بنا دیا تھا۔ زینی خاموشی سے سنتی رہی مگر اس کے تاثرات میں شک بہت نمایاں تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ ابھی اور تولیہ وہیں چھوڑ کر ایک طرف موجود اپنے لباس کی طرف بڑھی۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ بہت عجیب سی چال چلتی میری گاڑی کی طرف آرہی تھی۔ مگر وہ خاص چال تھی۔ اس وقت وہ نارمل انداز میں چل رہی تھی مگر اس کی یہ چال بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں فتنہ بدن قرار دیا جاتا ہے، ان کے بدن کی ہر جنبش مرد کے ہوش اڑا سکتی تھی۔ اس نے کسی قدر سستی سے کپڑے پہن کر میری طرف دیکھا۔

”چلو مجھے ثبوت کے ساتھ دکھاؤ۔“

میں نے انکار کیا۔ ”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں ثبوت دینے کی۔“

”لیکن میں تو ثبوت چاہتی ہوں۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی۔ ”تم نے کہا تا کہ وہ کسی انسان کو کاٹ لے تو وہ مر سکتا ہے۔“

”تمہارا دماغ درست ہے، کیا تم ثبوت کے لیے کسی کی جان لوگی؟“

”نہیں مگر تم نے ہی.....“

”وہ کوئی تماشا نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”آخر تم اسحاقانہ ضد کیوں کر رہی ہو۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”اوکے تم مجھے مت دکھاؤ مگر میں تصدیق کر کے رہوں گی۔“

اس سے بحث بیکار تھی اس لیے میں نے بات بدل دی۔ ”جب تم مجھ سے ملی تھیں اور شیرخان اور کپنی کے ساتھ تھیں تو تم روسی لہجے میں انگریزی بول رہی تھیں اور جب تم افغانستان پہنچیں تو یک دم تمہارا لہجہ مغربی ہو گیا اور تم ٹی اور ٹی میں واضح فرق کرنے لگیں۔“

”کیونکہ میرا شیرخان کو یہی تاثر دے رہی تھی کہ میرا تعلق مشرقی یورپ سے ہے۔“

”تو کیا نہیں ہے؟“

”بالکل ہے میں جا رہی ہوں لیکن اب میں اپنی حقیقت جان گئی ہوں اور میں نے بہت عرصہ امریکا

میں گزرا ہے۔“

وہ دیکھنے میں چوبیس بجیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی مگر اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ اس کے تجربات اس کی عمر سے کہیں زیادہ تھے۔ ”تمہیں کب علم ہوا کہ ڈیوڈ شامہارا باپ ہے؟“

”تین سال پہلے۔“ اس نے کہا۔ ”اس وقت میں یورپ میں تھی اور اس کی تلاش میں تھی۔“

”اگر تمہاری زندگی کے ابتدائی واقعات درست ہیں تو تم نے قابل رشک حد تک اپنی شخصیت بنائی ہے۔“

”میں نے سب اسی دوران میں سیکھا ہے اور یقین کرو دنیا سے بڑھ کر کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ میں انگریزی، روسی اور جارجین کے علاوہ فرنجی، اردو اور جرمن زبان بھی جانتی ہوں۔ اردو تم دیکھ چکے ہو باقی زبانوں میں بھی تقریباً ماہر ہوں۔ اسلئے کے استعمال کی ماہر ہوں۔ سیلف ڈیفنس جانتی ہوں۔ میں نے اس مشکل دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بہت کچھ سیکھا ہے۔“

”درحقیقت اب تم نے مجھے متاثر کیا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”ریلی۔“ وہ خوش ہو گئی۔

”ہاں لیکن اس انداز میں نہیں جس انداز میں تم اب تک مجھے متاثر کرنے کی کوشش کرتی آئی ہو۔ میں خود سیلف میڈ ہوں اور ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہوں جو سیلف میڈ ہوں اور دنیا کی مشکلات سے ہار نہ مانتے ہوں، چاہے وہ میرے مخالف گروہ سے کیوں نہ ہوں۔“

”یقین کرو میں تمہاری مخالف نہیں ہوں بلکہ جب سے میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے میں تم سے اپنائیت محسوس کرنے لگی ہوں۔“

اس کا تو میں بھی گواہ تھا کہ اس نے یہ احساس دلانے کی پوری کوشش کی تھی۔ شاید یہ اس ابتدائی ناکامی کا رد عمل تھا جب اس نے مجھے رجھانے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہی تھی۔ ”تم نے کیا سنا ہے؟“

”پاپا سے..... تم یقین کرو وہ تمہیں بہت اہم آدمی سمجھتے ہیں صرف اس لیے نہیں کہ تم اس مہم کے لیے ضروری ہووہ اس سے ہٹ کر بھی تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں اور تمہیں ایشل پرن قرار دیتے ہیں۔“

”وہ صرف ’ایشل پرن‘ قرار نہیں دیتے ہیں بلکہ انہوں نے مجھے بنانے کی بھی پوری کوشش کی۔“

”وہ ہنسی۔“ تمہاری یہ بات بھی اچھی لگتی ہے کہ تم کسی حال میں ٹینس نہیں ہوتے۔“

”یہ تم سے کس نے کہا کہ میں ٹینس نہیں ہوتا، ہاں ظاہر نہیں کرتا اور بعض اوقات ہنسی اور استہزا میں اپنی ٹینشن چھپاتا ہوں۔“

”میں سمجھتی ہوں آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ وہ بولی اور پھر انجان بن کر کہا۔ ”تم اس لڑکی کو.....“

”اس کا نام اوشا ہے۔“

”او کے اوشا کو اپنے ساتھ لے گئے ہو اب وہ تمہارے پاس رہے گی؟“

”میرے پاس رہے گی لیکن دوسرے کمرے میں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ویسے اگر وہ میرے کمرے میں رہے تب بھی تمہیں کیا اعتراض ہے؟“

”کوئی نہیں۔“ اس نے فراخ دلی سے کہا۔ ”تم اپنے معاملات میں آزاد ہو۔“
 ”تھینک یو۔“ میں نے سادہ طنز کے ساتھ کہا۔ ”کیا خیال ہے باہر نہ چلیں۔“
 ”اگر تم چاہو تو یہ پول اور جم استعمال کر سکتے ہو۔“

”میرا خیال ہے اتنا وقت نہیں ہے۔“ میں نے انکار کیا۔ ”ڈیوڈ شا پہلے ہی ایک دودن کا کہہ چکا ہے۔“
 میں اس کی چالاکی سمجھ رہا تھا، وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اوشا کو کیوں ساتھ لایا تھا اور اسے یہ جان کر
 اطمینان ہوا تھا کہ وہ الگ کمرے میں رہے گی۔ زینی اتنا تو سمجھتی ہوگی کہ وہ زہریلی تھی اور کوئی مرد اس کے پاس
 نہیں آ جاسکتا تھا۔ جو ایسی جسارت کرتا وہ موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرے
 پاس اوشا کا وجود بہ مشکل ہی برداشت کر رہی تھی۔ اگرچہ میں ڈیوڈ شا کو خبردار کر چکا تھا اور زینی کو بھی سمجھا دیا تھا
 کہ اوشا میری ساتھی ہے اس کے باوجود میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ بہت شاطر عورت تھی جو گھاٹ
 گھاٹ کا پانی پی چکی تھی اور اس کے ظاہر سے اس کے باطن کا درست اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ پھر وہ ڈیوڈ شا
 جیسے شخص کی بیٹی تھی اس کی کچھ نہ کچھ فطرت اس میں آئی ہوگی۔ اس لیے میں نے سرسری سے انداز میں اسے
 بتا دیا کہ اوشا میرے لیے جنس سے قطع نظر صرف ایک ساتھی تھی اور مجھے اسی لحاظ سے اس کا بہت زیادہ خیال تھا۔
 میں اپنے ساتھیوں کو اہمیت دینے والا شخص ہوں۔ میں اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کو معاف کر سکتا ہوں لیکن
 اگر کوئی میرے ساتھی کو نقصان پہنچائے تو میں اسے کسی صورت معاف نہیں کرتا۔

ہم باہر آئے تو سورج ڈھل رہا تھا۔ دن کے وقت یہاں کسی قدر گرمی تھی مگر اب ہوا خشکی لیے ہوئے اور
 مخصوص پہاڑی نباتات اور پھولوں کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ زینی نے چائے کی دعوت دی مگر مجھے اوشا کی فکر ہو
 رہی تھی کہ وہ میری غیر موجودگی سے پریشان ہو کر باہر نہ نکل آئے اور اگر اسے روکا گیا تو وہ غصے میں بھی آسکتی
 تھی۔ اس لیے میں نے انکار کیا اور روانہ ہو گیا۔ زینی شاید میرے ساتھ مزید وقت گزارنا چاہتی تھی مگر میں نے
 روانہ ہوتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ بھی ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کے معاملے میں کبھی ہار نہیں مانتی
 ہیں اور اپنی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ مجھے اس سے پہلے بھی ایسی عورتوں سے واسطہ پڑ چکا تھا اور میں ان کو ہینڈل
 کرنا جانتا تھا۔ اس لیے پہلے میں نے اس سے بے تکلفانہ رویہ رکھا مگر جب اس کے پاس سے روانہ ہوا تو اسے
 بالکل نظر انداز کر دیا اور وہ میرے پیچھے نہ آسکی اور نہ ہی مجھے روک سکی۔ وہ مجھے گھورتی رہ گئی تھی اور مجھے اس کی
 نظروں کا دیرینک احساس ہوتا رہا تھا۔



حسبِ توقع اوشا بے تاب اور کسی قدر غصے میں تھی مجھے دیکھتے ہی لگی اور میرا بازو پکڑ لیا۔
 ”کہاں تھارے؟“

”ڈیوڈ شا سے بات کر رہا تھا۔“ میں نے نرمی سے کہا اور بازو چھڑا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”وہ حرامبادی تو نہیں ملی؟“

”ملی تھی۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ تم سے دور رہے۔“
 ”مجھ سے نہیں تجھ سے دور رہے۔“ وہ بولی۔ ”میرے پاس آئی تو ماری جائے گی۔ میں اسے کاٹ لوں

گی۔“

میں نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ ”تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گی اس سے میرے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔“

وہ فرش پر میرے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور اپنا سر میرے گھٹنوں پر ٹکا لیا۔ ”شہباز کوئی تیرے پاس آئے ہم سے برداشت نہیں ہوتا ہے۔“

”تم جانتی ہو میں کس قسم کا آدمی ہوں اس لیے فکر مت کیا کرو۔“

اس نے سراٹھا کر دیکھا۔ ”جانتی ہوں رے پرٹو عورت کا چلتیر نہیں جانتا۔“

”جان گیا ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم عورتوں نے بتا دیا ہے کہ ایک مرد کے پیچھے تم لوگ کتنی دور

نکل جاسکتے ہو۔“

”ٹو مجھے دوسری عورتوں کی طرح سمجھتا ہے رے؟“ اس نے شکوہ کیا۔

”نہیں ورنہ ٹو میرے پاس نہ ہوتی۔“

”شہباز میں یہاں تیرے ساتھ رہوں گی؟“

”نہیں اس کمرے میں تم رہو گی میں برابر والے کمرے میں رہوں گا۔“

”یہاں کیوں نہیں رے؟“ وہ بے چین ہو گئی۔

”یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ میں نے سمجھایا۔ ”ٹو جانتی ہے مرد اور عورت کا پاس رہنا ایسا ہی ہے جیسے آگ

اور پیٹرول ایک جگہ ہوں۔“

وہ افسردہ ہو گئی۔ ”ٹو ٹھیک کہہ رہا ہے..... میں وٹ کنیا ہوں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”شہباز باہر چل میرے

ساتھ۔“

”آؤ موسم بھی اچھا ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے پڑ سکون سے بیٹھنے کی بجائے اس

جگہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ ٹھیک ہے میں باہر نہیں جاسکتا تھا مگر مجھے کسی بھی ہنگامی حالت کے لیے تیار رہنا چاہیے

تھا۔ ہم باہر آئے۔ لان، پھولوں کے تختوں اور روشوں پر ٹپلتے ہوئے ہم پورے پیلس میں گھومنے لگے۔ اوشانے

میرا مقصد بھانپ لیا تھا اس لیے وہ ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز ادھر کوئی دیکھ تو نہیں رہا

ہے۔“

”یہاں دوسرے طریقے سے نگرانی کی جارہی ہے۔ وہ دیکھو دیواروں پر تاریں لگی ہیں۔ ان میں کرنٹ

ہوگا۔ دیواریں بھی اونچی ہیں۔ ان پر کیمرے بھی لگے ہیں۔ یہاں یقیناً ٹریپ بھی ہوں گے۔“

”وہ کیا ہوتے ہیں؟“

میں اسے سمجھانے لگا کہ ٹریپ کیا ہو سکتے ہیں اور آدمی بے خبری میں ان کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ ڈر گئی اس

نے سہمی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ ”اتنے کمزراک ہوتے ہیں رے۔“

”اس لیے بہت احتیاط کرنا۔ یاد رکھنا اگر میں کہیں چلا جاؤں اور تمہیں میرے بارے میں معلوم نہ ہو تب

بھی تم اپنے طور پر باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرو گی۔“

”تو کم ہوا تو میں رہ نہ سکوں گی۔“ اس نے انکار کیا۔ ”میں آگ کے دریا میں کود جاؤں گی۔“

”ایسا ہو گا نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں صرف ایک امکان کا کہہ رہا ہوں۔“

اس نے چلتے ہوئے ایک جھاڑی سے پھولوں کا گچھا توڑا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ”میرے بالوں میں لگاتا۔“

میں نے لے کر اس کے بالوں میں اٹکا دیا۔ سرخ رنگ کے پھول اس کے بالوں میں اچھے لگ رہے تھے مگر میری توجہ اوشا کی بجائے ایک جھاڑی کے عقب میں موجود شخص کی طرف گئی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر چھپنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی۔ میں جھاڑی کی طرف بڑھا تو اس کے پیچھے کوئی نہیں تھا مگر کسی کی جھلک پھر دکھائی دی اور اس بار وہ شخص ایک دیوار کے عقب میں غائب ہو رہا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگرچہ مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ ہماری نگرانی نہیں ہو رہی ہے اور ہمیں ایسے ہی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ اس کا امکان تھا کہ دور سے ہماری آلات کی مدد سے نگرانی ہو رہی ہو۔ مگر اب تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی کو براہ راست نگرانی کرتے پایا تھا۔ وہ سیاہ بالوں اور چھوٹے قد والا شخص تھا میں اس کے نقوش تو نہیں دیکھ سکا تھا مگر مجھے لگا کہ وہ نیپالی نقوش کا حامل شخص ہے۔ اوشا پیچھے رہی تھی اس نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”ہماری نگرانی ہو رہی ہے۔“ میں نے واپس آتے ہوئے کہا۔

”قید کیا ہے تو نگرانی تو کریں گے۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”آؤ اندر چلتے ہیں۔“ میں نے واپسی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ہم عمارت میں واپس آئے۔ مجھے کچھ بے چینی سی ہو رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس شخص نے جان بوجھ کر خود کو نمایاں کیا تھا۔ جیسے وہ جتنا چاہ رہا ہو کہ ہم کھلے نہیں چھوڑ دیئے گئے ہیں بلکہ ہماری نگرانی ہو رہی ہے۔ ورنہ اسے یوں اپنی جھلک دکھانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ابھی ڈنکا وقت نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے خادم سے کچھ ہلکی پھلکی چیزیں لانے کو کہا۔ اس کے جانے کے ایک منٹ بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ خادم اتنی جلدی واپس نہیں آ سکتا تھا میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کون ہے کہ دروازہ کھلا اور میرے سامنے ایک چھوٹے قد کا اور نیپالی نقوش والا شخص کھڑا تھا جس کے بال سیاہ تھے۔ میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے میں کچھ کہتا اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر تیزی سے اندر آیا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا تھا کہ اس کی آہٹ بھی نہ ہو۔ میں چونکا تھا اور اوشا بھی ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تھا مگر میں نے نفی میں سر ہلا کر اسے بتایا کہ میں بھی نہیں جانتا ہوں۔ اس شخص کا انداز مشکوک تھا مگر مجھے اس سے خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ آگے آیا تو میں اس کے اور اوشا کے درمیان میں آ گیا۔ نزدیک آ کر اس نے ہاتھ آگے کیا تو اس پر ایک چھوٹا اور نارمل ہٹن والا موبائل تھا۔ اس کی اسکرین آن تھی اور اس پر میسج لکھا ہوا تھا۔ اس نے اشارے سے کہا کہ میں میسج پڑھوں، میں نے لے کر پڑھا۔

”یہ میرا آدمی ہے اور میں نے اسے خاص طور سے تم سے رابطے کے لیے بھیجا ہے۔ اس سے یہ موبائل

لے لو اور اپنے پاس چھپا لو موقع پا کر مجھ سے رابطہ کرنا۔ اے شا۔“

میں نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا کر پیغام کی تصدیق کی تھی۔ اے شا سے سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ یہ پیغام اور آدمی ایمن کی طرف سے آیا تھا۔ اس دوران میں کسی نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس شخص نے ایک مختصر سا چارجر نکال کر میرے حوالے کیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے اجازت لی اور میں نے سر ہلایا تو وہ تیزی سے واپس چلا گیا۔ اس نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا اور بند کیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اوشا میری طرف آئی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے اشارے سے منع کیا کہ اس بارے میں کوئی بات نہ کرے۔ وہ سمجھ گئی اور سر ہلایا تو میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے وہ نمبر دیکھا جس سے پیغام آیا تھا اور اسی پر جوابی میسج کیا۔ ”کیا ثبوت ہے کہ تم ایمن ہو اور یہ آدمی تمہارا بھیجا ہوا ہے؟“

چند لمحے بعد جواب آیا۔ ”تم کال کرو مگر بولنا مت میری آواز سننا، میری آواز تو نہیں بھولے ہو گے۔“ میں نے والیوم کم کر کے اس نمبر پر کال کی اور ایمن نے کال ریسپونڈ کی اور بولی۔ ”شہباز کیسے ہو..... کتنا عرصہ ہو گیا تم سے بات کیے اور تمہیں دیکھے بغیر..... مگر میں یہیں ہوں اور تم سے زیادہ دور نہیں ہوں..... مجھے معلوم ہے تم کہاں ہو اور کس کے قبضے میں ہو..... مگر اطمینان رکھو جلد تم آزاد ہو گے..... شہباز ڈیوڈ شا کی طرف سے بہت ہوشیار رہتا وہ صرف تمہیں استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد وہ تمہارا نشان مٹانے کی پوری کوشش کرے گا۔“

میں نے کال کاٹ دی اور اسے میسج کیا۔ ”اب مجھے یقین آ گیا لیکن تمہیں یہاں میری موجودگی کا کیسے علم ہوا؟“

”مجھے مانی نے بتایا ہے۔“ ایمن کے جواب نے مجھے حیران کیا۔

”مانی جو میرا ساتھی ہے؟“

”ہاں اسی نے مجھے تلاش کیا اور پھر رابطہ کیا۔ میں ان دنوں اپنی ہمالیہ سیریز کے شوٹ کے لیے یہاں انڈیا آئی ہوں۔“

”تم نے رانا دیاس سے بھی رابطہ کیا تھا؟“

اس بار وہ حیران ہوئی۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”اوشا میرے پاس ہے اسے میں نے رانا دیاس کے پاس بھیج دیا تھا مگر اسے میرے نام کا دھوکا دے کر ڈیوڈ شانے وہاں سے نکلوا لیا اب وہ بھی یہاں قید ہے۔“

”میں اس کے بارے میں جانتی ہوں، رانا دیاس نے بتایا تھا لیکن مجھے یہ علم نہیں کہ وہ تمہارے پاس پہنچ گئی ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں کہاں ہوں اور ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہوں۔“

”میں نے ڈیوڈ شا کو تلاش کیا اور اسے تلاش کرنا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میڈیا میں ہونے کی وجہ سے میری یہاں واقفیت ہے اور میں نے اسے استعمال کیا۔“

”تم نے اس آدمی کو اندر تک کیسے بھیجا؟“

”یہ اصل میں اندر کا آدمی ہے اور برسوں سے اس پبلیس میں ملازم ہے۔ میں نے اسے استعمال کیا ہے۔“

”تم نے اسے استعمال کیا ہے اور اگر اس نے اپنے مالکوں کو بتا دیا تو؟“

”نہیں بتائے گا۔ وہ اپنے مالکان سے نفرت کرتا ہے۔ انہوں نے اس کی اکلوتی بیٹی کے علاج کے لیے مدد دینے سے انکار کر دیا اور وہ مر گئی۔ اسی لیے وہ اتنی آسانی سے ہمارے لیے کام کرنے کو تیار ہو گیا۔“

میرا ذہن اتنی آسانی سے ایمن کی بات تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ میں بہت عرصے سے اس دشت کی سیاحتی میں تھا اور مجھے معلوم تھا یہاں سراب زیادہ تھے اور حقیقت بہت کم۔ عین ممکن ہے ایمن جس شخص کو اپنا آدمی سمجھ کر استعمال کر رہی ہو وہ اصل میں ڈیوڈ شا کا آدمی ہو اور وہ اس کے جال میں آ رہی ہو۔ اگر وہ سچ بھی اپنے مالکان سے غداری کر رہا تھا تب بھی اس کا چھپنا قرین قیاس نہیں تھا۔ وہ پکڑا جاسکتا تھا اور اس کے بعد اسے حقیقت اگلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو ایمن نے کہا: ”تم فکر مت کرو میں نے پکا کام کیا ہے۔“

”کیا تمہیں رانا دیاس کی مدد حاصل ہے؟“

”نہیں، میں نے اس بارے میں کسی پر اعتبار نہیں کیا ہے تم جانتے ہو یہاں تم کتنے شدید خطرے میں ہو۔ اگر تم پکڑے گئے تو بچنا بہت مشکل ہوگا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے جواب لکھا۔

”اسی لیے میں نے تمہارے معاملے میں کسی مقامی شخص پر اعتماد نہیں کیا ہے۔“

”اس شخص کو تو معلوم ہے جس نے مجھے موبائل لاکر دیا ہے۔“

”اسے صرف اتنا معلوم ہے کہ اسے یہاں قید شخص کو موبائل لے جا کر دیتا ہے وہ تمہاری شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہے۔“

”جو تمہاری مدد کر رہے ہیں؟“

”وہ بھی نہیں جانتے ہیں صرف میں اور میرا ایک ساتھی جانتا ہے۔ وہ میری ٹیم کا حصہ ہے۔“

”تم جانتی ہو ڈیوڈ شا کا کیا پلان ہے؟“

”ہاں میں جانتی ہوں۔ وہ ہالیائی وادی کی طرف جانے کی تیاری کر رہا ہے۔“

”وہ تیاری کر چکا ہے۔“ میں نے تھج کی۔ ”ایک یا دو دن میں وہ روانہ ہونے والا ہے۔“

”شہباز۔“ وہ بے چین ہو گئی۔ ”تم اس کے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ یہ خودکشی ہوگی۔“

”میں مجبور ہوں اور اس کے قبضے میں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں جس جگہ قید ہوں یہاں بہ ظاہر کوئی سکیورٹی نہیں ہے لیکن میرا نہیں خیال کہ میں یا کوئی بھی یہاں سے آسانی سے نکل سکتا ہے۔ دوسرے میں اندھا میں ہوں اور یہاں مجھے زیادہ خطرات ہیں۔ میں اندھا دھند یہاں سے نکل کر بھارتیوں کو اپنے پیچھے نہیں لگانا چاہتا ہوں۔“

”میں بھی اس بات کو سمجھتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں کوشش کر رہی ہوں کہ تمہیں یہاں سے نکالنے کا بندوبست کروں اور اس کے بعد تمہیں آزاد کرانے کی کوشش کروں۔“

”تم زونیا عرف زینی کے بارے میں جانتی ہو؟“

”نہیں یہ کون ہے؟“

”تمہاری کزن اور ڈیوڈ شا کی ناجائز بیٹی۔“ میں نے انکشاف کیا۔ ”اس کی ماں ایک جارجین عورت تھی جس سے ڈیوڈ شا کے تعلقات مختصر مدت کے لیے رہے اور اس کے نتیجے میں زینی وجود میں آئی۔“

ایمن حیران ہوئی تھی۔ ”تم اس سے ملے ہو؟“

”وہی تو مجھے اغوا کر کے لائی ہے۔“ میں نے کہا اور مختصر ایمین کو بتایا کہ مجھے کس طرح پاکستان سے پہلے افغانستان اور پھر انڈیا لایا گیا۔ اس میں ڈیوڈ شا نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا تھا۔ ایمین نے نفرت سے لکھا۔

”آخر ہے نا ڈیوڈ شا کی اولاد۔“

ایمن کے ایموشن کا مجھے یوں پتا چل رہا تھا کہ وہ میسج میں سائن بھی بنا رہی تھی۔ میں نے آخر میں پوچھا۔

”کیا تمہارا میرے ساتھیوں سے رابطہ ہے؟“

”بالکل ہے۔“ اس نے کہا۔

”تب انہیں میرے بارے میں بتا دو اور یہ نمبر دے دو۔“ میں نے کہا۔ ”مگر چیویشن بتا دینا۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ ایمین نے کہا۔

”اس موبائل میں پیلنس ہے؟“

”تم اس کی فکر مت کرو، پیلنس بہت ہے اور اس کی بیٹری بہت چلتی ہے اور جلدی چارج ہو جاتی ہے۔ میں نے خاص طور سے اسی لیے یہ سیٹ بھیجا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اب تم موبائل نیل اور ٹونز آف کر کے کہیں چھپا دو اسے زیادہ استعمال کرنا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”اوکے بائے۔“ میں نے کہا کہ موبائل جیب میں رکھ لیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور خادم اجازت لے کر ٹرائی سمیت اندر آیا۔ چائے کے ساتھ گھر میں بنی ہوئی چیزیں تھیں۔ وہ ٹرائی رکھ کر سرود کرنے لگا تو اوشانے اس سے کہا۔

”ٹو جا رہے۔ میں دیکھ لوں گی۔“

وہ سر جھکا کر چلا گیا اور اوشا چائے بنانے لگی اور پھر اس نے چیزیں نکالیں۔ وہ جتنے سلیقے اور طریقے سے یہ کام کر رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس نے بھوکے ہونے کے باوجود پہلے سب میرے سامنے رکھا اور پھر اپنے لیے نکالنے لگی۔ میں رکا ہوا تھا تو اس نے کہا۔ ”ٹو کھارے۔“

”تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔“ میں نے کہا تو وہ خوش نظر آنے لگی۔ اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھی مگر اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ممکنہ طور پر ہماری باتیں سنی جا رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں سے کیسے رابطہ کروں۔ خادم کے جانے کے بعد میں نے موبائل نکال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کچھ دیر بعد میسج آیا تو میں نے کھولا۔ میسج ویسک کی طرف سے تھا۔

”اُف آپ پھر دشمن دیس پہنچ گئے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”بس باری قسمت۔ باقی سب خیر ہے نا؟“

”کبھی خیر جناب، ہمارا تشویش سے اور خواتین کا رورو کر برا حال ہے۔“

”ان کو تسلی دے پار۔“ میں نے کہا۔

”میں تو خود کو تسلی نہیں دے پار ہاتھ انہیں کہاں سے دیتا۔ اب ذرا اطمینان ہے مگر آپ ہیں کہاں؟“

”میں ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہوں اور وہ مجھے وادی کی طرف لے جانے پر تلا ہوا ہے اس بار کوئی راہ مفر نظر

نہیں آرہی۔“

”آپ فکر نہ کریں جناب وہ اتنی آسانی سے کامیاب نہیں ہوگا۔ اب ہم بے خبر نہیں ہیں۔“

”کیا ارادہ ہے؟“

”ظاہر ہے ہم آپ کو اس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔“

”وہی میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا ارادہ ہے؟“

”آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا ارادہ ہو سکتا ہے۔“

”میں اس کی تائید نہیں کروں گا۔ کم سے کم تم یہاں جانے پہچانے فرد ہو میری طرح۔“

”ہم فی الحال سوچ رہے ہیں اور راستے تلاش کر رہے ہیں۔ سفیر اور میں کل ہی واپس آئے ہیں۔ عبداللہ

پہلے سے یہاں موجود تھا یہ اسی کی چھٹی حس تھی کہ اس نے مانی سے کہا کہ وہ ایمن شا کو تلاش کرے کیونکہ شبہ ڈیوڈ

شا پر جا رہا تھا اور اس کا پاکستان میں کوئی سراغ نہیں لگ رہا تھا۔ ایمن نے بتایا ہے کہ آپ وہاں تک کیسے پہنچے؟“

”ڈیوڈ شا کی دختر بد اختر نکل آئی ہے اور اسی نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ کہتے ہیں ناپوت کے پاؤں

پالنے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں بیٹی نے ثابت کیا کہ وہی ڈیوڈ شا کی وارث ہے۔“

”یقیناً آپ کے چکر میں بھی ہوگی۔“ وسیم نے لکھا تو میں جھینپ گیا۔

”یاران خواتین نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ ڈیوڈ شانے او شا کو بھی یہیں بلوایا ہے۔“ میں نے

فریادی۔

”اس نے آپ کو صحیح ذخیریں ڈالی ہیں۔“ وسیم نے لکھا اور آگے ہنسنے کا سائن بنایا۔

”اوشا کے حوالے سے مجھے لگ رہا ہے ڈیوڈ شا کسی اور چکر میں ہے کیونکہ وہ اسے وادی کی طرف لے جا

رہا ہے۔“

”وہ جائے گی؟“

”اس کا تو کہنا ہے کہ میرے ساتھ نہ کہ میں بھی ہنسی خوشی جائے گی۔“

”ہا ہا ہا، آپ ٹھیک چکر میں پڑے ہیں۔ اللہ رحم کرے۔“

”بہت شوخیاں سو جھ رہی ہیں۔ بیٹے خود اس چکر میں پڑو گئے تب پتا چلے گا۔“

”جی بات ہے چند گھنٹے پہلے تک تشویش سے برا حال تھا۔ ہنسنا تو دور کی بات ہے مسکرا بھی نہیں رہا تھا۔

اب آپ کی خیریت کی اطلاع ملی ہے تو جان میں جان آئی ہے۔“

”حالا تک تم لوگوں کو اب تک عادی ہو جانا چاہیے۔“

”نہیں ہو سکتے جناب، آپ کی طرف سے ہمیشہ تشویش رہتی ہے۔“

”مرشد اینڈ کمپنی کا کیا حال ہے؟“

”اس محاذ پر مکمل خاموشی ہے۔“

”اندرون خانہ کوئی کچھڑی پک رہی ہے؟“

”نہیں میں نے آدمی لگائے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ فی الحال سب امن و سکون ہے۔ فتح خان کا پتا چلا تھا۔ آپ نے بالآخر اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ کر لیا۔“

”ہاں یار۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا اور کال مت کرنا۔“

”میں سمجھ رہا ہوں جناب، آپ بھی محتاط رہیں اور اپنا خیال رکھیں۔“

میں نے وسیم، سفیر اور دوسرے لوگوں کے انڈیا آنے یا نہ آنے پر زیادہ بات اس لیے نہیں کی کہ ابھی تو ان کو علم ہوا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بیگ اٹھا کر انڈیا کا رخ کرتے۔ سیدھے راستے سے آنا مشکل اور ریسکی تھا اور کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنے میں وقت لگتا۔ حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے اور میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ شاید ان لوگوں کے یہاں آنے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ میں نے موبائل واپس رکھا تو اوشاب بے چین لگ رہی تھی اس نے اشارے سے کہا کہ میں اسے بھی صورت حال سے آگاہ کروں۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے اس نے اب تک غیر معمولی مہر محفل کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے سوچا اور اس سے کہا۔ ”کیا خیال ہے باہر کا ایک چکر اور نہ لگائیں؟“

”میں بھی یہی کہہ رہی ہوں رے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”اندروم گھٹ رہا ہے۔“

ہم باہر آئے جہاں سورج غروب ہونے کے بعد تاریکی اپنا پر پھیلا چکی تھی اور اب ہوا میں خنکی تھی۔ روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ میں اوشا کو ایک ایسی جگہ لایا جہاں کسی قدر فاصلے تک نہ تو کوئی تعمیر تھی اور نہ ہی کوئی درخت یا جھاڑی تھی جہاں مائیک کی موجودگی کا شبہ کیا جاسکے۔ اس کے باوجود میں نے تقریباً زپرلب اور مبہم الفاظ میں اوشا کو بتایا کہ مجھ سے میرے ساتھیوں نے رابطہ کیا تھا۔ جب ایمن بات کر رہی تھی تو اوشا فاصلے پر تھی اور اس نے اس کی آواز نہیں سنی تھی اور نہ ہی وہ میج پڑھ سکتی تھی۔ اس لیے اسے ایمن کے بارے میں علم نہیں تھا اور نہ ہی میں نے مناسب سمجھا کہ اسے ایمن کے بارے میں بتاؤں۔ وہ پہلے ہی زہنی سے بھڑکی ہوئی تھی ایمن کے بارے میں پتا چلتا تو نہ جانے اس کا رد عمل کیا ہوتا؟ وہ خوش ہو گئی کہ میرے ساتھیوں نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔ ”وہ تجھے یہاں سے نکال سکتے ہیں؟“

”ہاں لیکن ابھی وہ یہاں نہیں ہیں اور جب تک وہ یہاں آئیں گے پتا نہیں ہم یہاں ہوں گے بھی یا نہیں۔“

اوشا بخیدہ ہو گئی۔ ”شبباز ایک وعدہ کر۔“

”کیسا وعدہ؟“

”یہی کہ اگر یہاں سے بھاگنے کا موقع آیا تو تو میری پروا نہیں کرے گا اور یہاں سے نکل جائے گا۔“

”تم مجھے بے غیرت سمجھتی ہو۔“ میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”تم میری پناہ میں ہو اور میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں اس کے بعد کیا میں کبھی خود کو غیرت مند سمجھ سکوں گا۔“

”میں سمجھتی ہوں رے.....“

”جب سمجھتی ہو تو ایسی فضول بات کیوں کی۔ ہمارے ہاں عورتوں کی عزت کے لیے مرنا مارنا بہت آسان سمجھا جاتا ہے۔“

مجھے حقیقت میں غصہ آ گیا تھا۔ اوشا میرے تاثرات سے ڈر گئی۔ ”مجھے شاکر دے۔“

”اب ایسی بات مت کہنا۔“

”بالکل بھی نہیں رے۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”تو ایسا نہ ہوا کر مجھے ڈر لگتا ہے رے۔“

”تب میری بات مانا کر۔“ میں نے کہا اور نارمل ہوا تو اوشا کی جان میں جان آئی تھی۔ ہم کچھ دیر ٹہلتے رہے اور اس بار بھی ہمیں کوئی نظر نہیں آیا۔ حالانکہ اس بار ہم نے تقریباً پچیس گھوم لیا تھا مگر اکاؤنٹ کا گھومتے خامدوس کے سوا کوئی نظر نہیں آیا۔ البتہ جب مین گیٹ کے پاس آئے تو وہاں پہلی بار سکیورٹی گارڈز دیکھے اور یہ بڑے مستعد قسم کے کمانڈوز اسٹائل کے سکیورٹی گارڈز تھے۔ دوسرا منے تھے اور یقیناً کئی اس چوکی میں تھے جو گیٹ کے ساتھ بنی ہوئی تھی۔ عجیب بات تھی کہ پورا پچیس دیکھنے کے دوران میں مجھے کہیں کوئی گاڑی نظر نہیں آئی یقیناً گاڑیاں کسی جگہ رکھی جاتی تھیں جہاں ہر ایک کی ان تک رسائی نہیں تھی۔ پچیس کی چار دیواری کم سے کم بارہ فٹ بلند تھی اور اس پر مزید چار سے پانچ فٹ تک اینگول پر تین قطاروں میں خاردار بازنگی تھی۔ دیوار کے آس پاس کوئی ایسا درخت یا چیز نہیں تھی جس کی مدد سے دیوار پر چڑھا جاسکتا۔ تمام عمارات احاطے کے تقریباً وسط میں تھیں۔ پھر پوری دیوار کھلی ہوئی اور دور سے بھی صاف نظر آتی تھی۔ یقیناً اس طرح سے کیمروں سے نگرانی آسان ہو جاتی تھی۔

میں جتنا پچیس دیکھ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ یہاں حفاظت اور نگرانی کا نہایت جدید اور فول پروف نظام کام کر رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ تمام سسٹم مکمل طور پر پوشیدہ تھا اور یہ اندازہ لگانا نہایت دشوار تھا کہ حفاظتی نظام کیا کیا اور کہاں کہاں تھا؟ اس صورت میں فرار کی کوئی کوشش بہت مشکل سے ہی کامیاب ہو سکتی تھی۔ لازمی بات ہے جب تک میں یہ نہیں جان لیتا کہ سسٹم کیا ہے اور اسے کس طرح بریک کرنا ہے میں یہاں سے کیسے نکل سکتا تھا؟ اب تک میں نے جتنا دیکھا تھا اس سے صاف لگ رہا تھا کہ یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ میں اوشا کے تجسس کا شکر گزار تھا کہ اس کی وجہ سے مجھے پچیس کے حفاظتی نظام کو جانچنے کا موقع ملا تھا۔ اوشا نے ساڑھی کا پلو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”شہباز اندر چل نا مجھے سردی لگ رہی ہے۔“

”حالانکہ تیرے اندر تو آگ بھری ہوئی ہے۔“ میں نے اسے چھیڑا۔ ”یاد ہے ایک وقت کتنی چھوٹی سی ساڑھی میں ایسے ہی رہتی تھی اور زمین پر چٹائی پر سوتی تھی۔“

”ہاں رے پر اب عادت نہیں رہی ہے۔ اب تو کسی سخت جگہ بیٹھ جاؤں تو شریر دیکھنے لگتا ہے۔ میں پہلی جیسی نہیں رہی ہوں رے۔“ اس نے چلتے ہوئے میرا بازو تھام کر اس سے سر نکال دیا۔ ”تیری جدائی نے مجھے بہت کمزور کر دیا ہے رے۔“

”ٹو جانتی ہے میں دھوپ سائے کی طرح ہوں ابھی ہوں اور اب نہیں۔“

”میں بتا رہی ہوں اب ٹو جدا ہوا تو میں جیتی نہیں رہوں گی رے۔“

میں نے ملائمٹ سے کہا۔ ”اوشا خود کو سنبھالو تم جانتی ہو میں دوسری دنیا کا آدمی ہوں میں یہاں تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔“

”میں جانتی ہوں رے، خود کو سمجھاتی ہوں مگر یہ من ہے نا۔“ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔
”ماننا نہیں ہے تیرے لیے چلتا ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں ایک بار پھر ڈیوڈ شا کو سنا لیا کہ اس نے اوشا کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ صرف اپنے مقصد کے لیے اس نے اوشا کو اس کی پناہ گاہ سے نکالا تھا۔ مگر یہ بھی کم تھا ورنہ وہ تو انسانوں کو ٹشو پیپر سمجھنے والا شخص تھا۔ اوشا نے میرا بازو ہلایا۔ ”کیا سوچ رہا ہے رے؟“
”کچھ نہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”شہباز ٹو مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا؟“ اس نے امید سے پوچھا۔ ”بے شک داسی ہا کر رکھ لینا تیری اور تیری عورت کی کھد مت کروں گی۔“

”ایسا مت کہو میں نے کبھی کسی انسان کو اپنا ملازم نہیں سمجھا۔ میں تم سے وعدہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ ساتھ رکھوں گا۔ شاید اللہ کوئی ایسا راستہ نکال دے کہ میں تمہیں ساتھ رکھ سکوں۔“
وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر ہنس دی۔ ”میں پاگل ہوں تجھے پریشان کر دیا۔“

وہ کہتے ہی پلٹ کر تیز قدموں سے عمارت کی طرف بڑھ گئی اور میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں اوپر والے نے میرے مقدر میں یہ کیوں لکھا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ میں اتنا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔ مگر اس نے جب مقدر میں لکھا تھا تو وہی اس کا کوئی حل بھی نکالتا۔ اوشا میری مجبوری سمجھتی تھی مگر اس کا دل نہیں سمجھتا تھا۔ میں سوچ میں گم تھا کہ پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا میں نے دیکھا وہ خادم تھا جو یوں مجھے گم صم پا کر کسی قدر تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے چوکتے پا کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا اور میں بھی بوجھل قدموں سے اندر آیا۔ خادم نے برابر والا کمر اٹھول دیا تھا۔ مگر میں اپنے یعنی اوشا کے کمرے میں آیا۔ وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹی تھی اور اس کا لرزنا بدن بتا رہا تھا کہ وہ رورہی ہے۔ مجھے اس طرح روتی خواتین کو منانے کا اور انہیں چپ کرانے کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اور میں جوانی کے شہد سے بھرے اس چہرے کو چھوڑتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس لیے خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ خود ہی اٹھ گئی اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا چہرہ صاف تھا مگر آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر زبردستی مسکرائی تو میں نے بھی ہانچیں پھیلا دی تھیں۔ موہاں پر کئی میزجر آئے ہوئے تھے یہ ایکن اور ویم کی جانب سے تھے۔ میں ان کے جواب دینے لگا۔ ویم نے کسی آدمی سے بات کی تھی۔ اس کے پاس یورپی پاسپورٹس تھے اور ان کی مدد سے وہ بھارت آ سکتے تھے۔ مگر میں نے منع کر دیا کہ اس میں رسک بہت زیادہ تھا۔ ایکن نے بتایا تھا کہ وہ وکرو نامی شہر میں ہے جو آسام میں اہالیائی ریاست ارونا چل پردیش کے پاس تھی یہ جگہ چین اور بھما کی سرحدوں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں جس

ہیلز میں تھا وہ اسی ریاست میں ذرا اوپر پہاڑوں کے ساتھ تھا اور اس سے آگے ہمالیہ کا وہ حصہ تھا جس میں وادی تھی۔ ڈیوڈ شا کو یہیں سے جانا تھا اس لیے وہ یہاں موجود تھا۔ پراسرار وادی اس جگہ سے سو کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

یہ جگہ بھارت کے دور دراز خطوں میں شمار ہوتی ہے اور یہاں آبادی زیادہ نہیں ہے۔ مگر یہاں بھارتی فوج اور ایجنسیوں کی موجودگی بہت زیادہ ہے کیونکہ چین اور تبت یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ارونا چل پردیش کی ریاست پر چین کا دعویٰ ہے کہ یہ اصل میں تبت کا حصہ ہے اور اس پر انگریزوں نے غیر قانونی قبضہ کر کے اسے برصغیر کا حصہ بنا دیا تھا۔ یہ انگریز کی اسی تقسیم کردار و صورت کرو کی پالیسی کا بنیادی حصہ ہے جس کا مقصد اپنے مقبوضات کو اس طرح چھوڑ کر جانا تھا کہ وہاں کبھی پائیدار امن قائم نہ ہو سکے۔ انہوں نے برصغیر اور عرب خطے سمیت دنیا کے کئی حصوں میں یہی گندہ کھیل کھیلا اور آج بھی یہ خطے بد امنی کا شکار ہیں۔ ملکوں اور قوموں کے درمیان تصادم نے کروڑوں انسانوں کی زندگی کا چراغ گل کیا اور اربوں انسانوں کو مستقل خطرے میں ڈالا ہوا تھا۔ ارونا چل پردیش میں بھی ان دونوں طاقتور ملکوں کے درمیان مفادات کی کشمکش جاری تھی۔ اگرچہ یہ تصادم ابھی سرد ہے لیکن آنے والے وقتوں میں گرم بھی ہو سکتا ہے۔

”شہباز ٹو دیکھی نہ ہو جو میرا بھاگیہ۔“ اوشانے کہا تو میں سوچوں سے چونکا اور پھر شرمندہ ہو گیا میں تو کچھ اور سوچ رہا تھا اور وہ کبھی کہ میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

”بھوک لگی ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے نفی میں جواب دیا۔

”ابھی کھانے کو من نہیں کر رہا۔“

”ٹھیک ہے کچھ دیر بعد منگوا لیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ ”شہباز اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس گورے نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ میرا بھلا کیا کام ہے۔“

”یہی میں سمجھنے سے قاصر ہوں آخر وہ تمہیں کیوں لے جانا چاہتا ہے اس سفر پر جب کہ وہ گئے چنے افراد لے کر جا رہا ہے اگر اس کا مقصد تمہاری مدد سے مجھے قابو میں رکھنا ہے تو اس کے لیے تمہیں پیچھے رکھا جاسکتا ہے۔“

”ٹو ٹھیک کہہ رہا ہے رے۔“ وہ بولی۔ ”پر مجھے اچھا لگے گا کہ میں تیرے ساتھ رہوں۔“

”اوشا میں نے کبھی وہ علاقہ خود نہیں دیکھا ہے مگر ایک جانے والے سے سنا ہے وہاں زندگی مشکل اور موت آسان ہے۔“

”تیرے سنگ تو موت بھی قبول ہے۔“ وہ والہانہ انداز میں بولی تو میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ میرا کیا تصور ہے؟ اس کی بجائے میں نے پوچھا۔

”پھر بھی میں تمہیں اس سفر پر ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔“

اوشانے تعجب سے مجھے دیکھا۔ ”ٹو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے جائے گا۔“

”ہاں میری چھٹی جس کہہ رہی ہے کہ اب مجھے اس سفر پر جانا ہی ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھیوں کو میری وجہ سے مشکل ہو۔ ان میں ٹو بھی شامل ہے۔“

”پردہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔“

”میں اس سے بات کروں گا۔“ میں نے کہا۔

جب خادم رات کے کھانے کا پوچھے آیا تو میں نے اس سے ڈیوڈ شا کا پوچھا۔ حسب توقع اس نے اعلیٰ ظاہر کی کہ وہ ڈیوڈ شا کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تب تم کرٹل جیمز تک میرا پیغام پہنچا دو کہ میں ڈیوڈ شا سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔“

”میں کہہ دیتا ہوں سرکار۔“

ابھی ہم ڈرنے سے فارغ ہوئے تھے کہ کرٹل جیمز آ گیا۔ وہ مہمان خانے کی نشست گاہ میں میرا انتظار تھا۔ رسی باتوں کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”میں ڈیوڈ شا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ اس وقت پیلس میں نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں میری موبائل یا فون پر بات کرادو۔“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”اتنی ایمر جنسی بھی کیا ہے؟“

”میں اس لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا بات کرنا چاہتے ہو؟“

”کیا اسے لے جانا ضروری ہے؟“

”یہ تو ڈیوڈ شا ہی بتا سکتا ہے۔“

”اسی لیے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”اوکے میں ٹرائی کرتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا اس نے کوئی وضاحت نہیں کی کہ وہ

کس طرح ڈیوڈ شا سے میری بات کرائے گا۔ اس کے جانے کے بعد میں واپس اوشا کے پاس آیا۔

”تم اسی کمرے میں رہو گی۔“ میں نے کہا۔

وہ بے قرار ہو کر میرے پاس آ گئی۔ ”اور تو؟“

”میں برابر والے کمرے میں ہوں۔“

”تو یہاں رہ لے۔“

”یہ مناسب نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے سمجھایا۔ ”میں اس مزاج کا نہ سہی مگر ہوں تو مرد اگر بہک گیا تو

اپنی نظروں میں گرنے سے پہلے مر جاؤں گا اور تو بہ کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“

وہ لرز گئی۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے رے۔“

”میں زیادہ دور نہیں ہوں ایک لمحے میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں اگر تمہیں خوف ہو تو دروازہ اندر سے

بند کر لینا۔“

”میں بند کروں گی۔“

”اگر خطرہ محسوس ہو تو مجھے آواز دینا اور جب تک میں نہ کہوں دروازہ مت کھولنا۔“

اس نے سر ہلایا تو میں باہر آ گیا اور دوسرے کمرے میں آیا۔ یہ تقریباً وہی کمرہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا

کہ یہ کار نہیں تھا اور اس میں صرف ایک طرف کھڑکی تھی۔ مجھے ایمن اور وسیم سے بات کرنی تھی۔ مگر مجھے شبہ تھا کہ شاید یہاں مائیک کے ساتھ کیمرا بھی نہ لگا ہو اس لیے میں نے ہلکا سیل سربٹک اوڑھ لیا اور اس کے اندر موبائل نکالا۔ مجھے ہنسی آئی آج کل کے ٹین ایج نو جوان لڑکے اور لڑکیاں جیسے گھر والوں سے چھپ کر موبائل استعمال کرتے ہیں میں بھی ایسا ہی کر رہا تھا مگر گھر والوں سے نہیں بلکہ دشمنوں سے چھپ کر۔ اس بار بھی کئی ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے۔ ایمن نے مجھے خبردار کیا تھا کہ آنے والے چوبیس گھنٹے میں ڈیوڈ شاکی لمبے بھی سفر پر روانہ ہو جائے گا اور ظاہر ہے میں اس کے ساتھ ہوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے اس صورت حال میں کیا مدد دے سکتی ہے۔ ایمن نے جواب دیا۔ ”اگر میں فوری طور پر کچھ نہ کر سکی تو میں تمہارے پیچھے آؤں گی۔“

”اس خطرے میں؟“

”ہاں شبہا میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“

”لیکن میں تمہیں اس خطرے میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”بالکل اسی طرح میں تمہیں یوں خطرے میں جاتے نہیں دیکھ سکتی۔“

میں سمجھ رہا تھا اس کی جگہ کوئی اور میڈیا پرسن ہوتا تو اس جگہ کاسن کر ہی پاگل ہو جاتا اور اسے دریافت کر کے اور دنیا کے سامنے پیش کرنے کے خواب دیکھنے لگتا۔ مگر ایمن ان لوگوں میں سے تھی جو تیز رفتار ترقی پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور نہ ہی خوابوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ وہ صرف میرے لیے فکر مند تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کچھ اندازہ ہے کہ ڈیوڈ شاسفر کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے گا؟“

”میری معلومات کے مطابق وہ ابتدائی سفر ہیلی کاپٹر میں کرے گا اور جہاں تک ممکن ہو اسی سے رسائی حاصل کی جائے گی۔ ایک ایئر فیلڈ پر دو عدد بڑے ہیلی کاپٹر اس مقصد کے لیے تیار کھڑے ہیں۔“

”جب تم اتنا جانتی ہو تو یہ بھی معلوم کر آؤ کہ اس کی روانگی کس وقت ہے؟“

”میرا ساقھی ان ہیلی کاپٹرز کے پائلٹس تک رسائی کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کام یوں بھی آسان ہو گیا ہے کہ میں خود اپنے لیے ایک ہیلی کاپٹر بک کر رہی ہوں۔“

”پیچھے آنے کے لیے؟“

”بالکل ورنہ ان پہاڑوں پر دس منٹ کا فضائی سفر دو دن کا ہو جاتا ہے۔“

”ایمن میں تمہیں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم پیچھے آنے سے گریز کرنا میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم یا کوئی بھی مشکل میں پڑے۔“

”میں نے کہا تا میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔“ اس نے جواب دیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے کبل سے سر نکال کر پوچھا۔

”کون ہے؟“

”سرکار۔“ باہر سے خادم کی آواز آئی۔

”آ جاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ اندر آیا اور ادب سے بولا۔

”آپ کو کرنل صاحب نے یاد کیا ہے۔“

”تم چلو میں آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اس کے جانے کے بعد موبائل اپنی جیب میں رکھ کر باہر آیا۔ کرنل نشست گاہ میں موجود تھا اور کسی قدر فکر مند لگ رہا تھا۔ میری چمٹی حس نے اشارہ دیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”تم نے بلایا ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”میری ڈیوڈ شا سے بات ہوئی ہے اس نے کہا ہے کہ لڑکی بہر صورت جائے گی۔ اسے پیچھے نہیں چھوڑا جاسکتا ہے۔“

”اس صورت میں وہ مجھ سے تعاون کی توقع نہ رکھے۔“

”وہ تم سے ایسی کوئی توقع رکھ بھی نہیں رہا ہے۔“ کرنل کا لہجہ روکھا تھا۔ ”پیس کا ایک ملازم اس عمارت میں آیا تھا کیا اس نے تم سے ملاقات کی یا تمہیں کچھ کہا ہے۔“

میں چونکا۔ ”کون ملازم؟..... یہی جو یہاں.....“

”یہ نہیں۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”میں اس کی بات کر رہا ہوں۔“

اس نے کہتے ہوئے اپنا شب میری طرف کیا اور اس کی اسکرین پر اسی ملازم کی تصویر تھی جس نے مجھے موبائل پہنچایا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ مجھ سے نہیں ملا اور نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہے۔“

”یہ چند گھنٹے پہلے یہاں آیا تھا جب کہ دوسرے ملازمین کو یہاں آنے سے منع کیا گیا ہے۔“

”تم اس سے ہی پوچھو کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا؟“

”ہم پوچھ رہے ہیں۔“ کرنل کھڑا ہو گیا۔ ”میں بتا دوں شاید صبح ہماری روانگی ہے اس لیے تم رات کو ٹھیک سے نیند پوری کرو، آگے آرام کا موقع بہت کم ملے گا۔“

کرنل کے انداز اور اس کے جواب سے واضح تھا کہ ڈیوڈ شا اب مجھے راضی کر کے لے جانے میں کوئی لچکی نہیں رکھتا تھا۔ میں اس کے قبضے میں تھا اور شاید مجھے قابو میں رکھنے کے لیے اس نے اوشا کو ساتھ رکھا تھا۔ بات خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں تھی کہ ان لوگوں نے نیپالی نقوش والے کی یہاں آمد جان لی تھی اور اب وہ اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ لازمی بات ہے وہ اس پر تشدد کا حربہ آزما رہے اور اس صورت میں وہ زیادہ دیر بی زبان بند نہیں رکھ سکتا تھا۔ کرنل کے جاتے ہی میں اپنے کمرے کی طرف لپکا اور دروازہ اندر سے بند کر کے لبل میں گھس کر موبائل نکالا اور تیزی سے اس پر اینٹن کے لیے میسج لکھا۔ ”پول کھلنے والا ہے تم نے جس شخص کو بجھا تھا وہ جلد حقیقت اگل دے گا اور اس کے بعد وہ مجھ سے موبائل حاصل کر لیں گے۔ اگر وہ شخص تمہارے سے میں جانتا ہے تو پہلی فرصت میں جگہ بدل دو اور میں یہ موبائل ضائع کرنے والا ہوں۔ کل صبح روانگی ہے۔“

اسی لمحے دروازے پر تیز دستک ہوئی اور میں نے اگلا میسج وسم کے لیے لکھا۔ ”بھانڈا پھوٹ گیا ہے میں بائل ضائع کر رہا ہوں۔ اب رابطہ نہیں کر سکوں گا۔ کل صبح روانگی ہے۔ پھر ملیں گے اگر اللہ نے ملایا تو۔“

دروازے پر دستک تیز ہوتی جا رہی تھی میں اس طرف توجہ دینے بغیر دواش روم میں آیا اور موبائل فرش پر

ڈال کر اسے فلش ٹینک کے ڈھکن سے ضرب لگا کر توڑ دیا۔ اس کے بعد اس کی سم نکالی اور اسے انگلیوں سے دبا کر دو کلوڑے کیا اور آخر میں اس سارے بلے کو کوڑ میں ڈال کر فلش ٹینک چلا دیا۔ باہر دروازہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دوبارہ فلش ٹینک چلا کر میں نے اس بات کو یقینی بنالیا کہ سب بہہ کر آگے چلا جائے۔ پھر میں ہاتھ گیلے کر کے باہر آیا اور اسی لمحے ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔ سامنے باسو کھڑا تھا۔ یہ اسی کی جتنی قوت نے یہ مضبوط دروازہ توڑ دیا اور نہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ اصل میں صرف کنڈی ٹوٹی تھی اور یہ بھی خاصی مضبوط قسم کی تھی۔ باسو اندر آیا اور اس نے اجنبی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں مسکرایا۔ ”کیا حال ہیں تمہارے..... پھر دیکھ کر خوشی ہوئی مگر تم نے میرا دواش روم میں بیٹھنا حرام کر دیا تھا۔“

باسو کے پیچھے کرنل تھا اور اس نے اندر آتے ہی چاروں طرف دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔ ”تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے؟“

”میں دواش روم میں تھا۔“

کرنل کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”یہاں کیمرے لگے ہیں۔“

”لگے ہوں گے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”جلد حقیقت سامنے آجائے گی۔ موبائل کا کیا کیا ہے تم نے؟“

”فلش میں بہا دیا۔“ میں نے اس بار حقیقت بیان کر دی۔ ”اس کے کلوڑے مل سکتے ہیں۔“

کرنل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”تم نے کس سے رابطہ کیا؟“

”اگلو اسکے ہوا تو اگلو۔ ویسے میں نے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔“ میں نے ڈھٹائی سے کام لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ پر تشدد نہیں کر سکتے تھے۔ کرنل کا چہرہ سرخ تھا مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”شہباز تم اپنے لیے مشکل پیدا کر رہے ہو۔“

”میں اس کا عادی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے قید کبھی آسان نہیں ہوتی ہے۔“

”انتا یاد رکھنا ڈبوڈشا کی تحویل سے باہر تم انڈیا میں انتہائی غیر محفوظ ہو گے اور ایک بار تم انڈیا کی کسی اجنبی کے ہاتھ آ گئے تو تمہاری گلو خلاصی ممکن نہیں ہوگی۔“ کرنل کے انداز میں واضح دھمکی تھی۔

باسو تھکا کھڑا ہوا تھا۔ دروازہ توڑنے کے بعد اس نے کوئی رد عمل نہیں دکھایا تھا۔ اس نے حسب معمول بڑی سی نیکر اور اوپر بنیالہ پہنی ہوئی تھی۔ کرنل کچھ دیر اپنے ہونٹ کا تار ہا پھر اس نے باسو کو حکم دیا۔ ”اسے چار نمبر میں لے جا کر بند کر دو۔“

باسو نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ ”چلو۔“

سرتابی کی مجال نہیں تھی باسو کی گرفت اور قوت کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ راہداری میں اوشا میری ہدایت کے برخلاف دروازہ کھول کر باہر بھاگ رہی تھی مجھے باسو کی گرفت میں دیکھ کر وہ بے تابی سے باہر نکل آئی۔ اس کے باہر آتے ہی کرنل نے چونکا ہو کر پستول نکال لیا۔ مگر وہ اسے نظر انداز کر کے میرے پاس آئی۔ ”شہباز تجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟“

”یہیں ایک اور جگہ۔“ میں نے کہا۔ ”ٹو اندر جا۔“

اوشا نے خطرناک نظروں سے باسو کی طرف دیکھا اور ایسا لگا جیسے وہ اسے کاٹنے کا سوچ رہی ہو۔ اس کی آنکھیں اس وقت کسی ناگن کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اوشا اندر جا یہ میرا حکم ہے۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر سر ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹی اور کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور کرٹل کی طرف دیکھا۔ ”تم اسے خود پینڈل نہیں کر سکو گے۔ یہ خطرناک ہوئی تو مرنے مارنے پر تیل جائے گی۔“

”فکر مت کرو۔“ اس نے پستول رکھ لیا۔ ہم عمارت سے باہر آئے۔ امین نے یہاں کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ اسی وجہ سے نیپالی نقوش والا پکڑا گیا۔ اب مجھے امین کی فکر تھی کہ وہ ڈیوڈ شاکی دسترس سے دور رہے۔ وہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کے لیے بیکار تھی۔ ڈیوڈ شا ذرا بھی احساس کیے بغیر اسے مروا سکتا تھا۔ ایک چھوٹی عمارت جو پول اور جم کی عمارت کے پاس تھی مجھے وہاں ایک سادہ سیل نما کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس کا دروازہ فولادی تھا اور ایک طرف چھوٹا سا روشن دان تھا۔ ایک سادہ بستر تھا اور ایک طرف کموڈ اور واش بین لگا ہوا تھا۔ گویا یہ ایک مکمل سیل تھا جہاں کسی کو قید رکھا جاسکتا تھا۔ کرٹل ساتھ تھا اور دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے کہا۔ ”شہباز آرام کرو اور بھول جاؤ کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔“

”تم بھی بھول جاؤ کہ میں بے یار و مددگار ہوں۔ جلد تم دیکھ لو گے۔“ میں نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا تھا پھر دروازہ بند کر کے باہر سے لاک کر دیا۔ چھت پر ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اس کا سوچ یہاں نہیں تھا اس لیے میں اسے اپنی مرضی سے آن آف نہیں کر سکتا تھا۔ دروازے کے اوپری حصے میں چند انچ کا حصہ جالی پر مشتمل تھا میں نے اس سے باہر جھانکا اور پھر آکر بستر پر دراز ہو گیا۔ حالات ایک بار پھر بدل گئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے میرا ہنڈوں سے رابطہ ہوا تھا اور اب میں دوبارہ مکمل طور پر ڈیوڈ شا کے قبضے میں تھا۔ اگر امین نے نیپالی نقوش والے شخص پر اعتبار کیا تھا تو یہ اس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے بہتر ہوتا کہ وہ اب اس معاملے سے دور رہے۔ ڈیوڈ شا جیسے لوگوں سے نمٹنا اس کے بس سے باہر تھا۔

بالآخر حالات اسی طرف جا رہے تھے جس طرف میں لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ یعنی پُراسرار وادی کی لُف اور مین مجبور تھا۔ بستر پر دراز ہونے کے باوجود آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی اور دماغ آنے والے حالات میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا وادی تک رسائی کے بعد میرے اور اوشا کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ یہ ظاہر ہم اس کے لیے بیکار ہو جائیں گے اور وہ بیکار چیزیں رکھنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ وہ ملی فرمت میں کچرا اٹھکانے لگا دیتا ہے۔ باسو کی یہاں موجودگی چونکا نے والی مگر میرے ذہن میں کہیں تھا کہ ڈیوڈ شا اسے اس مہم میں استعمال کرے گا اور اسی لیے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ باسو کا رویہ میرے ساتھ ت نہیں تھا اور وہ غرا کر بات نہیں کر رہا تھا جیسا کہ وہ عام طور سے کرتا تھا۔ اسی طرح اس نے میرا بازو تھامتے نئے گرفت بھی بہت مضبوط نہیں رکھی تھی مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ میں اس انسان نما حیوان کے اندر اپنی جگہ

بنا۔ میں کامیاب رہا تھا مگر میرے لیے اس کے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔

ان ہی خیالوں میں نہ جان کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر آنکھ کھلی تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا میں نے اٹھ کر وضو کیا اور بستر کی چادر نیچے بچھا کر نماز پڑھی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ شاید میری آخری نماز ہے اور میرے لیے آخری موقع ہے کہ میں اللہ کے حضور سر جھکا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ لوں۔ شاید اسی وجہ سے میں نے بہت دل سے نماز پڑھی اور دعا کی کہ اگر میری زندگی ہے تو مجھے میرے پیاروں سے ملانے اور اگر میری زندگی کا آخری وقت آگیا تھا تو اللہ مجھے ایمان کی سلامتی کے ساتھ اٹھائے۔ نماز پڑھ کر میں ٹہلتا رہا اور تھوڑی بہت ورزش بھی کی لیکن میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ باہر سورج نکل آیا تھا اور کچھ دیر میں خاصی تیز روشنی ہو گئی تھی۔ دروازہ کھلا تو میں چوکانے والا باسو تھا اس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس نے وہ نیچے فرش پر رکھ دی اور بولا۔ ”تمہارے پاس آدھا گھنٹا ہے۔“

میرا خیال تھا کہ وہ چلا جائے گا مگر اس کی بجائے اس نے باہر سے ایک درمیانے سائز کا بیک پیک اٹھا کر اندر رکھا۔ ”اس میں سب کچھ ہے تیار ہو جانا۔“

وہ چلا گیا، مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے پہلے ناشتے سے انصاف کیا۔ یہ دلیہ، شہد اور دودھ پر مشتمل تھا۔ ایک پیک بگ میں چائے بھی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ آگے سفر میں اسی قسم کے ناشتے سے واسطہ پڑے گا اس لیے آج سے اس کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے بیک کھولا تو اس میں سے ایک عدد بہت گرم والا سوٹ نکلا تھا۔ یہ بہت موٹے اور گرم ترین میٹریل سے بنی پتلون اور جیکٹ تھی۔ اس کے ساتھ اندر پہننے والی گرم جری، گرم پاجامے اور موزے تھے۔ ایک عدد بہت اعلیٰ درجے اور خاص میٹریل سے بنے ہوئے جوتوں کا سیٹ تھا۔ ان کے علاوہ بھی کچھ چیزیں تھیں مگر فوری استعمال کی چیزیں یہی ہو سکتی تھیں۔ میں نے اپنے کپڑے اتار کر پہلے گرم پاجامہ اور جری پہنی۔ یہ جسم سے بالکل چپک جانے والی ہائی نیک جری تھی۔ اس کے اوپر میں نے پتلون پہن لی مگر اس موسم میں جیکٹ پہننے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ میں نے پیک میں رکھ لی اور ساتھ ہی اپنے اتارے کپڑے بھی رکھ لیے۔ میرے پیروں میں سلیپرز تھے جو اس سفر میں بیکار ہوتے مگر میں نے وہ بھی رکھ لیے۔ جوتے پہن کر میں بالکل تیار تھا۔ اب مجھے انتظار تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہوا میں ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا اور پھر ہیلی کاپٹر کی آواز واضح ہونے لگی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا، ہم سفر کا آغاز ہیلی کاپٹر سے کرتے اور جہاں ہیلی کاپٹر پارٹی کو ڈراپ کرتے وہاں سے پیدل سفر کا آغاز ہوتا۔ مگر یہ ایک ہیلی کاپٹر تھا جب کہ ایمن نے دو کے بارے میں بتایا تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور باسو نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا میں اپنا پیک اٹھا کر باہر آیا اور باسو کی رہنمائی اور نگرانی میں روانہ ہوا۔ ہیلی پیڈ پیلس کے نچلے حصے میں ایک کھلی جگہ تھا۔

باسو نے اس وقت پوری گرم پتلون اور اوپر میری طرح ہائی نیک جری پہنی ہوئی تھی اس کے پیروں میں اس کے سائز کے جوتے تھے۔ ہم ہیلی پیڈ پہنچے تو وہاں کرنل جیمز کے ساتھ اوشا بھی تھی اور اس کا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ اوشا کو آج تک میں نے ساڑھیوں میں دیکھا تھا اور اکثر اوقات وہ بہت مختصر سے لباس میں ہوتی تھی جس میں جسم کا بیشتر حصہ جھلک رہا ہوتا تھا مگر اس وقت وہ سر سے پاؤں تک لباس میں پوشیدہ تھی۔ اس نے جیکٹ بھی

پہن لی تھی۔ مگر اس کا ہڈا بھی سر نہیں تھا۔ یہ سارا لباس بھاری ہونے کے باوجود اس کی جسامت خاصی چھری سی لگ رہی تھی۔ میں ہنسا تو وہ جھینپ گئی۔ ”نہس کیوں رہا ہے رے کیا اچھی نہیں لگ رہی۔“

”تم ہر لباس میں اچھی لگتی ہو لیکن میں نے کبھی تمہیں اتنا زیادہ پہنے اوڑھے نہیں دیکھا۔“

”مجھے گرمی لگ رہی ہے رے پر اس نے کہا کہ سب پہننا ہے۔“ اوشا نے باسو کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اسے تسلی دی۔

”کچھ دیر بعد تمہیں اس میں بھی سردی لگ رہی ہوگی۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ کرنل جیمز نے کہا۔ ”آگے بہت سردی ہوگی۔ ابھی بیلی کا پٹر جب بلند ہو گا تب ہی سردی لگے گی۔“

”بس ہم چار افراد جائیں گے۔ ڈیوڈ شا اور اس کی صاحبزادی کہاں ہیں؟“

”ڈیوڈ شا یہاں نہیں ہے زونیا ہمارے ساتھ جائے گی۔“

اسی لمحے زینی ایک طرف سے نمودار ہوئی۔ اس نے بھی گرم لباس پہنا ہوا تھا مگر جیکٹ نہیں تھی اور جری اس کے جسم پر یوں چپکی ہوئی تھی کہ ایک ایک انگ نمایاں تھا۔ یہ بالکل لاحول کا موقع تھا مگر میں عادی ہو گیا تھا۔ وہ مخصوص چال چلتی آتی اور اس نے مجھ سے اور کرنل سے ہاتھ ملایا۔ اوشا اور باسو کو نظر انداز کر دیا۔ اوشا سے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس نے اپنا بیگ اتار کر باسو کو دیا جسے اس نے بیلی کا پٹر کے سامان والے خانے میں ڈال دیا۔ وہ پیچھے ہٹی تو اوشا جلدی سے میرے پاس آگئی۔ زینی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی تھی مگر اس نے سوائے بیلو ہائے کے اور کوئی بات نہیں کی تھی۔ گویا کل پانچ افراد تھے اور دو بیلی کا پٹر کے پائلٹس تھے۔ ہم عقبی حصے میں سوار ہوئے۔ آٹنے سامنے دو عدد بیچ نمائشوں کے ساتھ عقب میں سامان رکھتے والا خانہ بھی تھا مگر اس میں سامان باہر سے رکھا اور نکالا جاتا تھا۔ جب ہم بیٹھنے لگے تو اوشا جلدی سے میرے ساتھ والی نشست پر آگئی جیسے اسے خطرہ ہو کہ زینی نہ برابر میں آجائے۔ زینی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ہم نے سیٹ بیلٹس باندھیں۔ بیلی کا پٹر کے انجن اشارت ہوئے۔ یہ دو انجنوں والا بڑا بیلی کا پٹر تھا۔ ہلکے سے دھچکے سے وہ ہوا میں بلند ہوا اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ پیلس سے اتنا اوپر جا چکا تھا کہ سارا پیلس دکھائی دینے لگا۔

میں اپنی نشست پر اس طرح بیٹھا تھا کہ مجھے سامنے انسٹرومنٹ پینل صاف دکھائی دے رہا تھا اور آلتی میٹر کے مطابق یہاں بلندی دو ہزار دو سو میٹر تھی۔ تقریباً تین ہزار میٹر کی بلندی پر آ کر بیلی کا پٹر نے شمال مشرق کا رخ کیا اور اس کی رفتار تیز ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایمین نے دو بیلی کا پٹر کا ذکر کیا تھا اور یہ ایک تھا تو دوسرا بیلی کا پٹر یقیناً ڈیوڈ شا اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو لے جانے کے لیے کہیں موجود ہوگا۔ جیسے جیسے ہم آگے جا رہے تھے زمین پر برف کی سفیدی نمایاں ہو رہی تھی اور بیلی کا پٹر کی بلندی بڑھتی جا رہی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم پانچ ہزار میٹر کی بلندی پر تھے اور یہاں ہوائی دباؤ اتنا کم تھا کہ بیلی کا پٹر ہموار پرواز سے قاصر تھا اور بلندی کی وجہ سے بیلی کا پٹر کے پر ہوا کانٹے کی کوشش کر رہے تھے اور اس چکر میں پورا بیلی کا پٹر لرز رہا تھا۔ اب نیچے مکمل سفید منظر تھا۔ ہم ٹنڈرا کے خطے میں داخل ہو گئے تھے جہاں سارے سال برف جمی رہتی ہے۔ اوشا میرے ساتھ بیٹھی تھی اور کسی بچے کی طرح جھک جھک کر باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی اسی نے پہلے دوسرے بیلی

کا پڑ کو دیکھا اور پھر مجھے متوجہ کیا۔

”شہباز اُدھر دیکھ۔“

میں نے تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر اسی جیسے دوسرے ہیلی کا پڑ کو دیکھا جو اتر رہا تھا اور اس کے آس پاس برف کا طوفان سا آیا ہوا تھا۔ ہمارا ہیلی کا پڑ بھی اسی سمت بڑھ رہا تھا جب تک وہ وہاں پہنچا پہلا ہیلی کا پڑ لینڈ کر چکا تھا مگر اس کے پچھلے بدستور گھوم رہے تھے اور برف کا طوفان جاری تھا۔ اتنی بلندی پر انجن بند کرنے کا مطلب تھا کہ ہیلی کا پڑ یہیں رہ جاتا کیونکہ اس کا انجن پھر اسٹارٹ نہیں ہوتا۔ ہمارا ہیلی کا پڑ زافا صلے پر اترتا تھا اور کسی قدر مشکل سے اترتا تھا کیونکہ تیز ہوا کے باعث وہ ڈول رہا تھا اور اس کے اسکیز ذرا دقت سے برف پر نکلے تھے۔ ہیلی کا پڑ کے نکلنے ہی باسو نے دروازہ کھولا اور سرد ترین ہوا کے ساتھ برف کے ذرات مع شورا اندر گھس آئے تھے۔ میرے پیک میں ایک اسنو گلاس بھی تھا جو میں نے کچھ دیر پہلے گلے میں ڈال لیا تھا اور اترتے ہی آنکھوں پر لگا لیا تھا میری دیکھا دیکھی اوشا نے بھی یہ کام کیا تھا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھنے کے قابل رہے۔ یہاں ہوا بہت ہلکی تھی اور سانس لینے کے لیے باقاعدہ زور لگانا پڑ رہا تھا۔ شہناہیسی تھی کہ سب ہی کانپ اٹھے تھے۔

باسو اور کرٹل نیچے اتر گئے تھے۔ میں نے اوشا کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ پائلٹ چلا چلا کر سامان جلدی اتارنے کو کہہ رہے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ کسی خرابی کی وجہ سے انجن بند ہو گئے تو وہ اسی برف زار میں پھنسے رہ جائیں گے اور یہاں سے واپسی کا زمینی راستہ تین دن کا تھا۔ راستے میں مجھے جو گلشیر اور پہاڑی سلسلے نظر آئے انہیں سر کرنا آسان نہیں تھا۔ باسو اور کرٹل ہیلی کا پڑ کے عقبی حصے سے سامان نکال رہے تھے اور اسے اٹھا کر ہیلی کا پڑ سے دور لے جا رہے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش نہیں کی اور دوسرے ہیلی کا پڑ کی طرف بڑھا جہاں ڈیوڈ شاہمارے جیسے لباس میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور تھے جو سامان اتار کر ہیلی کا پڑ سے دور لے جا رہے تھے۔ سارا سامان بڑے سائز کے بیگز میں پیک تھا اور اسے پشت پر لا کر سفر کرنا تھا۔ میرے پاس آتے ہی ڈیوڈ شاہ چوکننا ہو گیا اور اس کا ہاتھ اپنی جیکٹ کی ایک جیب میں چلا گیا تھا۔ ہیلی کا پڑ زور اور ہوا کا شور اتنا تھا کہ کسی قسم کی گفتگو خارج از امکان تھی۔

جو لباس پیلس میں ہمیں گرم لگ رہا تھا وہ یہاں آتے ہی جیسے طبل کا ہو گیا اور جنہوں نے جیکٹ نہیں پہنی تھی انہوں نے فوری جیکٹ پہن لی۔ مشکل سے پانچ منٹ میں سارا سامان اتار لیا گیا اور ہم بھی دور ہٹ گئے۔ ہیلی کا پڑ بلند ہوئے اور جس سمت سے آئے تھے اسی سمت پرواز کر گئے۔ ایک منٹ سے ہی پہلے وہ ناقابلِ شناخت باریک نقطوں میں بدل گئے اور پھر نظروں سے اوجھل گئے۔ تب ہمیں احساس ہوا کہ ہم اس ویرانے میں رہ گئے تھے۔ تہذیب اور آباد دنیا سے دور ایک ایسا ویرانہ جہاں تاحدنگاہ سوائے برف کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس احساس نے چند لمحے کے لیے مجھ سمیت سب کا دل سہا دیا تھا۔ اوشا میرے بازو سے چپک گئی تھی اور باقی سب اپنی اپنی جگہوں پر گرم مسم سے کھڑے تھے۔ پھر ڈیوڈ شاہ کی سرد آواز نے سب کو چونکا دیا۔ ”میرا خیال ہے اب ہمیں حرکت میں آ جانا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے اوشا کو ساتھ لا کر اچھا نہیں کیا ہے۔ یہ نازک عورت ہے اس سفر کی صعوبتیں کیے

برداشت کرے گی۔“

”کر لے گی۔“ ڈیوڈ شانے سکون سے جواب دیا۔ ”تم اسے نہیں جانتے یہ بہت باہمت ہے جہاں دوسرے لڑکھڑائیں گے یہ وہاں بھی ثابت قدم رہے گی۔ تم بھول رہے ہو اس سفر میں زنی بھی ساتھ ہے اور وہ نازک عورت ہے۔“

میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ زنی سمیت شوق سے جہنم میں جائے لیکن اس کی بجائے میں نے کہا۔ ”ڈیوڈ شاہ یہ بہت مشکل مہم ہے اور اوشا کو پہاڑوں پر سفر کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

میری بات کا ڈیوڈ شانے کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے بھی مزید بحث بیکار تھی کیونکہ اوشا یہاں آچکی تھی۔ ڈیوڈ شانے بھی مجھ سے کل ہونے والے واقعات پر کوئی بات نہیں کی کیونکہ اب ہم ان باتوں سے بہت دور آچکے تھے۔ ہم کل آٹھ افراد تھے۔ ڈیوڈ شاہ کے دونوں ساتھی سفید فام اور تو مند تھے۔ سامان کے ٹھلے سات بڑے بیگز تھے۔ ان میں پانچ بڑے بیگ تھے اور دو چھوٹے تھے۔ چھوٹے بیگز میرے اور ڈیوڈ شاہ کے حصے میں آئے۔ دو بڑے بیگز باسو نے اپنی پشت پر لاد لیے جب کہ باقی تین بیگز، کرنل، اور دونوں سفید فاموں کے حصے میں آئے۔ اوشا کے پاس اپنے بیگ کے ساتھ میرا بیگ بھی تھا جب کہ زنی نے اپنا بیگ خود اٹھایا ہوا تھا۔ سامان سے جو ذکر بنائی جانے والی اسٹک نکالی گئیں۔ برف پر سفر کرنے کے لیے یہ لازمی تھیں۔ ان کے نچلے نوکیلے حصے میں ذرا اور پرایک گول ڈسک لگی ہوئی تھی جو چھڑی کو برف میں دھنسنے سے بچانے کے لیے تھی۔ جیسی کہ برف پر پھسلنے والوں کی اسٹک میں لگی ہوتی ہیں۔ ڈیوڈ شانے روانگی سے پہلے کہا۔

”اب ہم ایک ٹیم ہیں اور ہمارا ایک دوسرے سے واقف ہونا ضروری ہے۔ سب اپنا اپنا تعارف کرا دیں۔“

”میں مارک رائٹ ہوں۔“ ایک سفید فام نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ چھبیس ستائیس برس کا نوجوان تھا۔

”میں پیشہ ور کوہ پیما ہوں۔“

”سین بانڈن۔“ دوسرے نے کہا۔ ”میں بھی کوہ پیما ہوں لیکن پیشہ ور نہیں۔ میں اس مہم کا آفیشل کلک ہوں۔“

باقی سب کے بارے میں ہمیں جانتا تھا۔ اپنی باری آنے پر میں نے اپنا اور اوشا کا تعارف کرایا۔ باسو، سین اور مارک صرف انگریزی جانتے تھے باقی سب اردو یا ہندی سے واقف تھے۔ صرف اوشا انگریزی سے نااہل تھی۔ اوشا میرے ساتھ ہوتی اس لیے آپس میں گفتگو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر تعارف کے بعد ڈیوڈ شانے اوشا کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ باسو کے ساتھ رہے گی۔“

”یہ میرے ساتھ رہے گی۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ڈیوڈ شام ہمیں یہاں تک لے آئے ہو جہاں سے واپسی کا راستہ بہت مشکل ہے اور ہمیں تمہارا ہی ساتھ دینا ہے اس لیے سفر کو اپنے اور میرے لیے مشکل مت دو۔“

ڈیوڈ شاہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”اوکے اس صورت میں تم دونوں کے ساتھ باسو ہے۔“

میرا بھی یہی خیال تھا کہ باسو کو میری اور اوشا کی نگرانی کے لیے ساتھ رکھا گیا ہے۔ اس کا اضافی فائدہ اس کی طاقت تھی۔ وہ زیادہ سامان اٹھا سکتا تھا اور جہاں ضرورت پیش آتی اور جو کام دوسرے نہ کر پاتے وہ اپنی جناتی قوت سے کر جاتا۔ یہاں اترتے ہی سب نے گرم جیکٹس اور دستاں پہن لیے تھے اس کے باوجود سردی ایسی غضب کی تھی کہ اب تک ہمارے بدن لرز رہے تھے۔ ٹھنڈا ایسی تھی جیسے ہم بے لباس ہی اس برف زار میں نکل آئے ہوں۔ دن کا وقت تھا اور سورج نکلا ہوا تھا مگر درجہ حرارت شاید منفی میں تھا۔ اور پھر شمال کی طرف سے سرد ہوا چل رہی تھی۔ اوشا نے دستاں میں مٹلوف ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”بہت سردی ہے رے۔“

”یہ تو آغاز ہے۔“ میں نے خبردار کیا۔ ”آگے موسم اس سے بھی زیادہ خراب ملے گا۔“

مگر جب ہم نے چلنا شروع کیا تو جسم ذرا گرم ہوئے اور کپکپاہٹ میں کمی آئی تھی۔ ہم نے گروپ بنا لیے تھے اور آپس میں رسیوں سے منسلک تھے کیونکہ اس جگہ برف میں دراڑوں کی موجودگی عین ممکن تھی اور اگر کوئی کسی دراڑ میں گر جاتا تو رسی اسے بچا سکتی تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم ایک دوسرے سے کم سے کم دس فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اس وقت کمانڈر مارک تھا اور وہی فیصلہ کر رہا تھا کہ ہمیں کس راستے سے آگے جانا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل میپ تھا اور اس پر راستے کا تعین تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہم تقریباً سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور یہاں سے ڈھلوان کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سردی، آکسیجن کی کمی اور معمولی سا حادثہ بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ہمیں ممکنہ مشکلات اور ان سے بچنے کی تدابیر سے بھی آگاہ کر رہا تھا۔ ہم غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔ سفر کا آغاز ہوا تو پتا چلا کہ عملی مشکلات کیا ہیں؟

میرا پیشہ ہی ٹورزم تھا اور میں سیاحوں اور ٹریکرز کے لیے لائقہ اور ٹیکس ترتیب دے چکا تھا اس لیے مجھے معلوم تھا کہ بلندی کی طرف جاتے ہوئے ٹریکزر ایک دم زیادہ بلندی کی طرف جانے سے گریز کرتے ہیں اور وہ پہلے خود کو بلندی کا عادی بناتے ہیں اور اس کے لیے وہ اصل ٹریک سے ذرا کم بلند مقامات پر کچھ وقت گزارتے ہیں مگر یہاں ہم براہ راست ہی سات ہزار فٹ سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر آگئے تھے۔ ہمارے جسم اور بھیچرے اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے سب ہی دقت سے سانس لے رہے تھے۔ روانگی سے پہلے سین نے سب کو جوس کی صورت میں مخصوص منرلز اور ایسے سیلی منٹس دیئے تھے جو بلندی کا موسم سہارنے کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔ ڈیوڈ شانے غیر معمولی محنت کا مظاہرہ کیا تھا۔ پہلے دو دن بعد روانگی تھی اور اچانک ہی ڈیوڈ شانے پلان بدلاتھا۔ شاید میرے پاس موبائل کی موجودگی اور اپنے ساتھیوں سے رابطے نے ڈیوڈ شا کو مجبور کیا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ کوئی مسئلہ ہو اور اس کا سفر پھر کھٹائی میں پڑ جائے۔

سفر بلندی کی طرف تھا اور ہم سر جھکائے اٹھتے قدموں سے چل رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں سب کے سانس پھول گئے اور اب بلا ضرورت بات نہیں کر رہے تھے۔ مارک نے بتا دیا تھا کہ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد دس منٹ کا وقفہ ہوگا اور اگر کوئی مسئلہ محسوس کر رہا ہے تو بتائے تاکہ اس کا حل نکالا جاسکے۔ اگر کوئی حادثے کا شکار ہو کر شدید یا ایسا زخمی ہو جائے جس میں وہ پارٹی کا ساتھ نہ دے سکے تو مجبوراً اسے یہیں چھوڑ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ پارٹی کسی ایک فرد واحد کے لیے نہیں رکے گی۔ یہ ڈو اور ڈائی کا کھیل تھا۔ اس میں کوئی تیسری راہ نہیں تھی۔ ایک

گھٹنے بعد جب مارک نے رکنے کا اعلان کیا تو جو جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ اوشا کی حالت سب سے خراب ہوگی مگر وہ دھمک دکھائی دے رہی تھی اور اس کا سانس بھی ہموار تھا۔ میری سانس تیز تھی البتہ میں اتنی تھکن محسوس نہیں کر رہا تھا۔ سب سے بری حالت ڈیوڈ شا کی تھی۔

ایک بار اس نے بتایا تھا کہ اسے دے کا پرانا مرض تھا جو حکیم قاسم نے علاج سے ٹھیک کیا تھا مگر دے کا مریض ٹھیک ہو جائے تب بھی اس کے پھیپڑے اس بلندی پر ٹھیک سے سانس لینے کے قابل نہیں رہتے ہیں مجھے حیرت تھی کہ وہ یہاں سانس کیسے لے رہا تھا۔ اس نے اپنے بیک سے ایک چھوٹی بوتل نکال کر تھنوں سے لگاتے ہوئے اس کا سپرے دیا اور واپس رکھی۔ سپرے کے بعد اس کی حالت کسی قدر بہتر نظر آنے لگی تھی۔ یہ شاید آکسیجن یا کسی دوا کا سپرے تھا۔ دس منٹ کے وقفے کے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ سب کے پاس گھڑیاں تھیں جن میں وقت اور دوسری کئی چیزیں دیکھی جاسکتی تھیں۔ میری گھڑی کے مطابق سوا گیارہ بج رہے تھے۔ اب تک ہم کسی قدر ہموار جگہ سفر کرتے آئے تھے مگر اب دشوار علاقہ شروع ہوا تھا۔ یہ کوئی کلیشیر تھا جس کے دونوں طرف اونچے پہاڑ تھے اور ہمیں اس کی نرم پڑتی برف پر سفر کرنا تھا۔ دن کی تیز دھوپ میں برف نرم پڑ جاتی ہے اور رات میں یہ جمتی ہے۔

اس پھیلنے اور جمنے کے عمل سے گلیشیر میں دراڑیں جنم لیتی ہیں اور اب ہمیں دراڑوں کے اوپر سفر کرنا تھا۔ اس لیے سب میں کوہ پیمائی کے اوزار تقسیم کر دیے گئے۔ ان میں نوکدار کلبھاڑیاں، بکلیس اور اضافی رستے تھے۔ کسی حادثے کی صورت میں یہ چیزیں جان بچانے میں معاون ثابت ہوتیں۔ مارک نے ان کا استعمال بھی بتایا تھا۔ خاص طور سے اگر کوئی فرد کسی دراڑ میں گر جائے اور اس کے رستے سے منسلک افراد بھی کھینچ رہے ہوں تو وہ فوراً برف میں کلبھاڑی گاڑھ دیں۔ ورنہ کھینچنے والا فرد بھی دراڑ میں جا گرے گا۔ رسیاں بھی ایک حد تک تحفظ دے سکتی تھیں۔ گلیشیر پر سفر کے آغاز پر میں نے ڈیوڈ شاسے کہا۔ ”پاسو بہت وزنی ہے اور اس کی وجہ سے برف ٹوٹنے کا خطرہ بھی زیادہ ہے گویا یہ گرے گا اور ہمیں بھی لے جائے گا۔ ہم کسی صورت اس کا وزن نہیں بھار سکتے ہیں۔“

میرے اعتراض نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے باسو سب سے الگ سفر لے گا۔“

اگرچہ یہ خود غرضی تھی مگر باسو حکم کا غلام تھا اگر اسے خود کشی کا حکم دیا جاتا تو وہ سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کرتا۔ ڈیوڈ شا کے حکم پر اس نے خود کو میری اور اوشا کی رشتی سے الگ کر دیا۔ ڈیوڈ شا کے ساتھ کرنل رشتی سے ملکہ تھا جب کہ مارک، امیت اور سین ایک رشتی سے بندھے ہوئے تھے۔ مگر جب باسو ہم سے الگ ہوا تو ڈیوڈ نے کرنل کو حکم دیا اور وہ ہمارے ساتھ رشتی سے منسلک ہو گیا۔ باسو کو مارک اور سین کے ساتھ رہنے کو کہا تاکہ وہ لمبے ممکنہ دراز کو بھانپ لیں۔ اب زینی اور ڈیوڈ شا ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ دوسری بار ہم پندرہ منٹ کے لیے کتو کے حالات زیادہ خراب تھی کیونکہ اب ہم تقریباً سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر آ گئے تھے۔ یہاں سردی زیادہ اور تینجن مزید کم تھی۔ ٹانگوں سے جیسے جان نکل گئی تھی اور ہم جو ہوا سینے میں بھرتے تھے اس سے برائے نام ہی تینجن مل رہی تھی۔ ہم تین سانس لیتے تو آکسیجن ملتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس سفر کے آغاز میں یہ حال ہے

اس میں آگے جا کر کیا ہوگا۔ میں ڈیوڈ شا سے ذرا فاصلے پر جا بیٹھا جس کا چہرہ کسی قدر عنابی ہو رہا تھا اور وہ لرز تے ہاتھوں سے منتھوں میں اسپرے لے رہا تھا۔ اسپرے لے کر وہ قدرے نارمل ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”ڈیوڈ شاتم نے خود کو اور سب کو کس مصیبت میں پھنسا لیا ہے۔“

”بڑے مقصد کے لیے تکلیفیں سہنا پڑتی ہیں۔“

”بھڑا میں گیا تمہارا بڑا مقصد۔“ میں نے کسی قدر بھنا کر کہا۔ ”ہمارا کیا قصور ہے؟“

”تم لوگ مجبور ہو۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”اسی وجہ سے میرے ساتھ ہو۔“

”تمہیں معلوم ہے وادی یہاں سے کتنی دور ہے اور ہمیں کتنے دن لگ سکتے ہیں؟“

”اس بار ہم نے ممکنہ حد تک سفر فضا میں طے کیا ہے اور یہاں سے وادی صرف تین دن کی مسافت پر ہے۔ اگر ہم آسام کی فضائی اسٹریپ سے سفر کا آغاز کرتے تو یہاں تک آنے میں مزید چار دن اور لگ جاتے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم نے سفر کا ساٹھ فیصد حصہ کم کر لیا ہے۔“

”مگر تین دن بھی بہت ہوتے ہیں مجھے راجا عمر دراز نے بتایا ہے کہ راستے میں بائیس ہزار فٹ بلند پہاڑ بھی آتے ہیں۔“

”یہ درست ہے ان پہاڑوں کو سر کرنا لازمی ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم شام تک ان پہاڑوں تک پہنچ جائیں گے۔“

”میں اپنی اور اوشا کی بات نہیں کرتا لیکن کیا تم پہاڑوں کو سر کر سکو گے؟“

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے تردد آیا مگر اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں میں اس کا تجربہ رکھتا ہوں۔“

یہ سارا دن ہم اسی گلیشیر پر سفر کرتے رہے تھے۔ بلند پہاڑ اس گلیشیر کے آخری سرے پر تھے۔ ہم شام تک ان کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔ چھ بجے جب ہم نے پڑاؤ ڈالا تو سب اتر حالوں میں تھے۔ تھکن، سردی اور مختلف حصوں میں درد کی کیفیت تھی۔ دوپہر کا کھانا بس ایسے ہی کھایا تھا اس میں گوشت کے ابلے ٹکڑے اور آلو کے قتلے تھے۔ یہ سب ن بن خوراک تھی۔ کیونکہ گرم نہیں کیا گیا تھا اس لیے سب کو بخ بستہ کھانا پڑا تھا۔ ڈیوڈ شا نے میری وجہ سے خاص طور سے حلال گوشت کے ٹن لیے تھے۔ سین کک کے فرائض انجام دیتا اور اس نے جھٹ پٹ کچن کا خیمہ لگایا اور اس میں اسٹوو آن کر لیا۔ اس کی گرمائش کے لیے سب ہی اس کے خیمے میں گھس آئے تھے۔ سفر میں پہلی بار حرارت لی تھی اور سب اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سین نے سب سے پہلے ہمیں نوڈلز سوپ پیش کیا اس کی گرمائش نے ہمیں جیسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد چائے اور کافی سرو ہوئی۔ ساتھ میں خستہ ویفر بسکٹ تھے۔ اس کے بعد وہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

مارک نے کہا۔ ”کل ہمیں پہاڑوں کو سر کرنا ہے۔“

”کیا ہم کل کے دن میں سر کر سکتے ہیں؟“ ڈیوڈ شا نے پوچھا۔

”لازمی کرنے ہوں گے ورنہ اگر پہاڑوں پر رات گزارنی پڑ گئی تو سب کے لیے بہت مشکل ہوگا۔ میرا خیال ہے اکثر لوگ اس کے عادی نہیں ہیں۔ کوئی بیمار پڑ گیا تو اس کے لیے یہاں ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اس

لیے ہمیں رسک نہیں لینا ہوگا۔“ مارک نے ہماری طرف دیکھا۔ ”مجھے تو حیرت ہے کہ تم لوگوں نے آج کا دن کیسے گزار لیا۔“

”کیونکہ ہم عام لوگ نہیں ہیں۔“ ڈیوڈ شانے کہا۔ ”تم فکر مت کرو ہم میں سے کوئی نہ تو بیمار پڑے گا اور نہ ہی ہماری رات پہاڑوں پر بسر ہوگی۔ ہم کل شام انہیں عبور کر چکے ہوں گے۔“

”اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کل صبح سویرے روانہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم زیادہ لوگ ہیں اور سامان بھی زیادہ ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ مارک نے تائید کی۔ ”ہمیں ذہن بنا لینا ہے کہ کل ہم ان دو پہاڑوں کے دوسری طرف ہوں گے۔“

باسو کی خیمے میں گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور اسے کھانا پینا وہیں سلائی کیا جا رہا تھا۔ کھانا کی کڑوا جان آئی تو سب کے خیمے لگائے جانے لگے۔ سب سے پہلے زینی اپنے خیمے میں گھسی تھی۔ اس کی حالت ٹھیک تھی مگر وہ اس سفر کے دوران میں چپ رہی تھی اور اس نے مجھ سے یا اوشا سے چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کی تھی۔ درحقیقت اس سفر میں کسی کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی جو جسمانی طور پر ٹھیک تھے وہ ذہنی لحاظ سے پریشان تھے۔ یہ سب ہائی آلٹیٹیوڈ اور بہت گرم میٹرل سے بنے ایسے خیمے تھے جن میں منفی تیس درجہ حرارت میں بھی رات گزاری جاسکتی تھی۔ ان میں ہمارے سلپنگ بیگز رکھے گئے تھے یہ بھی بہت گرم میٹرل سے بنے ہوئے تھے اس کے باوجود لگ رہا تھا کہ اس برف خانے میں ہماری پہلی رات ہرگز سکون سے نہیں گزرے گی۔ شام ہوتے ہی درجہ حرارت یک دم خاصا گر گیا تھا اور تھرما میٹر کا پارہ منفی سات تک آ گیا تھا۔ رات میں اس میں مزید کمی کا پورا امکان تھا۔ خیمے لگا کر سب اپنے اپنے خیموں میں گھس گئے تھے سوائے اوشا کے جو میرے خیمے میں آگئی تھی اور یہاں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ہم ذرا فاصلے پر ہو کر بیٹھ سکتے۔ وہ مجھ سے چپک کر بیٹھی تھی۔ مگر درمیان میں ہمارے اتنے موٹے لباس تھے کہ مجھے اس کے یوں پاس بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اوشا نے کہا۔

”شہباز یہ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟“

اگرچہ میں اسے کسی قدر بتا چکا تھا کہ ڈیوڈ شاکی منزل کہاں ہے؟ مگر اب موقع ملا تو میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ ہم کہاں جا رہے تھے اور وہاں کیا کیا تھا۔ اگرچہ میں خود سنی سنائی باتیں بتا رہا تھا مگر یہ بھی اتنی حیرت انگیز اور ناقابل یقین تھیں کہ اوشا کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”شہباز جی میں ایسی چیزیں ہیں؟“

”لیا کہا جاسکتا ہے کیونکہ میں نے تو یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ کوئی لڑکی اتنی زہریلی ہو کہ جسے کاٹ لے وہ منوں میں چھوٹے۔“

”شہباز میرا من چاہتا ہے کہ تیرے سارے دشمنوں کو مار دوں۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”یہ تجھے کتنا تنگ کرتے ہیں۔“

”قسمت کی بات بھی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”مگر تو ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ مجھے

تیری زندگی اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ اپنی زندگی ہو سکتی ہے۔ پھر ہم یہاں عام حالات سے کٹ گئے ہیں یہاں سب کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔“

”بس یہی سوچ کر رہ جاتی ہوں کہ تجھے ٹھیک نہ لگے۔ مگر تو صرف ایک بار اشارہ کر دے تو.....“

”اوشا تو سوچ سکتی ہے کہ میں کبھی تجھے استعمال کروں گا؟“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں اس قسم کا

آدمی ہوتا تو کیا اتنے لوگ مجھ سے ہوں بے لوث محبت کرتے؟“

اس نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے میں اور دوسرے تجھ سے اسی لیے تو محبت کرتے

ہیں کہ تو دوسروں کو اپنے جیسا سمجھتا ہے۔“

باہر کی فضا کے مقابلے میں چمے میں موسم بہت بہتر تھا اس لیے جب رات کے کھانے کے لیے بلایا گیا تو دل پر جبر کر کے باہر نکلنا پڑا تھا۔ کچن تک جاتے جاتے برا حال ہو گیا تھا۔ مگر وہاں کی گرم فضا اور گرم کھانے میں مزہ آیا۔ سب ایک جگہ ہو کر بیٹھے تھے اس لیے جسموں کی گرمی سے بھی ماحول بہتر ہوا تھا۔ سین نے اگرچہ پہلے سے تیار کھانا ہی گرم کر کے پیش کیا تھا مگر وہ بھی مزے لگا۔ نوبج ہم واپس اپنے خیموں میں جا چکے تھے۔ اوشا کا خیمہ میرے خیمے کے پاس تھا اور اس کے پاس ہی ڈیوڈ شا اور باسو کے خیمے تھے۔ دوسری چیزوں کی طرح باسو کا خیمہ بھی خاص تھا۔ یہ ساز میں بڑا تھا اور اس کا سلپنگ بیگ بھی اس کی جسامت کے لحاظ سے تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسروں کے مقابلے میں اسے سردی نے اتنا متاثر نہیں کیا تھا اور وہ آرام سے تھا جب کہ ہم کانپتے تھے اور سردی سے بچنے کی کوشش کرتے تھے شاید اس کی قوت اور جسامت نے اسے سردی سے بھی محفوظ رکھا تھا۔ ڈیوڈ شا اور باسو کے ہمارے پاس رہنے کا مقصد ہماری نگرانی بھی تھا۔

حسب توقع رات بہت دیر سے نیند آئی کیونکہ سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ بہت گرم خیمہ اور سلپنگ بیگ بھی سردی روکنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ جس وقت کچن سے نکل کر خیموں میں آئے تو موسم خطرناک ہو چلا تھا اور ہوا میں بہت تندہی اور خشکی آگئی تھی۔ یہ ہوا اوپر پہاڑوں سے اتر رہی تھی اور کسی دریا کی طرح مسلسل بہہ رہی تھی۔ اس کے دباؤ سے خیمے کی دیوار دھکی تھی۔ اس کا شور کانوں میں چھتا تھا۔ ہمارے خیمے گلیشیر کے اوپر تھے اور نیچے سے مسلسل چیخنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی کبھی ایسی آواز آتی جیسے پانی بہہ رہا ہو اور یہ ساری آوازیں حقیقی تھیں کیونکہ گلیشیر کے سرکنے سے اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔ دن میں جب دھوپ تیز ہو تو برف پگھل جاتی ہے اور گلیشیر کے اندر ندیاں رواں ہو جاتی ہیں رات میں یہ ندیاں جم جاتی ہیں مگر پورے طور پر نہیں بلکہ نیم پگھلی ہوئی حالت میں۔ اگلے دن گرمی سے یہ پھر پگھل کر رواں ہو جاتی ہیں۔ کئی بار ایسی آوازیں سے آنکھ کھلی اور میں دوبارہ سونے کی کوشش کرتا رہا۔ حقیقی نیند کا دورانیہ بہت کم رہا مگر جسم کو آرام مل گیا تھا۔ صبح کے قریب نیند آئی تھی کہ اٹھنے کا وقت ہو گیا۔

ڈیوڈ شا کا کہنا تھا کہ دادی یہاں سے اب صرف دو دن کی مسافت پر تھی اور جب ہم پہاڑ سر کر لیتے تو اس کے بعد ایک دن کا سفر اور تھا جس کے بعد ہم دادی کے کنارے تک پہنچ جاتے۔ صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی سب اٹھ گئے تھے۔ یہاں منہ ہاتھ دھونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سب نے تھوڑے سے گرم پانی سے چھوٹے تو لے لگا کر منہ صاف کر لیے اور برش کر کے کلی کر لی۔ اس کے بعد ناشتا ہوا اور میرا اندازہ درست نکلا

جب ناشتا گرم دلیہ، ابلے انڈوں اور شہد پر مشتمل نکلا۔ یہ قوت بخش ناشتا تھا جو ہمیں یہاں توانائی بھی دیتا اور سردی کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتا۔ جب تک سورج طلوع ہوا سامان پیک کیا جا چکا تھا۔ صبح کے وقت مثال سے نہایت سرد ہوا بہہ رہی تھی اور جسم کے کپلے حصوں پر یوں لگ رہی تھی جیسے پھوڑا آزار ہے ہوں۔ سامان باندھ کر ہم آگے روانہ ہوئے کیونکہ مارک پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اگر ہم رات سے پہلے پہاڑوں کے دوسری طرف نہ پہنچے تو رات بہت خوفناک گزرے گی۔ یہاں سردی ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ ڈیوڈ شا، زینی، مارک اور باسو ساتھ تھے۔ میں، اوشا، کرنل، اور سین دوسرے گروپ میں تھے۔ مگر ہمیں ایک ہی راستے سے اور پاس پاس رہتے ہوئے سفر کرنا تھا۔ گزشتہ شام تک ہم تقریباً پہاڑ کے پاس پہنچ گئے تھے اس لیے صبح جب آغاز کیا تو فوراً ہی کوہ پیائی شروع ہو گئی تھی۔

اگر حالیہ سلسلے کے دوسرے پہاڑ دیکھے جائیں تو یہ دو چوٹیاں ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں۔ ماہر کوہ پیما ہتھ کھینٹے انہیں سر کر لیتے۔ میرے، سین، مارک، باسو اور کرنل کے لیے بھی زیادہ مشکل نہیں تھیں۔ مگر زینی، اوشا اور سب سے بڑھ کر ڈیوڈ شا کے لیے یہ بہت ہی مشکل تھیں۔ ہمارے گروپ میں سین سب سے آگے تھا اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے اوشا تھی سب سے آخر میں کرنل تھا۔ زینی کے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ ماہر کوہ پیما نہیں ہے۔ چڑھائی کے آغاز میں اس کی مہارت سامنے آنے لگی۔ وہ بہت مشکل راستوں سے بھی با آسانی گزر رہی تھی اور اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ اس سفر کی اہل ہے۔ کرنل سب سے آخر میں تھا میں نے اس سے کہا۔ ”تم اوشا کا خیال رکھنا یہ ماہر کوہ پیما نہیں ہے۔“

”تم فی کارمت کارو۔“ کرنل نے اردو بگھارنے کی کوشش کی۔ ”میں کماری جی کا خیال رکھے گا۔“

اوشا اس کی بات پر ہنسی۔ ”میں کہاں سے کماری ہو گئی رہے۔“

آج بھی اوشا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے انداز میں ذرا بھی کمزوری نہیں تھی۔ ڈیوڈ شا کا کہنا درست ثابت ہو رہا تھا کہ وہ مردوں سے زیادہ ہمت والی تھی کم سے کم ڈیوڈ شا سے زیادہ ہی ہمت تھی جسے اس سفر کے آغاز میں ہی باسو کے سہارے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ باسو اسی مقصد کے لیے اس کے ساتھ تھا۔ جہاں کوئی مشکل مرحلہ آتا ڈیوڈ شا اس کی مدد سے آگے بڑھتا تھا۔ اس کے برعکس اوشا اب تک بغیر سہارے کے اوپر چڑھ رہی تھی اور اس نے کہیں بھی کسی کی مدد نہیں لی تھی۔ ڈیوڈ شا کا گروپ آگے تھا اس لیے میں انہیں بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد اصل چڑھائی شروع ہوئی تھی اب تک ہم پہلے پہاڑ کی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ ہمیں ہاتھ اور اوزار استعمال کرنے پڑے تھے مگر اب تک رسوں کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ مگر ایک گھنٹے بعد رسوں کی ضرورت پیش آ گئی۔ یہاں سے نہیں بدل سکیں۔ سب سے آگے مارک اور سین ہو گئے۔ وہ راستہ دیکھ رہے تھے اور کیلیں لگا کر رسیاں باندھ رہے تھے تاکہ باقی ان کی مدد سے اوپر چڑھ سکیں۔ دوسرے ان کی طرح اوپر نہیں جا سکتے تھے۔

جیسے جیسے بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ موسم خراب اور راستہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ راستے تنگ اور پیچیدہ ہو گئے تھے اور دونوں ٹیمیں پاس پاس تھیں۔ پہلے ڈیوڈ شا کی ٹیم گزرتی تھی اور پھر ہماری ٹیم جاتی تھی۔ مگر پاس ہونے سے ہم تقریباً ایک ہی ٹیم ہو گئے تھے۔ زینی باسو کے تقریباً پیچھے تھی اور اس کے پیچھے میں تھا۔ میں ہزار فٹ

کی بلندی پر ہوا تیز اور برف کے باریک ذرات اڑ رہے تھے۔ درجہ حرارت منفی پندرہ تک چلا گیا تھا اور ہماری سانسوں کے ساتھ منہ و ناک سے جونی خارج ہو رہی تھی وہ برف بن کر مونچھوں اور شیو پر جم رہی تھی۔ پہلے سانس لینا دشوار تھا اور اب دشوار تر ہو گیا تھا۔ ہوا جیسے خالی تھی اور ہمارے سینے دھوکئی کی طرح چل رہے تھے۔ ہر چند قدم کے بعد رک کر ہمیں سانس ہموار کرنا پڑتا تھا تب کہیں مزید آگے جانے کی ہمت پیدا ہوتی تھی۔ میری حالت بری تھی مگر مجھے اوشا کا خیال تھا اور میں بار بار مڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ میں جب بھی اسے دیکھتا تو وہ ہونٹ پھیلا کر بتاتی کہ وہ ٹھیک ہے اور مسکرا رہی ہے۔

ایک بار میں نے مڑ کر اوشا کی طرف دیکھا اور پھر پلٹنے والا تھا کہ مجھے اوپر سے چیخ کی آواز سنائی دی اور میں برفانی دیوار سے چپک گیا۔ اسی لمحے میرے پاس سے باسو گزرا۔ وہ گر رہا تھا مگر اس کی پیٹ سے رسا بندھا ہوا تھا۔ یہ رستی اوپر ڈیوڈ شا، مارک اور سین سے بھی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے خطرہ بھانپ لیا اور چلا کر کہا۔ ”سب اپنی جگہ چپک جائیں۔“

میں نے کلبازی کی نوک برف کی دیوار پر ماری تھی اور وہ اس میں کھس گئی۔ باسو کی رستی کی حد ختم ہوئی تو ڈیوڈ شا کھنچا آیا تھا۔ زینی محفوظ رہی تھی اس لیے میں نے برف سے کلبازی نکال کر اس رستی پر ماری جس سے ڈیوڈ شا بندھا ہوا تھا۔ وہ ابھی گرنے سے بچا ہوا تھا کیونکہ سین اور مارک نے برف میں اپنی کلبازیاں گاڑ دی تھیں۔ باسو ایک سیلف سے لنگ رہا تھا جس کے نیچے کئی سو فٹ کی گہرائی تھی اور اگر وہ گر جاتا تو اس کے نیچے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری چلائی کلبازی نے رستی کا ٹ دی اور ڈیوڈ شا گرتے گرتے رک گیا۔ مگر باسو کو رستی کا جو سہارا تھا وہ اچانک ختم ہو گیا۔ ایک لمحے کو لگا کہ وہ گر گیا ہے۔ مگر جب میں نے پلٹ کر نیچے دیکھا تو وہ کئی گز نیچے ایک ہاتھ سے سیلف سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ راستے سے ہٹ گیا تھا اس لیے نیچے اوشا اور کرنل کو اس سے خطرہ نہیں تھا کہ وہ گرتے ہوئے انہیں بھی لپیٹ میں لے جائے گا۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

”اپنی رستی دو۔“

مگر وہ ساکت رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس کی رستی باسو تک پہنچا کر اسے محفوظ کرنا چاہتا ہوں اور وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر باسو کا ہاتھ اس جھجے سے چھوٹ جاتا تو وہ گرتے ہوئے دوسروں کو بھی ساتھ لے جا سکتا تھا اس کے تقریباً پونے دو سو کلو گرام وزن کو سہارا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے پھر رستی دینے کو کہا تو ڈیوڈ شا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اسے بچانا مشکل ہے۔“

”کوشش تو کی جا سکتی ہے۔“ میں نے چلا کر کہا۔ یہاں ہوا کا شور اور دباؤ بہت زیادہ تھا اس لیے چلا کر بات کرنی پڑ رہی تھی اور ایک بار چلانے کی صورت میں سانس خلاص ہو جاتی اور دوبارہ بولنے کے لیے کم سے کم دوسرا سانس پڑتے تھے۔ میرے دوسرے بار کہنے پر بھی جب ڈیوڈ شا نے رستی نہیں دی تو میں نے اسے ہی دل میں سنائیں۔ اگر میں رستی نہ کاٹتا تو اچھا تھا باسو اسے بھی ساتھ لے جاتا۔ مگر ایک تو اسے سنانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور دوسرے اس میں بھی مشقت لگتی۔ میں پلٹا تو زینی نے بے چین لہجے میں کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہو اسے بچانا بہت مشکل ہے۔“

میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور نیچے اترنے لگا۔ اس طرف راستہ نہیں تھا اور واحد چھبچھا تھا جس پر

باسولکا ہوا تھا۔ میں نے اترتے ہوئے برف میں کیلیں گاڑنا شروع کیں اور رتی کو ان سے منسلک کرتا رہا۔ تین کیلوں کے بعد میں نے رتی باسو کی طرف اچھال دی۔ ”اسے پکڑ لو مگر ابھی اوپر چڑھنے کی کوشش مت کرنا۔ میری بات سمجھ رہے ہوتا؟“

اس نے سر ہلایا اور رتی تمام لی مگر دوسرے ہاتھ سے چھبائیں چھوڑا تھا وہ دونوں پر زور دیتے ہوئے خود کو قائم رکھے ہوئے تھا۔ یہاں برف کی تہ تھی اور اس میں لگی کیل ایک حد سے نہ۔ وزن برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے میں زیادہ سے زیادہ کیلیں لگا رہا تھا کہ جب باسو مجھے سے اوپر آنے کی کوشش کرے تو یہ کیلیں اس کا وزن برداشت کر سکیں۔ اوشا بھی دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ ”شہباز اگر یہ گیا تو سب کو لے جائے گا۔“

”یہ تم نے اچھا یاد دلایا۔“ میں نے کہا اور خود کو اس رتی سے الگ کر لیا جس سے زینی، اوشا اور کرئل بندھے ہوئے تھے۔ اوشا چلائی۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”اب تم تینوں کو خطرہ نہیں ہے۔“ میں نے رتی کے سہارے نیچے جاتے ہوئے کہا۔ اب پاؤں نکلنے کی جگہ نہیں تھی اور میں پہاڑ سے لپٹا ہوا تھا۔ میرے پاس کل چھ کیلیں تھیں۔ یہ سات آٹھ انچ لمبی تھیں۔ ان کے سروں پر رنگ بھی لگے تھے جن سے رتی یا کلپ منسلک کیے جاسکتے تھے۔ اوشا چلا چلا کر مجھے واپس آنے کو کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو رتی سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر کرئل نے اسے روک لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اوشا زہریلی ہے اور اسے غصہ آ گیا تو وہ اسے ہی کاٹ لے گی اس لیے اس نے حکمت عملی کا مظاہرہ کیا اور اسے سمجھانے لگا کہ وہ اپنی جگہ رہے کیونکہ وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ کرئل میری مدد کر سکتا تھا اس لیے وہ میری مدد کو جائے گا۔ اوشا مان گئی اور کرئل رتی سے الگ ہو کر آگے آیا۔ اس دوران میں باسو کوشش کر کے اپنا دوسرا ہاتھ بھی مجھے تک لے آیا تھا۔ اب وہ کسی قدر محفوظ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”جب میں کہوں تم اوپر آنے کی کوشش کرو گے۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ رتی کو تھامے رکھوں۔“

باسو نے سر ہلایا۔ اس مشکل ترین صورت حال میں بھی اس کا چہرہ جیسے جذبات سے عاری تھا۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی جان کو خطرہ نہ ہو۔ بلکہ یہ سب کسی کھیل کا حصہ ہو۔ جسمانی بڑھوتری نے اسے ذہنی طور پر پیچھے کر دیا تھا اور وہ صرف حکم ماننے اور سمجھنے والا رو بوٹ بن کر رہ گیا تھا۔ میں نے آخری کیل مجھے سے کوئی چار گز اوپر لگائی اور رتی ان سات کیلوں سے منسلک تھی جو یکے بعد دیگرے بندھی تھیں۔ یہ ظاہر یہ خاصا مضبوط سہارا تھا مگر جب میں باسو کے وزن کو دیکھتا تو میرا اعتماد ڈانواں ڈول ہو جاتا کہ یہ کیلیں میرا اور باسو کا بوجھ برداشت کر سکیں گی؟ میں بہت بڑا رسک مول لے رہا تھا۔ آخری کیل لگانے کے بعد میں ایک چھوٹی سی جگہ کھڑا تھا یہاں سے نیچے دائیں طرف چھبایا تھا اور میرے قدموں تلے لاتنا ہی خلا تھا۔ میں نے ایک بار رتی کو کھینچ کر کیلوں کی جانچ کی اور پھر باسو سے کہا۔ ”اوپر آ جاؤ۔“

اس نے سر ہلایا اور اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی غلطی تھی اسے چھبنا چھوڑ کر پہاڑ کی دیوار سے چپک جانا چاہیے تھا اور پھر رتی کے سہارے اوپر آنا چاہیے تھا۔ مگر اس نے مجھے پر چڑھنے کی کوشش کی جب تک میں اسے خبردار کرتا۔ اس کے وزن سے برف کا چھبنا خوفناک آواز کے ساتھ ٹوٹا اور باسو جھٹکے سے نیچے گیا۔ اس کا پورا

وزن رتی پر آیا تھا اور رتی کھنچی۔ اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک گلی کیل برف سے نکل گئی۔ پھر دوسری اور تیسری کیل بھی نکل گئی۔ اس دوران میں جھکے کا زور ختم ہو گیا تھا اس لیے باقی کیلیں پوری طرح باہر تو نہیں آئیں لیکن وہ بھی نکلنے لگے تھیں۔ اولین جھکے نے میرے قدم بھی اکھاڑ دیئے تھے اور میں اس جگہ کھڑا ہوا ڈمگ رہا تھا۔ اگر میں گر جاتا تو میرا اور باسو کا مشترکہ وزن لازماً باقی کیلوں کو بھی نکال دیتا۔ میں خود کو سنبالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرا توازن درست نہیں تھا اور میں آگے کی طرف جا رہا تھا۔ بالآخر میرا توازن مکمل طور پر خراب ہوا اور میں آگے کی سمت گیا تھا۔



سامنے موت تھی اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا جب موت کا سامنا ہوا تھا۔ بارہا میں اس مرحلے سے گزر چکا تھا اور عین موقع پر قدرت نے میری مدد کی کیونکہ وہ وقت نہیں آیا جسے میرے لیے لمحہ اجل کہا جاسکتا مگر اس وقت سامنے کچھ نہیں تھا ایک بار میں جاتا تو خلا میں جاتا اور پھر اس وقت کچھ دیر کے لیے رکتا جب رتی کھنچ جاتی۔ اس کے بعد باقی کیلیں بھی نکل جاتیں اور پھر سینکڑوں فٹ تک کوئی روک نہیں تھی۔ میں آگے کی طرف جھک رہا تھا کہ اچانک کوئی چیز سر کے پیچھے سے دونوں طرف سے آئی اور میرے سینے سے لپٹ گئی اس کے ساتھ ہی میں واپس دیوار سے چپک گیا۔ میرا سانس جو ایک لمحے کو رک گیا تھا وہ پھر سے چل پڑا مگر مجھے یقین کرنے میں کچھ لمحے لگے تھے کہ ابھی اجل نہیں آئی ہے۔ آتے آتے رہ گئی تھی۔ میرے سینے سے لپٹنے والی دو چیزیں دو عدد ٹانگیں تھیں اور یہ ٹانگیں زین کی ثابت ہوئیں۔ وہ اپنی رتی کے ساتھ پھسلتی ہوئی مجھ تک آئی اور اس نے بروقت عقب سے ٹانگیں ڈال کر مجھے واپس کھینچ لیا۔

مگر خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ باسو رتی سے جھول رہا تھا اور پر موجود چار کیلیں اپنی جگہ چھوڑ رہی تھیں۔ زین نے مجھ سے کہا۔ ”شہباز رتی کھول دو۔“

پہلے میں سمجھا کہ وہ باسو کی رتی کاٹنے کی بات کر رہی ہے مگر فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ میری رتی کی بات کر رہی تھی۔ میں نے تیزی سے خود کو رتی سے الگ کیا۔ اب صرف باسو کا وزن تھا۔ مگر وہ بھی کم نہیں تھا۔ میں نے اوپر دیکھا رتی الگ کرنے کے بعد اب کیلوں سے میرا تعلق نہیں رہا تھا اور میں ان کی طرف نہیں جاسکتا تھا۔ باسو اپنے کیلوں والے جوتے برف میں مار کر خود کو نیچے جانے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نکلتی کیلوں کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اسی دوران میں کرنل وہاں تک آ گیا۔ اس نے پہلی کیل کو ہتھوڑی سے ٹھونک کر واپس لگایا اور پھر اوپر سے ایک رسہ اور نیچے پھینکا۔ اسے باسو نے اپنی بیلٹ سے باندھ لیا۔ کرنل واپس نیچے کی طرف گیا تھا اور دوسری رتی کی مدد سے باسو کو جھلاتے ہوئے واپس راستے پر کھینچ لیا۔ یہ آسان کام تھا ورنہ صرف رتی سے باسو کو اوپر کھینچنا بہت مشکل کام تھا خود اس کے لیے اوپر چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔

”اب تو جان چھوڑو۔“ میں نے شانوں پر سوار زین سے کہا۔ اوشا اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں خود بھی اس سواری سے خفت محسوس کر رہا تھا۔

”یہ صلہ ہے جان بچانے کا۔“ وہ شوفی سے بولی اور رتی کے سہارے اوپر سرک گئی۔ میں کیلوں سے بندھی رتی کے سہارے واپس راستے پر آیا۔ باسو نیچے سے آ رہا تھا۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کے

لیے میرے پاس رکنا کچھ کہے یا تاثر دیئے بغیر اوپر چلا گیا۔ وقت پہلے ہی کم تھا اور اس چکر میں تقریباً آدھا گھنٹہ اور ضائع ہوا تھا اس لیے فوری طور پر سفر شروع کیا گیا تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر جا رہے تھے۔ راستہ دشوار اور موسم خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ گیارہ بجے ہم نے چوٹی تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اب دوسری طرف اتر رہے تھے۔ درحقیقت ہم دوسری طرف نہیں اتر رہے تھے بلکہ ایک تنگ پل سے ہوتے ہوئے دوسری چوٹی کی طرف جا رہے تھے۔ اصل اترائی اس کے بعد تھی۔ تقریباً ایک کلومیٹر پر مشتمل یہ پل بعض ایسی جگہوں سے بھی گزرا جہاں اس کے دونوں طرف ہزاروں فٹ تک سیدی مگرانی تھی۔

ان جگہوں سے بہت احتیاط سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ باقی پل آسان تھا۔ اس پر سفر کرتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کے ساتھ لگ کر کسی خلا میں سفر کر رہے ہیں۔ یہاں سفر کے آغاز میں، میں نے اوشا کو ساتھ رکھا تھا اور مشکل مقامات پر اسے سہارا دیتا تھا۔ سفر کے شروع میں میری حالت اچھی نہیں تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہتر ہوتی گئی تھی۔ شاید میں اس ماحول اور بلندی کا عادی ہو رہا تھا۔ البتہ اوشا اب تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کی رفتار کم تھی اور بعض جگہوں پر اسے مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخی اب کم ہو گئی تھی۔ لہجہ ہم نے اسی پل پر کیا اور جب دوسری چوٹی کے پاس پہنچے تو تین بج رہے تھے اور ابھی ہمیں اس کی ڈھلان پر طویل سفر کرنا تھا۔ ڈیوڈ شاکی حالت میری توقع سے کم خراب تھی مگر اسے اچھا بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ بیشتر سفر اس نے باسو اور مارک کے سہارے طے کیا تھا۔ آرام کے وقفوں میں وہ سب سے الگ اور خاموش بیٹھا رہتا تھا۔

لہجہ کے دوران میں، میں نے کرنل سے کہا۔ ”اگر ہم رات سے پہلے دوسری طرف نہ اتر سکے تو ڈھلان پر اتار گزرنے کے لیے ہمارے پاس کیا ہے؟“

”کچھ خاص نہیں ہے۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”صرف ڈیوڈ شاکی کے لیے ایک خاص خیمہ اور سلیپنگ بیک ہے۔ وہ یہاں کی سردی برداشت نہیں کر سکے گا۔“

”اور کیا ہم کر لیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم سب جوان اور فٹ ہیں۔“

”اوشا اس ماحول کی عادی نہیں ہے اور وہ عورت ہے۔“

”ڈیوڈ شاکی کہتا ہے کہ اس کے جسم میں موجود ہر اسے سردی سے محفوظ رکھے گا اور تم نے دیکھا کہ اس نے کسی بھی موقع پر کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔“

”ٹھیک ہے اس کا زہرا سے سردی سے بچائے گا مگر یہ پُر مشقت سفر تو اسے اپنے جسم کے بل بوتے پر نبھانا ہے۔“

کرنل نے میری طرف دیکھا۔ ”تم بیکار کی بحث کر رہے ہو۔ اب ہم نصف راستہ طے کر چکے ہیں۔ پرسوں صبح تک ہم وادی کے کنارے پہنچ جائیں گے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ اب یہ بحث بیکار تھی اور مجھے سوچنا تھا کہ آگے کیا حالات ہوں گے اور مجھے خود کو اور اوشا کو کیسے محفوظ رکھنا تھا۔ مگر میں مجبور تھا۔ اول تو میرے پاس کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ

ہی اپنی یا اوشا کی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار تھا۔ پھر یہاں پیش آنے والے خطرات فطرت کے تھے اور ان سے مقابلہ مشکل تھا۔ اس معاملے میں میرا ذہن صاف تھا کہ اگر مجھے راستے میں کوئی موقع ملا تو میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں اپنی اور اوشا کی زندگی کے لیے ڈیوڈ شایا اس کے ساتھیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ دوبارہ سفر کے آغاز میں، میں نے موقع پا کر اوشا کو بھی یہ بات سمجھا دی تھی اور وہ خوش ہو گئی تھی۔ اس نے کہا: ”کاش کہ ڈو پہلے یہ سوچ لیتا۔ جب وہ دیوگر اٹھا تب موقع تھا۔“

”نہیں تب موقع نہیں تھا، ڈو نے دیکھا نہیں کسی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ جب میں اس کی مدد کو گیا تو کرنل آیا تھا۔“

”ٹوٹھیک کہہ رہا ہے رے۔“ اوشا ہانپتے ہوئے بولی۔ ”یہ بہت کھود کر رہیں۔“

تین بجے کے بعد ہم نے بہت دور تک پھیلی ڈھلان پر اترنا شروع کر دیا تھا یہاں ہمیں زیادہ اترنا تھا اور نیچے موجود میدان میرے حساب سے سطح سمندر سے بارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھا۔ مگر یہاں مستقل برف جمی رہتی تھی کیونکہ یہ جگہ ہمالیہ کے عین وسط میں تھی۔ اس اترائی کے دوران میں ڈیوڈ شایا ایک جگہ رک گیا تھا اور وہاں برف سے نکلے کسی چیز کا معائنہ کر رہا تھا۔ مارک اور سین بھی اس کے پاس موجود تھے۔ زینی ڈرافٹا صلے پر تھی۔ میں اور اوشا ان کے پاس پہنچے تو حسب عادت زینی نے لگاؤٹ بھرے انداز میں پوچھا۔ ”کیسے ہو ہینڈسم؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن یہ کیا چکر ہے؟“

اس نے شانے اچکائے اور نارمل لہجے میں بولی۔ ”اسنو مین کی لاش ہے۔“

”اسنو مین؟“ میں حیران ہوا۔ ”تم اتنے نارمل انداز میں بتا رہی ہو۔“

”ہاں مجھے صرف مین سے دل چسپی ہے اسنو مین سے نہیں۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو میں اس کے واہیات جملے پر جرجر ہوتا ہوا ڈیوڈ شایا کے پاس آیا تو جو برف سے جھانکتی اسنو مین کی لاش کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہ اسنو مین ہی تھا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہری دوڑ گئی۔ زندگی میں پہلی بار میں اس افسانوی مخلوق کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے بارے میں لاتعداد کہانیاں لکھی جا چکی تھیں اور جو بے شمار موزیکل مرکز کی کردار تھا۔ چہرہ انسانی ہی تھا مگر رخساروں تک بالوں کی لہر آ رہی تھی۔ کسی قدر پھیلی ناک اور تنگ ماتھا تھا۔ آنکھیں نیم دائیں اور ان میں انسانی آنکھوں جیسے ڈیلے تھے۔ کسی قدر کھلے منہ سے انسانوں جیسے ہموار دانت جھلک رہے تھے۔ مگر اس کا چہرہ عام انسانی چہرے سے کم سے کم دو گنا بڑا تھا۔ راجا عمر دراز نے اپنے حوالے سے اس کے بارے میں مجھے بتایا تھا اور مجھے اس کے کہے ایک ایک لفظ پر یقین تھا مگر جو یقین اپنی آنکھ سے دیکھ کر ہوتا ہے وہ مجھے اس وقت ہوا تھا۔ برف سے اسنو مین کا سر اور دائیں شانے کا کچھ حصہ جھانک رہا تھا۔ سب اس کی تصویریں لے رہے تھے۔ بلکہ مارک اور سین منصوبہ بنا رہے تھے کہ واپسی میں اس کا سر کاٹ کر لے جائیں گے تاکہ ہمارے پاس برفانی آدمی کے بارے میں حتمی ثبوت ہو۔ مگر میں کچھ اور..... سوچ رہا تھا۔ میں نے ڈیوڈ شایا سے کہا۔

”تم نے سوچا کہ یہ یہاں موجود ہیں؟“

ڈیوڈ شایا نے میری طرف دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ دوسرے اسنو مین کی موجودگی بھی ممکن

ہے؟“

”بالکل جہاں ایک ہو سکتا ہے وہاں دوسرا کیوں نہیں ہو سکتا؟“

ڈیوڈ شانے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

”دوسرے میں نے اس درندے کے بارے میں راجا عمر دراز سے تفصیل سے سنا ہے۔ ہماری خوش قسمتی کہ ہمارا واسطہ ایک مردہ اسنوین سے پڑا ہے۔ دوسری صورت میں ہم بہت بڑی مصیبت میں پڑ سکتے تھے۔ بلکہ اب بھی پڑ سکتے ہیں۔“

ڈیوڈ شانے کرٹل کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ شناس تھا اس نے سر ہلا کر ڈیوڈ شا کو اطمینان دلایا کہ وہ اس معاملے میں بے فکر ہے۔ فوٹو سیشن کے بعد دوبارہ سفر شروع ہوا اور مارک نے ایک سرخ جھنڈی پانچ فٹ لمبی ایک اسٹک پر اسنوین کے پاس لگا دی تھی تاکہ نشانی رہے۔ اس کا پورا امکان تھا کہ برف باری سے اسنوین چھپ جائے گا۔ ہم نے ڈھلان پر دوبارہ سفر شروع کیا۔ پانچ بجے کے بعد ڈھلان نسبتاً آسان ہو گئی تھی۔ اس لیے اترنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی اس کے باوجود سات بجے جب اندھیرا ہوا تو ہم ابھی ڈھلان پر ہی تھے اور آٹنی میٹر کے مطابق بلندی چودہ ہزار فٹ تھی۔ ڈیوڈ شانے فیصلہ کیا کہ سفر جاری رہے گا جب تک ہم بارہ ہزار فٹ کی بلندی تک نہیں پہنچ جاتے۔ اس سے اوپر رات گزارنا اس کے لیے مسئلہ بن جاتا۔ پہاڑوں کے دوسری طرف آنے کے بعد کم سے کم مجھے موسم اتنا سخت نہیں لگ رہا تھا۔ بہر حال ابھی تو رات کا آغاز تھا اور شاید رات کو سردی کی شدت بڑھ جاتی۔

اوشا نے اسنوین دیکھا تھا اور ہم گئی تھی۔ اس نے سفر کے دوران میں مجھ سے کہا۔ ”ایک بار بابا نے اس کے بارے میں بتایا تھا۔“

میں چونکا۔ ”اسے کیسے پتا چلا؟“

”بابا جزی یونیوں کے لیے پہاڑوں میں بھی جاتا تھا وہیں اسے ایک باریہ برف والا آدمی ملا تھا۔ اس نے بابا پر حملہ کیا مگر بابا بچ گیا تھا۔“ اوشا نے انکشاف کیا۔

”میں نے اس کے بارے میں سنا ہے لیکن دیکھا آج پہلی بار ہے۔“

”اچھا ہے رے مرا ہوا تھا ورنہ سب کو پتا چل جاتا۔“ اوشا نے کہا۔ تاریکی کی وجہ سے ایمر جنسی لائٹس نکال لی گئی تھیں اور ان کی روشنی میں سفر ہو رہا تھا۔ سب کے پاس ایک ایک لائٹ تھی۔ ہم اپنا راستہ خود دیکھ بھال کرتے رہے تھے۔ پورا دن سفر نے سب کا مشر کر دیا تھا اور دو پہاڑ سر کرنا تو اچھے خاصے کوہ پیماؤں کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ مگر ہم اس کے بعد بھی سفر کے لیے مجبور تھے۔ آٹھ بجے ہم تیرہ ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آچکے تھے۔ تقریباً سب کا تھکن سے برا حال تھا مگر اوشا کی حالت بری تھی۔ وہ میرا سہارا لے کر چل رہی تھی اور اس کے قدم بہت مشکل سے اٹھ رہے تھے۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

”اب ہمیں رک جانا چاہیے۔ سب تھک گئے ہیں۔“

خود ڈیوڈ شا کی حالت اچھی نہیں تھی اور وہ بہت مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے انکار کیا۔ ”ابھی نہیں..... بارہ ہزار فٹ کے بعد.....“

”اس کے لیے ہمیں ایک گھنٹہ اور سفر کرنا پڑے گا۔“

”بارہ ہزار فٹ سے نیچے۔“ ڈیوڈ شانے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ سب سفر کر رہے تھے مجبوراً مجھے اور اوشا کو بھی آگے بڑھنا پڑا۔ کرنل کے پاس گھڑی میں آٹمی میٹر تھا اور اس سے بلندی کا پتا چل رہا تھا۔ باسو نے اب مستقل ڈیوڈ شا کو اپنے شانے پر اٹھالیا۔ گویا وہ ٹھاٹ سے سفر کرتا اور ہم اپنے پیروں کو کھینٹتے۔ اوشا کی حالت ٹھیک نہیں تھی اور وہ لڑکھڑاہی تھی۔ میں اسے مستقل سہارا دے رہا تھا۔ پھر میں نے اس کا بیک لے لیا اس نے منع کیا مگر مجھے لگ رہا تھا کہ اب اس میں سکت باقی نہیں رہی ہے۔ بیک اتارنے کے باوجود مجھے اوشا کو سہارا دینا پڑ رہا تھا۔ چلنے کے دوران میں اوشا ہاپنٹے ہوئے ڈیوڈ شا کو اپنی زبان کی منتخب گالیوں سے نوازا رہی تھی جو خود تو باسو کے شانے پر سوار تھا اور ہمیں پیدل خوار کر رہا تھا۔ میں اوشا سے متفق تھا مگر میں نے کہا۔

”اپنی سانس مت ضائع کرو۔“

آٹھ بجے کے بعد ہم ایک سیدھی جگہ پہنچے جو سوا بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھی۔ ڈیوڈ شانے یہاں قیام کا فیصلہ کیا اور رکستے ہی جو جہاں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سین کی حالت بھی اچھی نہیں تھی مگر اس کی مجبوری تھی کہ اسے کک کا کردار بھی ادا کرنا تھا۔ اس نے باورچی خانے والا خیمہ لگایا اور اندر کھانا بنانے کا سامان کرنے لگا۔ سب سے پہلے ہم نے انرجائل کے گلاس پیئے اور ہماری جان میں جان آئی۔ اس کے بعد قواعد کے مطابق پہلے نوڈلز اور پھر چائے آئی۔ سوائے باسو کے سب کچن میں سٹ آئے تھے۔ گرم ماحول نے بھی ہماری مدد کی۔ مگر ماگرم ڈنر نے خاصی حد تک آج کی تھکن کا مداوا کر دیا تھا۔ اس لیے جب سب اپنے اپنے خیموں اور سلپنگ بیگز میں گھسے مطمئن تھے۔ اوشا نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے رے، میں تیرے پاس ہی رہوں گی۔“

”تمہارا خیمہ پاس ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈر کس بات کا ہے؟“

”برف والے آدمی کا۔“

میں نے تسلی دی۔ ”وہ تو مر ا ہوا تھا۔“

”ہاں پر اس جیسے اور بھی تو ہوں گے۔“ اس نے بھی وہی کہا جو میرے ذہن میں تھا۔ ”ایک یہاں ہے تو اور بھی یہیں ہوں گے۔“

”تم فکر مت کرو ان کے پاس ہتھیار ہیں اگر برفانی آدمی آیا تو یہ اس سے نمٹ سکتے ہیں۔“

”میں کسی کو نہیں جانتی رہے بس تجھ پر بھروسہ ہے۔“

”ٹو جانتی ہے میں نے بھی ہمیشہ اپنے زور بازو پر بھروسہ کیا ہے لیکن اصل بھروسہ مجھے اللہ کی ذات پر

ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے لیے بھی اور تیرے لیے بھی اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔“

”میں اپنے بھگوان کو جانتی ہی نہیں ہوں رہے۔“ اس نے حسرت سے کہا۔ ”تم اپنے بھگوان پر کیسے اتنا

اعتماد کرتے ہو۔“

”یہ بھی اس کی مہربانی ہے کہ اس نے اعتماد دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب سو جانچ پھر سفر کرنا ہے اور پتا

نہیں کتنی دور جانا ہے۔“

اوشا اپنے خیمے میں کھس گئی اس کا خیمہ میرے اور باسو کے خیمے کے درمیان میں تھا۔ سب سو گئے تھے لیکن

باسو جاگ رہا تھا۔ وہ اپنے خیمے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ لازمی بات تھی کہ اس کی ڈیوٹی ڈیوڈ شانے لگائی تھی کہ وہ سونے کی بجائے میری اور اوشا کی نگرانی کرے۔ میں اپنے سلیپنگ بیگ میں گھسا اور ایک منٹ میں سو گیا تھا۔ رات کسی وقت ایک طویل چیخ سے میری آنکھ کھلی تھی۔ چیخ کی گونج اس وقت بھی باقی تھی اور یہ خاصی دور سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں یہ سوچتے ہوئے دوبارہ سو گیا کہ چیخ کسی جاندار کی ہے یا ہوا کی آواز ہے۔ پہاڑوں اور برفانی میدانوں میں ہوا بھی ایسی آوازیں نکالتی ہے جن پر انسانی یا جانوروں کی آوازیں کا گمان ہوتا ہے۔ صبح میری آنکھ خود بخود چھ کے آس پاس میں کھل گئی اور اس کی وجہ مٹانے پر آنے والا دباؤ تھا۔ مگر جب میں باہر آیا تو کرل اور باسو کو ہمارے یکپ سے ذرا دور ایک جگہ کھڑے دیکھا۔ وہ جھک کر زمین کا معائنہ کر رہے تھے۔ سین جاگ کر کچن کی طرف جا رہا تھا اور میں نے ایک نیلے کارخ کیا۔ وہاں سے واپس آیا تو کرل اور باسو واپس آتے دکھائی دیے۔ مجھے لگا کہ کرل کسی قدر فکر مند تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے موسم سے زیادہ سرد لہجے میں کہا اور ڈیوڈ شا کے خیمے کی طرف چلا گیا۔ وہ اب تک خیمے سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ اوشا نکل اور اسے بھی رفع حاجت کا مسئلہ تھا میں اسے نیلے تک لے گیا۔ واپسی میں ہم براہ راست کچن میں آئے کیونکہ اس وقت ایک وہی جگہ تھی جو گرم ہو سکتی تھی۔ اندر آ کر ہمیں سکون ملا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اس سے کہیں زیادہ سردی تھی جتنی کہ ہمالیہ کی ڈھلوانوں پر ہو سکتی تھی۔ وہاں اس وقت بارہ ہزار فٹ بلند کئی جگہوں پر برف پگھل چکی ہوتی ہے اور گھاس پھوس، کانٹے اور چھوٹے پھولوں والے پودے بھی نکل آتے ہیں۔ یہاں سوائے برف کے کچھ نہیں تھا اور یہ سخت جچی ہوئی برف تھی۔ سین نے پہلے سب کو گرم کافی مہیا کی۔ ڈیوڈ شا کے لیے کافی اس کے خیمے میں بھجوا دی گئی تھی۔ وہ وہاں سے نہیں نکلا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کل کا سفر اس نے جیسے تیسے کر لیا تھا مگر اس کے بعد اس کی حالت خراب ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اب تک اپنے خیمے سے نہیں نکلا تھا۔ مگر جب ہم ناشتے سے فارغ ہو کر باہر آئے تو ڈیوڈ شا خیمے کے پاس اپنے بیگ پر بیٹھا ہوا شیو بنا رہا تھا۔ شیو وہ روایتی انداز میں استرے سے بنا رہا تھا اور خشک شیو کر رہا تھا کیونکہ پانی یا جھاگ فوراً جم جاتا ہے۔ میں اس کے پاس چلا آیا وہ مجھے دیکھ کر خفیف سا مسکرایا اور خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ہیلو شہباز کیسے ہو؟“

”فائن اور مجھے تم نے بھی حیران کیا ہے۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم آج صبح خیمے سے برآمد ہو سکو گے۔“

”یہ سفر میری زندگی کا مقصد ہے اور اپنے مقصد کے لیے آدمی اس سے بھی زیادہ مشکلات برداشت کرتا ہے۔“ ڈیوڈ شانے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے کل بہت بڑا خطرہ مول لیا۔“

”یہ میری عادت ہے۔ صرف باسو نہیں کوئی بھی شخص حد یہ کہ اگر تم بھی کسی مشکل سے دو چار ہو گے تو میں سوچے سمجھے بغیر تمہاری مدد کروں گا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”برف والے نے تمہیں ایسے ہی طلب نہیں کیا ہے۔ تم صاحبِ کردار آدمی ہو۔“

میں نے سرد آہ بھری۔ ”کاش کہ میں ذرا بد معاش ہوتا تو ان چکروں میں نہ پڑتا۔“
 ”یہ سب نصیب کے کھیل ہیں۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم قسمت اور تقدیر جیسے الفاظ پر یقین رکھتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”کون نہیں رکھتا ہے میں بھی رکھتا ہوں لیکن اپنے انداز میں۔“

میں ہنسا۔ ”تم مغرب والوں کی فطرت میں سمجھنے لگا ہوں تم لوگ تقدیر بھی اپنے مطلب کی چاہتے ہو اور

یہ بھول جاتے ہو کہ تقدیر بنانے والا کوئی اور ہے۔“

ڈیوڈ شانے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ جب تک ہم نے
 سامان باندھا ڈیوڈ شانے ناشتہ کیا۔ اس دوران میں کرئل ایک بار پھر اسی طرف گیا تھا جہاں وہ اور باسوج کے
 وقت دکھائی دیئے تھے۔ جب وہ واپس آیا تو میں ٹہلنے کے انداز میں اس طرف گیا۔ ابھی میں ذرا آگے گیا تھا کہ
 کرئل نے آواز دی۔ ”تم کہاں جا رہے ہو۔“

”میں بھاگ نہیں رہا۔“ میں نے مزے بغیر جواب دیا۔ ”ذرا ٹہل رہا ہوں۔“

”ہیں روانہ ہوتا ہے۔“

”بب روانہ ہو گئے تو مجھے اپنے ساتھ ہی پاؤ گے۔“ میں نے پیش قدمی جاری رکھی۔ کرئل نے پھر مجھے
 رکنے کو کہا اور جب میں نہیں رکا تو وہ میرے پیچھے آیا تھا۔ اس جگہ کے عین قریب پہنچ کر اس نے میرا راستہ روک لیا
 اور درشت لہجے میں بولا۔

”تم سنتے کیوں نہیں ہو؟“

”تم بیکار میں میرا پیچھا کر رہے ہو۔“ میں نے رخ واپس کیپ کی طرف کر لیا اور چلنے لگا۔ کرئل میرے
 ساتھ آگیا۔

”تم ضدی آدمی ہو۔“

”میں نے دیکھ لیا ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے تھے۔“

کرئل بھی سمجھ گیا تھا کہ میں نے دیکھ لیا ہے تب ہی میں پلٹ کر آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر تم
 کسی سے کہو گے تو اس سے صرف پنک پھیلے گی۔“

”یہ خطرے کی بات ہے برفانی آدمی ہمارے کیپ تک چلا آیا ہے اور اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔“

”تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔“

”اس کے برف پر بنے پیروں کا رخ کیپ کی طرف تھا اور وہ مخالف سمت سے آیا تھا پھر اسی سمت واپس

چلا گیا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے اس نے رات کو حملہ کیوں نہیں کیا؟“

”کوئی جاگ رہا ہوگا اور وہ اکیلا بھی تھا اس نے خیموں سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہماری تعداد زیادہ ہے۔“

جہاں تک میں نے اس مخلوق کے بارے میں سنا ہے کہ یہ عقل رکھتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ آس پاس ہی ہے؟“

”بالکل اور ہماری نگرانی کر رہا ہوگا۔ شاید کہیں گھات لگا کر بیٹھا ہو۔“
 میری اس گفتگو کے نتیجے میں روائگی کے وقت کرنل اور باسو کے پاس شات گن نظر آنے لگی تھی۔ اوشا
 میرے پاس تھی اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تُو اس طرف کیوں گیا تھا رے؟“
 ”رات یکمپ کے پاس برفانی آدمی آیا تھا۔ وہاں اس کے پیروں کے نشان ہیں۔“ میں نے بتایا تو اوشا
 کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔
 ”میں نے تجھے کہا تھا نا؟“

”ہاں لیکن ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور کسی سے کہنا بھی مت۔“
 اس کا منہ بن گیا۔ ”لے تیرے سوا کس سے بات کرتی ہوں رے۔“
 ”مطلب یہ کہ میرے ساتھ بھی کسی اور کے سامنے برفانی آدمی کا ذکر مت کرنا۔“
 ”نہیں کروں گی رے پر مجھے لگتا ہے یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔“

وہ درست کہہ رہی تھی اور کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ سب ہی جان گئے تھے کیونکہ زینی ڈیوڈ شا سے
 بات کر رہی تھی اور مارک وسین آپس میں محو گفتگو تھے اور سب کا انداز پُر اسرار سا تھا۔ باسو اور کرنل خاموش تھے
 کیونکہ وہ پہلے سے جانتے تھے۔ جب ہم نے سفر شروع کیا تھا تو ہمارے پاس کوئی دو سو کلو گرام وزن تھا مگر اب
 اس میں کوئی پچیس کلو گرام کی کمی آئی تھی۔ استعمال ہونے والی اشیاء خوراک، ایندھن اور آکسیجن کی بوتلیں تھیں۔
 کم ہونے والا وزن سب میں برابر کی شرح سے تقسیم کر دیا گیا تھا اور سب ہی کسی قدر ہلکے ہوئے تھے۔ سامان
 میں اصل وزن خوراک کا ہی تھا جو سو کلو گرام سے اوپر بننا تھا۔ سو کلو گرام دوسرا سامان تھا۔ اگر وہی کا سفر ہمارے
 نصیب میں ہوتا تو ہم بہت ہلکے ہو کر واپس جاتے۔ ذاتی سامان اس دو سو کلو گرام کے علاوہ تھا۔ میں اور اوشا
 صرف اپنا سامان اٹھائے ہوئے تھے اس لیے میں نے اوشا کا بیگ بھی سنبھال لیا تھا۔

اب ہم ایک ٹیم کی صورت میں سفر کر رہے تھے۔ مگر آپس میں فاصلہ رکھا تھا کیونکہ یہاں کچھ پتا نہیں تھا
 کہ برف تلے کوئی خلا موجود ہو اور ہمارے وزن سے برف ٹوٹ جائے۔ سب آپس میں رشتی سے منسلک تھے۔
 آج صبح سے آسمان پر بادل تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے برف باری ہوگی یا ہلکا طوفان آئے گا۔ ہم سات بجے
 روانہ ہوئے تھے اور نو بجے جب پہلا وقفہ آیا تھا تو ہوا میں تیزی آگئی۔ آدھے گھنٹے بعد روانہ ہوئے تو آگے
 بڑھنے کے لیے باقاعدہ زور لگانا پڑ رہا تھا، ہوا ہمیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔ بعض اوقات تو جوتے پھسلنے لگتے تھے۔
 پہاڑوں سے اترنے کے بعد ہم نے جوتوں سے کیلوں والے تلے نکال دیئے تھے۔ آگے بڑھنے کے لیے ہم نے
 چھڑیاں نکال لیں اور انہیں برف میں گاڑ کر ان کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ دس بجے طوفان میں شدت
 آگئی اور کرنل نے ڈیوڈ شا سے بات کی۔ وہ دور تھے اس لیے میں ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا حالانکہ ہواؤں کے
 شور کی وجہ سے وہ چلا کر بات کر رہے تھے مگر ڈیوڈ شا کے نفی میں ہلتے سر سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کرنل کی کسی
 بات سے انکار کر رہا تھا۔

کرنل نے شاید طوفان کے دوران میں سفر روکنے کو کہا تھا۔ اس نے درست کہا تھا کیونکہ اس طوفان میں
 سفر کرنا خود کو کسی خطرے سے دو چار کرنے کے مترادف تھا۔ ڈیوڈ شا یہ بات تسلیم نہیں کر رہا تھا وہ شاید بہر

صورت آج کے دن ہی وادی کے کنارے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مجبوراً کرل نے سفر جاری رکھا۔ مگر گیارہ بجے طوفان اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ اب چند گز سے آگے دیکھنا بھی محال تھا اور برف کے باریک ذرے جسم کے کھلے حصوں پر چھروں کی طرح لگ رہے تھے اور یقیناً درجہ حرارت خاصا گر گیا تھا۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ ہم برف میں خیمے لگا کر انہیں رسیوں اور کیلوں سے باندھ کر اندر گھس جائیں۔ کرل نے پھر ڈیوڈ شا سے بات کی اور اس بار وہ ماننے پر مجبور ہو گیا۔ ایک جگہ ہم نے برف میں بڑی والی کیلیں لگا کر ان سے رسیاں باندھ کر خیمے لگائے اور انہیں رسیوں سے جکڑ دیا۔ خیموں کو آپس میں بھی جکڑا تھا اور سامان کے بیگز ان کے درمیان میں رکھ دیئے تھے۔

جس جس کا خیمہ لگ رہا تھا وہ اندر گھستا جا رہا تھا۔ سب سے آخر میں کرل اپنے خیمے میں گیا تھا۔ نہایت تندہوا میں خیمے لگانا آسان کام نہیں تھا مگر کسی نہ کسی طرح اسے انجام دے لیا گیا۔ اوشا کا خیمہ میرے ساتھ تھا۔ اس کا تو اصرار تھا کہ وہ میرے خیمے میں ہی آ جاتی ہے۔ مگر کرل نے کوئی خیمہ خالی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے توازن خراب ہوتا۔ مجبوراً اوشا کو اپنے خیمے میں جانا پڑا تھا۔ ہواؤں کا شور ایسا تھا کہ بالکل پاس سے بھی بات کرنے کے لیے حلق کے بل چلانا پڑ رہا تھا۔ درجہ حرارت بہت تیزی سے گرا تھا اور جب میں خیمے میں آیا تو مجھے صبح معنوں میں اندازہ ہوا کہ باہر کس قدر سردی ہو چکی تھی۔ خیمے کی زپ بند کرتے ہی جیسے سکون آ گیا تھا۔ یہاں ہواؤں کا شور بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ سلپنگ بیگز نہیں نکالے تھے۔ وہ بدستور بیگز میں تھے۔ اس وجہ سے خیمے میں جگہ تھی اور مجھے خیال آیا کہ اگر اوشا میرے خیمے میں آ جاتی تو یہاں تنگی نہ ہوتی ایک خیمہ بھی کم لگانا پڑتا۔ بہر حال اب تو وہ اپنے خیمے میں جا چکی تھی۔

میں اس سے پہلے بھی ہمالیہ کے خطوں میں اس قسم کے طوفان دیکھ چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ دو سے تین گھنٹے میں طوفان اپنی شدت سے گزر جائے گا اور تب ہم آگے سفر کر سکیں گے۔ مگر اس صورت میں آج کے دن وادی کے کنارے تک رسائی ممکن نہیں ہوگی۔ اب تک اس کی جو مسافت سامنے آئی تھی اس میں دو پہاڑوں کو سر کرنے کے بعد کم سے کم ایک دن کا سفر تھا جب وادی کے کنارے تک پہنچا جاسکتا تھا۔ میرے پاس وقت کا اندازہ کرنے کے لیے گھڑی تک نہیں تھی۔ ڈیوڈ شا اور کرل نے مجھے کوئی غیر ضروری چیز فراہم نہیں کی تھی۔ اس لیے میں وقت کا اندازہ کیے بغیر بڑھتا رہا۔ شاید ایک گھنٹہ گزر گیا تھا اور باہر ہواؤں کی تندہی اور شور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہوا کے زور سے خیمہ دب رہا تھا اور کبھی کبھی تھوڑا سا زمین سے اٹھ جاتا۔ اس لیے جب ایک طرف سے خیمہ دبا تو میں اسے ہوا کا دباؤ سمجھا تھا۔ پھر خیمہ ایک طرف سے تھوڑا سا بلند ہوا پھر واپس نیچے آ گیا۔ اسی لمحے اوشا کی چیخ سنائی دی اور پھر ایک خوفناک غراہٹ کی آواز آئی۔ یہ غراہٹ ایسی تھی کہ طوفان کے شور پر بھی حادی ہو گئی تھی اور اس میں ایسا خونخوار تاثر تھا کہ سننے والے کا خون خشک ہو جائے۔ میرا بھی ہوا تھا مگر دوسرے لمحے میں اپنی تھوڑی اٹھا کر زپ اتار رہا تھا ساتھ ہی میں نے چلا کر کرل کو آواز دی۔

”کرل اسنوین۔“

زٹ کھلتے ہی تندہوا اور برف کے ذرات اندر گھس آئے۔ بخ ایسی آئی کہ میں لرز اٹھا مگر پھر کسی چیز کی پردا کیے بغیر باہر آیا۔ اوشا نے دوسری چیخ ماری اور یہ خیمے کی طرف سے نہیں آئی تھی بلکہ ذرا فاصلے سے آئی

تھی۔ وہ پشت کے بل برف پر گری ہوئی تھی اور ایک سفید برف جیسا ہیولہ اسے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچنے لے رہا تھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ چند سیکنڈ میں اوشا سمیت سوفٹ سے زیادہ فاصلے پر جا چکا تھا۔ اوشا کا خیمہ پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ یہ برفانی آدی کی جتنی قوت کا کمال تھا کہ اس نے مضبوط ترین میٹرل سے بنا خیمہ کاغذ کی طرح پھاڑ دیا تھا۔ میں بھاگا تھا مگر خیمے کی کھل جانے والی رشتی سے الجھ کر گر کر اور میرا سر برف میں لگی فولادی کیل کے سرے سے ٹکرایا۔ میرے سر پر موٹی فردالا ہڈ تھا مگر بد قسمتی سے گرتے ہوئے ہوا کے زور سے ہڈ پیچھے ہوا اور میری کینٹی کیل کے سرے سے ٹکرائی اور ایک جھماکے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ اسی اندھیرے میں مجھے اوشا کی ایک چیخ اور سنائی دی اور اس بار آواز جیسے بہت دور سے آئی تھی۔ ہواؤں کے شور کے پس منظر میں اور لوگوں کے چلانے کی آوازیں بھی آرہی تھی مگر وہ واضح نہیں تھیں۔

میں ذہن پر چھاننے والی تاریکی سے لڑ رہا تھا۔ مجھے اوشا کی فکر تھی کہ اسے برفانی آدی لے گیا تھا۔ مگر جب تک میں خود پر قابو پا تا بہت دیر ہو چکی تھی۔ مجھے ہوش آیا تو میں برف پر دراز تھا اور سین میری ناک سے امونیا کی بوتل لگائے ہوئے تھا اس کی بو مجھے ہوش میں لائی تھی۔ سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور جہاں کیل کا چپٹا سرا لگا تھا۔ وہاں سے کھال پھٹ گئی تھی اور نکلنے والا خون فوراً ہی جم گیا تھا۔ میں اٹھنے لگا تو سین نے مجھے روکا مگر میں اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں ڈیوڈ شا، زینی اور مارک بھی تھے۔ البتہ کرنل اور باسو نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”اوشا کہاں ہے؟“

زینی آگے آئی اور زنی سے بولی ”کرنل اور باسو اس کے پیچھے گئے ہیں وہ اسے لے آئیں گے۔“
ڈیوڈ شا کا چہرہ ساکت تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ڈیوڈ شا اگر اوشا نہ آئی تو اس کا حساب تمہیں دینا ہوگا۔“

”وہ ابھی نہیں ملے گی۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”لیکن وہ زندہ رہے گی اور تمہیں واپس ملے گی۔“
”اب تم اپنے ستاروں کا علم جھاڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ میں نے اپنی کینٹی دباتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

”میں نے حقیقت بیان کی ہے دوسرے جو ہو چکا ہے میں اور تم اسے لوٹا نہیں سکتے۔“
”میں تقدیر کے لکھے کی بات نہیں کر رہا میں تم سے حساب لینے کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے اس کی طرف انگلی دراز کی۔ ”میری اس مشکل کی براہ راست ذمے داری تم پر آتی ہے ڈیوڈ شا۔“

”پلیز اس وقت تمہیں ریلیکس اور ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔“ زینی نے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے میرے خیمے میں لے آئی۔ میں نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ اوشا کے یوں جانے سے مجھے دھچکا لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اس کی حفاظت کروں گا اور وہ مجھ پر اعتماد کرتی تھی مگر میں اسے نہیں بچا سکا۔ زینی مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی اور اس نے میرے کینٹی کے زخم کو صاف کر کے پٹی بھی چپکا دی تھی۔ باہر سے آوازیں تو نہیں آرہی تھیں مگر مجھے لگا کہ شاید کرنل اور باسو واپس آئے ہیں۔ میں باہر نکلا تو وہ جھج آگئے تھے اور ڈیوڈ شا کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی کہ اوشا نہیں ملے گی۔ اگرچہ مجھے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں تھا کیونکہ اوشا کو ان کے ساتھ

نہ پا کر میرا دل ڈوبنے سا لگا تھا اور مجھے لگا کہ اب وہ کبھی نہیں ملے گی۔ کرنل آگے آیا اور اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”سوری شہباز ہم ان کے پیچھے گئے مگر برفانی آدمی کہیں زیادہ تیز ثابت ہوا، وہ اوشا کو لے کر ایک گھاٹی میں اتر گیا جب کہ ہمیں اس میں اترنے کا راستہ بھی نہیں ملا تھا۔“

”کتنا تیز رفتار ہو سکتا ہے وہ ایک انسان جتنا ہی بھاگ سکتا ہے اور پھر اس نے اوشا کو بھی اٹھا رکھا ہوگا۔“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”تم لوگوں نے کوشش ہی نہیں کی اسے بچانے کی۔“

کرنل خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ندامت تھی اور باسوحب معمول بے تاثر کھڑا تھا۔ طوفان کی شدت میں کمی آئی تھی، یا بلکہ میرے اندر جاری طوفان کے سامنے اس کی شدت کم لگنے لگی تھی۔ کرنل نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسے موسم میں حملہ کرے گا۔“

”اس کے لیے یہ موسم معمول کی بات ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”اب تم اس غلط فہمی کا شکار مت ہو جانا کہ وہ ایک کو لے گیا ہے تو دویارہ نہیں آئے گا۔ وہ اپنے علاقے میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ وہ پھر آئے گا اور بار بار آئے گا جب تک سب کو نہیں لے جائے گا یا مار نہیں ڈالے گا۔“

”تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ کرنل نے بدلے لہجے میں پوچھا۔

”میں نے اس ورنڈے کے بارے میں سنا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جیسا سنا تھا اس سے زیادہ خطرناک پایا۔ کیسے وہ سب کے درمیان سے اوشا کو لے گیا اور تم لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔“

کرنل جھنجھلا گیا۔ ”میں نے کہا نا وہ بہت تیز رفتار تھا۔ ہم اس کا پیچھا نہیں کر سکے۔“

رفتہ رفتہ میرا بال کم ہونے لگا اور میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اگر تم لوگوں کے پاس نگرانی کے آلات ہیں تو نکال لو ورنڈہ دیر ہوگئی تو وہ پھر کسی اور کو لے جائے گا یا مار ڈالے گا۔“

زینی ویسے تو بہت بے خوف اور تیز عورت تھی۔ ڈیوڈ شاکی بیٹی کو ایسی ہی ہونا چاہیے تھا مگر اس وقت وہ بھی خوفزدہ نظر آئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”وہ اوشا کو اور دوسروں کو کیوں لے جائے گا؟“

”بھوک!“ میں نے جواب دیا۔ ”انسان کی طرح اسے بھی پیٹ کی اور جنس کی بھوک ہوتی ہے۔ انسان سے وہ دونوں طرح کی بھوک مٹا سکتا ہے۔“

زینی کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ”تت..... تمہارا مطلب ہے کہ وہ انسان سے تعلق بھی قائم کر سکتا ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں ایسے فرد کو جانتا ہوں جو برفانی آدمی کی مادہ کی زیادتی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کی قسمت تھی کہ وہ مرنے سے بچ گیا اور نہ مادہ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

میری بات نے زینی کو مزید سہا دیا تھا۔ سچی بات تھی کہ ڈیوڈ شاکی پیش گوئی کے باوجود مجھے اوشا کی زندگی کا یقین نہیں رہا تھا۔ راجا عمر دراز نے رانا دیاس کے حوالے سے جو کہانی سنائی تھی اس کے مطابق اسے لے جانے والی برفانی آدمی کی مادہ تھی اور وہ رانا دیاس سے اظہار عشق کرتی رہی جب تک کہ وہ مرنے والا نہیں ہو گیا۔ پھر برف والے نے اس کی جان اس ورنڈے سے چھڑائی تھی۔ مگر اوشا عورت تھی اور اگر اسے لے جانے والی مادہ

تھی تو اس کے لیے اوشا بیکار تھی وہ اسے ماردیتی۔ ہاں اسے لے جانے والا نہ ہوتا تو اوشا کی زندگی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر اس کی بچت بہت بڑی قیمت کے بدلے ہوتی اور شاید اسی وجہ سے اس کی جان بچ جاتی کہ اس کے پاس آنے والا برفانی آدمی اس کے زہر کا شکار بن جاتا اور اس کا بھی امکان تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اوشا کو مار دیتا۔ اس کی جتنی قوت کے سامنے دھان پان سی اوشا کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ ایک ہاتھ مار کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

سوچیں میرے دماغ میں آوارہ بگولوں کی طرح گھوم رہی تھیں اور ان سے چھچھا چھڑانے کے لیے میں دوسری طرف متوجہ ہوا۔ کرنل اور مارک ایک ایک سے کچھ آلات نکال رہے تھے اور انہیں خیموں کے آس پاس لگا رہے تھے۔ پھر ان آلات کو تاروں سے آپس میں ملانے لگے۔ ان ڈش انٹینا نما آلات کو ایک چھوٹے سے کمپیوٹر سے منسلک کیا جا رہا تھا۔ ڈشوں کا رخ چاروں طرف کر رہے تھے۔ میں ڈیوڈ شا کے پاس آیا اور اس سے مطالبہ کیا۔ ”مجھے کوئی ہتھیار چاہیے۔“

”تمہیں یا پارٹی کے کسی دوسرے فرد کو ہتھیار نہیں مل سکتا۔ یہاں ہتھیار رکھنے کا مجاز صرف میں، کرنل اور باسویں۔“

”تم لوگ کسی کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے ہو مگر اسے ہتھیاروں سے محروم ضرور رکھ سکتے ہو۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اگر میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ درندہ اتنی آسانی سے اوشا کو نہیں لے جاسکتا تھا۔“

ڈیوڈ شا کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”شہباز تم زیادہ فکر مند ہو رہے ہو۔ تمہارے جیسے آدمی کے عزائم بلند ہونے چاہئیں ایک معمولی لڑکی کے لیے فکر مند ہونا تمہیں زیب نہیں دیتا ہے۔“

”میں معمولی آدمی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”غالباً تم مجھے اپنے لیول کا آدمی سمجھ رہے ہو۔ اس بحث کو چھوڑ دو یہ بتاؤ کہ مجھے ہتھیار دے رہے ہو یا نہیں؟“

”میں نے بتایا تا کہ یہاں ہتھیار صرف تین آدمی رکھ سکتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ حتمی تھا۔ میں اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پانے لگا۔ یہاں برف زار میں اور برفانی آدمی کے خطرے کے ہوتے ہوئے ہمارا آپس میں لڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اوزاروں میں سے جن کر سب سے بڑی کلہاڑی نما ہتھوڑی نکال لی۔ بہ وقت ضرورت یہ بھی اچھا ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔ طوفان کی شدت میں کی آئی تھی مگر ہوا میں اڑتے باریک برف کے ذرات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور ان کی وجہ سے حدنگاہ سو فٹ بھی نہیں تھی میں کرنل کے پاس آیا تو لیپ ٹاپ نما آلہ لے کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی اسکرین پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر سرخ دھبے حرکت کر رہے تھے۔ کرنل نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ”سرخ دھبے زندہ انسان ہیں۔“

میں نے گمان کی تعداد سات تھی۔ کرنل وسط میں تھا اور باقی سب بکھر گئے تھے۔ ڈیوڈ شا اور زینی ایک جگہ تھے۔ مارک سین اور باسویں الگ الگ سمتوں میں تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”فرض کرو برفانی آدمی دوبارہ آتا ہے تو یہ آلات اسے کتنی دور سے دیکھ لیں گے؟“

”ویسے ان کی ریج ایک کلومیٹر ہے مگر اس موسم میں ریج گھٹ گئی ہوگی۔ ویسے اسنوین کا جسم بڑا ہوتا ہے

اس لیے وہ انفراریڈ کا بڑا منبع ہو گا اسے خاصی دور سے نظر آ جانا چاہیے۔“

ڈیوڈ شا اپنے خیمے میں چلا گیا تھا کیونکہ باہر سردی کی شدت بہت زیادہ تھی۔ مارک نے براڈلی کی بوتل نکال لی تھی۔ وہ، سین، کرنل اور پاساں بوتل سے باری باری چسکی لگا کر خود کو گرم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے پاس خود کو گرم رکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ چائے کافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زینی بھی آگئی اس نے براڈلی لی اور مجھ سے کہا۔ ”تم نہیں پیتے ہو لیکن اس موسم میں یہ ضروری ہے۔“

”موسم ایسا ہو یا دیا میں نے کبھی اس حرام شے کے استعمال کے بارے میں نہیں سوچا۔“ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم لوگ عجیب ہو۔ کچھ ایسے پیتے ہیں کہ کیا مغرب والے پیتے ہوں گے اور کچھ ایسے بھاگتے ہیں کہ جیسے یہ موت ہو۔“

”دوسروں کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”ہاں میں کسی صورت استعمال نہیں کر سکتا۔ تمہیں یاد ہے کہ جب تم نے رنی شاہ کے اکسانے پر مجھے شراب پینے پر مجبور کیا تھا تو کیا ہوا تھا؟“

وہ ہنسی۔ ”ہاں تم نے اس کے لباس اور قالین کا ستیاناس کر دیا تھا۔“

”حالانکہ اس وقت میرا تمہارے قابو میں تھا اور اگر پی لیتا تو مجھے اُمید ہے کہ یہ میرا گناہ شمار نہیں ہوتا اس کے باوجود اوپر والے نے مجھے محفوظ رکھا۔“

زینی کا منہ بن گیا۔ ”تم اوپر والے کو کچھ زیادہ ہی یاد نہیں کرتے ہو.....؟“

”اسے یاد کرتے رہنا چاہیے تاکہ جب وہ یاد کرے تو ہمارے پاس پیش کرنے کے لیے کچھ تو ہو۔“

”میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”تب تم اپنے باپ سے بہتر ہو جو یقین رکھتا ہے مگر اس میں اپنا مفاد بھی شامل کر دیتا ہے۔“

ہم دونوں کرنل کے پاس ہی کھڑے تھے اور میں کبھی کبھی اسکرین پر نظر ڈال لیتا تھا۔ ایک بار میں نے اسکرین کی طرف دیکھا تو مجھے شبہ ہوا۔ دھبوں کی تعداد زیادہ لگ رہی تھی اور اسی لمحے کرنل نے بھی یہ بات محسوس کر لی۔ اس نے جلدی سے گنا۔ ”ایک دو تین..... چھ سات آٹھ۔“

”برفانی آدمی۔“ میں نے کہا اور زینی تیزی سے ڈیوڈ شا کی طرف لپکی۔ اسے اپنے باپ کی فکر نہیں تھی بلکہ وہ اس کے پاس موجود ہتھیار لینے لگی تھی۔ میں اور کرنل اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ برفانی آدمی کہاں ہو سکتا تھا۔ ایک دھبے کے بارے میں مجھے شبہ ہوا اور میں نے کہا۔ ”یہ ہو سکتا ہے۔“

وہ دھبا بڑا بڑا تھا کرنل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ باسو ہے۔“

مگر اسی لمحے بڑا دھبا ایک چھوٹے دھبے پر جھپٹا اور طوفان کے شور میں ایک چیخ سنائی دی۔ میں اور کرنل اچھل پڑے تھے۔ کرنل نے اسکرین سے سمت کا اندازہ کیا، مارک۔“ اس نے کہا اور اس طرف دوڑا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اڑتے ذرات منظر میں حائل تھے اور جب تک ہم اس جگہ پہنچے جہاں مارک تھا تو وہاں برف پر سوائے خون کی سرنی کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ میں اور کرنل کچھ آگے اور گئے مگر جیسے ہی عقب میں یکمپ نظروں سے اوجھل ہوا میں رک گیا۔ بس اس سے آگے جانا مناسب نہیں ہے۔“

”وہ مارک کو لے گیا ہے۔“

”میرا خیال ہے ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ تم نے برف پر خون کا دھبا دیکھا۔ وہ اتنا بڑا ہے جو کسی جان لیوا زخم سے خون نکلنے کی صورت میں بن سکتا ہے۔ ہمیں واپس جانا ہوگا ایسا نہ ہو برفانی آدمی دوسری سمت سے حملہ کر دے یا اس کے اور ساتھی بھی ہوں۔“

بات کرکٹ کی کچھ میں آگئی اور ہم واپس آئے۔ سب کو پتا چل گیا تھا کہ مارک بھی غائب ہو گیا ہے وہ سب اب کیمپ میں تھے۔ کرٹل نے جب خون کے بڑے سے دھبے کے بارے میں بتایا تو سب کے چہرے ست گئے تھے۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔ ”یہ دوسرا خون ہے جو تمہاری اس احمقانہ مہم جوئی کی نذر ہوا ہے۔“

مگر وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوا۔ اس نے پُر سکون انداز میں کہا۔ ”یہ ایسی مہم ہے کہ اس کے لیے میں اپنی اور زینی سمیت سب کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔“

”تم شوق سے خود کو قربان کر دو۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں قربانی کا بکرہ نہیں ہوں۔“

”پلیز۔“ زینی نے ایک بار پھر ثالث کا کردار ادا کیا۔ ”یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں ہے۔“

”ہاں یہ وقت اس درندے کے ہاتھوں ایک ایک کر کے مارے جانے کا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات اپنے باپ کو سمجھاؤ جو مجھے اسلحہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ مارک بھی اسی وجہ سے مارا گیا کہ وہ مسلح نہیں تھا۔“

کرٹل نے جھک کر ڈیوڈ شا کے کان میں کچھ کہا اور اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ کرٹل نے اسلحہ پالیسی کے حوالے سے بات کی تھی مگر ڈیوڈ شا اپنے موقف پر قائم تھا۔ اس دوران میں طوفان کی شدت میں کمی آنے لگی اور دس منٹ میں ہوا کی شدت بہت کم ہو گئی تھی۔ اڑتے ذرات کی مقدار میں کمی آنے سے حدنگاہ بڑھنے لگی اور پھر ادر پراڈل پھٹے تو سورج نکل آیا اور درجہ حرارت بھی بہتر ہونے لگا۔ باسو اور سین مل کر خیمے پیک کرنے لگے۔ یہ آسانی سے مکمل اور بند ہو جانے والے خیمے تھے۔ جب تک خیمے پیک ہوئے موسم تقریباً صاف ہو گیا تھا۔ ہوا نہ ہونے کے برابر رہی تھی اور سردی بھی کم ہوئی تھی۔ برسنے والی برف نے مارک کے خون اور برفانی آدمی کے بیروں کے نشان مٹا دیے تھے۔ ہم یہ اندازہ کرنے سے بھی قاصر تھے کہ وہ اسے کہاں لے گیا تھا۔ لیکن میرا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ اگر ہمیں مارنا مقصود تھا تو برفانی آدمی کو مارک کی لاش لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے خوراک کے طور پر استعمال کرنے کے لیے لے گیا تھا۔ یہی بات زینی کے ذہن میں تھی اور اس نے مجھ سے کہا۔

”تم نے ٹھیک کہا تھا وہ آدم خور بھی ہے۔“

”ان معنوں میں نہیں، اصل میں اسے یہاں کھانے کے لیے جو بھی ملے گا وہ کھائے گا۔“

”میرے خدا۔“ اس نے کانپ کر کہا۔ ”یہ اتنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

”اس نے ثابت کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ مارک کی کمی سے سب کے حصے میں آنے والا سامان بڑھ گیا

تھا۔ اب مجھے بھی سامان اٹھانا تھا جب کہ میرے پاس اپنے ساتھ اوشا کا سامان بھی تھا۔ گئی صرف ایک خیمے کی ہوئی تھی جسے برفانی آدمی نے پھاڑ کر بیکار کر دیا تھا۔ میں نے اوشا کے بیک سے اس کا سامان نکال کر اپنے بیک

میں ٹھونسا کیونکہ اب مجھے پشت پر سامان کا بیگ اٹھانا تھا اور اپنا بیگ میں ہاتھ میں رکھتا۔ تیار ہو کر ہم یوں روانہ ہوئے کہ سب سے آگے کرنل اور ڈیوڈ شا تھے۔ ان کے پیچھے میں اور زینی تھے جب کہ سب سے پیچھے باسو اور سین تھے۔ ہر ٹولی کے درمیان دس گز کا فاصلہ تھا اور ہم رسیوں سے منسلک تھے۔ طوفان کے بعد جگہ جگہ برف کے ڈھیر لگ گئے تھے اور آنے والوں دونوں میں گرمی سردی کے امتزاج سے پکھل اور جم کر یہ ڈھیر ہموار ہو جاتے۔ مگر فی الحال ان کی وجہ سے سفر کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ زینی ذرا دیر میں ہاپنے لگی تھی۔

”زم برف پر چلنا اتنا دشوار ہوتا ہے مجھے آج پتا چلا۔“

”اگر ہم اسکیز استعمال کریں تو بہت تیزی سے سفر کر سکتے ہیں۔“

اس نے ٹلی میں سر ہلایا۔ ”پاپا اسکیز استعمال نہیں کر سکتے۔“

”پاپا کچھ بھی نہیں کر سکتے مگر یہاں ضرور آ سکتے ہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اگر ضدی آدمی طاقتور

بھی ہو تو دوسروں کو کس قدر مشکل میں ڈال سکتا ہے۔“

میری بات پر وہ کسی قدر جھنجھلا گئی۔ ”اب بس بھی کرو۔ کب تک اسی بات کو لے کر بیٹھے رہو گے۔“

”میرے لیے سب سے اہم بات یہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جب بھی میری باری آئی ڈیوڈ شا کو حساب

دینا ہوگا۔“

ہر پارٹی میں کم سے کم ایک مسلح فرد موجود تھا۔ زینی کے پاس شاٹ گن تھی۔ پیچھے باسو کے پاس اس کی جسامت کے لحاظ سے ہائی گنی شاٹ گن تھی۔ جب کہ کرنل اور ڈیوڈ شا دونوں ہی مسلح تھے۔ میں نے غور کیا تو برفانی آدمی نے دونوں بار غیر مسلح افراد کو نشانہ بنایا تھا۔ اوشا بے شک خیمے میں تھی مگر مارک کھلی جگہ اس کا نشانہ بنا تھا۔ اگر وہ جن کر غیر مسلح افراد کو نشانہ بنا رہا تھا تو اس سے دو باتیں سامنے آتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اسلحے اور اس کی ہلاکت خیزی سے واقف تھا اور دوسرے میں اور سین اب خطرے میں تھے۔ ہم دونوں ہی غیر مسلح تھے۔ سانس لینے کے لیے ہوا اب بھاری تھی اور میرا اندازہ تھا کہ ہم خاصے نیچے آ گئے تھے۔ شاید یہ جگہ سطح سمندر سے دس ہزار کے آس پاس بلند تھی۔ اس وقت دو پہر کے بارہ بج رہے تھے اور طوفان نے کئی گھنٹے ضائع کیے تھے۔ آج کے دن وادی کے کنارے پہنچنا مشکل لگ رہا تھا۔ دو بجے ہم ایک جگہ رکے تھے۔ سین نے ہلکا پھلکا لٹچ کرایا۔ اس نے صبح ہی سینڈوچز بنا لیے تھے جو اس وقت ہلکے گرم کر کے سب کو دیئے تھے۔ میں کرنل کے پاس بیٹھا ہوا تھا میں نے اسے اپنے خدشے سے آگاہ کیا۔

”اسنو میں اب تک غیر مسلح افراد کو لے کر گیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے اگلی باری میری یا سین کی ہو سکتی ہے۔“

”تم فکر مت کرو اس بار ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔“ اس نے کہا۔

”مجھے فکر ہے کیونکہ تم لوگوں کی تمام تر ہوشیاری صرف اپنے لیے ہے۔ جب باسو چٹان سے لٹک رہا تھا

تب بھی تم لوگ اطمینان سے تماشا دیکھ رہے تھے۔“

”تم ڈیوڈ شا کے لیے اہم ترین فرد ہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اس لیے تمہاری ہر قیمت پر حفاظت کی

جائے گی۔“

”دیکھتے ہیں۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ ہم نے ایک کھلی جگہ پڑاؤ ڈالا تھا جہاں سے چاروں طرف دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ غالباً برفانی آدمی کی وجہ سے یہاں رکے تھے مگر وہ بھول رہے تھے کہ اس کے پاس بہت وقت تھا۔ یہاں ہمیں رات بھی گزارنی تھی اور جب ہم وادی کے کنارے پہنچتے تو وہاں برفانی آدمی کے لیے گھات لگانے کی بے شمار جگہیں تھیں۔ وہ احمق نہیں تھا کہ دن دھاڑے اور کھلی جگہ پر ہم پر حملہ آور ہوتا۔ اس نے دونوں بار جتنی ہوشیاری سے وار کیا تھا اس سے اس نے یوانی ذہانت واضح تھی۔ وہ دور سے ہماری نگرانی کر رہا تھا جہاں اسے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے مگر وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا اور وہ ہمارا تعاقب کرتا جب تک کہ اسے اگلا وار کرنے کا موقع نہیں ملتا۔



چنچ اور آرام کے وقفے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔

چھ بجے کے قریب ہم کھلی جگہ سے ہٹ کر ایک کسی قدر خشک درے میں سفر کرنے لگے اور اب بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ مگر یہ دورہ کسی پہاڑی چوٹی تک نہیں جاتا تھا بلکہ شاید کسی سطح مرتفع کو درمیان سے کاٹتا تھا۔ اس کے دونوں طرف اونچی ہوتی ڈھلانیں تھیں اور مجھے یاد آیا کہ شاید وہ گڑھے تھے جن میں سے ایک میں راجا عمر دراز وادی سے واپسی کے وقت گر گیا تھا اور برفانی آدمی کی مادہ اسے لگانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ میں نے کرٹل اور دوسروں کو یہاں موجود گڑھوں سے خبردار کیا۔ کرٹل نے پوچھا۔ ”کیسے گڑھے ہو سکتے ہیں۔“

”کہنا مشکل ہے کہ کس قسم کے گڑھے ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ کلیشہ بھی نہیں ہے جس کے نیچے دراڑیں ہوں۔“

کرٹل نے سب کو ہوشیار رہنے کو کہا اور ہم آگے بڑھے۔ اب تاریکی قریب تھی کیونکہ سورج پہاڑوں کے پیچھے جا چکا تھا اور کچھ دیر بعد ہمیں لائنس آن کرنا پڑتیں۔ گڑھوں سے بچنے کے لیے سب آگے بڑھنے سے پہلے چھڑی سے برف دبا کر دیکھتے تھے اور پھر اس پر قدم رکھتے۔ میں بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔ ایک بار میں نے ایک جگہ کو چھڑی سے دبایا تو وہ مجھے ٹھوس لگی تھی مگر جب میں نے قدم رکھا تو ایک لمحے کو ڈگمگایا۔ مجھے لگا کہ نیچے سے برف سرک رہی ہے۔ مگر جب وہ اپنی جگہ قائم رہی تو میں سمجھا کہ میرا پاؤں پھسلا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ مگر چند گز آگے گیا ہوں گا کہ عقب سے برف ٹونے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی زہنی کو جھٹکا لگا اور وہ تیزی سے پیچھے گئی۔ اس کے بعد رستی سے میں بندھا ہوا تھا میں نے زمین میں پاؤں جمائے کی کوشش کی مگر میں بھی زور میں پیچھے گیا اور زمین پر گر اٹھا۔

رستی بہت زور سے کھنچ رہی تھی۔ نیم تاریکی کی وجہ سے میں دیکھنے سے قاصر تھا کہ کیا ہوا تھا۔ پھر جس طرح میں تیزی سے کھنچا تھا اسی طرح اچانک رک گیا۔ رستی کا زور ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے پیچھے دیکھا تو مجھے اسی جگہ برف میں گڑھا دکھائی دیا جہاں میرا پاؤں ڈگمگایا تھا۔ زہنی گڑھے کے بالکل کنارے تھی اور اگر وہ بھی گڑھے میں جاتی تو میں بھی کھنچا چلا جاتا۔ باسو اور سین غائب تھے اور اس کا مطلب تھا کہ وہی گڑھے میں گرے تھے اور رستی سے منسلک ہونے کی وجہ سے ہم بھی کھنچے چلے گئے تھے۔ مگر گڑھا بڑا نہیں تھا اس لیے ہم رک

گئے۔ ڈیوڈ شا اور کرئل بھی کھینچے آئے تھے مگر انہیں زیادہ رگڑنا نہیں پڑا تھا۔ ڈیوڈ شا تو گر ابھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے لباس سے ٹارچ نکالی اور رستی الگ کرتا ہوا گڑھے کی طرف بڑھا۔ زہنی نے بھی اٹھ کر خود کورستی سے الگ کر لیا تھا۔ بہ ظاہر وہ ٹھیک لگ رہی تھی اس لیے میں نے اس کی خیریت نہیں پوچھی..... میں نے گڑھے میں روشنی ڈالی تو سین باسو کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ تہہ میں دراز تھا۔ میں نے آواز دی۔

”سب ٹھیک ہے؟“

”نہیں۔“ سین نے اوپر دیکھا۔ ”میرا خیال ہے اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔“

یہ نہایت تشویشناک خبر تھی۔ باسو ہماری ٹیم کا سب سے مضبوط رکن تھا اور وہی ناکارہ ہو گیا تھا۔ میں نے روشنی میں گڑھے کا جائزہ لیا۔ یہ تقریباً بارہ فٹ گہرا تھا اور اس کا قطر آٹھ فٹ تھا۔ تہہ ٹوٹنے سے اندر اچھی خاصی برف گری تھی اور گڑھا خاصی حد تک بھر گیا تھا۔ میں نے کناروں پر کلبھاڑی ماری تو برف مزید اندر گئی تھی۔ سین چلایا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟ برف اندر گر رہی ہے۔“

”فکرمات کرو تم برف میں دفن نہیں ہو گے۔“ میں نے کہا اور برف گرانے کا عمل جاری رکھا۔ میں اس بات کو یقینی بنا رہا تھا کہ ٹوٹنے والی کوئی تہہ باقی نہ رہے جس پر کسی کا قدم جائے اور وہ بھی اندر گر جائے۔ دوسرے جتنی برف اندر جائے گی گڑھے کی تہہ اتنی ہی اونچی ہوگی۔ زہنی میرا ساتھ دینے لگی اور ڈراسی دیر میں کناروں پر جی ساری برف نیچے گر گئی۔ سین سمجھ گیا اور گرنے والی برف کو ایک طرف جمع کر رہا تھا وہ اس کی مدد سے تہہ کی بلندی بڑھا کر باہر آنے میں آسانی پیدا کر رہا تھا۔ کرئل اور ڈیوڈ شا آگئے تھے۔ کرئل نیچے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔ ”تمہارا، زہنی اور ڈیوڈ شا کا باہر رہنا ضروری ہے اب تم برفانی آدمی سے بچ بچ ہو شیار ہو جاؤ۔ اگر وہ پاس موجود ہے تو یہ جملہ کرنے کا بہترین وقت ہوگا۔“

یہ سنتے ہی وہ باسو کو بھول گئے اور انہوں نے اپنے ہتھیار اور لائٹس نکال لی تھیں۔ میں نے کنارے پر کیل ٹھونکی اور اس سے رستی باندھ کر نیچے اترا۔ ڈھائی تین فٹ تک برف جمع ہونے سے تہہ کی اونچائی بڑھ گئی تھی اور مجھے خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ نیچے اتر کر میں نے باسو کو دیکھا جو ٹارچ کی روشنی میں اپنی بائیں پنڈلی کا معائنہ کر رہا تھا۔ نیچے گرتے ہوئے اس کا بایاں پاؤں تہہ میں موجود پتھر سے ٹکرایا تھا۔ موٹی اونچی پتلون کا وسطی حصہ نوکیلا ہو رہا تھا۔ اس کی ایک ہڈی لازمی ٹوٹ گئی تھی اور کھال چھاڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ مگر آفرین ہے جو اس کے چہرے پر درد کی معمولی سی بھی جھلک ہو۔ وہ یوں اپنی پنڈلی کا معائنہ کر رہا تھا جیسے یہ کسی دوسرے کی پنڈلی ہو۔ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنا پاؤں دیکھنے دو۔“

اس نے سر ہلایا اور گھٹنے سے پکڑ کر پاؤں میری طرف کیا۔ میری نظر ایک لمبے کے لیے اس کی مہیب ٹانگ کی طرف گئی تھی مگر اس نے اس حالت میں بھی اسے نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اس کا بھاری بھر کم جوتا پکڑا اور زور لگا کر اس کا پاؤں کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر چند لمبے کے لیے کرب کی لہر آئی تھی۔ مگر اس کا پاؤں سیدھا ہو گیا اور پتلون میں جو سراسر ابھرا ہوا تھا وہ غائب ہو گیا۔ پھر میں نے اس کی پتلون اوپر کی گھٹنے تک بشکل چڑھائی۔ نیچے اس نے موزہ بھی پہنا ہوا تھا اور وہ خون آلود ہو رہا تھا۔ موزہ نہ صرف بہت موٹا بلکہ تنگ بھی تھا اور اس نے پنڈلی کو جکڑ لیا تھا۔ میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ مجھے لگا کہ ٹوٹ جانے والی ہڈی اپنی جگہ بیٹھ گئی

تھی۔ اب اس میں نوک محسوس نہیں ہو رہی تھی اور میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ موزہ ہٹا کر زخم کا معائنہ کرنے کی کوشش کروں۔ اس کوشش میں ہڈی دوبارہ اپنی جگہ سے ہٹ سکتی تھی۔ یہ سہل فرنگیچر تھا۔ اگر وہ کسی آبادی میں ہوتا اور اسے میڈیکل ایڈل جاتی تو وہ چند ہفتوں میں ٹھیک ہو جاتا۔ مگر اس برفانی دیرانے میں یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ تقریباً جان لیوا حادثہ تھا۔ میں نے کرل سے کہا۔

”میڈیکل پیک دو۔“

میڈیکل پیک میں طبی امداد کا سامان تھا۔ کرل نے اپنے بیگ سے پیک نکال کر نیچے اچھال دیا۔ میں نے اسے کچل کیا اور کھول کر اندر سے پہلے زخموں کو صاف کرنے والا پتھر نکالا۔ یہ جتنا نہیں ہے اور سخت ترین سردی میں بھی مائع حالت میں رہتا ہے۔ میں نے اسے موزے کے اوپر سے ہی زخم والی جگہ ڈالا۔ باسو کا جسم ایک لمبے کو اینٹھا۔ اسے خاصی تکلیف ہوئی تھی مگر اب انفیکشن کا خطرہ کم ہو گیا تھا۔ پھر میں نے فرنگیچر کے لیے مخصوص رکھی ہوئی لکڑیاں نکال کر انہیں باسو کے پاؤں پر رکھا اور پھر مضبوط پٹی سے باندھ دیا۔ میں نے پٹی سخت رکھی تھی مگر اتنی نہیں کہ نیچے کا دوران خون رک جائے۔ پھر انفیکشن اور درد سے بچانے والے کپسول اسے انرجی ڈرنک کے ساتھ دیے۔ اس دوران میں سین باہر چلا گیا تھا اور مزید برف آس پاس سے جمع کر کے نیچے گرارہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے ایک زینہ سا بنالیا۔ میں نے رتی باسو کی بیلٹ سے منسلک کی اور اوپر جا کر اسے سین اور کرل کی مدد سے باہر کھینچ لیا۔ ڈیوڈ شا ایک طرف خاموش کھڑا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ باسو کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ باسو کا کام کا آدی تھا مگر اب اس کی حیثیت ایک لنگڑے ہو جانے والے گھوڑے سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ ماحول تقریباً تاریک ہو گیا تھا مگر آسمان صاف تھا اور اگر چاند نکل آتا تو کسی قدر روشنی ہو جاتی۔

”باسو کو اب سہارا دینا ہوگا۔“ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

”کیسے؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”اس کا وزن بہت زیادہ ہے اور پھر ہمارے پاس سامان بھی

ہے۔“

”ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

کرل ہماری طرف آیا اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں اب سلیج بنالینی چاہیے۔“

میں چونکا۔ ”تمہارے پاس سلیج ہے؟“

”ہاں لیکن اسے تیار کرنا پڑے گا۔“

”سلیج ہے تو پہلے کیوں نہیں استعمال کی؟“

”پہلے ضرورت نہیں تھی اور پہاڑوں پر اسے استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے اسے ایسے ہی علاقوں میں استعمال

کیا جاسکتا ہے۔“ کرل نے کہا اور ایک بیگ سے سلیج کا سامان نکالنے لگا۔ یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بنی ہوئی سلیج تھی جس کے بیشتر حصے فابریکس سے بنے ہوئے تھے۔ کرل تیزی اور مہارت سے کام کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے روشنیاں نکال کر یوں چاروں طرف رخ کر کے لگا دی تھیں کہ سو گز تک کوئی بھی چیز حرکت کرتی تو فوراً نظر میں آ جاتی۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

”ہم یہیں نہ قیام کر لیں؟“

”آگے ایک جگہ ہے جہاں ہمیں غار ملیں گے وہاں ہم زیادہ محفوظ ہوں گے۔“

مجھے یاد آیا کہ راجا عمر دراز اور پھر ڈیوڈ شانے بھی کبھی ان غاروں کا ذکر کیا تھا۔ غار ہمیں برقانی آدمی سے محفوظ رکھ سکتے تھے مگر ساتھ ہی کسی حملے کی صورت میں ہم محصور ہو کر رہ جاتے۔ بہر حال باخبری میں محصور ہونا بے خبری میں مارے جانے سے بہتر تھا اس لیے میں نے ڈیوڈ شاے سے اتفاق کیا۔ باسو اس حالت میں اپنی شاٹ گن سنبھالے پھرے داری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں ڈیوڈ شاے کے پاس سے ہٹا تو زینی اس کے پاس پہنچ گئی اور دونوں باپ بیٹی میں سرگوشیوں میں کسی موضوع پر تبادلہ خیال ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ زینی کسی بات پر اصرار کر رہی تھی اور ڈیوڈ شاے کا انکار کر رہا تھا۔ اس سفر کے دوران میں بہت کم مواقع ایسے آئے جب ڈیوڈ شانے کسی معاملے پر کسی دوسرے سے اتفاق کیا ہو ورنہ وہ زیادہ تر اپنی ہی چلاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہا تھا۔ زینی مایوسی کے عالم میں اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ وہ کچھ برہم ہو رہی تھی۔ سلیج تیار ہوئی تو باسو اور اضافی سامان جو باسو نے ہی اٹھایا ہوا تھا اس پر بار کیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”اسے کھینچے گا کون؟“

”تم اور سین۔“ کرنل نے کہا۔

”میں کس خوشی میں یہ ذمے داری اٹھاؤں؟“ میں نے کہا۔

”دوسری صورت میں ہم مجبور ہوں گے کہ باسو کو یہیں چھوڑ جائیں۔“ کرنل کی بجائے ڈیوڈ شانے

جواب دیا۔ ”اب اسے لے جانے کی دوسری صورت نہیں ہے۔“

”میں ہتھیار استعمال کرنے کے لیے آزاد رہنا چاہتا ہوں۔“ کرنل نے کہا۔ ”ویسے تم فکر مت کرو زیادہ

بو جھ نہیں ہوگا کیونکہ باسو عقب سے اپنی چھتری برف میں گاڑ کر دھکا دے گا۔“

باسو کو یہاں چھوڑ جانا خلاف انسانیت ہوتا اور ڈیوڈ شانے چالاکی سے بندوق میرے شانے پر رکھ دی تھی۔ مجبوراً میں نے سین کے ساتھ مل کر سلیج کھینچنا شروع کی۔ اس میں آگے کی طرف دو چوڑی بیلٹس تھیں جنہیں کمر اور شانوں سے باندھ کر سلیج کھینچنا آسان ہو جاتا۔ ہمارے ہاتھ آزاد تھے۔ کرنل نے ٹھیک کہا تھا کہ بو جھ اتنا زیادہ محسوس نہیں ہو رہا تھا اور باسو بھی عقب سے برف میں چھتری گاڑ کر سلیج کو آگے دھکیلنے میں مدد دے رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ عقب کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔ سلیج پر اس طرح لائنس نصب کی گئی تھیں کہ اس کے پیچھے اور دائیں بائیں دور تک روشنی ہو رہی تھی۔

سانے کی طرف ہم نے روشنیاں کی ہوئی تھیں۔ سب سے آگے کرنل تھا اور اس کے پیچھے زینی اور ڈیوڈ شاے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اب کرنل کے شانے پر ایک خود کار رائلنفل بھی نظر آئی تھی۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے اور کم سے کم میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے آج صبح ناشتا کیا اور دوپہر میں برائے نام ہی کھایا تھا۔ میں نے ڈیوڈ شاے سے پوچھا۔

”غار یہاں سے کتنی مسافت پر ہیں؟“

”تقریباً دو میل کی دوری پر ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس رفتار سے ہم آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ

جائیں گے۔“



آدھے گھنٹے میں تو نہیں لیکن پون گھنٹے میں ہم ان غاروں کے پاس تھے۔ یہ چھوٹی ٹیلے نما پہاڑیاں تھیں جن کے اندرونی حصے کھوکھلے ہونے سے غار وجود میں آئے تھے۔ ان کے دہانے اوپر سے آتی برف میں چھپ جاتے تھے اور گرمیوں میں جب برف کم ہوتی تو یہ نمایاں ہو جاتے تھے۔ ایک لائن میں تین دہانے تھے۔ ڈیوڈ شا نے وسطی غار کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سب سے بہترین اور بڑا ہے۔“

کرنل نے اندر جانے سے پہلے تینوں کا معائنہ کرنے کا کہا۔ اس نے فاسفورس اسٹک ہلا کر اندر پھینکیں تو ان کی روشنی سے غار اندر سے روشن ہو گئے اور کرنل مختلف زاویوں سے جھانک کر ان کا اندر سے معائنہ کرنے لگا۔ چند منٹ بعد اس نے کلیئر کا سگنل دیا۔ وہ پہلے وسطی غار کے اندر گیا۔ پھر اس نے ڈیوڈ شا کو بلایا۔ زمینی، مین، سین اور باسو باہر تھے۔ آسمان پر کہیں آخری تارینوں کا چاند تھا۔ اس کی روشنی منعکس ہو کر یہاں تک آ رہی تھی اور ماحول کو اس قابل بنارہی تھی کہ ہم آس پاس دیکھ سکتے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ دہانہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ سلیج اس میں باسوسمیت جا سکے۔ باسو کو الگ سے لے جانا پڑا یا وہ خود جاتا۔ کرنل اور ڈیوڈ شا کو اندر گئے ہوئے تقریباً پانچ منٹ ہو گئے تھے اور اب تک ان کی واپسی نہیں ہوئی۔ جب دس منٹ ہو گئے تو میں نے اندر جھانکا۔

”کیا ہمیں باہر رکھنے کا ارادہ ہے۔“

کرنل اور ڈیوڈ شا کسی چیز پر جھکے ہوئے تھے۔ کرنل نے مڑ کر مجھ سے کہا۔ ”ہوشیار ہو یہ جگہ برفانی آدمی کے استعمال میں ہے۔“

یہ سن کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”تم اب بتا رہے ہو۔“ پھر پلٹ کر زمینی اور سین کو ہوشیار کیا۔ ”ہر طرف دیکھو، کرنل کہہ رہا ہے یہ غار برفانی آدمی کا مسکن ہیں۔“

ایک منٹ بعد کرنل باہر آیا۔ اس نے کہا۔ ”اندر ایک گڑھے میں مارک کی لاش ہے۔“

یہ سن کر سب کو دھچکا لگا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ برفانی آدمی بھی آس پاس ہے۔“

”بالکل۔“ کرنل نے کہا۔ ”اس نے لاش گڑھے میں تقریباً چھپا دی تھی مگر مارک کی جیکٹ کا ایک کونا باہر

رہ گیا اور وہ مجھے نظر آگئی میں نے برف ہٹائی تو نیچے مارک کی لاش موجود تھی۔“

”اب ہم کیا کریں گے؟“ زمینی نے پوچھا۔

”ہم یہیں قیام کریں گے۔“ ڈیوڈ شا نے کہا۔

”اور برفانی آدمی، اس کا کیا ہوگا؟“

”اس کا علاج بھی ہمارے پاس ہے۔“ ڈیوڈ شا نے حکم دیا۔ ”سامان اندر لے چلو۔“

”اندر ایک لاش موجود ہے۔“ میں نے پھر کہا تو ڈیوڈ شا نے سر دنگھڑوں سے مجھے دیکھا۔

”وہ لاش ہمیں کچھ نہیں کہے گی۔“

باہر کھڑے رہنا بھی عقل مندی نہیں تھی مجبوراً ہم اندر آئے۔ غار کے اندر بھی برف تھی اور یہاں جا بہ جا برفانی آدمی کے قدموں کے نشانات تھے۔ برف سخت تھی مگر ان پروزنی پاؤں آنے سے برف دب گئی تھی اور یوں اس پر نشان آ گئے۔ یہ نشان عام آدمی کے پاؤں جیسے مگر اس سے تقریباً دو گنے بڑے تھے۔ مارک کی لاش گڑھے

میں موجود تھی۔ کرنل نے اس کے اوپری جسم سے برف ہٹادی تھی برفانی آدمی نے اس کی گردن اڑھتی تھی اور اس کی پوری جیکٹ سامنے سے سرخ ہو رہی تھی۔ یہ منظر خاصا خوفناک تھا۔ زینی نے منہ پھیر لیا۔ میں نے کرنل سے کہا۔ ”اسے دفنا دینا ہی بہتر ہوگا۔“

”نہیں پہلے برفانی آدمی کا سید باب کرو۔“ ڈیوڈ شانے حکم دیا تو کرنل سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس دوران میں سین ایک کونے میں اپنا کچن لگا رہا تھا۔ ہم کو پیش آنے والے حادثات اور اموات اپنی جگہ اور پیٹ کی بھوک اپنی جگہ تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر برفانی آدمی مارک کی لاش یہاں لایا تھا تو اسے اوشا کو بھی یہیں لانا چاہیے تھا۔ میں باہر جانے لگا تو ڈیوڈ شانے مجھے روک دیا۔ ”ابھی باہر مت جاؤ۔“

”مجھے اوشا کو دیکھنا ہے ممکن ہے برفانی آدمی اسے بھی یہاں لایا ہو۔“

”اوشا یہاں نہیں ہے اور اس وقت تمہارا باہر جانا تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”مجھے برفانی آدمی کی پروا نہیں ہے۔“

”نہیں خطرہ دوسرا ہے باہر کرنل بارودی سرنگیں لگا رہا ہے۔“ ڈیوڈ شانے کہا تو میں حیران رہ گیا۔

”بارودی سرنگیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہم خاص طور سے اس خطرے سے نمٹنے کے لیے اپنے ساتھ بارودی سرنگیں بھی لائے ہیں اسی لیے میں تمہیں باہر جانے سے روک رہا ہوں۔“

”اوکے میں باہر نہیں جاؤں گا لیکن دہانے تک تو جاسکتا ہوں۔“

”ہاں دہانے تک خطرہ نہیں ہے۔“

میں دہانے تک آیا اور باہر جھانکا تو کرنل ٹیلے کی دیوار کے ساتھ سرنگ نصب کر رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے آواز نکال کر اسے متوجہ کیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اشارے سے پوچھا کہ کیا ہے؟ میں نے اسے جوابی اشارے سے پاس آنے کو کہا۔ اس نے انگلی سے ایک منٹ رکنے کو کہا اور پھر اپنا کام مکمل کر کے محتاط انداز میں دہانے تک آیا۔ ”کیا ہے تم باہر کیوں آئے ہو؟“

”مجھے اوشا کا خیال آیا ہے شاید برفانی آدمی اسے بھی یہاں لایا ہو۔“

”میں نے پہلے ہی باقی دو غاروں کا جائزہ لے لیا ہے وہ خالی ہیں اور وہاں کوئی نشان بھی نہیں

ہے۔“

”ممکن ہے آس پاس کوئی اور بھی جگہ ہو۔“

”اس وقت باہر کا جائزہ لینا بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔“ کرنل نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے

کہ اگر برفانی آدمی باہر موجود نہیں بھی ہے تو جلد وہ یہاں آنے والا ہے۔“

میرا بھی یہی خیال تھا کہ جلد یا بدیر برفانی آدمی اس غار کا رخ کرے گا۔ مگر اوشا کا خیال مجھے بے چین کر رہا تھا۔ اگرچہ کرنل کہہ رہا تھا کہ اس نے باقی دو غار دیکھ لیے ہیں مگر میں اس کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف وہ باہر بارودی سرنگیں لگا چکا تھا اور ان کی پوزیشن سے صرف وہی واقف تھا۔ اگر میں باہر جاتا اور میرا قدم کسی سرنگ پر آ جاتا تو میں مارا جاتا۔ کرنل نے جان بوجھ کر غار کے دہانے پر

برف جمع کی تھی جیسے اسے چھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس کا مقصد برفانی آدمی کو ہوشیار کرنا تھا۔ تاکہ وہ براہ راست اندر آنے کی کوشش نہ کرے اور باہر گھومے پھرے۔ اس طرح کسی بارودی سرنگ پر اس کا پاؤں آنے کا امکان زیادہ ہو جاتا۔ میں نے سوچا اور فی الحال خاموش ہو گیا۔ دہانے کی نگرانی باسو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ کرٹل اور زینی بھی مسلح اور چوکنا تھے۔ سین اپنے کام میں مصروف تھا۔ ڈیوڈ شا آرام کر رہا تھا۔ میں نے کرنال سے پوچھا۔

"ان بارودی سرنگوں کی قوت کیا ہے؟"

"ایک انسان کو بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے اس کا نصف دھڑ اڑ جائے گا مگر ایک برفانی آدمی بھی بچ نہیں سکے گا۔ اگر وہ نہ مرے تب بھی خرت کے قابل نہیں رہے گا۔"

سین نے ٹیونا مچھلی کے ٹن لکالے اور برنر پر اس کے قتلے فرانی کرنے لگا اس کے ساتھ خشک نان تھے جو راشن میں ساتھ آئے تھے۔ گرم کرنے پر یہ نرم اور تازہ ہو جاتے تھے۔ وہ قتلے فرانی کر کے باری باری سب کو گرم نان کے ساتھ پیش کر رہا تھا۔ کھانے کے بعد گرم کافی تھی۔ آج پہلے نوڈلز اور چائے نہیں بنی تھی کیونکہ وہ ہنگامی حالات میں تھے اس لئے پیٹ بھرنا اولین ترجیح تھی۔ ایک عدد لاش کی موجودگی میں بھی کسی نے کھانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ غار بند ہونے کی وجہ سے اندر اتنا سرد نہیں تھا اور جب یہاں ہم آئے اور پھر برنر بھی جلا تو اندر کا درجہ حرارت مزید بہتر ہوا تھا۔ یہاں ہمیں خیموں کی ضرورت نہیں تھی اس لئے نیچے ترپال بچھا کر اسی پر سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ آج سفر نہ صرف طویل بلکہ اعصاب شکن بھی رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے پیش آنے والے حادثات نے طبیعت کو بد مزہ کر دیا تھا۔ میں سو جانا چاہتا تھا تاکہ جب کوئی ہنگامی موقع آئے تو میں تازہ دم ہوں۔



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
ستارہ میں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کاشفِ ذخیر کے قلم سے ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور ناول



PDFBOOKSFREE.PK

ایک انگ، ایک بار، ایک دن، ایک آج تک سلسلہ

- ❑ کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- ❑ انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص مسائل پر نظر رکھتی ہے۔
- ❑ خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفہ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی ممکن نہیں۔
- ❑ اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اس کی پہنچ گئی۔
- ❑ اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مسطور تھا۔
- ❑ چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چمٹتی گاہت ہوا۔

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور
 فون: 37247414
 علی میاں پبلیکیشنز